www.pklibrary.com

جنوری 2024

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ

قیمت 200 روپے

بانی
معراج رسول

سسپنس ڈائجسٹ
CPNE
MEMBER APNS

مدیرِ اعلیٰ
عذرا رسول

مدیرہ
یمنیٰ احمد
نائب مدیر
اطہر حسین

مارکیٹنگ وسرکولیشن منیجر
محمد شہزاد خان
0333-2256789

07 انشائیہ / جون ایلیا
سالوں پہلے لکھے گئے لفظوں کی اہمیت، جو آج بھی پورے اترتے ہیں

08 آپ کے خط / مدیر اعلیٰ
سسپنس کی مجلس مشاورت وقارئین کی تلخ و شیریں باتیں گلے شکوے اور پرخلوص مشورے

12 جنگجو صف شکن / زویا صفوان
ماضی کا آئینہ... بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات

39 کھڑکی / عبوق بخاری
اپنی کھڑکی سے مناظر دیکھنے والی حسینہ کی دلچسپ کارروائیوں کا ماجرا

50 شہ زور / اسما قادری
اپنے حریفوں پر قہر بن کر نازل ہونے والے ایک سراپا انتقام نوجوان کی حیرانگیز داستان

73 تشنہ کام / عائشہ نصیر
اپنی ہی جان کے دشمن ایک دھوکے باز مجرم کی راہ فرار کا انوکھا قدم

80 دستور شکن / ملک صفدر حیات
جرم کی دنیا میں خیر اور شر کے درمیان ہونے والی معرکہ آرائی کا احوال

105 پراسرار مردہ / شاہد لطیف
ایک مردے کی پراسرار سرگرمیوں کا خوفناک احوال

pklibrary.com

120 — **محفلِ شعر و سخن** / قارئین
آپ کے ہاتھوں بھی ایک انجمن رنگ رنگ
آپ کی پسند، آپ کے ذوق سے ہم آہنگ

123 — **ہمراز** / آصفہ ضیا احمد
خوابوں کی کرچیوں سے زخمی ایک
عاشق جوڑے کی دلدوز کتھا

136 — **جنگ باز** / ڈاکٹر عبدالرب بھٹی
معاشرتی ناسوروں اور درندوں کی خوں ریز سازشوں اور
زخم زخم ہونے والے ایک جنگ باز کی دلدوز داستان

157 — **بدلہ** / امجد اقبال
روپ اور مقام بدلنے
والی حسینہ کی عجیب روداد

163 — **صاف بن صیاد** / ضیاء تسنیم بلگرامی
اپنے دور کی ایک پراسرار مگر
دلچسپ شخصیت کے حالات

171 — **شاکا** / نازیہ کامران کاشف
سترھویں صدی کی اندھیری راتوں سے
جنم لینے والی ایک لرزہ خیز داستان

194 — **وہی راستے وہی مرحلے** / ناہید سلطانہ اختر
پلٹ پلٹ کر گمشدہ راستوں اور منزلوں کو تلاش
کرنے والی ایک عاقبت نااندیش حسینہ کی داستان

** — **کترنیں** / ادارہ
دنیا بھر سے ادھر ادھر سے لطیفے، چٹکلے، اقتباسات
مسکراہٹیں اور قہقہے سب کچھ آپ کے لیے

pklibrary.com

انشائیہ

جون ایلیا

مبارک ترین

"جنابِ نشیان! آداب، بندگی، کورنش! تو آپ تشریف لے آئے۔ آپ نے مجھ پر اور میری آنے والی نسلوں پر بھی احسان فرمایا۔"

"جون ایلیا! آخر بات کیا ہے۔ تم اتنے تپے میں کیوں ہو؟"

"میں اتنے تپے میں کیوں ہو؟ نشیان! اس صورت میں میرا اور تمہارا نباہ ممکن نہیں ہے۔"

"کس صورت میں جون ایلیا، آخر ہوا کیا ہے؟"

"ہوا یہ ہے کہ دوپہر سے سہ پہر ہوئی اور اب شام کا اخیر ہے اور آپ اب تشریف لائے ہیں۔ آپ کی شہر گردی اور بیروں نوردی روز افزوں ہے۔ میں تم سے بار بار ایک بات کہتا چلا آیا ہوں اور وہ یہ کہ مجھے زیادہ دیر تک اکیلا نہ چھوڑا کرو...... مگر تم جو ہو تمہارے سننے کی اہلیت بہرے پن کی ایک لگاتار اور شاندار شروعات ہوتی جا رہی ہے اور اسے بھگت کر اب میں کم سے کم آدھا گونگا ہو چکا ہوں۔ میں دوپہر سے لے کر ایک ساعت پہلے تک افلاطون اور ابن مسکویہ سے بات چیت کرتا اور آپ کی منتظری میں بتلا رہا ہوں۔ آخر وہ دونوں مجھ سے رخصت طلب کر کے "الماری" میں چلے گئے...... پھر آپ کے انتظار میں وقت کاٹنے کے لیے میں ابنِ فارض اور عرفی سے استفادہ کرنے میں لگ گیا۔ وقت کا تنا رہا اس حالت میں کہ آپ اب آئے اور اب آئے۔ پر تم نہیں آئے، یعنی نہیں آنا چاہا۔

"تم میری اس بات کا بہت بُرا ماننا کہ تم بہت ملنسار اور مجلسی ہوتے جا رہے ہو، یعنی فرنگی زبان میں "سوشل۔" پچھلے دنوں مجھے بہت سے لوگوں نے یہ بتایا کہ تم ایک دن یعنی تم کسی قرابت دار کی لڑکی کی منگنی میں میزبانی کے فرائض انجام دیتے ہوئے نظر آئے۔ ایک رات بارہ بجے تک تم کسی جنے کی شادی میں ایک "منتظمِ اعلیٰ" کا عہدہ سنبھالے ہوئے تھے۔

"میرے دماغ میں جو چھن ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ تم بہت "ملنسار" مرنجاں مرنج اور مجلسی ہو گئے ہو۔ مجھے تو یہ بتایا گیا ہے کہ اب تم اپنے دن کا ایک قابلِ ذکر حصہ ریستورانوں میں شاعروں کے ساتھ بیٹھ کر گزارتے ہو۔ شاید پندرہ بیس دن پہلے کی بات ہے کہ تمہاری زبان سے ایک نہایت فحش جملہ صادر ہوا تھا۔ وہ کچھ یہ تھا کہ عبیداللہ علیم نے اسد محمد خان پر آج ایک عجب فقرہ لگایا۔ میں نے تمہارا یہ جملہ نہ سننے کی طرح سنا اور پھر بھول گیا مگر اب میں سمجھا ہوں کہ تم بھی شاعروں کی صحبتِ بد کے اثر میں آ کر میری چھ سو برس کی زبان کی ناموس بگاڑنے میں کوشاں ہو۔ "فقرہ لگانا" کیا اردو کا کوئی محاورہ ہے؟ تمہیں اتنی بے ہودہ زبان بولنے کی ہمت کیسے ہوئی؟

"جونی! تم ان دنوں بہت کھولے ہوئے اور تپے ہوئے رہتے ہو۔ تم اپنے احساسِ جمال اور اپنے دل کے شاعرانہ جذبوں تک سے بے سروکار ہو گئے ہو۔ اس لیے کہ تمہیں تمہارے اصل طیش اور حقیقی غصے یعنی اپنے لوگوں، کروڑوں لوگوں کے طیش اور غصے سے بے واسطہ کر دیا گیا ہے...... اور دل کے دل اور جان کی جان سے یہ سمجھنے لگے ہو کہ تمہارا اور تم ایسے لوگوں کا لکھا بڑی طرح غارت گیا۔ اس وقت بھی تم بہت کھولے اور تپے ہوئے ہو، یعنی بہت۔"

"ہاں نشیان! بہت اور بہت سے بھی کچھ زیادہ ہی...... مگر اس وقت میری جھونجل کی وجہ میرا یہ احساس ہے کہ تم بہت "ملنسار" ہو گئے ہو اور کیا ہم دونوں یہ بات نہیں جانتے کہ ملنسار ہونے کا کیا مفہوم اور کیا مطلب ہے۔ ملنسار کے صحیح کیفیت اور مفہوم کے اعتبار سے کئی مترادف ہیں مثلاً دوغلا، ٹمنی اور منافع وغیرہ۔

"ملنسار ظالم کا بھی نیاز مند ہوتا ہے اور مظلوم سے بھی دعا سلام رکھتا ہے۔ وہ بچوں کا بھی جی بہلاتا ہے اور جھوٹوں کو بھی لطیفے سناتا ہے۔ وہ سقراط کے حامیوں سے بھی دردمندی کا رشتہ جوڑے رکھتا ہے اور اتھنس کی اس عدلیہ کے ارکان میں سے ہر رکن کے حضور بھی آداب گزارتا ہے جس نے سقراط کو اسیری اور پھر شوکران کا قرابہ پلانے کی سزا دی تھی۔ نشیان! ملنسار انسان، انسان کی سب سے زیادہ بودی، بھدی قسم ہے۔ میں نے غلط کہا، ملنسار انسان یزداں یا اہرمن تو ہو سکتا ہے کہ اس کا سروکار سب سے رہتا ہے مگر وہ انسان نہیں ہوتا...... اور اگر تمہیں اس کے انسان ہونے پر اصرار ہے تو میں تمہیں اتنی رعایت دے سکتا ہوں کہ وہ ایک بدترین، بدکوش، بزدل اور بدنہاد انسان ہوتا ہے۔ وہ "وقت" کے ہر موسم سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔

"اماں نشیان! مجھے "وقت" کے لفظ پر یہ بات یاد آئی کہ یہ مہینا اس سال کے آخری دن ہیں اور ہم وہیں کے وہیں ہیں جہاں گزشتہ سال، گزشتہ سال ہی نہیں بلکہ گزشتہ بیس اکیس سال پہلے تھے اور سچ پوچھو تو ہم اس سے بھی بہت پیچھے چلے گئے ہیں۔ ہماری طبع کی جولانی، جودت اور ہنگامہ، سامانی کا اقتضا یہ ہے کہ ہم...... پاکستان کے قیام کا جشن جس اہتمام سے مناتے ہیں، اب نئے سال کے دوران پاکستان کے زوال کا "جشن" بھی پورے کروفر کے ساتھ منائیں۔ آخر تو ہمیں یہ اعزاز حاصل ہے کہ ہم گزشتہ کئی سال سے بڑے سلیقے قرینے کے ساتھ "واپس" ہوتے چلے گئے ہیں۔ میں نے غلط کہا، صحیح بات یہ ہے کہ جو "واپس" ہوتے چلے گئے ہیں وہ اس ملک کے حکمراں، سیاست داں، صاحبانِ قوت اور افسر شاہی کے...... گھٹیا اور گھناؤنے دوپائے ہیں۔ ان سب کو نیا سال یکسر نامبارک ہو اور اس ملک کے اصل مالکوں کے حق میں یعنی عوام کے حق میں یہ سال مبارک ترین سال ثابت ہو۔ ہاں نشیان! ہمارے حق میں یہ سال مبارک ترین سال ثابت ہو۔"

☆☆☆

pklibrary.com

ایک خط

عزیزانِ من...... السلام علیکم!

کیا بات ہے...... جناب وقت کی رفتار کو جیسے پر ہی تو لگے ہیں...... ابھی 2023ء کا آغاز ہوا تھا کہ اختتام نے ڈیرے ڈال دیے اور دیکھتے ہی دیکھتے جنوری 2024ء کا سسپنس آپ کے مطالعے کا شوق پورا کرتے ہوئے آپ کے ہاتھوں کی زینت بن گیا...... ماہ دسمبر میں سسپنس کی ترتیب و اشاعت کا سلسلہ چلا اور ہمیں ایک سال کے بچھڑنے اور نئے سال کی آمد کا تاثر عجیب احساس سے دوچار کر گیا جبکہ دل سے دعا نکل رہی ہے کہ اللہ پاک یہ نیا سال تمام امتِ مسلمہ اور پاکستان کے لیے رحمت اور کرم نوازیوں کا سال ثابت ہو اور فلسطین پر ہونے والے ظلم و ستم کا اختتام اور راز الوں کا پیامبر ہو (الٰہی آمین)۔ ملکی اور بین الاقوامی سطح پر جہاں بہت سی تبدیلیاں اثر پذیر ہو رہی ہیں...... وہاں عوامی مسائل مزید اضافوں کے ساتھ پاکستانیوں کے لیے آزار کا سبب بنے ہوئے ہیں...... یعنی حالات کی یہ ستم ظریفی کچھ کم نہیں کہ مایوس ہو کر استطاعت رکھنے والے تو ملک بدری کو ترجیح دینے پر مجبور ہو رہے ہیں جبکہ بے روزگاری ایک شہر سے دوسرے شہر ہجرت کرنے پر اکسا رہی ہے...... سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کب تک اور کس انجام تک چلتا رہے گا...... نہ صرف یہ کہ ملکی زرخیزی اور وسائل پاکستانیوں کے لیے ایک شجرِ ممنوعہ بنتے جا رہے ہیں جبکہ یہی زرخیزی اور اجناس بیرونِ ملک ترسیل کر کے بے تحاشا زرِ مبادلہ کمایا جا رہا ہے جس سے صرف چند فیصد لوگ ہی مستفیض ہو رہے ہیں۔ گرمیوں میں بجلی اور سردیوں میں قدرتی گیس کی قلت کا پرچار...... اس پر اضافی ٹیکس کی مد میں بلوں میں بے تحاشا اضافہ کچھ کم ظلم نہ تھا کہ مزید ستم یہ ہوا کہ اچھی کوالٹی کا اجناس جن میں بہترین چاول اور دالیں ہماری قوم کی دسترس سے دور کر دیے گئے۔ افسوس کا مقام ہے کہ یہاں چاولوں کا...... ٹوٹا بھی اس معیار کا میسر ہوتا ہے جسے پرندے بھی شاید منہ نہ لگاتے ہوں...... اوپر سے چاولوں کی قیمتوں میں بے دریغ اضافہ...... بھوک اور افلاس کو بڑھانے کا سبب بن رہا ہے مگر افسوس کہ بااختیار طبقہ شہنشاہیت کی رسا کشی میں اتنا مصروف ہے کہ اسے لوگوں کی غربت کا نعرہ صرف حکومت حاصل کرنے کے لیے چارے کے طور پر استعمال کرنا آتا ہے لیکن غریب بے چارے کے لیے اس کے پاس کچھ نہیں ہوتا۔ یہ ظلم جانے کب تک یونہی جاری رہے گا۔ روٹی، کپڑا اور مکان...... یوں کہا جائے کہ ”کھا گئے سب دھن وان“ تو غلط نہ ہوگا...... دھن والے دھن سمیٹنے کی دھن میں لگے ہوئے ہیں جبکہ عوام سراپا سوال ان کی ایک ہمدرد نظر کے منتظر ہیں...... شاید 2024ء اس انتظار کو ختم کرنے کا سبب بن جائے اور کچھ آسانیاں پاکستانی عوام کا بھی مقدر بن جائیں (الٰہی آمین)...... اور اب اچھی امیدوں اور ڈھیروں دعاؤں کے ساتھ نئے سال کی پہلی محفل سجانے چلتے ہیں۔

❋ جنید علی ملتان سے سالانہ تبصرہ بڑی شان سے لے کر حاضر ہو رہے ہیں۔ ”ہماری نگاہوں کے سامنے 2023ء کے تمام سسپنس ڈائجسٹ رکھے ہوئے ہیں۔ دسمبر کی اختتامی، سرد، خاموش اور طویل راتیں ہیں اور ہم ہاٹ کریم کافی کے مگ سے لطف اندوز ہوتے ہوئے سسپنس کا سالانہ تبصرہ تیار کر رہے ہیں جو کچھ اس طرح ہے کہ 2023ء کے تمام شمارے دلچسپ رہے جو 2712 صفحات میں قید تھے۔ ہر شمارے میں جون ایلیا کا کالم ”انشائیہ“ مختلف معاشی، معاشرتی، اخلاقی و روحانی معاملات میں ہماری راہنمائی کر رہا تھا۔ اس سال سسپنس کے لیے قارئین کے محبت ناموں کی تعداد 67 تھی جو قابلِ اشاعت رہے۔ سب سے زیادہ نامے روبینہ اشعر، جنید علی یعنی ہمارے، ناہید یوسف، ملک وحید، سید محی الدین اشفاق، سیتا شاہ، آذین رضوان کے شامل رہے وہیں دسمبر کے شمارے میں ہماری پکار پر دیرینہ قاری عبدالجبار رومی اور انجم فاروق ساحلی صاحب بھی محفل میں پھر سے آکر چھا گئے۔ ہمارے لیے اعزاز ہے کہ سسپنس میں ہمارے مسلسل گیارہ ماہ طویل نامے شامل ہوئے (ارے واہ کمال ہو گیا۔ اس کا مطلب آپ نے باقاعدہ سسپنس کا مطالعہ کیا ہے)۔ اس محفل کے شروع میں ہر ماہ مدیرہ کی حالاتِ حاضرہ پر اور پُر فکر و تعمیری گفتگو پڑھنے کو ملتی رہی اور ہاں، 76 نامے تاخیر کی وجہ سے شامل نہیں ہو سکے۔ سسپنس کے مستقل سلسلے یعنی ذکرِ صالحین جس میں ہر ماہ نیک اور برگزیدہ بندوں کا احوال شامل تھا۔ پورے سال اس سلسلے میں مختلف مضامین شامل ہوئے جن کے نام یہ ہیں۔ امام غزالی، حکیم لقمان، جوچیا کا عقاب، سید محمد مہدی، ابوعثمان حیری اور صاف بن صیاد شامل تھے۔ جہاں بارہ شماروں میں ہر ماہ دلکش و دل نشین انداز میں ”محفلِ شعر و سخن“ میں معیاری شاعری پڑھی وہیں تمام شماروں میں تحریروں کے سنگ سنگ ان باکس میں دلچسپ و اصلاحی مواد پڑھنے کو ملا۔ اسما قادری اور عبدالرب بھٹی کے قسط وار ناولز ہر ماہ دلچسپ انداز میں شامل رہے۔ نازیہ کامران کا ریسرچ پر مبنی ناول ”شاکا“ مئی سے منفرد انداز میں شروع ہوا جس نے قارئین کی طرف سے بے پناہ پسندیدگی کی سند حاصل کی۔ مصنف طاہر جاوید مغل کا آخری صفحات پر ناول جولائی میں شروع ہوا جو اپنی منازل طے کرتا دسمبر میں اختتام پذیر ہوا۔ جنوری 2023ء کا سرورق بہت پسند آیا۔ سسپنس کے اولین صفحات پر تاریخی تحریریں سسپنس کی پہچان اور انفرادیت کی وجہ ہیں۔ اس سال بھی پورے بارہ شماروں میں مصنفین نے تاریخ کے سنہری اوراق کو کھولتے ہوئے دلچسپ و پُر فکر ماضی کی تاریخی داستانیں پیش کیں۔ جنوری سے مارچ تک زویا صفوان کی تحریر ”باغی“ پڑھنے کو ملی جس میں ورگوت کا کردار یادگار رہے گا۔ جنوری کی دیگر تحریروں میں وظیفہ، زہریلا، جلد باز، اداس دسمبر، لاعلمی اور بقائے حیات پسند آئیں وہیں اس ماہ سسپنس کی عدالت میں صفدر حیات کی دلچسپ کہانی ”دغاباز“ پڑھی۔ آخری کہانی نشور ہادی کی ”دوسرا بچھو“ تھی جو خوفزدہ حسینہ کی دلگداز داستان تھی۔ فروری کا سرورق بیک گراؤنڈ پر دلکش منظر کشی سے مزین تھا مگر دوشیزہ کا چہرہ اچھا نہیں لگا۔ فروری کی دیگر تحریروں میں لائیکا، مشاہدہ، ادھوری واردات، خود فریبی اور خون آشام پسند آئیں۔ اس ماہ

pklibrary.com

کی عدالت میں مرزا امجد بیگ نے ”بقعۂ فتور“ میں ضمیر فروشوں کی داستان سنائی اور آخری صفحات پر ناہید سلطانہ ”گردشِ افلاک“ میں ایک عبرت ناک داستان سنا رہی تھیں۔ مارچ کا سرورق بہت خوبصورت رہا جس میں دوشیزہ کے ہاتھ میں کتاب اور ٹیبل پر کینڈل نے انفرادیت ظاہر کی۔ مارچ کی تحریروں میں اڑان، طاق، معما، پس وپیش، غیر محفوظ اور کاش پسندیدہ رہیں، وہیں اس ماہ کی عدالت میں صفدر حیات نے ”عرضِ ارض“ بتائی یعنی زمین ہم سے کیا درخواست کرتی ہے۔ یہی کہ اس کی حفاظت کی جائے۔ آخری صفحات پر نشور ہادی نے معصوم عاشق کی حسرتوں کی ایک اور دلگداز داستان سنائی جو ہمیں پسند آئی۔ اپریل کا سرورق رمضان المبارک کی مناسبت سے ترتیب دیا گیا تھا جس میں دوشیزہ کے سر پر آنچل تھا اور سرورق بہت تروتازہ تھا۔ تاریخی صفحات پر اپریل اور مئی میں اے آر راجپوت ”گلِ وفا“ میں ایک نخلستان میں جیش ونفیسہ کی دلکش داستان سنا رہے تھے جس میں دونوں کی بہادری اور پُرخلوص محبت عروج پر تھی۔ اپریل کی دیگر تحریروں میں ڈراپ سین، معزز چور، نگہبان اور گورکھ دھندا زیادہ پسند آئیں جبکہ اس ماہ کی عدالت میں صفدر حیات نے گاڑی کے ”دو پہیے“ میں ایک جوڑے کی بے اعتباری کا قصہ سنایا جس میں شادی شدہ جوڑوں کے لیے سبق پوشیدہ تھا۔ آخری صفحات پر فرح بخاری نے ”شکستہ سایہ“ میں ایک لڑکی کی نادانیوں کی طویل داستان سنائی۔ مئی کا سرورق عیدالفطر کی مناسبت سے دلکش تھا۔ مئی کی تحریروں میں سایہ، طریقۂ واردات، مردود اور زبان زیادہ پسند آئیں۔ اس شمارے میں نازیہ کامران کا ناول ”شاکا“ شروع ہوا اور اس ماہ کی عدالت میں ”دوعملی“ میں چند مجبوروں کی بے بسی کا احوال سنا رہے تھے اور آخری صفحات پر محمد فاروق انجم کی کہانی ”اسیر“ پسندیدہ ترین رہی۔ جون کا سرورق دیکھ کر تپتی دھوپ کا احساس ہوا جس میں دوشیزہ پچاس سال پرانی فلمی ہیروئن لگی۔ تاریخی صفحات پر ”فتنہ پرور“ میں زویا صاحبہ نے لارنس کی ہوشیاری وعیاری کی طویل داستان سنائی جس میں لارنس نے آخر میں منہ کی کھائی۔ جون کی دیگر تحریروں میں غلطی، چالباز، قیمتی گھڑی زیادہ پسند آئیں۔ سسپنس کی عدالت میں ”بے تحاشا“ میں امجد بیگ نے لالچ کے سبب ایک معصوم قتل کی روداد سنائی وہیں آخری صفحات پر ایچ اقبال ”کایا پلٹ“ میں محبت کے دیوانوں کی انا پرستی کا احوال دلچسپی سے سنا رہے تھے جو کافی دلچسپ تھی۔ جولائی کے سرورق کا بیک گراؤنڈ اچھا تھا۔ تاریخی صفحات پر زویا صاحبہ ”بھاروتیا“ میں بھوپت (محمد امین) کی جرأت وبہادری کی داستان پڑھنے کو ملی جس نے آخر میں اسلام قبول کیا۔ جولائی کی دیگر تحریروں میں کٹا ہوا ہاتھ، شکی، اغوا، ہوا میں تیر، اطمینان خاطر زیادہ پسند آئیں وہیں جولائی کی عدالت میں ”بے ضابطہ“ میں غلط راستوں پر چلنے والوں کی نادانیوں کی داستان پڑھی۔ آخری صفحات پر طاہر جاوید کا ناول ”آخری شام سے پہلے“ شروع ہوا۔ اگست کا سرورق اور شمارہ جشن آزادی سے متعلق تھا۔ سرورق پر گاؤں کی کوئی جٹ برادری کی دوشیزہ منہ بنا کر کھڑی تھی۔ تاریخی صفحات پر اے آر راجپوت کے قلم سے ایک دلکش اور تروتازہ سی تحریر ”گل وگلزار“ ہم نے پڑھی جس میں ہندو شہزادی اور جونا خان کی داستان رقم تھی۔ اگست کی دیگر تحریروں میں تاوان، آزارِ ماضی، وبال اور نسیان تحریریں ٹاپ پر تھیں۔ اگست کی عدالت میں ”دختِ فتن“ میں فتنہ پرور لڑکی کی چالاکیوں کی داستان پڑھنے کو ملی۔ ستمبر کے سرورق کا بیک گراؤنڈ بہت اچھا تھا مگر دوشیزہ کو دیکھ کر لگتا تھا جیسے سو کر اٹھی ہو۔ تاریخی صفحات پر شہزادی سرسوتی اور سورن لتا کے ساتھ دو مسلم شہزادوں کی دلچسپ ”اندر اندر داستان“ اے آر راجپوت کے قلم سے پڑھی اور باقی تحریروں میں قیمتی متاع، بے نیاز، روئی کا چکر، ظاہر وباطن اور مکان ومکین بھی ٹاپ پر تھیں جبکہ ستمبر کی عدالت میں ”آوازِ حق“ صفدر حیات نے ظلم وبرائی کے خلاف اٹھائی۔ اکتوبر کا سرورق جاذبِ نظر تھا۔ اکتوبر اور نومبر کے شماروں میں تاریخی صفحات میں اے آر راجپوت نے ”شعلہ شب گیر“ منفرد موضوع پر طویل تاریخی تحریر لکھ کر سسپنس کا لطف دوبالا کر دیا جس میں شوکت مرزا، نورن اور وردانہ کے کردار یادگار رہے۔ اکتوبر کی باقی کہانیوں میں بے ایمان، تشنہ لب، جیسے کو تیسا، سوا سیر، احساسِ جرم اور پس مردن کہانیاں بھی کسی سے کم نہیں تھیں۔ ہاں، اکتوبر کی عدالت میں صفدر حیات کی ”اندھیر نگری“ شامل رہی۔ نومبر کا سرورق جس کا بیک گراؤنڈ براؤن تھا، بہت ہی اچھا رہا۔ ”خدا کی رسی“ نومبر کے شمارے کی ٹاپ کہانی تھی جس میں اپنے وطن کی عزت کے لیے بہادر جاں بازوں نے جامِ شہادت نوش کیا۔ باقی تحریروں میں پیغام رساں، ذرا سی بات، پراسرار بھی اچھی تھیں اور ”چوپٹ راج“ بھی حسام بٹ کے قلم سے تحریر اچھی تھی جس میں قاتل صفدر کو اس کے انجام تک پہنچایا گیا۔ اب دسمبر پر تفصیلی بات چیت۔ اس کا سرورق پورے سال کے سرورقوں کو مات دے رہا تھا۔ دسمبر کی مناسبت سے بیک گراؤنڈ اور دوشیزہ کا پیلا لباس اور ساتھ سائڈ پوز کی دلکش مسکراہٹ کافی خاص تھی۔ جون صاحب سالِ نو کے لیے اپنے خدشات اور آرزوئیں بتا رہے تھے۔ محفل میں روبینہ اشعر حسبِ معمول اچھے سے تبصرہ کرتی ہوئی نظر آئیں۔ جبار صاحب اب آپ بھی ہر ماہ محفل میں آئیں اور اپنے اس موجودہ شاندار تبصرے کی طرح لطف دوبالا ہر ماہ کریں۔ ویسے ہی جیسے محی الدین اشفاق، ملک وحید، بینا شاہ، ناہید یوسف کرتی ہیں۔ انجم فاروق ساحلی کی مختصر حاضری بھی اچھی تھی مگر اگلی بار بھی ہونی چاہیے۔ تاریخی صفحات پر حسبِ معمول زویا صفوان ”جنگجوئے صف شکن“ کی پہلی قسط میں تیمور کا کردار بہت ہی دلچسپ اور آج کی نسل کے لیے ایک مثال ہے۔ درحقیقت اسلام نے صنفِ قوی کو ہمیشہ سے ایک باوقار انداز عطا کیا ہے۔ اب بھی وقت ہے ان رسائل کی تحریروں کو پڑھ کر ہم اپنے اصل، اپنے ماضی کے بہادر مسلمانوں کی داستانوں سے آگاہ ہو سکتے ہیں۔ تاریخی تحریر کے بعد کی ”پہلی کہانی“ صائمہ دانش کے قلم سے کافی سنسنی خیز تھی جس میں جینی ولسن کی پیشہ ورانہ کارکردگی عروج پر تھی جس کی کہانی کا پلاٹ اس کے لیے کافی پیچیدہ رہا، خود جینی کے لیے.... ”شہ زور“ اب کچھ ذرا ریلکس موڈ میں آئی ہے ورنہ ہر قسط میں دشمنوں نے ناک میں دم کر کے رکھا ہوا تھا۔ بادل کے ساتھ جو کرنا ہے جلدی کریں۔ کہیں ایسا نہ ہو برائی مرتے مرتے زندہ ہو جائے۔ حیات یزدانی نے اقبالِ جرم کر لیا۔ شکر ہے اس کا بھی قصہ ختم ہوا۔ ”سامنے کی بات“ تحریر ویسے تو اچھی لکھی گئی تھی۔ گڑیا نے شروع میں سب کو اچھے سے ستایا اور آخر میں بھی ساری زندگی کے لیے ہیرو کے ساتھ رہے گی مگر شاید اب بدل جائے۔ اس سال کی آخری عدالت میں ”حجت تمام“ میں ایک بہت ہی تلخ موضوع پر امجد صاحب نے کافی اچھے سے لکھا۔ بابر نے فقط پانچ ہزار کے لیے

pklibrary.com

سرا احمد پر اتنا گھٹیا الزام لگایا مگر آخر میں ہاتھ صرف جیل کی ہتھکڑیاں ہی آئیں۔ انجم فاروق نے بھی ایک بے بس نوجوان کی دکھی کہانی ''شہر بے وفا'' میں سنائی۔ جس کی زوجہ محترمہ انہیں دھوکا دے رہی تھیں مگر آخر میں برائی کی ہی ہار ہوئی اور کون سچا تھا اور کون جھوٹا، سب سامنے آگیا۔ شاہدہ شاہ کی ''شکار'' بھی بہتر رہی۔ سیر کو سوا سیر ہی مل گئے اور عبدالکریم کو اچھے سے منہ کی کھانی پڑی۔ عائشہ نصیر ترجمہ زاد تحریریں لکھنے میں ماہر ہیں جو ہر بار بہت دلچسپ اور منفرد موضوعات اور عنوانات کے سنگ آتی ہیں۔ ''گڑھا مردہ'' اس ماہ کی مختصر تحریروں میں ٹاپ پر تھی جس کا ایک اپنا ہی لطف تھا۔ بیلارڈ نے خود کو ماضی میں موت کے منہ سے تو نکال لیا تھا مگر اپنی ساتھی کو نہیں بچایا۔ ''جنگ باز'' میں سہراب کا ایک اور ساتھی جان سے گیا جس کی وجہ سے سہراب کی ول پاور میں اپنے دشمنوں کا منہ توڑ جواب دینے کے لیے مزید اضافہ ہوگیا ہے۔ جو بھاگی بوٹی کا اثر ہے۔ کہانی دلچسپی سے اپنی منازل طے کر رہی ہے۔ ''شاکا'' نے اس بار کمال کر دیا اور کیا ہی دلچسپ پلاٹ نازیہ نے ترتیب دیا ہے۔ صوفیہ کے دل میں چھپی خواہش پوری ہو رہی ہے۔ بہت خوب رہی قسط۔ طاہر جاوید کی کہانی ختم ہوگئی۔ اچھا ہی ہوا۔ صالح اب مزید کچھ کرتا۔ آخری شمارے میں بھی اشعار کی محفل خوب تھی۔ ''صاف بن صیاد'' واقعی کافی منفرد تھا اور دنیا کے سب سے سنہری دور میں یہ واقعہ وقوع پذیر ہوا۔ دوسری قسط کا انتظار ہے۔ لیجیے ہمارا تبصرہ اختتام پر پہنچا۔ اب آپ بھی ایک کپ چائے کا پی لیجیے کہ تھک گئے ہوں گے (بھئی واہ، خوب لاجواب تبصرہ۔ ہمیں پسند آیا)۔''

❋ سیتا شاہ کا خط ڈیرہ غازی خان سے۔ ''ماہ دسمبر کا شمارہ 2 تاریخ کو ہی مل گیا۔ مطالعے کے شوقین سمجھ سکتے ہیں سسپنس کے تاخیر اور جلدی مل جانے کے احساسات (جی جی...... بہت اچھی طرح)۔ ٹائٹل گرل کی خوبصورتی کو سراہ کر جون ایلیا کا انشائیہ پڑھا۔ زمانے کی تلخ حقیقتوں کو آشکار کرتا انشائیہ پڑھ کر خطوط کی جانب بڑھے جہاں روبینہ اشعر اپنے دلچسپ و شاندار تبصرے کے ساتھ کرسیِ صدارت سنبھالے ہوئے تھیں، مبارک باد۔ جنید علی کا تبصرہ ہمیشہ کی طرح زبردست تھا۔ عبدالجبار رومی انصاری کی دوبارہ آمد سے لگ رہا ہے کہ دیگر پرانے تبصرہ نگار سسپنس میں واپسی ضرور کریں گے۔ رومی انصاری کا تبصرہ بہت اچھا تھا۔ انجم فاروق ساحلی کا تبصرہ تو مختصر تھا مگر اس کی کسر ان کی تحریر نے دلچسپی کے عنصر کے ساتھ پوری کر دی۔ ''شہر بے وفا'' بہت اچھی تحریر تھی۔ نیلم، رفیق علی اور ظفر علی خان کی سازش کے نتیجے میں کامران کو دس سال جیل میں گزارنے پڑے لیکن کامران نے جیل سے باہر آتے ہی بڑے اچھے طریقے سے سب سازشیوں کو گھیرا اور سزا دلوائی۔ سیدہ شاہدہ شاہ کی تحریر ''شکار'' زبردست تھی۔ برائی کا انجام برا ہی ہوتا ہے۔ معصوم لوگوں کو بے وقوف بنا کر استعمال کرنے والے عبدالکریم کو سلیم اور نرگس کے ایک وار نے ہی گرا دیا۔ عیوق بخاری کی ''سامنے کی بات'' غور طلب تھی۔ بے حد پسند آئی۔ ایک ایک سطر دلچسپی سے بھرپور تھی۔ شاہ زیب کی سمجھداری سے نہ صرف سائرہ بیگم کو سامنے کی بات سمجھ آئی بلکہ دونوں گھروں کے حالات دوبارہ پہلے جیسے اچھے ہوگئے۔ ویل ڈن عیوق جی۔ ''آخری شام سے پہلے'' میں طاہر جاوید مغل صاحب نے صالح کو معافی دلوا ہی دی اور دوبارہ ہیرو بنا ہی دیا۔ یہ صحیح ہے کہ اگر کوئی بگڑا ہوا سنورنا چاہے تو اسے موقع دینا چاہیے مگر صالح کا معاملہ کافی بگڑا ہوا تھا۔ گزشتہ اقساط میں وہ کہیں ہیرو نہیں لگ رہا تھا لیکن اسے آفرین جیسی اچھی لڑکی کا ساتھ اور معافی دونوں مل گئے۔ بہر حال اختتام اچھا تھا۔ ''حجت تمام'' اچھی کہانی تھی۔ مرزا صاحب اور ملک صاحب کی تحریروں سے تعلق اتنا ہی پرانا ہے جتنا سسپنس سے۔ اس لیے ان دونوں (ملک صاحب، مرزا صاحب) کی تحاریر پڑھتے ہوئے ایسا لگتا ہے کہ پہلے ان تحریروں کو پڑھ چکے ہیں۔ زویا صفوان نے بھی نہایت شاندار لکھا، ویل ڈن۔ ''شہ زور'' ٹھیک تھی۔ صائمہ دانش کی ''پہلی کہانی'' تھوڑی الجھے انداز میں لکھی تحریر تھی۔ ''گڑھا مردہ'' اچھی کہانی تھی۔ خوش و مطمئن بیلارڈ کو اندازہ ہی نہیں تھا کہ جیک اس کی تمام برائیوں و جرائم کا حساب کرنے چل پڑا ہے۔ ''شاکا'' اس بار بھی شاندار تھی۔ محفل شعر و سخن میں تمام انتخاب اچھے تھے۔ کترنیں بھی خوب تھیں۔ مجموعی طور پر پورا شمارہ ہی زبردست تھا۔ سسپنس اور اس کی پوری ٹیم کے لیے دعاگو (رسالے کی پسندیدگی کا بے حد شکریہ)۔''

❋ روبینہ اشعر کی مبارکباد کراچی سے۔ ''قارئین کو نئے سال کی آمد مبارک ہو اس امید کے ساتھ کہ یہ سال پاکستان اور پوری امتِ مسلمہ کے لیے خیر و عافیت، خوشحالی اور سلامتی لے کر آئے اور ہم سب کے لیے مبارک ثابت ہو (آمین، ثم آمین)۔ دسمبر کا شمارہ حسبِ روایت جلد ہی مل گیا۔ ٹائٹل پر نظر پڑی تو حسینہ کو پیلے کپڑوں میں ملبوس سر جھکائے ہنستا ہوا پایا۔ ٹائٹل کو سراہتے ہوئے اور فہرست پر سرسری نظر ڈالتے ہوئے جون ایلیا کے انشائیے ''ہمہ رخ'' سے مستفید ہوئے جہاں وہ نئے سال کی آمد پر نئی امیدوں کا دیا روشن کر رہے تھے۔ خطوط کی محفل میں خود کو کرسیِ صدارت پر براجمان دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ جنید علی کا بھرپور اور طویل تبصرہ پسند آیا۔ اللہ پاک آپ کو تعلیمی میدان میں کامیابی عطا فرمائے، آمین۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے تبصرے تاریخی لحاظ سے معلوماتی ہوتے ہیں، بات کچھ سمجھ نہیں آئی۔ تبصرے میں تاریخ کہاں سے آگئی؟ خیر، تبصرہ شاندار رہا۔ سیتا شاہ، عبدالجبار رومی کی حاضری بھی خوب رہی۔ انجم فاروق ساحلی مختصر تبصرے کے ساتھ موجود تھے۔ ملک وحید اس بار محفل سے غائب رہے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے نازیہ کامران کاشف کی ''شاکا'' پڑھی۔ جوشوا نے اپنی آرمی کے ساتھ رشیا نیوز چینل پر قبضہ کر لیا۔ دوسری جانب ہیری اور اسٹیو رینزو کی تلاش میں جنگلات میں پہنچ گئے۔ چانڈ نے صوفیہ کو شاکا کے لیے منتخب کر لیا۔ اب دیکھتے ہیں آگے کیا ہوتا ہے۔ کہانی تمام تر سسپنس کے ساتھ جاری ہے۔ طاہر جاوید مغل کی ''آخری شام سے پہلے'' کا آخری حصہ زبردست رہا۔ صالح نے آفرین کے لیے خود کو مکمل طور پر بدل لیا اور راجے فضل نے صالح کے لیے بہت بڑی قربانی دی۔ کہانی کا اختتام شاندار رہا۔ زویا صفوان کی تاریخی کہانی ''جنگجوئے صف شکن'' کا بھی پہلا حصہ شاندار رہا۔ چنگیز خان کے خاندان اور تاریخ کے کردار تیمور اور الجائی کے بارے میں تاریخی واقعات پڑھنے کو ملے۔ اس کے ساتھ امیر حسین اور تیمور کی فتوحات بھی پڑھنے کو ملی۔ دوسرے حصے کا شدت سے انتظار ہے۔

pklibrary.com

صائمہ دانش کی ''پہلی کہانی'' خوب رہی۔ جینی ولسن نے اپنی پہلی کہانی کے لیے پُر جوش تھی اور اس کہانی سے ہی جرنلزم کا کیریئر اسٹارٹ کیا۔ عیوق بخاری کی ''سامنے کی بات'' زبردست تحریر تھی۔ شاہ زیب نے گڑیا کو اپنایا اور اس کی سمجھداری نے بہت سوں کو یہ راہ دکھا دی کہ رشتہ کرتے وقت اپنے اردگرد رشتے داروں پر نظر دوڑائیں۔ مرزا امجد بیگ کی ''حجت تمام'' اچھی تحریر تھی۔ آغا مسعود اور اس کی بیوی سلمٰی نے احمد نوید کو بڑی چالاکی سے بابر علی کو استعمال کرتے ہوئے جال میں پھنسایا تھا۔ مرزا امجد بیگ کی کڑی تفتیش کے باعث سچ سامنے آگیا اور سازش کا پردہ چاک ہوگیا۔ انجم فاروق ساحلی کی ''شہرِ بے وفا'' بھی جرم و سزا پر مبنی تحریر بھی خوب رہی۔ نیلم نے کامران کو دھوکا دیا، رفیق علی اور ظفر علی نے اپنے پیشے سے بے وفائی کی مگر بہر حال سچ سامنے آگیا۔ سیدہ شاہدہ شاہ کی تحریر ''شکار'' اچھی تحریر تھی۔ عبدالکریم بچپن سے ہی انتہائی عیار اور شاطر تھا اور اس کا سیاہ باطن اس کی شخصیت کے پیچھے مکمل طور پر چھپا ہوا تھا۔ وہ اتنا تجربہ کار اور کائیاں ہو کر بھی سلیم اور نرگس کو نہ پرکھ سکا اور بظاہر انتہائی سادہ اور بھولا بھالا سا نظر آنے والا یہ جوڑا انتہائی شاطر نکلا اور عبدالکریم جیسے گھاگ شکاری کا بھی شکار کر گیا۔ سیر کو جب سوا سیر ٹکراتا ہے تو یہی کچھ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی سلسلہ وار تحریر ''جنگ باز'' بھی اپنے پورے عروج پر ہے۔ جگنو کو ظالموں نے بڑی بے دردی سے ہلاک کر دیا۔ فوزیہ کی تلاش جاری ہے اور ساتھ ہی سہراب کی مہم جوئی بھی عروج پر ہے۔ عائشہ نصیر کی تحریر ''گڑھا مردہ'' میں شوہر کی بے وفائی پر پردہ ڈالنے والی بیوی کی چالبازیوں کا احوال پڑھنے کو ملا۔ اچھی تحریر تھی۔ ضیا تسنیم بلگرامی کی ''صاف بن صیاد'' کے پہلے حصے میں اپنے دور کی ایک پراسرار مگر دلچسپ شخصیت کے حالات پڑھنے کو ملے۔ دوسرے حصے کا انتظار ہے۔ ''محفل شعر و سخن'' بھی خوب سجی رہی۔ کترنوں کا انتخاب بھی خوب رہا۔ مجموعی طور پر دسمبر کا پرچہ شاندار رہا (اچھا تو اسی طرح شاندار طریقے سے مبارک باد بھی قبول کیجیے اتنا جاندار تبصرہ کرنے کے لیے)۔''

❀ سید محی الدین اشفاق، فتح پور (لیہ) سے تبصرہ کر رہے ہیں۔ ''خطوط کی محفل میں اپنا خط نہ دیکھ کر پہلی بار بالکل مایوسی نہیں ہوئی۔ پتا ہے کیوں؟ کیونکہ ہم نئے سال کی ابتدا مایوسی سے نہیں بلکہ خوشی بھرے جذبات، اچھی امیدوں اور نیک توقعات سے کرنا چاہتے ہیں۔ اپنا ادارہ ہے۔ خط اس بار نہیں لگا تو کیا ہوا۔ رشتہ جو اٹوٹ ہے، وہ تو قائم ہے نا...... اور ان شاء اللہ قائم رہے گا (او شاباش...... دل بہت خوش ہوا آپ لوگوں کی اتنی محبت پا کر جو ہمارے لیے کسی انرجی سے کم نہیں)۔ دعا ہے کہ نیا سال پاک وطن، امتِ مسلمہ اور پوری انسانیت کے لیے مبارک ثابت ہو۔ امن و آشتی کے مذہب اسلام کے پیروکار ہونے کے ناتے ہم پوری انسانیت کے لیے دعا گو ہیں۔ رب سے دعا ہے کہ مقبوضہ کشمیر، فلسطین کے اور ان مسلمانوں کی مشکلات ختم فرمائے جو کسی بھی علاقے میں اذیت برداشت کر رہے ہیں اور پوری دنیا کو ارضی و سماوی آفات، قحط، جنگ سے محفوظ رکھے (آمین)۔ روبینہ اشعر کو کرسیِ صدارت مبارک ہو۔ واقعی تبصرہ اسی جگہ کے لائق تھا۔ جنید علی آپ کا خط ہمیشہ ہی بہت اچھا لگتا ہے لیکن اس بار تو اپنی اسٹڈیز کے بارے میں بتا کر آپ نے دل باغ باغ کر دیا۔ پڑھیے، پڑھیے...... ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ آپ نے جس طرح مطالعے اور کتب بینی کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے اس سے آپ کے ذہن اور علم دوستی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ اللہ کرے تمام نوجوان مطالعے سے سیکھنے کے عمل کو اپنا لیں (آمین)۔ سر عبدالجبار رومی انصاری صاحب! ایک عرصے بعد آپ نے سسپنس اور ہم نے آپ کے خط کا دیدار کر لیا۔ بہت خوبصورت احساس پیدا ہوا۔ ہم سب پرانے دوستوں، ساتھیوں کے خطوط کے منتظر رہیں گے (جب کوئی محبت سے پکارے تو گمشدہ قارئین کو واپسی کی راہ اختیار کر لینی چاہیے)۔ انجم فاروق ساحلی اور سیتا شاہ کا تبصرہ بھی خوب رہا۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی جانب۔ سب سے پہلے ''آخری شام سے پہلے'' کا آخری حصہ پڑھا۔ خوشگوار اختتام نے طبیعت پر بڑا اچھا اثر ڈالا۔ طاہر جاوید مغل صاحب ویل ڈن۔ عیوق بخاری کی ''سامنے کی بات'' معاشرے کے ایک اہم پہلو کو اجاگر کرتی تحریر تھی اور یقیناً سبق آموز بھی۔ سیدہ شاہدہ شاہ کی ''شکار'' دلچسپ لگی۔ سیر کو سوا سیر ملنے کے قصے نے ثابت کیا کہ کبھی کبھی چوروں کو مور پڑ جاتے ہیں۔ صائمہ دانش کی ''پہلی کہانی''، انجم فاروق ساحلی کی ''شہرِ بے وفا'' اور عائشہ نصیر کی کہانی ''گڑھا مردہ'' اچھی تحاریر تھیں۔ ادارہ، قارئین اور امتِ مسلمہ کو سالِ نو کی مبارک باد اور نیک خواہشات (آپ کو بھی ہم سب کی جانب سے نیا سال مبارک ہو)۔''

❀ انجم فاروق ساحلی، لاہور سے چلے آ رہے ہیں۔ ''امید ہے آپ اور ادارے کے دیگر احباب بخیر و عافیت ہوں گے۔ اس بار سسپنس کا ٹائٹل گہرے رنگوں میں شوخ اور جاذبِ نظر ہے۔ انشائیہ کا نچلا حصہ زیادہ بہتر معلوم ہوا۔ خطوط کافی جامع اور بھرپور تھے۔ لوگوں نے اپنے جذبات اور احساسات کا اظہار کیا۔ ''شہرِ بے وفا'' کا شکریہ، جنگجوئے صف شکن، شہ زور، شکار، صاف بن صیاد ہشا کا، آخری شام سے پہلے، حجت تمام تحریریں خوب تھیں۔ باقی کچھ ابھی زیرِ مطالعہ ہے۔ محفل شعر و سخن بھی دل کے تار چھیڑ رہی تھی۔ سسپنس نے ''دیوتا'' کے علاوہ دوسری معاشرتی کہانیوں کو جدت کے ساتھ پیش کیا۔ ملک میں الیکشن کی آمد آمد ہے۔ الیکشن کو صحیح معیار کے مطابق کروانا چاہیے۔ اگر الیکشن میں گڑبڑ ہوئی تو کچھ لوگ وقتی طور پر خوش اور فتح مند تو ہوں گے لیکن آگے چل کر اس کا نتیجہ اچھا نہیں ہوگا۔ بڑے شہروں میں گنجان آبادی ہے۔ زیادہ کھلا ایریا نہیں۔ وہاں اسموگ کی وجہ سے اسکول اور مارکیٹیں بند کروانے کا کوئی فائدہ نہیں (لگتا ہے صاحب جلد بازی میں تبصرہ کرنے کے عادی ہیں۔ جناب! بھرپور تبصرے کے ساتھ شرکت کریں تو زیادہ خوشی ہوگی)۔''

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔

فہیم شوکت، کراچی۔ ناہید یوسف، اسلام آباد۔ مہتاب احمد، حیدر آباد۔ ملک وحید، کراچی۔ خالد احمد، ساہیوال۔ راحیل احمد، کراچی۔ نازش علی، ملتان۔ حرا اطہر، کراچی۔ میمونہ خان، کوئٹہ۔ لبنیٰ یوسف، نواب شاہ۔

دوسرا حصہ

جنگجوئے صف شکن

زویا صفوان

یوں تو یہ کائنات اللہ کی مخلوق سے بھری ہوئی ہے۔ جانے کتنے نام والے بے نام ہوئے مگر تاریخ کے صفحات نے کچھ لوگوں کو اپنے دامن میں کچھ اس طرح جگہ دی ہے جو ہمیشہ آنے والے لوگوں کو یاد رہیں گے... انہی میں چنگیز خان کے خاندان کو بھی دنیا کبھی نہیں بھول سکتی لیکن اس خاندان میں جو باہر سے شامل ہوا، اس کے کارناموں نے بھی اس خاندان کو چونکا دیا۔ اس کی جنگجو فطرت نے مشکل ترین حالات میں بھی جس طرح جینے کا رستہ نکالا اور تمام مشکلات کو اپنی جان پر جھیل کر اپنی قوم کو بدگمانی اور غیر یقینی کے بھنور سے بچایا... اس صلاحیت نے اسے تاریخ میں ہمیشہ کے لیے ایک بلند مقام عطا کر دیا۔

ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

pklibrary.com

pklibrary.com

کچھ ہی عرصے میں بہت سے سردار امیر حسین سے بیزار ہو کر تیمور کے پاس چلے آئے۔ انہی سرداروں میں سے ایک منگلی بوغا بھی تھا۔ مغل نسل کا یہ خانہ بدوش معمر سردار ماضی قریب میں تیمور کا سخت دشمن ہوتا تھا۔ وہ برملا ایک ہی بات کہا کرتا تھا۔

''اگر مجھے چھ ہزار سوار دے دیے جائیں تو میں تیمور کو زندہ گرفتار کرلاؤں گا۔''

تیمور کی بہادری، عوام دوستی اور جنگی فہم و فراست نے کچھ ہی عرصے میں منگلی کو اس قدر متاثر کیا کہ وہ ایک روز گھوڑے پر سوار ہو کر تیمور کے پاس آیا اور اپنا تعارف کروائے بغیر گھوڑے سے اتر کر اس کے سرداروں کے درمیان جا بیٹھا۔ تیمور نے بھی خوشدلی اور گرمجوشی سے اسے اپنے حلقۂ سرداران میں شامل کرلیا۔

کچھ ہی عرصے میں نوبت یہاں تک آن پہنچی کہ منگلی بوغا علی الاعلان ایک بات کہنے لگا۔

''میں امیر تیمور کا نمک کھا چکا ہوں۔ اب کسی اور کی طرف رخ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

ایک منگلی بوغا پر ہی موقوف نہیں، اگلے چند برسوں میں کئی تاتاری تیمور کے حلقہ بگوش بن گئے۔ اس دوران تیمور نے چھوٹی بڑی کئی لڑائیوں میں حصہ لیا۔ وہ بے دھڑک ہر خطرے میں کود جاتا۔

گزرتے وقت کے ساتھ تیمور کی مقبولیت بڑھتی ہی جارہی تھی۔ اس نے حقیقی معنوں میں خود کو سالارِ لشکر کی حیثیت سے منوالیا تھا۔ اس کی فوج میں حیران کن رفتار سے اضافہ ہورہا تھا۔ تیمور کی یہ صلاحیتیں، کارنامے اور مقبولیت امیر حسین کے سینے پر سانپ بن کر لوٹ رہی تھی۔ تیمور کی جانب سے معزولی کا خدشہ اس قدر بڑھا کہ وہ خود ہی دریائے آمو اور پھر بلخ کی طرف فرار ہوگیا۔ اس کی غیر موجودگی میں تیمور نے یہ شہر بہ آسانی فتح کرلیے۔

شکست کے بعد امیر حسین نے کھنڈروں میں روپوشی اختیار کرلی اور تیمور کو ایک پیغام بھجواتے ہوئے کہا۔

''مجھے حج کے لیے روانگی کی اجازت دے دی جائے تو پھر میں اس ملک میں واپس نہیں آؤں گا۔''

تیمور نے فراخدلی سے اس کا مطالبہ قبول کرلیا۔ وہ امیر حسین سے دوستانہ عہد و پیمان کے باعث اسے اپنی صوابدید پر کوئی گزند نہیں پہنچانا چاہتا تھا تاہم قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ امیر حسین کی حکمتِ عملی سے برگشتہ چند سرداروں نے اسے کسی نہ کسی طور تلاش کیا اور موت کے گھاٹ اتار دیا۔

☆☆☆

امیر حسین کی موت کے بعد تیمور نے اس کی بیوہ ''سرائے خانم'' سے شادی کرلی۔ یہ شادی درحقیقت مغلوں کی ایک قدیم رسم تھی جس کے مطابق کسی بادشاہ یا سردار کے قتل کے بعد بیوہ فاتح کے حرم کا حصہ بن جاتی تھی۔

بلخ میں تیمور کا قیام زیادہ عرصے پر محیط نہیں تھا تاہم یہ مختصر دورانیہ بھی اس کے لیے ہزارہا پرانی یادیں تازہ کرنے کے لیے کافی تھا۔ بلخ ایک گرم وادی تھی جہاں گنے کی کاشت عام ہوتی۔ تجارت کی بھی افراط تھی۔ خراسان سے ہندوستان جانے والے قافلے بھی یہیں سے گزرتے تھے۔ اس کے علاوہ کوہستانی سردار بھی اپنے مساکن سے اتر کر یہیں آیا کرتے۔ ماضی قریب میں چنگیز خان کے سپاہی اسے مٹی اور پتھروں کا ڈھیر بنائے چھوڑ گئے تھے۔ اس ڈھیر کے گرد مقبرے اور مساجد تعمیر ہوجانے کے باعث یہ شہر کسی قبرستان کا تاثر دینے لگا تھا۔

تیمور نے اسے ایک نئے سرے سے تعمیر کرکے بارونق شہر بنانے کی ٹھان لی۔ اسی دوران امیر حسین کی تدفین کے بعد تاتاریوں کو نیا ''خان'' منتخب کرنے کی بھی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ اب چنگیز خانی قانون کا بھی تقاضا یہی تھا کہ اگلا خان لازماً ''ترا'' ہو۔ اس مقصد کے لیے قبائلی مجلس ''قروتائی'' میں شرکت کے لیے تمام امیر اپنے کوہستانی مساکن سے بلخ چلے آئے۔ مولانا زین الدین اور ماوراء النہر میں ہادی و مرشد کا مقام رکھنے والے خواجہ بہاء الدین بھی اپنی تمام تر مصروفیات ترک کیے اس محفل کا حصہ تھے۔ تیمور نے البتہ خود کو ان سب سے الگ تھلگ ہی رکھا تھا۔ وہ بے نیازی سے جہانگیر کے ساتھ کھیل کود اور وقت گزاری میں مگن رہا۔ اسے قروتائی میں ہونے والے بحث و مباحثے کی کوئی خبر نہ تھی جہاں اسی کی ذات موضوعِ گفتگو تھی۔

''امیر تیمور کو خان منتخب نہیں کیا جاسکتا۔ ہم برسہا برس سے استوار عہد نامے کی خلاف ورزی کیسے کرسکتے ہیں؟'' ایک کوہستانی امیر نے کہا۔

''میرا خیال تو یہ ہے کہ اب ہمیں یہ سلطنت بھائیوں کی طرح بانٹ لینی چاہیے۔'' ایک بدخشانی سردار نے رائے دی۔

''بالکل، مناسب خیال ہے۔'' دوسرے بدخشانی سردار نے فوراً تائید کی۔ ''ہر امیر اپنے علاقے پر حکومت

کرے اور کسی بھی بیرونی حملے کی صورت میں ہم متحد ہو جایا کریں گے۔''

''لیکن میرے خیال میں یہ رائے بالکل قابلِ عمل نہیں ہے۔'' تیمور کے ایک تجربہ کار امیر نے رائے دی۔

''کیا قباحت ہے آخر اس میں؟'' بدخشانی امیر نے تیکھے انداز میں دریافت کیا۔

''اس پر عملدرآمد سے کافی منفی نتائج سامنے آئیں گے اور یہ تو ایک فطری اصول ہے کہ ایک گھر میں رہنے والے بھائیوں کے کام بھی اسی وقت ہی بخیر وعافیت انجام پاتے ہیں جب ان کے سر پر کوئی بڑا بھائی سرپرست کی حیثیت سے موجود ہو۔ ایک سلطنت کو یوں تقسیم کر کے اتفاق ومحبت سے حکومت نہیں کی جاسکتی۔ اس صورت میں جتہ مغلوں کے حملوں اور انفرادی علاقوں پر قبضے کے امکانات میں بھی اضافہ ہو جائے گا۔'' تجربہ کار امیر کہنے لگا۔

''قدیم دستورِ حکومت بحال کرنے میں برائی ہی کیا ہے آخر؟'' ایک طاقتور قبیلے کا امیر کہنے لگا۔

''ہاں تو اور کیا؟ ہمارے قدیم قانون میں بادشاہت کا تو کہیں بھی تصور ہی نہیں۔ اصولی طور پر چنگیز خان کی اولاد میں سے کسی کو حکمران مقرر کر کے تیمور کو اس کا نائب متعین کرنے میں ہی بہتری ہے۔'' ایک اور طاقتور قبیلے کا امیر کروفر سے بولا۔

ان تجاویز پر قرولتائی میں خاموشی چھا گئی۔ کئی لمحے اسی سکوت میں بیت گئے پھر خواجہ ابوالبرکات نے قرولتائی کے اراکین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''آپ سب حضرات کی رائے اور تجاویز کا احترام بجا لیکن یہ سب تجاویز دنیاوی قوانین کے زیرِ اثر دی جارہی ہیں۔ آپ میں سے کسی ایک نے بھی شریعتِ نبوی ﷺ کے احکامات کا ذکر نہیں کیا۔ آپ ایک بنیادی نکتہ کیسے فراموش کر رہے ہیں کہ چنگیز خان ایک صحرانشین غیر مسلم تھا۔ اس نے بزورِ شمشیر ظلم وجبر سے مسلمانوں پر غلبہ پایا۔ ہم چنگیز خان کے وضع کردہ قوانین کو اپنی روایات کیوں بنائیں؟''

ابوالبرکات نے اتنا کہہ کر لمحاتی توقف کیا اور حاضرین کے تاثرات کا جائزہ لینے لگے۔ ان کی توقع کے عین مطابق جنگجو تاتاریوں کے جذبات میں حدت محسوس ہونے لگی تھی۔ انہوں نے اپنے سلسلۂ کلام کا ازسرِنو آغاز کرتے ہوئے کہا۔

''تیمور کی تلوار کی دھار کسی بھی طور چنگیز خان سے کم نہیں ہے۔ وہ بڑی سے بڑی مشکل کا تنہا مقابلہ کرنے کے حوصلے سے مالا مال ہے۔ میں بحیثیت تاتاری نہیں بلکہ ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے اپنی رائے دے رہا ہوں کہ میں محض ''آلِ رسول ﷺ'' ہوں اور اپنے شیوخ وعلماء کی جانب سے تیمور کو ماوراء النہر نہیں بلکہ تورانی ممالک کا بھی حکمران تسلیم کرتا ہوں۔''

''کیا آپ یہ فیصلہ اس لیے کر رہے ہیں کہ تیمور ایک عبادت گزار اور متقی انسان ہے؟'' ایک امیر نے جز بز ہوتے ہوئے دریافت کیا۔

''نہیں، حقیقت یہ ہے کہ اس وقت تیمور ہی ایسا شخص ہے جو موجودہ طوائف الملوکی اور لوٹ مار کا خاتمہ کرنے کا اہل ہے۔ یہ تیمور ہی تھا جس نے بلادِ شمال سے مغلوں کے حملے روکنے میں کامیابی حاصل کی۔'' ابوالبرکات نے ایک اور دلیل دی۔

ان کی یہ تجویز سن کر تیمور کے جنگ آزما سپاہی رضامند دکھائی دینے لگے۔ وہ تیمور کے علاوہ کسی اور کو حکمران تسلیم کرنے پر رضامند نہیں تھے۔

ان سب کی باتوں اور تجاویز سے بے نیاز تیمور ہنوز اپنے بیٹے کے ساتھ محوِ سخن تھا۔ اس کے بعد بحث وتمحیص سے معاملے کا حتمی حل نکال لیا گیا۔ اگلے روز تمام سردار اور قبائلی امیر متفقہ طور پر تیمور کے خیمے میں آئے۔ وہ پہلے اس کے سامنے دوزانو ہو کر بیٹھے پھر ایک توقف کے بعد اس کا بازو تھام کر سفید نمدے کی مسند پر لے گئے۔ یہ مغلوں کی ایک قدیم رسم تھی جس کے مطابق سفید نمدے کی مسند قبیلے کے سردار اور حاکمِ وقت کے لیے مخصوص ہوتی تھی۔

تیمور کے لیے یہ سمجھنا دشوار نہیں تھا کہ ان خود پوش افراد نے اسے اپنا حکمران تسلیم کر لیا ہے۔ اس کے بعد مولانا زین الدین نے تاجپوشی کی ایک رسم ادا کی۔ انہوں نے قرآن پاک اپنے ہاتھ میں تھاما اور فرداً فرداً ہر سردار کے پاس لے گئے۔ رسم کے مطابق سردار قرآن پاک پر ہاتھ رکھ کر تیمور کی اطاعت کا حلف اٹھاتے۔ گو تیمور کی حکمرانی اب مسلمہ تھی اور اس کی طاقت اس کا حکم بھی منوا سکتی تھی تاہم اس رسم کی ادائیگی کے بغیر اطاعت کا اظہار ممکن نہیں تھا۔

مولانا زین الدین کے ہاتھوں میں قرآن پاک پر اپنا دائیں ہاتھ رکھے ہر سردار نے کم وبیش یہی الفاظ دہرائے۔

''ہم تاتاری، امیر تیمور کے نمک خوار ہیں۔ ان کی اطاعت ہمارے لیے باعثِ عزت ہوگی۔ امیر تیمور سے غداری ہمارے اور ہماری اولاد کے لیے باعثِ شرم ہوگی۔ امیر تیمور ہماری املاک کے محافظ ہوں گے۔ وہی ہمارے

جھگڑوں کا تصفیہ کریں گے۔ اگر وہ اپنے فرائض انجام دینے میں ناکام رہے تو ہم تاتاری ایک مجلسِ مشاورت کے بعد کوئی نیا امیر منتخب کرلیں گے۔''

اس کے بعد مولانا زین الدین تیمور کے سامنے قالین پر کھڑے ہوکر بہ آوازِ بلند کہنے لگے۔

''مشیت کو آپ کی حکمرانی منظور ہے۔ ہمیں بھی قوی امید ہے کہ آپ کی طاقت میں اضافہ ہوا اور آپ کے ذریعے دینِ اسلام تقویت پاکر ایک نئی سربلندی حاصل کرے۔''

تیمور نے مسکرا کر ان کی دعاؤں کا خیر مقدم کیا اور سفید نمدے کی مسند پر آبنوس کے قدرے پست سے تخت پر براجمان ہوگیا۔ اس کی توجہ اب بخارا کے علمائے کرام اور سادات کی بحث پر مرکوز تھی۔ اس بحث کا موضوع گفتگو یہ تھا کہ تیمور کے دائیں ہاتھ پر قریب ترین نشست کون سنبھالے گا؟

ان علمائے کرام اور سادات کی توجہ بھی درونِ خانہ تیمور پر ہی مرکوز تھی۔ تیمور نے دانستہ طور پر اپنے بدن، چہرے یا لباس سے کوئی ایسی علامت ظاہر نہیں ہونے دی تھی جس سے اس کا کوئی مخصوص مذہبی رجحان عیاں ہوتا۔ اس نے حسب سابق زرہ ہی زیب تن کی ہوئی تھی۔ چہار آئینہ، بازو بند اور شانہ گیر اس کے علاوہ تھے۔ سر پر پہنا خود بھی زریں کام سے مزین تھا۔

تیمور نے مسند سنبھالتے ہی فراخدلی سے تحائف بانٹنے کا آغاز کردیا۔ ان تحائف میں اصیل گھوڑے، بیش قیمت خلعتیں، اسلحہ، قبا، مرصع زین جیسے بہترین لوازمات شامل تھے۔ تحائف کی تقسیم کے بعد رات کے وقت کھانے کا بھی بہترین انتظام تھا۔ اس نے ہر ایک کے خیمے میں کھانوں اور میووں کی کشتیاں بھجوائیں۔ چند ایک سادات اس کے خیمے میں بھی موجود تھے۔ وہ اشیائے خورونوش کے اس انتظام پر قدرے مضطرب دکھائی دینے لگے تھے۔

''ان سب کی بھلا کیا ضرورت تھی؟ یہ تو ابھی سے بے جا اسراف کرنے لگے ہیں۔'' وہ باہمی سرگوشیوں میں گفتگو کرنے لگے۔

تیمور سے ان کا یہ اضطراب اور وجہِ تشویش پوشیدہ نہ رہ سکی۔ اس نے متانت سے ان سادات کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''اگر میں ایک حکمران ہوں تو سب کی دولت میری دولت ہے اور اگر میں حکمرانی کی دولت سے محروم ہوجاؤں تو میرے پاس موجود دولت آخر کس کام کی؟''

تیمور کی اس سادہ منطق کے بعد کسی کے پاس بھی اعتراض کی گنجائش نہ رہی۔ اس بہترین دعوت کے بعد اگلے روز نئے افسران، وزراء اور مشیروں کا انتخاب کیا گیا۔ سمرقند کی حکومت اور مجلسِ مشاورت کی نگرانی ''امیر داد'' کے سپرد کی گئی۔

برلاس کے عمر رسیدہ ''امیر جاکو'' کو علم برداری اور نقارہ باشی کے علاوہ ''تاوا چی'' کا عہدہ تفویض ہوا۔ فوج کے کمانداروں کے لیے مغل خطائی بہادر اور ایک عرب شیخ علی بہادر پر اعتماد کیا گیا۔

تیمور نے مسندِ اقتدار سنبھالتے ہی اپنے ماتحتوں کو ان کی ''حدود'' سے آگاہ کردیا تھا۔ ان میں سے کوئی ایک بھی اس کے ارادوں اور احکام میں معمولی دخل اندازی کا مجاز نہیں تھا۔ مولانا زین الدین اور چند دیگر پرانے رفقائے کار کو اس کے خیمے میں جب چاہے داخل ہوسکتے تھے اس کے باوجود انہیں اوروں پر فوقیت نہ تھی۔ وہ مشاورت سبھی سے کرتا لیکن اپنے فیصلے میں کسی کو بھی عمل دخل کی اجازت نہ دیتا۔

عہدوں کی تفویض کے بعد تیمور نے اپنی طے شدہ حکمتِ عملی کے مطابق مخالف عناصر کی سرکوبی پر کمر کس لی۔ بلخ سے دربار کی منتقلی ابھی مکمل نہ ہوئی تھی کہ امیر حسین کے بہی خواہوں پر حملہ کرکے ان میں سے کئی ایک کو پابہ زنجیر کرلیا گیا۔ اکثریت کے سر قلم کردیے گئے۔ ان کے گھر نذرِ آتش کرنے کے بعد کسی بھی شر پسندی کا سرے سے ہی قلع قمع کردیا۔

ان سرگرمیوں میں الجھتے ہوئے تیمور جتہ مغلوں کی جانب سے بھی غافل نہیں تھا۔ اس نے بلادشال کے پہاڑی علاقے پر باقاعدگی سے حملہ آور ہوتے رہنے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔ مغلوں سے نبرد آزما ہونے کے برسہابرس کے تجربات سے ایک بات تو عیاں تھی کہ وہ دفاع کے بجائے صرف حملہ آور ہوتے وقت زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔ اس لیے انہیں زیر رکھنے کا بہترین طریقہ یہی تھا کہ کسی بھی طور مزاحمت کے قابل ہی نہ رہنے دیا جائے۔ ان کی سپاہ کو بھی یہی حکم تھا کہ قتل وغارت اور آتش زنی میں کہیں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی جائے۔

جتہ مغل قبائل کے پاس اب کہیں کوئی جائے امان نہیں تھی۔ وہ پسپائی اختیار کرتے سرحدی وادیاں چھوڑ کر اپنے مرکزی حصار ''المالیق'' کی جانب روانہ ہوگئے لیکن تیمور نے وہاں بھی ان کا تعاقب جاری رکھا۔ اس کے فولادی عزم اور غیر معمولی فراست نے ایسی دھوم مچادی تھی کہ ہر کوئی برملا کہتا۔

''امیر تیمور عدل اور مردم شناسی میں بے مثال ہے۔''

وہ مستحق افراد کو فراخدلی سے انعام واکرام سے نوازتا ہے۔''

تیمور کی اس طاقت اور انتظامی صلاحیتوں سے متاثر ہو کر کئی جتہ مغل شہزادے اس کے حلیف بن گئے۔ ان شہزادوں میں ایک بیگ جک کا بیٹا ''بیان'' بھی تھا۔ تیمور کے ان ''کارناموں'' کی دھوم اب سرحدیں عبور کر چکی تھیں۔ اس کی ان شخصی خوبیوں سے قطع نظر صحرا پار کے یہ حکمران ایک نئی سمت پر سوچنے لگے تھے۔ ان کے ذہن میں یہ خیال پروان چڑھنے لگا تھا کہ تیمور ''سفارتی آداب'' کس انداز میں نبھاتا ہے۔ انہوں نے مبارک باد دینے کے بہانے اپنے خصوصی اہلکار تیمور کے پاس روانہ کر دیے۔

دوسری جانب تیمور بھی ان امراء کے متعلق کافی چوکنا تھا۔ اسے علم تھا کہ یہ امراء بے حد طاقتور اور تاتاریوں کی خانہ جنگی کے دوران تاتاری علاقوں پر حملے کر کے کافی فائدہ اٹھاتے رہے تھے۔ انہی امراء میں ایک والی خوارزم ''حسین صوفی'' بھی تھا۔ قبیلہ جلایر سے تعلق رکھنے والا ''خیوہ'' اور ''اورگنج'' کا یہ حاکم درونِ خانہ جتہ خواتین کا ہی اطاعت گزار تھا۔ اس کا دارالحکومت دریائے آمو کے دہانے پر ہونے کی بدولت تجارتی سرگرمیوں میں بھی مالا مال تھا۔ اس دولت وثروت کے علاوہ فصیلیں بھی نہایت بلند تھیں۔ ان عوامل نے صوفی کے غرور وتکبر میں بے انتہا اضافہ کر رکھا تھا۔

صوفی نے اپنے طے شدہ منصوبے کے مطابق تیمور کو کئی بیش قیمت تحائف ارسال کیے۔ تیمور نے بھی جوابی طور پر سفیر کے ہاتھ بیش قیمت تحائف روانہ کر کے اس کی بیٹی ''خان زادہ'' کا رشتہ جہانگیر کے لیے طلب کر لیا۔ تیمور کی اس دوستانہ اور عمومی درخواست کو صوفی نے اپنی سوچ وفکر کے مطابق ایک نیا ہی رنگ دے دیا۔ اسے گمان تھا کہ تیمور اس رشتے داری سے صوفی کو اپنا باج گزار بنانا چاہتا ہے۔ اپنی اسی سوچ کے زیر اثر اس نے تیمور کو جواب بھجوایا۔

''میں تمہاری نیت سے بخوبی واقف ہوں۔ تم بھی اتنا جان لو کہ میں نے خوارزم تلوار کے بل بوتے پر حاصل کیا تھا اور اسے مجھ سے بزورِ شمشیر ہی چھینا جا سکتا ہے۔''

تیمور اس پیغام پر برافروختہ ہو گیا۔

''خوارزم پر حملے کی تیاریاں کرو۔ میں اس شخص کو منہ توڑ جواب دوں گا۔'' اس نے اپنے مشائخ سے کہا۔

''اتنی جلدی یہ فیصلہ بہتر نہیں ہے امیر!'' ایک مشیر نے متانت سے کہا۔ ''مناسب یہی ہے کہ پہلے خوارزم جا کر صوفی کو تاتاریوں سے مفاہمت پر راضی کیا جائے۔ اس کے بعد ہی کوئی قدم اٹھانا بہتر ہوگا۔''

تیمور نے لمحاتی تذبذب کے بعد ہامی بھر لی تاہم اس کا وجدان مسلسل گواہی دے رہا تھا کہ والیِ خوارزم سے جنگ ناگزیر ہے اور ہوا بھی یہی۔ صوفی نے اپنے پاس آنے والے سفیر کو قید کر لیا۔ تیمور کا طیش سوا تر ہو گیا۔ وہ ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے امیروں اور سرداروں کو پیغامات بھیج کر جنگ کے لیے جمع کیا۔ خندق کی کھدائی کروا کے اسے درختوں اور جھاڑیوں سے پٹوا دیا۔ اس کے بعد سپاہی کمندوں سے شہر پناہ پر چڑھنے لگے۔

خیوہ کی تسخیر کے بعد تیمور اورگنج پہنچ گیا جہاں حسین صوفی قلعہ بند تھا۔ تیمور نے محاصرہ شکن ہتھیاروں کی تیاری کا آغاز کیا ہی تھا کہ صوفی کی جانب سے ایک پیغام موصول ہوا۔

''اس جنگ میں دو طرفہ سپاہیوں کا خون بہانا مناسب نہیں ہوگا۔ یہ فیصلہ ہم دونوں ہی انفرادی مقابلے سے کر لیتے ہیں۔ ہم میں سے جو فریق ثانی کے لہو سے اپنے ہاتھ رنگین کرنے میں کامیاب رہا، وہی اس جنگ کا فاتح سمجھا جائے گا۔''

تیمور نے ایک لمحے کے لیے پیغام رساں کی بات پر غور کیا اور مضبوط انداز میں کہنے لگا۔

''ٹھیک ہے۔ میں تیار ہوں۔''

''یہ مبارزت شہر کے صدر دروازے کے سامنے والے میدان میں ہوگی۔'' پیغام رساں نے اسے مزید اطلاع دی۔

تیمور نے سر کو اثباتی جنبش دے دی۔ تیمور کے امراء اور سرداروں میں کھلبلی پیدا ہو گئی۔ وہ تیمور کو اس خطرے سے بغلگیر ہونے دینے کے خیال سے ہی لرز رہے تھے۔

''امیر! اس فیصلے پر نظر ثانی کیجیے۔ ہم محاصرہ توڑ کر حسین صوفی پر بہ آسانی قابو پا سکتے ہیں۔'' ایک سردار نے کہا۔

''امیر! لڑنا اب ہماری ذمے داری ہے۔'' بیگ جک کا بیٹا بیان کہنے لگا۔

''اچھا! تو میری کیا ذمے داری ہے پھر؟'' تیمور نے محظوظ ہوتے ہوئے استفسار کیا۔

''تخت نشینی اور دیگر ریاستی معاملات کی دیکھ بھال۔'' بیان نے دوٹوک انداز میں جواب دیا۔ ''باقی اگر آپ اجازت دیں تو میں والیِ خوارزم کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہوں۔''

بیان کی اس پیشکش پر دیگر امیر اور سردار بھی پُرجوش انداز میں اپنی خدمات پیش کرنے لگے۔ تیمور خندہ پیشانی

سے ان کی باتیں سنتا رہا۔ اس کے بعد بے لچک انداز میں گویا ہوا۔

''تم سب والیِ خوارزم کے پیغام کی اصل روح سمجھ نہیں پا رہے۔ اس نے مبارزت کے لیے میرے کسی امیر کو نہیں بلکہ مجھے للکارا ہے اور میں تن تنہا ہی اس کا سامنا کروں گا۔''

امراء اور سرداروں کے پاس اب مزید کچھ بھی کہنے کی گنجائش نہیں تھی۔ اس کے بعد تیمور پیغام رساں کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگا۔

''شاہ خوارزم سے کہہ دو کہ ہم مقررہ وقت و مقام پر صدر دروازے کے سامنے تنہا پہنچ جائیں گے۔''

مبارزت کے لیے روانگی کے وقت تیمور کے امراء کے چہرے تشویش و تفکرات کی آماجگاہ بنے ہوئے تھے۔ تیمور انہیں نظر انداز کیے اپنی تیاریوں میں مشغول رہا۔ اس نے ہلکی کڑیوں دار زرہ زیب تن کر رکھی تھی۔ اس کا اشارہ پاتے ہی ایک تیغ بردار آگے بڑھا اور بائیں بازو پر قدرے اونچی کیے ڈھال باندھتے ہوئے تلوار پٹکے میں لگا دی۔ اس کے بعد تیمور نے سیاہ رنگ کا خود اپنے ہاتھ سے سر پر رکھ لیا۔ خود کے جھلم سے گردن اور شانے ڈھک گئے تھے۔

تیمور کے چہرے پر مسکراہٹ کھیلنے لگی تھی۔ وہ لنگڑاتا ہوا گھوڑے کی جانب بڑھا تو ایک عمر رسیدہ امیر سیف الدین میں ضبط کا یارا نہ رہا۔ وہ افسران کی صف سے نکل کر اس کے پاس آیا اور گھوڑے کی رکاب تھام کر کہنے لگا۔

''امیر! خدارا اپنے فیصلے پر نظر ثانی کیجیے۔ اس طرح ایک معمولی سپاہی کے مانند لڑنے مت جائیے۔''

تیمور نے خاموش و سرد نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا اور تلوار نکال کر چپٹے رخ سے اس پر وار کر دیا۔ سیف الدین وار بچانے کی غرض سے پیچھے ہٹ گیا۔ تیمور خود اعتمادی اور بے نیازی سے آگے بڑھا اور منجنیقوں، ہزارہا سپاہیوں کے سامنے سے گزرتے ہوئے ایک درمیانی میدان عبور کر کے صدر دروازے کے سامنے پہنچ گیا۔

دروازے کے اوپر برجوں میں اہلِ خیوہ جم غفیر کی صورت میں کھڑے تیمور کو حیرت بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ایک اور حیران کن بات یہ بھی تھی کہ وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہزار ہا تیر اندازوں کے نشانوں کی زد میں تھا۔ اس کے باوجود خود اعتمادی اور بے نیازی ایسی کہ بادشاہ ہوتے ہوئے بھی وہ اپنے دشمن کا منتظر تھا۔

تیمور کا یہ انتظار طویل ہونے لگا۔ والیِ خوارزم صوفی باہر آ کے ہی نہیں دے رہا تھا۔ تیمور کا مزاج برافروختہ ہونے لگا۔ وہ طیش میں آ کر بہ آوازِ بلند گویا ہوا۔

''ایفائے عہد نہ کرنے والوں کو زندہ رہنے کا بھی کوئی حق نہیں ہے۔ ایسی زندگی سے تو موت بدرجہا بہتر ہے۔ مجھے علم نہیں تھا کہ میرا پالا خائن سے پڑنے والا ہے۔''

یہ کہنے کے بعد تیمور نے گھوڑے کی باگ موڑی اور اپنے لشکر گاہ کی جانب روانہ ہو گیا۔ وہ اس واقعے کے بعد خاصا بددل اور برہم تھا۔ تاہم اس کے امراء اور سردار خوشی سے نہال تھے۔ تیمور کو دیکھتے ہی لشکر میں نعروں، نقارے پر چوٹ اور گھوڑوں کی ہنہناہٹ نے ماحول گرما دیا۔

کچھ ہی روز گزرے تھے کہ حسین صوفی کی علالت کی خبریں گردش کرنے لگیں۔ یہ علالت صوفی کی موت پر منتج ہوئی۔ والیِ خوارزم کے انتقال پاتے ہی شہر کے دروازے کھول دیے گئے اور متفقہ طور پر اس کی بیٹی خان زادہ کو جہانگیر کی دلہن بنا کر بھیج دینے کا فیصلہ کر لیا گیا۔

تیمور نے اس فیصلے کا خیر مقدم کرتے ہوئے خوارزم کو ایک صوبہ بنایا اور جہانگیر کی زیرِ کمان دے دیا۔ خوارزم کی اس فتح کے بعد قزغن کی وہ سلطنت مغرب اور شمال میں نئی وسعت اختیار کر گئی۔

خوارزم کے بعد تیمور جنوبی سمت دریا پار کے پڑوسی ''والیِ ہرات'' کی جانب متوجہ ہوا اور بلا تامل فوج کشی پر کمر کس لی۔ اس مہم میں تیمور کے پاس فوج کی تعداد سابقہ مہمات سے زیادہ تھی۔ وہ کم از کم پچاس ہزار سپاہیوں کے ساتھ ''باب الحدید'' نامی گھاٹی سے گزر کر اپنی منزل کی جانب گامزن ہوا۔ باربرداری کے جانور بھی مخصوص گاڑیوں میں بندھے ان کے عقب میں رواں تھے۔

ہرات پہنچ کر حسبِ دستور سفیروں کی آمد و رفت کا سلسلہ شروع کیا جانا تھا۔ تیمور نے ہرات کے ملک غیاث الدین کے پاس اپنا ایک سفیر روانہ کیا۔ غیاث الدین نے سفارتی آداب کی پامالی کرتے ہوئے خود کو شہر میں محصور کر لیا۔

تیمور کی سپاہ کا جوش و جذبہ دیدنی تھا۔ ابتدائی طور پر مقابلہ دو طرفہ اور مساوی ہی رہا تاہم بعد ازاں تاتاری فصیل میں شگاف کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اسی اثنا میں کچھ سپاہیوں نے وہ نہر ڈھونڈ نکالی جو قلعے کے اندر جاتی تھی۔ سپاہی پانی میں سے گزر کر برہنہ تلواریں لیے شہر میں داخل ہو گئے۔ کچھ ہی دیر میں ''فوج فتح'' کی قیامت کا منظر پیش کرنے لگا تھا۔ رہائشی ہڑبونگ اور خوف و ہراس کے عالم میں ادھر ادھر بھاگتے پھر رہے تھے۔ قلعے کی فوج کو بھی تاتاریوں نے آن کی آن میں گاجر مولی کی طرح کاٹ کر

رکھ دیا۔

فوشنج پر ٹوٹنے والی اس قیامت سے اہلِ ہرات کی ہمتیں پست ہوگئیں۔ غیاث الدین کے حفاظتی دستے بھی تیمور کے سامنے ٹھہرنے میں ناکام رہے تھے۔ اس کے پاس اب امان طلب کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ تیمور نے اس سے نرمی و شفقت کا برتاؤ کرتے ہوئے سمرقند روانہ کردیا۔ شہر سے تاوان وصول کرنے کے بعد غیاث الدین کی تعمیر کردہ نئی فصیل منہدم کروادی گئی۔

ہرات پر اس قبضے نے تیمور کی سلطنت میں ایک عظیم شہر کا اضافہ کردیا۔ قدیم زریں تخت بھی شہر روانہ کردیے گئے۔ اس دور میں ہرات ایک مرکزی شہر شمار ہوتا تھا۔ اس کا گھیرا نو ہزار فٹ سے زائد اور آبادی تقریباً اڑھائی لاکھ تھی۔ شہر میں سیکڑوں مدرسے، تین ہزار حمام اور تقریباً دس ہزار دکانیں اس کے تمدن کا منہ بولتا ثبوت تھیں۔ تاتاریوں کے لیے ہرات میں سب سے زیادہ حیران کن شے وہ چکیاں تھیں جو پانی کے بجائے ہوا سے چلتی تھیں۔

اپنی اس فتح کے خمار و سرور میں مبتلا چونتیس سالہ تیمور کا ذہن اب مزید فتوحات کی تحریک دینے لگا تھا۔ اسے علم تھا کہ اس صدی کے اوائل میں چنگیزی سیلاب کی ''سیاہ وبا'' نے ایشیا سے یورپ تک ایک بے چینی برپا کررکھی تھی۔ قدیم حکمران خاندان دھیرے دھیرے اپنا نام و نشان کھو رہے تھے۔ ہر سمت کسی نہ کسی طور جنگ کے شعلے بھڑکتے اس دنیا کو وسیع تر میدانِ جنگ کا روپ دیے ہوئے تھے اور تیمور اس میدان میں اتر کر اپنی صلاحیتیں آزمانے کے لیے بے تاب تھا۔

☆☆☆

خانہ جنگی کے معاملات سے نبرد آزما ہونے اور اپنے لیے ہر ممکنہ خطرے کا سدباب کرنے کے بعد تیمور کے ذہن میں اب نئی کشمکش برپا تھی۔ موجودہ حالات کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ اپنا دربار شہر سبز سے سمرقند منتقل کرلے لیکن درونِ خانہ اس کا دل شہر سبز میں ہی اٹکا تھا۔ اس شہر کی دلکشی نے اسے اپنے سحر و محبت میں بے طرح گرفتار کررکھا تھا۔

اس جذباتی وابستگی سے قطع نظر وہ زمینی حقائق بھی فراموش نہیں کرسکتا تھا اور سب سے بڑی حقیقت تو یہی تھی کہ اس کی مملکت کی حدود میں سمرقند سے ہر جانب پانچ پانچ سو میل کا اضافہ ہوچکا تھا۔ اس کے علاوہ بلادِ شمال کے دروازوں کے مقابل ہونے کے باعث سلطنت کے لیے مرکزی مقام کی حیثیت سے سمرقند کی اہمیت ناگزیر تھی۔

ان حالات و واقعات کے پیشِ نظر تیمور نے دربار کی منتقلی کا حتمی فیصلہ کرلیا اور اپنے آبائی شہر کی تزئین و آرائش کی جانب متوجہ ہوگیا۔ اس نے شہر سبز کو خوشنما عمارتوں سے آراستہ کیا۔ طرغائی کی قبر پر ایک مقبرہ تعمیر کروایا۔ اس مقبرے کا گنبد سنہری کام سے مزین اور نہایت دیدہ زیب تھا۔

اس کے بعد تیمور نے اپنے ایک ''یادگار'' محل کی آرائش کا آغاز کروایا۔ اس محل میں تیمور اور الجائی نے اپنی ازدواجی زندگی کا آغاز کیا تھا۔ تیمور نے وہ پرانا مٹی کا محل منہدم کروا کے سفید اینٹوں پر مشتمل ''آق سرائے'' (قصر سپید) تعمیر کروایا جس کی سب سے بڑی انفرادیت یہ تھی کہ اس میں کئی ایک صحن موجود تھے۔ دور سے دکھائی دیتی صدر دروازے کی محراب بھی نہایت مسحور کن منظر تھی۔

تیمور بیرونی مہمات سے فراغت کے بعد موسمِ سرما اسی مقام پر بسر کرتا تھا۔ اسے اس وادی میں ہر چھوٹے بڑے منظر کی اوٹ میں الجائی کے سنگ بیتے لمحات یاد آتے تو دل میں ایک خلش دستک دے کر روح میں ایک بوجھل پن پیدا کرنے لگتی تھی۔

اس جذباتی کیفیت سے قطع نظر سمرقند بھی گوناگوں خصوصیات کا حامل تھا۔ سمرقند شہتوت کے درختوں کے جھنڈ میں بسا ایک نخلستان تھا جہاں شمالی علاقوں کی ٹھنڈی، خنک ہوا رہائشیوں کو ہمہ وقت چاق و چوبند رکھتی۔ زمین اس قدر زرخیز کہ سال میں چار فصلیں کاشت ہوا کرتیں۔ نہروں میں پانی کی فراوانی تھی۔ آبپاشی کا نظام اس قدر بہترین تھا کہ دریا پر بند باندھ کر سطحِ زمین سے بلندی پر ایک جھیل بنائی گئی تھی جس سے سیسے کے نلوں کے ذریعے ہر گھر میں پانی بہ آسانی پہنچایا جاتا۔

اہلِ سمرقند روزگار کے معاملے میں بھی خاصے خودکفیل تھے۔ ان کے قائم کردہ ''کرگھوں'' پر نہایت منظم انداز میں قرمزی کپڑے کی بُنائی ہوتی تھی۔ اس کپڑے کی بیرونی دنیا میں بے حد مانگ تھی۔ آبی گھڑیاں اور کاغذ بھی بہت پسند کیے جاتے۔ بیرونی دنیا میں جانے والے کارواں اس مقام پر لازماً پڑاؤ ڈالتے تھے۔

تیمور کی سمرقند آمد مقامی افراد کے لیے ایک یادگار تجربہ ثابت ہوئی۔ وہ تیمور کے کارناموں پر فخر و مسرت محسوس کرتے والہانہ استقبال کے لیے امڈ آئے۔ تیمور نے خوشدلی سے ''موصول'' کرتے اپنی مجوزہ اصلاحات کا سلسلہ بھی شروع کردیا۔ اس نے شہر پناہ کے تمام شگاف اپنی ذاتی نگرانی میں بند کروائے۔ اس کے بعد شہر کے دروازوں سے وسط شہر میں واقع بازاروں تک کشادہ سڑکوں کی تعمیر کا

آغاز بھی کروادیا۔ ان سڑکوں کا فرش سنگی تھا۔ شہر کے جنوب میں پہاڑی کے تمام بوسیدہ مکانات اور جھونپڑیاں منہدم کروا کے ایک حصار کی بنیاد رکھ دی گئی۔

مضافات میں البتہ فوجی لشکر گاہ قائم کی گئی تھی۔ اس کے بعد نہر سے دریا تک کشادہ سڑکوں کا جال بچھا دیا گیا۔ مختصر فاصلوں پر باغات تعمیر کروا کے ان کے گرد دیواریں کھنچوادی گئی تھیں۔ وسیع محلوں کی بنیاد رکھنے کے لیے نیلگوں پہاڑوں سے بھورا ابھرا پتھر ٹھیلوں پر لاد کر لایا جاتا رہا۔ ان عمارتوں کی تزئین کے لیے تیمور نے ہرات کے نیلگوں گنبد یہاں تعمیر کروانے کا حکم صادر کر دیا۔

اس حکم کے موجب سمرقند کی عمارتوں میں پرانی مٹیالے رنگ کی اینٹوں کے بجائے کاشی کی نیلی اینٹیں نصب ہوئی تھیں۔ نیلگوں رنگ تاتاریوں کے لیے بے حد محبوب ومرغوب تھا۔ اس نیلگوں پن کی وجہ سے ہی سمرقند کو ''گوگ کنڈ'' (نیلاشہر) بھی کہا جاتا تھا۔

اہل سمرقند کو بھی اپنا یہ نیا حکمران بے حد منفرد اور دل کے قریب محسوس ہو رہا تھا۔ سمرقند منتقلی کے بعد تیمور نے اپنے بیٹے اور بہو کے استقبال کے لیے بھی شاندار جشن کا اہتمام کیا۔ مغربی دروازے کا خیاباں قالینوں سے ڈھک دیا گیا۔ تیمور کی لشکر گاہ کے فرش پر کمخواب اور اطلس کے تھان بچھائے گئے۔ نوبیاہتا جوڑے کے استقبال کے لیے وزیر، امیر، تواچی اور علم بردار شاہی چتر کھولے، آراستہ گھوڑوں پر سوار طویل قطاروں میں کھڑے تھے۔

شہزادی قدسیہ خان زادہ اپنا چہرہ نقاب کی اوٹ میں چھپائے سفید اونٹ پر شغدف میں بیٹھی تھی۔ اس کے اردگرد شہسواروں کے دستے اور جہیز کے سامان سے لدے گھوڑوں اور اونٹوں کی طویل قطاریں تھیں۔ اس روز جشن کا سماں اور فضائیں ہی نرالی تھیں۔ آسمان پر آفتاب کی شمع نگاہوں سے اوجھل ہوئی تو سبک ہوا خیموں میں سرسرانے لگی۔ فضا میں صندل کی خوشبو نہایت رومان پرور تھی۔ تیمور مہمانوں سے انفرادی ملاقات کرتا ہر ایک پہلو کا باریک بینی سے جائزہ لے رہا تھا۔ اس کے غلام مہمانوں کی دستاروں پر ہیرے جواہرات نچھاور کر رہے تھے۔

اس کے بعد ان مہمانوں کو خان زادہ کے جہیز میں لائے گئے جہیز اور تحائف کی دید کروائی گئی۔ تیمور کے ایما پر متصل خیمے میں وہ تحائف بھی آراستہ کر دیے گئے جو جہانگیر کی جانب سے شہزادی کو دیے جانے تھے۔ ان تحائف میں زریں کمربند، زر وجواہر، لعل وگہر، مشک وعنبر، اطلس وکمخواب، ململ کے تھان، بیش قیمت لبادے، عمدہ گھوڑے اور حسین وجمیل کنیزیں شامل تھیں۔

جشن کی یہ تقریب اور جہانگیر کے چہرے پر منعکس ہونے والی چمک دیکھ کر تیمور کے دل سے ایک ہوک برآمد ہو رہی تھی۔ اسے الجائی کی یاد بے طرح ستانے لگی۔ تیمور نے سر جھٹکتے ہوئے اپنا ذہنی ارتکاز سرائے خانم کی جانب کر دیا۔ وہ حقیقی معنوں میں تیمور کے لیے غم خوار اور ہمدم ثابت ہوئی تھی۔ تیمور کے میدان جنگ میں ہونے کی صورت میں دربار اسی کی تنظیم بجا لاتا تھا۔ سپہ گروں کے خاندان سے تعلق ہونے کی بنا پر وہ اکثر شکار میں بھی تیمور کے ہمراہ ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ امیر حسین کی موت سے صرف نظر کیے وہ تیمور سے بے حد وفادار تھی۔ سرائے خانم کی یہ خوبیاں یاد کرنے کے باوجود پردۂ تصور پر الجائی کی جھلک ابھر کر تیمور کے دل میں خلش سوا تر کر رہی تھی۔

جنگجوئے صف شکن اپنی یادوں کے وار سہہ ہی نہیں پاتا تھا۔ اس کی پہلی محبت تاحال پھانس بن کر قلب وروح میں گڑی تھی اور جانے کب تک گڑی رہنی تھی۔

☆☆☆

سمرقند میں معاملات منظم کرنے کے بعد تیمور نے مغربی سمت میں خراسان، نیشاپور، مشہد میں بھی جتہ مغلوں کے خلاف معرکہ آرائی کا سلسلہ کسی نہ کسی طور جاری رکھا۔ اس کی آخری صف آرائی مغل بادشاہ قمر الدین سے ہوئی تھی۔ تیمور اس جنگ میں ایسی بے جگری سے میدان میں اترا کہ قمرالدین کو اپنے گھوڑے سے محروم ہو کر جان بچانے کے لیے پیدل بھاگنا پڑا تھا۔

اس فتح کے بعد مسرور ومطمئن انداز میں واپسی کا سفر طے کرتے تیمور کو اندازہ ہی نہیں تھا کہ سمرقند میں ایک قیامت اس کی منتظر ہے۔ وہ خطا کی شاہراہ پر ایک ہزار میل کی مسافت طے کر کے لوٹا ہی تھا کہ اسے بیرونی باغات میں سیاہ لباس میں ملبوس ایک وفد کی دید نے مضطرب کر دیا۔ ان سبھی افراد کے کپڑے خاک آلود اور چہرے گم صم تھے۔ تیمور ان مناظر پر بے طرح ٹھٹک کر رہ گیا۔ اس نے اپنے گھوڑے کی باگ کھینچ لی۔ اس کی نظریں سیف الدین پر مرکوز ہو گئیں۔ سیف الدین ایک وفادار سپاہی اور شہزادہ جہانگیر کا مشیر تھا۔ اسی اثنا میں سیف الدین اپنے گھوڑے سے اتر کر سر جھکائے تیمور کی طرف بڑھا اور اس کی رکاب تھام لی۔

''کیا بات ہے سیف الدین؟'' تیمور نے بے تابی سے دریافت کیا۔

pklibrary.com

سیف الدین کی آنکھوں میں ہراس اور نمی در آئی۔

''کیا بات ہے؟ کسی بات سے خوفزدہ ہو گیا؟'' تیمور کی نظروں سے اس کی کیفیت پوشیدہ نہیں رہ سکی تھی۔

''نہیں امیر! خوفزدہ تو نہیں ہوں۔ بس یہ دل غم سے شدید بوجھل ہے۔ ہمارا نوجوان شہزادہ اجل کے وار کا دفاع نہیں کر سکا اور ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گیا ہے۔'' وہ آزردگی سے کہنے لگا۔

تیمور کا بدن بے طرح سنسنا کر رہ گیا۔ اسے اپنی سماعت پر یقین کرنا دشوار ہو رہا تھا۔

''کب..... کیسے..... کیا ہوا جہانگیر کو؟'' وہ ہنوز بے یقین تھا۔

''علیل تھے۔'' اس نے ہونٹ کچلے۔

''مجھے کسی نے اطلاع کیوں نہیں دی؟'' تیمور چلّا اٹھا۔

''ہم نے شہزادے کے حکم پر ہی آپ کو مطلع نہیں کیا تھا۔'' سیف الدین نے نگاہیں چرا لیں۔

تیمور نے ایک گہری سانس بھرتے ہوئے آسمان کی جانب دیکھا اور لمحاتی توقف کے بعد سیف الدین سے کہنے لگا۔

''جاؤ، اپنے گھوڑے پر سوار ہو جاؤ۔''

بوڑھے سیف الدین نے اس کے حکم کی فوری تعمیل کر دی۔ تیمور نے فوج کو روانگی کا اشارہ دیا تو سپاہ دھیرے دھیرے پیش قدمی کرنے لگی۔

جہانگیر کی موت کی خبر اب کسی سے بھی پوشیدہ نہ رہی تھی۔ تیمور کا چہرہ پتھریلی سنجیدگی کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ اس رات تیمور نے جہانگیر کے طبل اور نقارے منگوا کر انہیں اپنے سامنے ٹکڑے ٹکڑے کروا دیا۔ اس کے دل میں اذیت و کرب کی ٹیسیں موجزن تھیں لیکن آنکھیں و چہرہ فولاد کا تاثر دے رہے تھے۔

☆☆☆

جہانگیر کی تدفین اور تمام تر آخری رسومات کی ادائیگی کے بعد تیمور ایک بار پھر دل و جان سے اپنے ریاستی معاملات کی جانب متوجہ ہو گیا۔ انہی دنوں اس کے پاس ''سنہری غول'' کا ایک شہزادہ ''توقتمش'' پناہ گزینی کے لیے چلا آیا۔

(سنہری غول کی سلطنت کی ابتدا چنگیز خان کے بڑے بیٹے جوجی خان نے کی تھی۔ جوجی کا بیٹا ''باتو خان اعظم'' اپنے خیمے پر سنہری کپڑا منڈھا کرتا تھا جس کے بعد اس خاندان کو سنہری غول کے نام سے پکارا جانے لگا)۔

توقتمش کریمیا کا حکمران تھا اور اپنی قوم سے کسی خفگی کی بنا پر علیحدگی اختیار کر کے سمرقند آیا تھا۔ توقتمش کی آمد کے کچھ ہی روز بعد سفید گھوڑے پر سوار ایک مغل سردار بھی ایلچی کی حیثیت سے سمرقند چلا آیا۔ تیمور نے اسے شرف باریابی بخشا تو وہ بے باکی سے کہنے لگا۔

''اے تیمور لنگ! ہمارے حاکم شرق و غرب اور خاقان اعظم نے تیرے لیے ایک پیغام بھیجا ہے۔''

''کیا کہا ہے ارس خان نے؟'' تیمور کا چہرہ احساس اہانت سے سرخ ہو گیا۔ اس کے پاؤں کی لنگڑاہٹ مقابل کے لیے یونہی ''باعث حظ'' تھی۔

''ارس خان نے کہا ہے کہ توقتمش میرے بیٹے کا قاتل ہے۔ وہ تمہارے پاس پناہ گزین ہے۔ اسے میرے حوالے کر دو ورنہ جنگ کے لیے تیار رہو۔ اس جنگ کے لیے بہت جلد کسی میدان کا انتخاب بھی کر لیا جائے گا۔''

ارس خان کے ایلچی کا یہ پیغام سن کر تیمور کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رینگ گئی۔ حالات اس کی مطلوبہ نہج پر ہی رواں تھے۔ تیمور بھی دلی طور پر جنگ کا ہی متمنی تھا۔ وہ سنہری غول کے چند علاقے پہلے ہی فتح کر چکا تھا اس لیے تصادم ناگزیر ہی تھا۔

دوسری جانب چنگیز خان کی اولاد میں سے کسی شہزادے کا اس کے دربار میں موجود ہونا خوش قسمتی تو تھی ہی تاہم وہ کسی بھی ایسے آدمی کو دشمن کے حوالے کر دینے کا قائل نہ تھا جس نے اس کے پاس پناہ لی ہو۔ اس نے ایلچی کو مضبوط دوٹوک انداز میں جواب دیتے ہوئے کہا۔

''توقتمش میرے پاس پناہ گزین ہے۔ میں اسے ہر ظلم سے بچانے کے لیے آخری حد تک کوشش کروں گا۔ ارس خان سے کہہ دینا تیمور ابن طرغائی جنگ کو زندگی کا ساز سمجھتا ہے۔ یہ جنگ، جہاں بھی ہو، میں اسے تیار ملوں گا۔''

ایلچی کے روانہ ہوتے ہی تیمور نے توقتمش کے اعزاز میں ایک خصوصی ضیافت کا اہتمام کیا۔

''ارس خان ایک کینہ پرور شخص ہے۔ وہ آپ کے انکار کو اپنی انا کا مسئلہ بنا لے گا۔'' توقتمش نے اپنے خدشات کو گویائی دی۔

''مجھے اس کی پروا نہیں ہے بیٹا!'' تیمور نے شفقت سے دانستہ طور پر طرز تخاطب تبدیل کیا۔

توقتمش چونک کر اس کی جانب دیکھنے لگا۔ کسی تاتاری امیر کی جانب سے ایسے طرز تخاطب کا براہِ راست مطلب یہی تھا کہ وہ دل و جان سے اس کی ہر ممکنہ مدد کے لیے تیار ہے۔ توقتمش کا یہ اندازہ بالکل درست تھا۔ تیمور نے شمالی سرحد کے دو قلعے اس کے حوالے کرنے کے بعد

افسران، سپاہی، ہتھیار، زر و جواہر، اونٹ، گھوڑے، خیمے، نقارہ، طبل اور علم بھی فراخدلی سے اسے سونپ دیے۔ یہ دونوں قبیلے درحقیقت مغلوں سے ہی چھینے گئے تھے۔

توقتمش تیمور کی ان عنایات پر بہت خوش و پُرجوش تھا۔ اس نے بھرپور جذبے سے شمال کی جانب پیش قدمی کی لیکن قسمت یاوری کے لیے تیار نہ تھی۔ دو مرتبہ میدانِ جنگ میں شکست خوردگی کے بعد وہ اپنی ہمت ہار ہی بیٹھا تھا کہ ارس خان کی موت نے اس کی امیدوں کا نخلستان ایک بار پھر سرسبز کر دیا۔

ارس خان کے مرتے ہی توقتمش نے سنہری غول کی سرداری کا دعویٰ کر دیا۔ مزید خوش قسمتی یہ ثابت ہوئی کہ نصف سے زائد قبیلے نے توقتمش کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ مزید برآں اسے تیمور کی طرف داری بھی حاصل تھی۔

توقتمش کی قسمت نے اب ایک نیا عروج حاصل کر لیا تھا۔ اسے جنگوں میں غیر متوقع فتوحات حاصل ہونے لگیں۔ تیمور اس کی فتوحات پر بے حد خوش تھا تاہم اس بات کا کسی کو بھی اندازہ نہیں تھا کہ توقتمش کی فطرت کے منفی عناصر اس پر ناقابلِ یقین رفتار سے غالب آ چکے تھے۔ وہ اپنی سرکشی اور سفاکی سے مغلوب ہو کر مغلیہ مملکت کے رہائشیوں کے لیے ایک عذاب ثابت ہونے لگا۔ اس نے سنہری غول کے خاقان ''ممائی'' کو سرائے سے نکالنے کے بعد تخت پر قبضہ کیا اور روسی والیانِ ریاست سے خراج کا مطالبہ کرنے لگا۔

روسی والیان اس کی سابقہ شکست خوردگی کے ہی گمان میں تھے۔ ان کی جانب سے خراج سے انکار پر توقتمش نے ان پر دھاوا بولا اور راہ میں آنے والی ہر آبادی نذرِ آتش کر کے رہائشیوں کے خون سے جی بھر کر ہولی کھیلی۔ ان سرگرمیوں میں الجھے توقتمش کے ذہن میں اب ایک نیا فتور کلبلانے لگا تھا۔ اس نے تیمور کو بھی زیر کرنے کے خواب دیکھنے شروع کر دیے۔ اس کے امراء اس فیصلے پر شدید حیرت زدہ تھے۔

''یہ آپ کیا کر رہے ہیں خاقان؟'' ایک امیر نے جز بز ہو کر دریافت کیا۔

''میں سنہری غول کا خاقان ہوں۔ کچھ بھی کر سکتا ہوں۔ اس وقت کیچی میں اتنی تاب نہیں ہے کہ خاقان کے سامنے ٹھہر سکے۔'' توقتمش نے تکبر سے کہا۔

وہ درحقیقت سمرقند کی شان و شوکت اور تاتاریوں کے جگمگاتے خیموں کی دید سے متاثر ہو گیا تھا۔

''امیر تیمور نے آپ کو پناہ دی، عسکری امداد فراہم کی۔ آپ کو اصولی طور پر ان کا احسان مند ہونا چاہیے۔'' ایک عمر رسیدہ مشیر نے اسے سچائی سے روشناس کرانا چاہا۔

''اس کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو ایسا ہی کرتا۔ چنگیز خان کی اولاد کی خدمت کرنا ان جیسوں کے لیے خوش قسمتی ہوتی ہے۔'' اس نے رکھائی سے جواب دیا۔ احسان مندی اس کی سرشت کا حصہ ہی نہیں تھی۔

''تیمور نے جس نہج تک تمہاری مدد کی تھی، اس کے بعد ایسے ہامی کو کھو دینا دانش مندی نہیں ہوگی۔ وقت کا دھارا کسی بھی لمحے زندگی تبدیل کر دیا کرتا ہے۔ کیا علم کہ کل تمہارے حالات کسی وجہ سے خراب ہو جائیں اور تمہیں اس کی دوبارہ ضرورت پڑ جائے۔'' اسی مشیر نے اسے دوبارہ آئینہ دکھایا۔

''مجھے اپنی کامیابی کا مکمل یقین ہے اور تم سب یہ کیوں بھول رہے ہو کہ تیمور نے جس اورنج پر قبضہ کر رکھا ہے وہ ایک زمانے میں سنہری غول کی ہی ملکیت تھا۔ میں یہ علاقہ بہرصورت واپس حاصل کروں گا۔ پوری احتیاط سے تیاریاں مکمل کرو۔ تیمور اس وقت بحیرۂ خزر کے قریب جنگ میں مصروف ہے۔ ہم اسے مزاحمت کا موقع ہی نہیں دیں گے۔''

امراء کے پاس توقتمش کے احکامات پر عمل کے سوا اب کوئی چارہ نہیں تھا۔ دوسری جانب تیمور ہنوز بحیرۂ خزر میں نبرد آزما تھا۔ سنہری غول کے دستے تاتار میں نمودار ہوئے تو ایک تھکا ہارا قاصد سمرقند سے نو سو میل کی مسافت سات روز میں طے کر کے تیمور کے پاس پہنچا اور اسے تازہ ترین حالات سے مطلع کیا کہ سنہری غول کی فوج کے مرکزی حصے نے دریائے سیر عبور کر کے ان کی سرزمین پر دھاوا بول دیا ہے اور سمرقند سے چند ہی روز کی مسافت پر ہے۔

تیمور کے لیے اب وہاں رکنا ممکن ہی نہیں تھا۔ اس نے فوری طور پر خراسان کی شاہراہ کا رخ کیا اور اس قدر برق رفتاری سے یہ مسافت طے کی کہ توقتمش کے سمرقند پہنچنے سے پہلے ہی وہاں پہنچ گیا۔ اس برق رفتار سفر میں اسے سیکڑوں گھوڑوں سے محرومی برداشت کرنا پڑی لیکن سمرقند کے تحفظ سے زیادہ کچھ بھی اہم نہیں تھا۔

توقتمش کے منظرِ عام پر نمودار ہونے کے بعد تیمور کے کئی ایک قلعہ داروں نے اس کی راہ میں مزاحم ہونے کی کوشش کی۔ تیمور کے منجھلے بیٹے عمر شیخ نے بھی بے جگری سے میدان میں جوہر دکھائے لیکن اس کے باوجود شکست سے نہ بچ سکا۔

عمر شیخ کو مات دینے کے بعد مغل فوجوں نے اپنا روایتی وحشت و بربریت کا کھیل شروع کر دیا۔ اسی اثناء

میں تیمور کی آمد نے انہیں حواس باختگی میں مبتلا کر دیا۔ انہوں نے عجلت کے عالم میں بخارا کے مضافات میں ایک محل نذر آتش کیا اور دریائے سیر عبور کر کے شمالی سمت لوٹ گئیں۔

تیمور کے امراء اور مشیر ایک بار پھر سر جوڑے بیٹھ گئے۔

''توقتمش کے یوں واپس چلے جانے سے یہ قضیہ ختم نہیں ہوسکتا۔ میری سرزمین کو میلی آنکھ سے دیکھا گیا ہے۔ فصلیں روند کر گھوڑے اور سپاہی گرفتار کیے گئے ہیں۔ توقتمش کو اس جسارت کی سزا نہ دی گئی تو مغلوں کے بعد بغاوت کے مزید علم بھی بلند ہونے لگیں گے۔'' تیمور نے ہونٹ بھینچتے ہوئے کہا۔

''میرا خیال ہے کہ اب وہ وقت آگیا ہے کہ تاتاریوں اور مغل خاقان کے درمیان حصولِ اقتدار کی آخری کشمکش کو انجام تک پہنچا دیا جائے۔'' ایک سن رسیدہ امیر نے تجویز دی۔

''توقتمش سے پنجہ آزمائی تو ضرور ہوگی لیکن وہ سطح مرتفع کے وسیع میدانوں میں غائب ہو چکا ہے۔ اس کے اگلے حملے کا اندازہ کرنا بہت ضروری ہے۔'' سیف الدین نے جواب دیا۔

''ہاں، لیکن اس سے قبل ایک اور ضروری کام کی تکمیل کرنی ہے۔'' تیمور نے سنجیدگی سے کہا۔

اس کے بعد ان تمام سرداروں کو اپنے سامنے طلب کیا گیا جنہوں نے مغلوں کے خلاف معرکہ آرائی میں شکست کے بادل منڈلاتے دیکھنے کے باوجود نہایت جرأت و بہادری کا مظاہرہ کیا تھا۔ تیمور نے انہیں انعامات و تحائف سے نوازا اور بزدلی دکھانے والے سرداروں کے ساتھ بھی ''یادگار'' سلوک کیا۔ دشمن کے سامنے سے پیٹھ دکھا کر فرار ہونے والے سردار کے بال زنانہ انداز میں بنا کر چہرے پر غازہ اور سرخی تھوپتے ہوئے زنانہ کپڑوں میں ہی سمرقند کی گلیوں میں گشت کرایا گیا۔

اس مہم کو ابھی کچھ ہی عرصہ گزرا تھا کہ منظر عام سے غائب توقتمش نے سخت سرما میں کثیر فوج کے ہمراہ ایک بار پھر سیر کے علاقے پر چڑھائی کر دی۔ تیمور کے لیے وہ وقت بہت کٹھن تھا۔ اس کی فوج کا صرف ایک ہی حصہ اس کے ہمراہ تھا۔ بقیہ ماندہ فوج جتہ مغلوں کو مشرقی دروں سے نکالنے میں مصروف تھی۔

''اس سرد موسم میں معرکہ آرائی بہت مشکل ہوگی امیر!'' سیف الدین کہنے لگا۔ ''کیا یہ مناسب نہیں ہوگا کہ ہم سمرقند میں قلعہ بند رہیں اور توقتمش کی فوج کو سردی سے نبرد آزما ہونے دیں۔ کب تک مزاحمت کر سکیں گے وہ؟ سردی ناقابل برداشت ہونے کی صورت میں وہ خود ہی پسپائی اختیار کر لیں گے۔''

''نہیں، یہ تجویز بالکل قابل عمل نہیں ہے۔'' تیمور نے قطعیت سے جواب دیا۔ ''توقتمش اور اس کے سنہری غول کو ملک میں آزاد چھوڑ دینے کا مطلب تباہی و بربادی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ وہ شمالی علاقے کے رہائشی ہیں۔ سخت ترین سرما کے مطمئن عادی۔''

''تو پھر جنوب کی طرف پسپائی اختیار کر کے منتشر افواج کی یکجائی کا انتظار کیے لیتے ہیں۔'' ایک اور امیر نے مشورہ دیا۔

''انتظار؟ کسی بھی صورت میں نہیں۔ یہ انتظار کرنے کا وقت نہیں ہے۔'' تیمور جوش سے کہنے لگا۔

اس کے بعد تیمور نے فوج کی کمان خود سنبھال کر اسے مختلف ٹکڑیوں میں تقسیم کیا اور پھر علم بلند کیے سیر کی جانب گامزن ہوگیا۔ وہ برفباری، بارش کسی بھی موسم کو خاطر میں لانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ کئی مقامات پر گھوڑے پیٹ تک کیچڑ اور دلدل میں دھنس گئے لیکن تیمور کی پیش قدمی رک کے ہی نہ دی۔

تیمور کی یہ جارحیت دیکھ کر توقتمش کی سٹی گم ہونے لگی۔ اس کے پاس پسپائی کے علاوہ کوئی راہ باقی نہ رہی تھی۔ تیمور نے اپنے دستوں کو مغل لشکر کا تعاقب جاری رکھنے کی ہدایات دیں اور مغربی سمت میں اورینج کا محاصرہ کر لیا۔ وہ صوفی حکمرانوں کی طوطا چشمی اور توقتمش کی طرف جھکاؤ کسی بھی صورت معاف نہیں کر سکتا تھا۔

تیمور نے اس مرتبہ کسی شخصی مبارزت کا حصہ بننے کے بجائے شہر کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ محلات اور مریض خانے زمین بوس کر دیے گئے۔ شہر بھر میں تاحد نگاہ سوختہ کھنڈروں اور انسانی ڈھانچوں کے سوا کوئی منظر نہ تھا۔ زندہ بچ جانے والے شہریوں کو سمرقند لے جایا گیا۔

اورینج کی مہم کامیابی سے نمٹانے کے بعد وہ جتہ مغل قبائل کی جانب متوجہ ہوا اور انہیں دھکیلتے ہوئے ''المالیق'' تک پہنچا دیا۔ اس پسپائی کے بعد وہ سرحدوں پر فتنہ برپا کرنے کے قابل نہیں رہے تھے۔ اپنے ان دو دشمنوں سے نبرد آزما ہونے کے بعد اب سنہری غول سے حتمی معرکہ ناگزیر تھا۔

''آپ نے یہ فیصلہ کر تو لیا ہے امیر! لیکن میری رائے میں اس پر عمل کرنا ایک یقینی موت کو دعوت دینا

ہے۔'' سیف الدین کہنے لگا۔

''ہمیں ابھی تک میدانِ جنگ میں سنہری غول کا سامنا کرنے کا اتفاق نہیں ہوا ہے۔'' ایک اور امیر نے کہا۔ ''تو تمش کے پاس کثیر فوج ہے۔ گھوڑوں کی تعداد بھی ہم سے کہیں زیادہ ہے۔ اسے نقل و حمل میں زیادہ سے زیادہ آسانی رہے گی۔''

''سنہری غول اس علاقے میں نسلوں سے رہائش پذیر ہیں۔ وہ یہاں کے جغرافیائی حالات سے ہم سے کہیں زیادہ واقف ہیں۔ اس لیے ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھانا ضروری ہے۔'' دوسرے امیر نے تجویز دی۔

''شمال میں ریت کے تودے اور غیر آباد پہاڑیاں ہیں۔ وہاں انسانی ضرورت کی کوئی بھی شے مہیا ہو ہی نہیں سکتی۔ اب یہ بات بھی عیاں ہے کہ لڑائی ایسے علاقوں میں ہوگی جہاں عقب میں بنجر زمینوں کے سوا اور کچھ بھی نہ ہوگا۔ ہم فوج کے ساتھ زیادہ سے زیادہ دو یا تین ماہ کا سامان ہی لے جاسکتے ہیں۔ ایسے علاقے میں شکست کا مطلب مکمل تباہی اور پھر سسکتی موت کے علاوہ کچھ بھی نہ ہوگا۔'' سیف الدین نے ایک اور حقیقت کا آئینہ دکھایا۔

''اس مہم کی پیش قدمی فوجی تزویرات کے مطابق شکست اور موت ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہم غیر ضروری مردانگی کا مظاہرہ کررہے ہیں۔'' ایک عمر رسیدہ امیر نے کہا۔

''میں اس وقت انسانی فطرت کے اصولوں کے تحت ہی ہر قدم اٹھاؤں گا۔ میں مغلوں کی فطرت، خوبیوں اور خامیوں سے بہت اچھی طرح واقف ہوں۔ اس لیے جانتا ہوں کہ وہ دفاعی جنگ میں کبھی کامیاب نہیں ہوسکتے۔ اس کے علاوہ معاملے کو دوسرے رخ سے بھی دیکھو۔ جب تک شمال میں توقتمش کی طاقت عروج پر ہے، سمرقند شدید خطرے کی زد میں ہے۔ سنہری غول کے علاقے میں گھس کر فیصلہ کن جنگ لڑنے کا یہی بہترین وقت ہے۔''

تیمور نے اتنا کہہ کر توقف کیا اور مزید سنجیدگی سے کہنے لگا۔

''چند اصولوں کو ہمیشہ کے لیے اپنی گرہ سے باندھ لو۔ اپنے ملک کو کبھی میدانِ جنگ نہ بنانا۔ دفاعی جنگ سے احتراز کرنا اور گھوڑوں کو زیادہ سے زیادہ تیز رفتاری سے دوڑا کر سرعت سے حملہ کرنا۔ صحیح مقام پر صرف دس آدمی لے کر پہنچنا دس ہزار فوج کی کمان ہونے کے باوجود موقعے پر نہ پہنچنے سے بدرجہا بہتر ہے۔ دشمن کے اپنی بھرپور طاقت جمع کرنے کا انتظار کرنا صریحاً حماقت ہے۔ اس انتظار کے بجائے دشمن پر جارحانہ حملہ کرکے اس کی گردن توڑ دینی چاہیے۔ فوج کی رسد کے کوچ کے دوران ضرورت سے زائد ایک بھی آدمی نہیں لے جانا چاہیے۔ بس انہی اصولوں پر عمل پیرا رہو۔ توقتمش کیا، کسی بھی دشمن کو بہ آسانی زیر کرلو گے۔''

تیمور کی اس تحریک پر سپاہ نے کوچ کا آغاز کردیا۔ اس پیش قدمی کے دوران وہ سلسلہ کوہ قراتاغ کے کئی قلعے سر کرچکے تھے۔ فروری کے اواخر میں برفباری اور بارش کی شدت کے باعث انہیں اپنا سفر موقوف کرنا پڑا۔ اس مقام پر توقتمش نے اپنے ایلچی روانہ کرکے درجن بھر نفیس گھوڑے اور ایک ایسا شکرا بطور تحفہ ارسال کیا جس کی آنکھوں پر یاقوت ٹنکی پٹیاں بندھی تھیں۔

''ان تحائف کا کیا مقصد ہے؟'' تیمور نے سرد مہری سے دریافت کیا۔

''توقتمش اپنی سابقہ غلطیوں پر نادم اور صلح کا خواہش مند ہے۔'' ایلچی نے پیغام پہنچایا۔

تیمور نے ہونٹ بھینچ لیے اور تیکھے انداز میں کہا۔

''میں اس شخص پر کس طرح یقین کرلوں؟ توقتمش وہی شخص ہے جو اپنے دشمنوں سے فرار ہوکر میرے پاس پناہ لینے آیا تھا۔ میں نے اسے پناہ دی، بیٹا کہہ کر تکریم دی، ارس خان سے لڑائی میں ہر ممکنہ مدد دی، اپنے شہسواروں سے محروم ہوا لیکن اس کا انجام کیا ہوا؟ توقتمش نے طاقتور ہوتے ہی میرے سب احسانات فراموش کرکے دغابازی کی انتہا کردی۔ میری غیر موجودگی میں میرا ملک تاراج کیا۔ میں بار بار اپنے قول سے پھرنے والے شخص پر اعتبار نہیں کرسکتا۔''

''کیا اس مفاہمت کی کوئی بھی راہ نہیں ہے؟'' ایلچی نے سر جھکا کر دریافت کیا۔

''اگر وہ بدعہد شخص واقعی صلح کا خواہش مند ہے تو اپنے وزیراعظم ''علی بے'' کو گفت و شنید کے لیے روانہ کرے۔''

ایلچی اس کا پیغام لیے واپس روانہ ہوگیا۔ تیمور کی توقع کے عین مطابق علی بے کی آمد نہ ہوئی تو تیمور نے کوچ کا دوبارہ آغاز کردیا۔ شاہی حرم کی مستورات کو اس مقام سے ان افسران کے ہمراہ واپس روانہ کردیا گیا جو سمرقند کے دفاع پر مامور تھے۔

اس کے بعد تیمور کی سپاہ پہاڑوں سے نکل کر سفید ریگ کے صحرا میں داخل ہوگئی۔ صحرا کا سفر نہایت پُرہول اور صبر آزما ثابت ہوا۔ انہیں اشیائے خورونوش کی کمی کا سامنا بھی کرنا پڑا تاہم ایک مقام پر انہیں شکار کے لیے غیر متوقع طور پر چند فربہ جانور مل گئے۔

سفر کا دوبارہ آغاز ہوا تو خطرات کسی عفریت کی طرح منہ پھاڑے ان کے استقبال کے لیے تیار تھے۔ نشیب میں ایسی خطرناک دلدلیں تھیں جن میں انسان اور حیوان سنبھلنے سے پہلے ہی دھنس جاتے۔ جانداروں کے نام پر درختوں کی بالائی سمت پرواز کرتے ''باز'' ہی دکھائی دیتے تھے۔ ان کے علاوہ کہیں کسی جاندار کا نام ونشان نہ تھا۔ کہیں کہیں بھولے بھٹکے مسافروں کی قبروں کی صورت میں مٹی کے چھوٹے ڈھیر بھی دکھائی دے جاتے۔ کنوؤں اور دریاؤں کے کناروں پر مکین رہنے والے شہری تمدن کے عادی تاتاریوں کو یہ سرزمین صحرا سے بھی بدتر محسوس ہوتی تھی۔

دقت ومصائب کا یہ عالم تھا کہ نماز کے اوقات کا تعین مشکل ہوجاتا تھا۔ صبح اجالا ہوجانے کے باوجود کئی گھنٹوں تک سورج طلوع نہ ہوتا۔ لوگ رات ختم ہونے سے پہلے اذان کی آواز پر خیموں سے نکل آتے تھے لیکن صبح کے لیے گھنٹوں منتظر رہنا پڑتا۔ شام کو شفق بہت جلد پھوٹنے کے باوجود غروب آفتاب میں کئی گھنٹے صرف ہوجایا کرتے تھے۔ شام کی اس شفق پھوٹنے اور نمازِ عشا کے اوقات میں کئی گھنٹے کا وقفہ ہوتا اور تاریکی کا دورانیہ اس قدر مختصر ہوا کرتا کہ لوگ پوری طرح آرام بھی نہ کرپاتے تھے۔ علمائے کرام نے اس معاملے کی نوعیت پر غور وفکر کے بعد نماز کے اوقات میں تبدیلی کا فتویٰ صادر کردیا۔

دوسری جانب تیمور نے اپنے نوجوان بیٹے عمر شیخ کی قیادت میں بیس ہزار سپاہ کا لشکر فوج سے علیٰحدہ کرکے سنہری غول کی کھوج میں روانہ کردیا۔ اس علاقے کی خاک چھاننے اور مشکوک افراد کو گرفتار کرکے تفتیش کرنے کے بعد علم ہوا کہ توقتمش اس مقام سے مغرب کی سمت سات روز کی مسافت پر موجود ہے۔

تیمور نے یہ اطلاع ملتے ہی لشکر کو فوری کوچ کا حکم دے دیا۔ اٹھارہ ہفتے پر محیط اٹھارہ سو میل کا وہ سفر بالآخر توقتمش کی تلاش پر منتج ہوگیا۔ تیمور نے میمنہ کی کمان چھوٹے بیٹے میراں شاہ کو سونپی۔ میسرہ سیف الدین کی زیر نگرانی اور قلب براہِ راست تیمور کی زیر کمان تھا۔ اس کے بعد میدانِ جنگ میں گھمسان کا رن پڑا۔ ہر سوار دشمن سوار سے الجھا تھا۔ تیروں کی بوچھاڑیں، تلواروں کی جھنکاریں، انسانی خون کی ندیاں ایک عبرت ناک منظر تھیں۔ زخمیوں کی بے جگری کا یہ عالم تھا کہ اپنی کاٹھیوں سے چمٹے بھی شمشیر زنی میں مصروف تھے۔ ان سپاہیوں کو بخوبی علم تھا کہ کسی جانب سے رحم کی کوئی امید نہ تھی۔ انہیں اپنی رگوں میں لہو کے آخری قطرے تک تلوار چلاتے رہنا تھا اور بدن اس آخری قطرے سے محرومی کے بعد بے جان ہوکر گھوڑوں سے گر پڑتا تو ان کے سموں تلے روندے جانے کے بعد ریشہ ریشہ ہوتے زمین کا حصہ بن جاتے۔

توقتمش، تیمور کی اس یلغار کے سامنے مزاحمت نہ کرسکا اور اپنے چند امراء کے ہمراہ جان بچانے کے لیے ہزار ہا سپاہیوں کو وہیں چھوڑ کر میدان جنگ سے بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کے فرار سے سنہری غول کے علم ازخود ہی سرنگوں ہوگئے۔

توقتمش کے فرار کے بعد لشکر گاہ اور اس کے تمام تر وسائل پر تاتاریوں کا قبضہ ہوگیا۔ مغل سپاہ مشرق کی سمت دریائے وولگا کی دلدلوں میں فرار ہوگئی۔ تاتاری فوج کے سامنے اب میدان بالکل صاف تھا۔ انہوں نے راہ میں آنے والے ہر دیہات میں لوٹ مار کا بازار گرم کیا۔ اس کے بعد وہ جنوبی گرم علاقوں کی جانب روانہ ہوگئے۔

اس مسافت کے دوران انہوں نے بے شمار گائیں، بیل، بھیڑوں، اونٹوں اور گھوڑوں پر تصرف جمایا تھا۔ تیار شدہ گندم کی فصل کاٹ لی گئی۔ مکانات کی تلاشی لے کر خوبصورت لڑکیاں اور کم سن لڑکے غلام بنالیے جاتے۔ یہ پیش قدمی روس کی سرزمین تک اسی طرح جاری رہی۔ دولت کی لوٹ مار کے بعد سونا، چاندی، سفید قاقم اور سیاہ سمور کی پوستینوں پر بھی قبضہ کرلیا گیا۔ اس لوٹ مار کے نتیجے میں ہر سپاہی اتنا کچھ سمیٹ چکا تھا کہ اس کی اولاد کی زندگیوں میں بھی ختم نہ ہوپاتا۔

جنوبی علاقے میں پہنچنے کے بعد یہ تمام لشکر ایک بار پھر یکجا ہوئے اور تیمور کے ایما پر اگلے ایک ہفتے کے لیے جشن میں مصروف ہوگئے۔ جشن کا یہ مقام تاتاریوں کو بے حد پسند آیا تھا۔ اس علاقے میں دھند کا کہیں نام ونشان نہ تھا۔ چاندنی راتیں اس قدر منور ہوتیں کہ گھاس کا ہر ایک تنکا علیٰحدہ دکھائی دیا کرتا۔

بادلوں کا یہ عالم تھا کہ دن کے اوقات میں سروں پر سایہ ڈالتے ہوئے گزرتے محسوس ہوتے۔ رات کے اوقات میں پرندوں کی غنودہ آوازیں، مٹی کی سوندھی مہک سپاہیوں کے قویٰ مست رو بنا رہی تھیں۔ تیمور نے سپاہیوں کی تھکاوٹ اور طویل جنگ کے دوران طاری ہونے والا اعصابی انتشار دور کرنے کے لیے ایک محفلِ موسیقی کا انتظام کرلیا۔

تیمور اس رات توقتمش کے خیمے میں مسند نشین تھا۔ ریشمی پردے اور چوبوں پر نصب سونے کی پتریاں ایک

دلکش منظر تھیں۔ تیمور کے ایما پر فرش پر عرق گلاب چھڑکا گیا۔ اس کے بعد جنگی قیدی گوشت کی قاشیں لا کر رکھنے لگے۔

کھانے کا آغاز ہوتے ہی مطربوں نے بانسریوں اور دوتاروں پر نغمے الاپنے کا آغاز کر دیا۔ تاتاری سپاہیوں کے دلیر کارناموں کی مدح سرائی میں ''ظفر صحرا کا مژدہ'' سنایا جانے لگا۔ یہ نغمہ فی البدیہہ تھا۔

کھانا ختم ہوتے ہی ساغر و مینا کا دور چلا۔ سونے کے جام گردش میں آتے ہی خوش گلو، خوبرو، دراز قد اور سیمیں بدن قیدی کنیزوں نے ساقی گری کا آغاز کر دیا۔ اس ساقی گری کے بعد وہ فاتحین کے سامنے عشق و محبت اور ہجر و وصال کے وہ گیت گاتی تھیں جن کی جڑیں ان کے آبائی ملک میں پیوست تھیں۔ اس شاندار جشن اور نغمات نے حاضرین کو مدہوشی کی حد تک مسحور کر دیا۔

جشن کے اختتام پر تیمور نے لشکر کی کمان سیف الدین کے سپرد کی اور خود سمرقند روانہ ہو گیا۔ اس کی آٹھ ماہ بعد سمرقند واپسی شہر بھر کے لیے بہت پُرجوش تھی۔ انہوں نے اپنے فاتح کا گرمجوشی سے استقبال کیا۔ اس استقبال سے محظوظ ہوتے تیمور ایک بار پھر حکومتی معاملات منظم کرنے میں مصروف ہو گیا تھا۔

☆☆☆

تین سال دبے قدموں بیت گئے۔ تیمور تندہی سے اپنے حکومتی معاملات میں مشغول تھا۔ اس کی سلطنت کے شمالی حصے میں چنگیز خان کی اولاد میں سے ایک خان کو رسمی طور پر نمائندہ متعین کیا گیا تھا جس کا نتیجہ بالآخر یہ برآمد ہوا کہ توقتمش نے ایک بار پھر پر پرزے نکالتے ہوئے سرحدوں پر بحیرۂ خزر کے شمال میں یلغار کا آغاز کر دیا۔

توقتمش کی اس پیش قدمی نے تیمور کا مزاج سخت برہم کیا۔ تیمور نے اسے ایک خط روانہ کیا۔

''تیرے دماغ میں یقیناً کوئی فتور موجود ہے جس نے تجھے گزشتہ جنگ اور اس کے نتائج فراموش کروا دیے ہیں۔ تو نے میرے ساتھ جو وقت گزارا ہے، اس کے بعد تجھے میری فطرت کا اتنا اندازہ تو ہو ہی گیا ہوگا کہ میں عالم امن میں بھی جنگ کے لیے ہمہ وقت تیار رہتا ہوں۔ میری فتوحات کا تناسب بھی تیرے سامنے ہی ہے۔ اب تجھے میرے ساتھ دوستی درکار ہے یا دشمنی؟ فیصلہ تیرے ہاتھ میں ہے۔''

تیمور کی اس واضح تنبیہہ کے باوجود توقتمش نے جنگ کو ہی ترجیح دی۔ اس نے ایسی بے جگری سے تیمور کی سپاہ کا مقابلہ کیا کہ اپنی فوج سے کٹنے کے بعد محض چند سپاہی ہی اس کے ہمراہ رہ گئے۔ توقتمش کے لشکر نے دباؤ اس قدر بڑھایا کہ تیمور کے ان سپاہیوں نے گھوڑوں سے اتر کر اس کے گرد حلقہ بنا لیا۔ نور الدین حاضر دماغی سے کام لیتے ہوئے مقابل کی چند بیل گاڑیاں کھینچ لایا اور تیمور کے گرد پشتہ باندھ کر دفاعی حصار قائم کر دیا۔

خوش قسمتی سے کمک جلد ہی میسر آ گئی۔ اگلے چند لمحے فیصلہ کن ثابت ہوئے۔ اس آخری معرکے کے نتیجے میں تیمور کا بیٹا میران شاہ اور امیر الامراء سیف الدین زخمی ہوئے تاہم خوش کن امر بہرحال یہی رہا کہ سنہری غول کا زور ٹوٹ گیا اور توقتمش شمالی صحراؤں کی بھول بھلیوں میں فرار ہو گیا۔ اس کے قبیلے منتشر ہو کر کرائیمیا، اور ناروہنگری چلے گئے۔ چند ایک قبائل نے تیمور سے الحاق کر لیا۔

تیمور کے مزاج پر آتشِ انتقام غالب آ چکی تھی۔ اس نے پہلے وولگا کے کنارے پر واقع مشہور شہر ''سرائے'' کو تاراج کیا پھر دیگر شہروں کو بھی تباہی کی زد میں رکھ لیا۔ سرائے کے باشندوں کو پہلے شہر سے باہر نکالنے کے بعد برف میں مرنے کے لیے چھوڑ دیا۔ مکانات نذرِ آتش کر دیے گئے۔ اس کے بعد تیمور کا اگلا ہدف وولگا کے کنارے ایک اور شہر ''استراخان'' تھا۔

اس شہر کی خاصیت یہ تھی کہ اس کی فصیل برف کی ایک اونچی دیوار تھی۔ استراخان کے رہائشی اس پر پانی ڈالتے رہتے تھے جو برف میں تبدیل ہونے کے بعد اسے مزید اونچا کر دیتا۔ اس مقام پر پہنچنے کے بعد تیمور کے ذہن میں ایک ہی سوچ دستک دینے لگی کہ ماضی قریب میں مغلوں نے بخارا کو نذرِ آتش کیا تھا۔ اپنی اس انتقامی سوچ سے مغلوب ہو کر تیمور نے انہیں قتل کرنے کا حکم دے کر حاکم شہر کو دریا میں ہی دفن کروا دیا۔

☆☆☆

سنہری غول کے اقتدار کا آفتاب غروب ہو چکا تھا۔ مغل خوانین کے پاس اب صحرائے گوبی اور شمالی ٹنڈرا کے سوا کچھ بھی باقی نہ رہا تھا۔ اس وقت تیمور کا ستارہ مکمل طور پر عروج پر تھا۔ فتوحات کے جھنڈے گاڑتے ہوئے تیمور کوہِ البرز تک رسائی حاصل کر چکا تھا۔ یہاں پہنچنے کے بعد اس نے پہلے کلات کا قلعہ فتح کیا اس کے بعد تکریت کا رخ کر لیا۔ تکریت دریائے دجلہ کے کنارے ایک بلند پہاڑی پر واقع تھا۔ یہاں ایک آزاد قبیلہ رہائش پذیر تھا جو ہر راہ گیر کو بے دھڑک لوٹ لینے میں مشہور تھا۔ قبیلے کے سرکردہ افراد کو جب تیمور کی پیش قدمی کی خبر ملی تو انہوں نے باہمی طور

پر یہ فیصلہ کیا کہ وہ ہر ممکن حد تک قلعے کی حفاظت کریں گے۔ اس کے بعد قلعے کے تمام تر دروازے پتھروں سے چُن کر ان کی درزیں چونے سے بند کردی گئیں۔

تاتاریوں نے نقاروں پر ضرب لگا کر فوراً حملہ کردیا۔ ان کی اس پیش قدمی کے نتیجے میں پہاڑ پر قلعے کے نیچے فصیل تو بہ آسانی فتح ہوگئی تاہم مزاحمت کار اندرونی حصار میں قلعہ بند ہوگئے۔ اس حصار پر منجنیقوں سے وزنی پتھر پھینکے گئے تو مکانات کی چھتیں بیٹھنی شروع ہوگئیں۔ حصار کی دیوار بلندی پر ہونے کی صورت میں کسی بھی نقصان سے محفوظ تھی۔ محاصرے کی تیسری رات سید خواجہ نامی سردار نے ایک بیرونی برج پر قبضہ کرلیا لیکن اس کے سپاہی حصار کی دیوار تک پہنچنے میں تاحال ناکام تھے۔ سید خواجہ کی حکمتِ عملی کے مطابق بلند شہتیروں پر سائبان ڈال کر اس کی آڑ میں تاتاری ماہر تعمیرات اور کھدائی کرنے والوں نے اتنی اونچائی پر باڑیں باندھیں کہ حصار کی دیوار کی بنیاد تک بہ آسانی رسائی مل گئی۔

حصار کے مختلف حصے مختلف دستوں کو سونپ دیے گئے۔ پہلے مرحلے میں بہتر ہزار افراد مختلف اوزاروں سے حصار کی بنیادیں کھودنے پر مامور کیے گئے۔ وہ شب و روز چھینیوں اور کدالوں سے سر توڑ محنت کر کے چٹان میں شگاف ڈالنے میں کامیاب ہوگئے۔ ایک دستے نے پہاڑ میں بیس فٹ طویل سرنگ کھود کر اہلِ قلعہ کو گھبراہٹ میں مبتلا کردیا۔ انہوں نے فوری طور پر تیمور کی خدمت میں تحائف روانہ کیے۔ تیمور نے جوابی طور پر ان کے سردار حسن سے ملاقات کا مطالبہ کردیا۔ حسن کی جانب سے انکار کے بعد تیمور کے حکم پر حملے کا نقارہ بجاتے ہوئے ایک سرنگ میں لکڑیاں اور جھاڑیاں بھر کر انہیں نذرِ آتش کردیا گیا۔

اس آتش زنی کے نتیجے میں فصیل میں بے شمار شگاف پیدا ہوگئے۔ اسی دوران دو سرنگیں مزید تیار کر کے نذرِ آتش کردی گئیں۔ کچھ ہی لمحوں میں حصار کے چاروں طرف دھوئیں کے بادل پھیل چکے تھے۔ فصیل میں مزید شگاف پیدا ہونے کے بعد وزنی ہتھیاروں سے لیس سپاہ نے حملہ کردیا۔ اہلِ قلعہ کے فرار اور مزاحمت کی ہر کوشش ناکام بنادی گئی۔ حسن کو مشکیں باندھ کر تیمور کے پاس لایا گیا۔ سپاہیوں کو البتہ پہلے ہی موت کے گھاٹ اتارا جاچکا تھا۔ تیمور کا مزاج شدید سفاکیت کی زد میں تھا۔ اس نے دریا کی ریت کی مدد سے سپاہیوں کے سروں کے دو کلہ مینار تعمیر کرنے کا حکم دیا۔ مینار کی تکمیل کے بعد ایک کتبہ نصب کردیا گیا۔

''ڈاکو اور باغی ایسے ہی انجام کے مستحق ہوتے ہیں۔''

مینار کی تکمیل اور کتبے کی تنصیب کے بعد سیف الدین کے ذہن میں ایک ہی سوال گردش کررہا تھا کہ اس کتبے پر درحقیقت یہ عبارت کندہ ہونی چاہیے تھی۔

''تیمور کی اطاعت سے انکار کرنے والے ایسے ہی انجام کے مستحق ہوتے ہیں۔''

☆☆☆

تکریت کی مہم سترہ دن میں مکمل ہوئی تھی۔ اس مہم کی تکمیل کے بعد تیمور کی سلطنت بلاد شمال، بحیرۂ خوارزم، بحیرۂ خزر، ایران اور کوہستان قلقاز تک وسیع ہوچکی تھی۔ خراسان کی تاریخی شاہراہ بائیس سو میل تک اس کی مملکت میں شامل تھی۔ نیشاپور سے المالیق تک چودہ شہر اسے خراج دینے کے پابند تھے۔ یہ کامیابیاں بہت خوش کن سہی تاہم ان کے پسِ پردہ حقائق یہ تھے کہ انہیں بہت سی قیمتی انسانی جانوں کا خراج دینا پڑا تھا۔ تیمور کے کئی امراء اور بہادر اپنی زندگیوں سے محروم ہوچکے تھے۔ خطائی بہادر، شیخ علی بہادر کی اموات کے بعد کوہستان قلقاز میں منجھلے بیٹے عمر شیخ کی موت اس کے لیے حقیقتاً صدمۂ جانکاہ تھی۔

تیمور کے لیے وہ لمحات بہت کٹھن تھے۔ اس نے میدانِ جنگ میں بے شمار مرتبہ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مقابلہ کیا تھا۔ کئی ایک بار یقینی موت کو شکست بھی دی تھی لیکن اس کے دلی رشتے اس شکنجے کی گرفت سے محفوظ نہیں رہ پاتے تھے۔ الجائی خاتون اور جہانگیر کے بعد عمر شیخ سے دائمی جدائی اس جنگجوئے صف شکن کے روح و قلب پر خراشیں پیدا کرنے لگی تھی لیکن اس نے متانت کا دامن تھامے رکھا۔ تیمور نے کسی بھی رنج و ملال کا اظہار کیے بغیر آسمان کی جانب نگاہ اٹھائی اور گہری سانس بھرتے ہوئے کہا۔

''اللہ کی عنایت تھی۔ اس نے واپس لے لی۔ جو اس کی رضا۔''

اس کے بعد تیمور نے سمرقند کی جانب کوچ کا حکم دے دیا۔ اس مسافت کے دوران تیمور نے ''آق سرائے'' میں مختصر قیام کیا۔ شہر سبز کے قریب ایک سبزہ زار میں ''قصر سپید'' کی تعمیر مکمل ہوچکی تھی۔ تیمور نے اس مقام پر پہنچ کر ہر قسم کی درباری سرگرمی موقوف کرتے ہوئے خود کو مکمل طور پر گوشہ نشین کرلیا۔ اس کا مزاج بے حد گمبھیر ہوچکا تھا۔ انہی سوچوں کے زیرِ اثر اس نے قدرے دور دراز علاقوں پر حملے کا فیصلہ کرلیا۔ یہی وہ وقت تھا جب اسے ایران کے بادشاہ ''شجاع'' کا ایک خط موصول ہوا۔ تیمور اور شجاع کی

زندگی میں کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ ہاں البتہ کچھ عرصہ پہلے شجاع نے دوستی کا عہد کیا تھا اور اب بسترِ مرگ پر اپنے لیے ذاتی نگرانی میں کفن اور تابوت تیار کرواتے ہوئے تیمور کو ایک خط لکھ بھیجا۔

''بچپن سے ہمیں یہی سمجھایا اور پڑھایا جاتا ہے کہ دنیا فانی ہے۔ یہاں ہر ایک شے ناپائیدار اور لذتیں محض امتحان ہیں۔ اس کے باوجود جانے کیوں ہم اس فانی دنیا کی محبت میں گرفتار ہونے کی حماقت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ میں بھی اس حماقت کا مرتکب ہو چکا ہوں لیکن بہرحال اس بات کا اطمینان ضرور ہے کہ زندگی میں کبھی کوئی ایسا امر سرزد نہیں ہوا جس کے نتیجے میں ضمیر کی ملامت کا سامنا ہو۔ میں نے اپنے تئیں بے لوث زندگی بسر کی ہے۔ اب وقت آخر نزدیک تر ہے اور ان لمحات میں میری یہی دعا ہے کہ پروردگار اس بادشاہ کو ہمیشہ سلامت رکھے جو سلیمان کی دانائی اور سکندر کی عظمت کا مرکب ہے۔ اس لمحے دل میں یہ خیال بھی در آرہا ہے کہ آپ سے اپنے بیٹے زین العابدین کی سفارش کروں۔ خدا کے بعد میں اسے آپ کے سپرد کرتا ہوں اور اس بدگمانی کی گستاخی تو ہرگز نہیں کر سکتا کہ آپ ہمارے باہمی عہد کو ہمیشہ نبھائیں گے۔ پروردگار اسے آپ کے سائے میں ہمیشہ خوش رکھے۔ اس ناچیز کے حق میں دعائے مغفرت کر دیا کیجیے گا۔ بوقتِ مرگ میری بھی یہی دعا ہے کہ آپ کا اقبال ہمیشہ بلند رہے۔''

اس خط کے ساتھ مختلف تحائف دیکھ کر تیمور لحاتی طور پر سوچ میں مبتلا ہوا اور اس سفیر سے کہنے لگا۔

''میں ایران کے متعلق تازہ ترین حالات و حقائق سے آگاہ ہونا چاہتا ہوں۔ مجھ سے کسی بھی قسم کی غلط بیانی نہ کرنا کیونکہ اگر میں نے دوسرے ذرائع سے یہ حقائق معلوم کر لیے تو پھر روئے ارض پر تمہیں کہیں کوئی پناہ نہیں ملے گی۔''

سفیر کا چہرہ متوحش دکھائی دینے لگا۔ اس نے رحم طلب نظروں سے تیمور کی جانب دیکھا اور کوئی نرمی نہ پا کر شکست خوردگی سے سر جھکا کر کہنے لگا۔

''ایران کبھی شوکت و سطوت کا مرکز ہوتا تھا لیکن اب ایک تباہ حال ملک بن چکا ہے۔ ماضی میں عظیم مسلمان فرماں رواؤں کا مرمریں تخت اب ان کے ناخلف بیٹوں اور پوتوں کے قبضے میں ہے۔ یہ موجودہ حکمران شراب و کباب کے زیادہ دلدادہ ہیں اور اپنا وقت محض چہلوں میں برباد کرتے ہیں۔''

''گویا شہبازوں کے آشیانوں میں کرگس گھسے بیٹھے ہیں۔'' تیمور نے ہنکارا بھرا۔

''جی ہاں۔ معاشرت کا یہ عالم ہے کہ کہیں برہنہ زائرین دھوپ تاپتے نظر آتے ہیں تو کہیں درویش طبلے کی تھاپ پر تھرکتے دکھائی دیتے ہیں۔ ہاں، وہ بات الگ ہے کہ اس درویشانہ رقص کے دوران ان کی آنکھیں انہی سکوں پر مرکوز ہوتی ہیں جو ان کے کشکول میں ڈالے جاتے ہیں۔ قبیلوں کے سردار خچروں پر بیٹھ کر نکلتے ہیں اور ان کے غلام سروں پر چھتر سے سایہ کیے ہوئے جلو میں چلا کرتے ہیں۔ اکثر ریشمی جائے نمازیں مئے لالہ فام سے تر رہتی ہیں۔ بگلا سی سفید ڈاڑھیاں حشیش سے رنگی ہوتی ہیں۔''

''دولت و ثروت کی موجودہ صورتِ حال کیا ہے؟'' تیمور نے کسی سوچ کے تحت دریافت کیا۔

''ایران ایک طویل عرصے سے دولت مند شمار ہوتا رہا ہے لیکن اب یہی دولت باعثِ مصیبت بن چکی ہے۔ امیر طبقہ شکمی ہو چکا ہے اور غریبوں میں خودسری و خردماغی سرایت ہو چکی ہے۔ اقتدار پرستی حد سے تجاوز کر چکی ہے۔ بادشاہ اپنے بیٹوں کی آنکھیں نکلوا دیتے ہیں، بھائی اپنے بھائی کی موت پر مسکرا کر کہتا ہے کہ میں زمین کے اوپر ہوں اور میرا بھائی زمین کے نیچے پہنچ گیا ہے۔ اب ہم دونوں خدا کی زمین کے صحیح معنوں میں مساوی طور پر مالک ہیں۔ مختصراً بتاؤں تو اس ملک میں قسمت بے وقوفوں کا ساتھ دیتی ہے۔ عالم وہ ہے جس میں روزی کمانے کی صلاحیت نہ ہو۔ خاتون وہ ہے جس کے ان گنت عاشق ہوں اور بیوی وہ ہے جس کی کوئی پوچھ نہ ہو۔ صوف پوش مشائخ شاعروں سے الٰہیات پر گرما گرم بحث و مباحثہ کرتے ہیں۔ شہزادوں کے گرد مہ وش ساقیوں کا ہجوم رہتا ہے۔ نقالوں، مسخروں، صنائع و بدائع کے ماہرین، ممدوحین کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملانے والوں، دوشالوں میں لپٹے بھکاریوں اور چند ایک ایسے شاعروں جن کے کلام کو الہام کا درجہ دیا جاتا ہے، ان شہزادوں کے مصاحب بنے رہتے ہیں۔''

''ان شہزادوں کی عسکری صلاحیتیں کیسی ہیں؟'' تیمور نے استفسار کیا۔

''وہ زرہ پہن کر جنگ میں شامل ہونے کے بجائے رزمیہ شاعری پر سر دھنتے اور ہمہ وقت عالمِ خیال میں گم رہتے ہیں۔ ہر اس کام میں ملوث ہوتے ہیں جسے اسلام نے ممنوع قرار دیا ہے۔ ان شہزادوں کی ذہنی کیفیت کا حال بھی سن لیجیے۔ اگر کوئی ان کے مذہب کی توہین کرتا ہے تو اسے سنگسار کروا دیتے ہیں اور دوسری جانب خود جام ہاتھ

ملک بھر میں جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت
ملنے میں اگر دشواری ہے تو مندرجہ ذیل نمبرز پر ہمارے نمائندوں سے رابطہ کیجیے۔

کراچی	03002680248	گجرات	03016215229	سیالکوٹ	0524568440
لاہور	03004009578	وزیرآباد	03456892591	میرپور AK	03460397119
ملتان	03006301461	لالہ موسیٰ	03216203640	اٹک سٹی	057210003
حیدرآباد	03213060477	خان پور	03337472654	دیپالپور	03004854922
سرگودھا	03447475344	کوہاٹ	03325465062	لیہ	03002373988
پشاور	03005930230	ساہیوال	03446804050	قصبہ ڈنگہ	03083360600
کوئٹہ	03337805247	پاک پتن	03006946782	عارف والا	03008758799
فیصل آباد	03006698022	مظفرآباد	03469616224	لورالائی	03023844266
راولپنڈی	03005583938	بوروالہ	03347193958	کوٹلہ ارب علی خان	03016299433
نواب شاہ	03003223414	وہاڑی	03136844650	جلالپور پیروالا	03338303131
صادق آباد	03007452600	تونسہ شریف	03346712400	ہری پور	03321905703
رحیم یار خان	03055872626	ڈیرہ غازی خان	03336481953	چکوال	03348761952
بہاولپور	0622730455	بہاولنگر	03336320766	وہوا	03346383400
گوجرانوالہ	03316667828	بنوں شہر	03329776400	حافظ آباد	0307-6479946
جہلم	03235777931	رائے ونڈ	03004719056	واہ کینٹ	0301-5497007
سیالکوٹ	03008711949	ہڑپہ	03317400678	ایبٹ آباد	0992335847
جھنگ	0477626420	ڈیرہ اسماعیل خان	03349738040	چترال	03454678832
بھکر	03337979701	چشتیاں	03348761952	مانسہرہ	0333-5021421

منڈی بہاؤالدین 0331-7619788 مغل آباد 0301-7681279 کوٹ رادھا کشن 03004992290

ڈسکہ 0300-9463975 سمبڑیال 0333-8604306 قصور 0300-6575020

حجرہ شاہ مقیم 03006969881 ٹوبہ ٹیک سنگھ 0315-6565459

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیز III ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی فون: 35895313

E-mail:jdpgroup@hotmail.com

pklibrary.com

میں تمام کر مذہب کا تمسخر اڑاتے اور اسے بے جا مصرف قرار دیتے ہیں۔ انہیں سرزمین ایشیا کا یونانی سمجھ لیں۔ کبھی عیش پرستی میں ڈوب جاتے ہیں تو کبھی تحفظ مذہب کے لیے مرنے مارنے پر تل جاتے ہیں۔'' سفیر نے مزید بتایا۔

''تاتاریوں کے بارے میں ان کے کیا خیالات ہیں؟'' تیمور کی آنکھیں کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔

سفیر یہ سوال سن کر تذبذب میں مبتلا ہوگیا تاہم تیمور کے کڑے تیور دیکھتے ہوئے مزید مزاحمت نہ کرسکا اور ہونٹ کچلتے ہوئے کہنے لگا۔

''وہ تاتاریوں کو بے دین سمجھتے ہیں۔ ان سے نفرت کرتے ہیں۔''

تیمور نے سفیر کو ملاقات سے برخاستگی کا عندیہ دیا اور ایران پر حملے کی منصوبہ بندی کرنے لگا۔ اس اثنا میں شاہ شجاع عدم روانہ ہوچکا تھا۔ اس کی رحلت کے بعد آل مظفر کہلائے جانے والے دسیوں شہزادے مملکت کے مختلف حصوں پر دعویدار بن کر ٹوٹ پڑے۔ کسی نے اصفہان پر قبضہ کرلیا تو کوئی شیراز پر قابض ہوگیا۔ ہر ایک نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنالی تھی۔ چند ایک نے اپنے نام کے سکے بھی ڈھال لیے۔ لگان البتہ بھی نے اپنے اپنے طور پر بڑھا دیا تھا۔

تیمور نے 1386ء کے موسم سرما میں شمالی سرحدوں سے ایران میں دراندازی کی۔ اس کے ہمراہ ستر آزمودہ کار لشکر تھے۔ اصفہان پہنچنے کے بعد شہر کی شان وشوکت نے ان سبھی کی آنکھیں چندھیا دیں۔ ہر جگہ گنبد، سایہ دار خیابان اور چہچہاتے ہوئے بازار تھے۔ پلوں پر بھی بازاروں جیسی چہل پہل ہی دکھائی دیتی تھی۔ اصفہان کی شان وشوکت دیکھتے ہوئے تیمور کے ذہن میں شاہ شجاع مرحوم کے خط میں پنہاں التجا دستک دے رہی تھی۔ اسی التجا کے زیر اثر تیمور نے فی الوقت جنگ میں پہل سے گریز ہی کیا ہوا تھا۔ اس کے استقبال کے لیے آنے والے اصفہان کے امراء زین العابدین کے خالو سید مظفر شمسی کی پیشوائی میں شہر کے باہر آئے تھے۔ تیمور نے نہایت متانت وخوشدلی سے ان سے ملاقات کی۔ انہیں تحائف پیش کیے اور اپنے پاس قالین پر بٹھا کر اصفہان کے متعلق گفتگو کرنے لگا۔ اس نے کسی بھی تکلف یا لگی لپٹی کے بغیر اصل مدعا بیان کرتے ہوئے کہا۔

''میں تم سب کو امان دینے کے لیے تیار ہوں۔ شہر بھی برباد نہیں کیا جائے گا۔ اس کے عوض تمہیں خراج ادا کرنا ہوگا۔''

''ہمیں آپ کی ہر شرط منظور ہے امیر!'' مظفر شمسی نے جواب دیا۔

دیگر امراء بھی نیم رضامند دکھائی دے رہے تھے۔ انہیں علم تھا کہ ایک ہزار میل کی مسافت طے کرکے آنے والی یہ ایک لاکھ فوج خالی ہاتھ تو ہرگز نہیں جائے گی۔ خراج کی رقم مقرر کرنے کے بعد انہوں نے تیمور کو رقم کی وصولی کے لیے اپنے محصل شہر روانہ کرنے کا عندیہ دے دیا۔ ہر لشکر میں سے ایک سردار رقم وصول کرنے ہر محلے میں روانہ ہوتا۔ ان سرداروں کی نگرانی کے لیے ایک اعلیٰ مرتبت امیر مقرر کیا گیا۔

اگلے روز تیمور نے جلوس کی معیت میں شہر بھر کا دورہ کیا اور بڑے بڑے بازاروں سے ہوتا ہوا لشکر گاہ واپس پہنچ گیا۔ اس نے شہر کو قابو میں رکھنے کے لیے دروازوں پر فوجی دستے تعینات کردیے۔ وہ رات بے حد پُرسکون تھی۔ ہر طرف امن کا دور دورہ تھا۔ دو مہینے کی مسافت کے بعد ایک متمدن شہر میں پہنچنے والے وہ ستر ہزار سپاہی اپنی دل بستگی کے لیے میخانوں کا رخ کرنے لگے۔

ان سپاہیوں کی دید سے شہر کے چند اوباش نوجوانوں کے دماغ میں ایک فتور پیدا ہوگیا۔ انہوں نے نقارہ بجاتے ہوئے اہل شہر کے مذہبی جذبات کو مشتعل کرنے کا آغاز کردیا۔ وہ نقارے کی مخصوص صدائیں بلند کرتے بہ آواز بلند پکارنے لگے۔

''اہل مسلمین! اٹھو، ہمت کرو۔ تمہارا دین شدید خطرے کی زد میں ہے۔ اپنے دین کی حفاظت کرو۔''

اس جذباتی چیخ وپکار سے کئی لوگ اپنے گھروں سے نکل آئے۔ کچھ ہی دیر میں مختلف گلی کوچوں میں مجمعے جمع ہوچکے تھے۔ یہ وہ وقت تھا جب تاتاری سپاہی شہر میں پُرامن طریقے سے نقل وحرکت کررہے تھے۔ مشتعل ہجوم نے ہوش وحواس اور نتائج کی فکر بالائے طاق رکھتے ہوئے ان سپاہیوں پر حملہ کرکے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ چند ایک علاقوں میں البتہ کچھ افراد نے دانش مندی کا ثبوت دیتے ہوئے تاتاریوں کی جانیں بچالیں۔

اس کے بعد خونریزی کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوگیا۔ اس رات تقریباً تین ہزار تاتاری اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔

تیمور کو اگلی صبح جب ان ہنگاموں کی اطلاع ملی تو وہ اپنے طیش پر قابو نہ رکھ سکا۔ اس نے بلا تامل شہر کی فصیل پر حملے کا حکم صادر کردیا۔ لشکر گاہ میں موجود ایرانی امراء کی سٹی گم ہوگئی۔

''امیر! اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کیجیے۔'' وہ ملتجی ہوئے۔

''اب وقت گزر چکا ہے۔'' تیمور نے سرد مہری سے کہا۔

''رحم کیجیے امیر! ان مٹھی بھر نادانوں کی سزا سب کو نہ دیجیے۔'' انہوں نے ایک بار پھر منت سماجت کی۔

''ان مٹھی بھر نادانوں پر کل رات باقی ہوش مندوں نے قابو کیوں نہ پایا؟'' اس نے سفاکی سے استفسار کیا۔ ''اب اس بہادری اور جرأت کا خمیازہ تو بھگتنا ہوگا۔''

''ان احمقوں نے جانے اپنے کس جذبے کی تسکین کے لیے وقتی طور پر جنگ تو مول لیا ہے لیکن دفاع ان کی استطاعت ہرگز نہیں ہے۔'' ایک ایرانی امیر نے صاف گوئی سے تجزیہ کیا۔

تیمور نے ان سبھی کی التجائیں ان سنی کرتے ہوئے اپنے کمانداروں کو حکم دیتے ہوئے کہا۔

''دروازوں پر ہلّا بول کر قتلِ عام برپا کردو۔ ہر سپاہی ایک ایرانی کا سر کاٹ کر حاضر کرے۔''

''امیر! کچھ علاقوں میں ہمارے سپاہیوں کی زندگی بچانے کے لیے کافی کوششیں کی گئی تھیں۔ ان کے لیے کیا حکم ہے؟'' ایک کمان دار نے دریافت کیا۔

''انہیں ضرر مت پہنچانا۔ باقی اہلِ شہر کو البتہ بے دریغ تہ تیغ کردینا۔''

تیمور کی ان ہدایات پر من وعن عمل کیا گیا۔ اس روز شہر بھر میں قتل وغارت کا بازار گرم رہا۔ چند ایک افراد رات کی تاریکی میں شہر سے فرار ہونے میں کامیاب تو ہوگئے تاہم انہیں اگلے روز برف سے ڈھکے میدان میں گھیر کر قتل کردیا گیا۔ اس قتلِ عام میں چند تاتاری البتہ ایسے بھی تھے جو ان شہریوں کے خون سے اپنے ہاتھ نہیں رنگنا چاہتے تھے۔ انہوں نے اپنے ساتھیوں سے ''ایرانی سر'' خرید کر تیمور کی خدمت میں پیش کردیے۔ آغاز میں ایک سر کی قیمت بیس ہزار دینار تھی۔ بعد ازاں یہ تناسب نصف دینار تک رہ گیا۔ ایرانی شہریوں کے یہ سر پہلے تو شہر کی دیواروں پر چنے گئے۔ اس کے بعد شاہراہوں پر ان کے کلہ مینار بنادیے گئے۔

اس قتلِ عام کے نتیجے میں اصفہان کے تقریباً ستر ہزار افراد مارے گئے تھے۔ تیمور کے اس ظالمانہ انتقام نے آلِ مظفر کے شہزادوں کو بے طرح سہما دیا۔ انہوں نے بے چون وچرا اطاعت میں ہی عافیت سمجھی تھی۔ شوستر کے حکمران منصور نے اطاعت قبول کرنے کے بجائے پہاڑوں میں روپوشی کو ترجیح دی۔ شیراز اور چند دیگر شہروں نے بلا تامل خراج بھی ادا کردیا۔ تیمور کا نام اب خطبے میں پڑھا جانے لگا تھا۔

تیمور نے ہر مظفری شہزادے کو اپنی سرخ رنگ کی ثبت شدہ مہر دے کر اختیارِ حکومت کا پروانہ دے دیا جس کے نتیجے میں وہ اس کی جانب سے صوبوں کے حاکم اور تیمور بذاتِ خود ان کا حکمرانِ اعلیٰ تھا۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ مملکت ایران صرف تیمور کی خوشنودی کی صورت میں ہی ان کے زیرِ حکومت رہ سکتی تھی۔ تیمور نے اپنی اس نوتسخیر شدہ سلطنت کے لیے کئی فلاحی اقدامات بھی کیے۔ اس نے مقامی باشندوں پر عائد بھاری محصولات کی شرح میں نمایاں کمی کردی۔

ان اقدامات کے بعد تیمور نے سمرقند واپسی کا ارادہ کیا اور ایران کے کئی مطربوں کو بھی اپنے ہمراہ لے گیا۔ تیمور کا یہ فیصلہ اس کے حق میں بہت نقصان دہ ثابت ہوا۔ اگلے کچھ عرصے میں اس کا بیٹا میراں شاہ ان مصاحبین کی ہم نشینی کے باعث مے نوشی کا دلدادہ ہوگیا۔ یہی قضیہ کم نہ تھا کہ میراں شاہ کی بے ربط حرکات اور اس کی ذہنی کیفیت تیمور کے اعصاب کے لیے امتحان ثابت ہونے لگیں۔ یہ وہ وقت تھا جب تیمور ہندوستان میں ایک سالہ مہم کے بعد سمرقند لوٹا تھا۔ اس نے اپنی غیر موجودگی میں بجیرۂ خزر کی حکومت میراں شاہ کے حوالے کردی تھی۔ گمان یہی تھا کہ میراں شاہ اس کا بہترین جانشین ثابت ہوگا لیکن نتیجہ برعکس برآمد ہوا۔ سمرقند واپسی کے بعد تاتاری افسران میراں شاہ کی شکایات کا پلندہ لیے اس کے پاس چلے آئے۔

''امیر! گستاخی معاف، لیکن معاملات بہت خراب ہوچکے ہیں۔'' ایک عمر رسیدہ تاتاری افسر کہنے لگا۔

''میراں شاہ کے طرزِ حکومت سے مسائل ہیں کیا؟'' تیمور نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

''امیر! سب سے پہلے تو ان کا غیر سنجیدہ رویہ معاملات کے انتشار کا باعث بنتا ہے۔'' دوسرے افسر نے اضطراب سے بتایا۔

تیمور خاموشی اور سنجیدگی سے ان کی گفتگو سنتا رہا۔

''وہ ایران سے آنے والے مصاحبین کے ہمراہ مے نوشی کی محافل برپا کیے رکھتے ہیں۔ رقص وسرود میں بہت زیادہ ملوث ہوگئے ہیں۔'' پہلے افسر نے بتایا۔

''لیکن جس حد تک میں اپنے بیٹے کے مزاج سے واقف ہوں، وہ طبعاً سفاک اور ظالم ہے۔ ایسے مزاج کا حامل شخص اتنی آسانی سے تو مصاحبین کے جھانسے میں آکر اپنے رنگ نہیں بدلتا۔'' تیمور مضطرب ہوا۔

''وہ طبعاً بالکل ایسے ہی ہیں امیر جیسا آپ نے بتایا

ہے لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ وہ آپ کے ماتحت رہ کر کسی مہم میں شرکت کے دوران ہی اس جامے میں رہتے ہیں۔ بصورتِ دیگر ان کے رنگ ڈھنگ تبدیل ہوجایا کرتے ہیں۔'' دوسرے افسر نے ڈرتے ہوئے بتایا۔

''وہ بہت عجیب وغریب حرکات کرنے لگے ہیں امیر!'' پہلا افسر گویا ہوا اور تیمور کی مستفسر نگاہوں کے جواب میں سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''کبھی جھروکے سے زر وجواہر بارش کی طرح ہجوم پر برسانے لگتے ہیں تو کبھی مسجد میں مے نوشی کا آغاز کردیتے ہیں۔''

''اگر وہ ایسی بدبختی کا مظاہرہ کررہا ہے تو اسے روکا یا سمجھایا کیوں نہیں گیا؟'' تیمور طیش زدہ ہوا۔

''امیر! ان کے مشیروں اور امراء نے ہر ممکن طور پر سمجھا کر دیکھا ہے۔ جوابی طور پر وہ یہی کہتے ہیں کہ میں اس شخص کا بیٹا ہوں جو دنیا بھر کو اپنے قدموں تلے روندنے کی تیاری کررہا ہے۔ مجھے بھی تو کوئی ایسا کام کرنا چاہیے جو تاریخ میں مجھے امر کردے۔'' افسر نے فوراً وضاحت دی۔

''کچھ عرصہ پہلے تبریز اور سلطانیہ میں مریض خانے اور محلات مسمار کروانے کے احکامات صادر کردیے تھے۔ امیر تیمور کے فرزند کا حکم اہلِ قانون کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کے احکامات کی تعمیل کردی گئی۔ اس کے بعد انہوں نے ایک اور ماورائے عقل فرمائش کردی۔ ان کا حکم تھا کہ حالیہ طور پر انتقال کرنے والے ایرانی فلسفی کی لاش اس کی قبر سے نکال کر یہودیوں کے قبرستان میں دفن کردی جائے۔''

''میراں شاہ پہلے ہرگز ایسے نہیں تھے۔'' ایک اور افسر نے گفتگو میں حصہ لیا۔

''تو پھر اس کے ذہن میں یہ فتور کیسے پیدا ہوا ہے؟'' تیمور کو مزید طیش آیا۔

''کچھ عرصہ پہلے گھڑسواری کے دوران زمین بوس ہونے سے ان کا سر مضروب ہوا تھا۔ اس کے بعد ان کی ذہنی کیفیت متوازن نہیں رہی۔''

''صرف یہی وجہ نہیں ہوسکتی۔'' تیمور نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''میراں شاہ کا یہ دماغی عدم توازن کثرتِ شراب نوشی اور نشہ آور اشیاء کے استعمال کا نتیجہ ہے۔ خیر، میں کوئی نہ کوئی بندوبست کرلوں گا۔''

افسران کی روانگی کے بعد دربان نے اذنِ باریابی طلب کیا اور تعظیم کے بعد کہنے لگا۔

''حضور! شہزادہ جہانگیر کی بیوہ باریابی کی طلب گار ہیں۔''

''خان زادہ.....؟ کس کے ساتھ آئی ہے وہ؟'' تیمور چونکا۔

''تنہا ہیں۔'' دربان نے بتایا۔ وہ بذاتِ خود سیاہ لباس میں ملبوس، چہرے پر نقاب ڈالے، کسی ملازم یا غلام کے بغیر آنے والی اس سوگواری و دلکشی کے پیکر کو دیکھ کر بہت حیران و مضطرب ہوا تھا۔

تیمور نے اسے فوراً اذنِ باریابی بخش دیا۔ اس کے دل و دماغ میں ماضیِ قریب میں شہزادہ جہانگیر کی شادی کے موقع پر منعقد ہونے والے شاندار جشن اور پھر بیٹے کی ناگہانی موت نے کشمکش برپا کردی تھی۔

خان زادہ کی آمد نے فضا میں ازخود ہی سوگواری کی لہریں سرایت کردیں۔ وہ تعظیم کے بعد تیمور کے قدموں میں جا بیٹھی۔

''اے امیروں کے امیر! میں آپ کے فرزند میراں شاہ کے شہر سے آئی ہوں۔''

خان زادہ کی اس بات سے تیمور کی پیشانی ٹھنک گئی۔ اس کا وجدان ایک اور ''شکایت نامہ'' کی گواہی دینے لگا تھا۔

''تمہارا یہ مقام نہیں ہے خان زادہ!'' تیمور نے نرمی سے کہتے ہوئے اسے اٹھنے کا عندیہ دیا۔

خان زادہ کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔ اس نے رندھی ہوئی آواز میں تیمور کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''میں اپنے ملازموں اور دربار سمیت بحیرۂ خزر کے علاقے میں منتقل ہوئی تو ذہنی طور پر بے حد مطمئن تھی کہ اپنے مرحوم شوہر کے چھوٹے بھائی کی زیرِ نگرانی رہوں گی۔ مجھے کیا علم تھا کہ میں ایک رہزن کو اپنا رہبر سمجھ رہی ہوں۔ میراں شاہ نے میرے ساتھ غیر اخلاقی حرکات کا ارتکاب شروع کردیا۔ میں نے اسے اس کی حدود سے آگاہ کیا تو مجھے جبری طور پر اپنے محل میں لے جا کر بے آبرو کردیا۔''

خان زادہ کے اس انکشاف پر تیمور نے کرب سے آنکھیں میچ لیں۔

''امیرِ محترم! مجھے انصاف چاہیے۔ مجھے پناہ چاہیے۔'' وہ بلکنے لگی۔

تیمور کے لیے وہ لمحات سخت کٹھن تھے۔ میراں شاہ نے اسے ایک دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا۔ جہانگیر اور عمر شیخ کی موت کے بعد میراں ہی اس کا قانونی وارث اور جانشین تھا۔ سب سے چھوٹا بیٹا شاہ رخ فطری طور پر ہی بہت نرم دل اور کتب بینی کی طرف مائل ایک علمی و ادبی شخص تھا۔ وہ کسی بھی طور عنانِ حکومت سنبھالنے کے قابل نہیں تھا اس لیے تیمور کی جانشینی میراں شاہ یا خان زادہ کے بیٹوں میں سے ہی

کسی کا مقدر بن سکتی تھی۔

''امیر! آپ کی یہ خاموشی میرا دل دہلا رہی ہے۔ کیا میں انصاف سے محروم رہوں گی؟'' وہ ایک بار پھر بلکی۔

تیمور کا چہرہ طیش سے سرخ ہوگیا۔ اس کیفیت میں خان زادہ کے شکم کا مخصوص ابھار مزید اضافہ کررہا تھا۔ اس نے خان زادہ کے مالی نقصانات کی تلافی کا حکم صادر کرتے ہوئے جہانگیر کی بیوہ کی حیثیت سے چند مناصب بھی عطا کردیے۔ اس کے بعد سفر کی تکان کو بالائے طاق رکھتے ہوئے تازہ دم گھوڑا طلب کیا اور انہی افسران کے ہمراہ سلطانیہ روانہ ہوگیا۔

سلطانیہ پہنچنے کے بعد اس نے فوری طور پر میراں شاہ کی بدنظمیوں کی تحقیق کروائی اور بھی ''جرائم'' ثابت ہونے پر بلاتامل سزائے موت صادر کردی۔ تیمور کے اس فیصلے نے دربار میں موت کا سکوت طاری کردیا۔

''امیر! رحم کیجیے۔ ولی عہد کے لیے ایسی سزا پر نظرثانی کیجیے۔'' اس کے امراء نے پُرخلوص سفارش کی۔

تیمور کا چہرہ پتھریلی سنجیدگی کی آماجگاہ بن گیا۔ اس کے بعد میراں شاہ کی سفارش کے لیے وہ امراء بھی درخواست گزار ہوگئے جو ماضی قریب میں اس کے ہاتھوں زک اٹھا چکے تھے۔ تیمور نے اپنے فیصلے پر نظرثانی کرتے ہوئے میراں شاہ کو اپنے دربار میں طلب کیا۔ اس کے حکم کے موجب میراں شاہ کو گلے میں رسی ڈال کر دربار میں لایا گیا۔ تیمور نے اسے اختیارات و مناصب سے محروم کرکے سلطانیہ کی حکمرانی کسی اور کے سپرد کردی۔ میراں شاہ کو اس صوبے میں بحیثیت ''عوام'' بن کر رہنا تھا۔ اس کے بعد تیمور نے ایران سے آنے والے مصاحبین، درباریوں، گویوں، مسخروں کو قتل کرنے کا حکم صادر کردیا۔

تیمور کے ان اقدامات نے دربار بھر میں سراسیمگی کی ایک نئی لہر پیدا کردی۔

☆☆☆

جنگجوئے صف شکن کی عمر نصف صدی کی مسافت طے کرچکی تھی۔ وہ وسطی ایشیا اور ایران کا بلاشرکت غیرے حکمران تھا۔ اس حکمرانی کے باوجود وہ اپنے لیے شہنشاہ کا لقب مستعمل نہ کرتا۔ وہ ہنوز ''امیر تیمور گورگاں'' ہی کہلاتا تھا۔ بادشاہت تاحال چنگیزی نسل کے ایک ''ترا'' خان کو سونپی گئی تھی۔ وہ بات الگ تھی کہ اس بادشاہ کے اختیارات برائے نام بھی نہ تھے۔ وہ محض فوج کے ایک لشکر کا کماندار اور سمرقند میں کسی معمولی محل کا مالک تھا۔ حکومتی معاملات میں اس کی شرکت صرف اس حد تک تھی کہ وہ چند مخصوص رسومات مثلاً سفید گھوڑے کی قربانی، عہدنامے کی توثیق اور سالانہ معائنے میں دو لاکھ تاتاری فوج کی جانب سے تاتاری علم کو سلامی دینے کی تقریب کا حصہ بن جایا کرتا۔

تیمور اپنی ذات میں ایک مکمل ''قانون'' بن چکا تھا۔ وہ اپنی مملکت کی نئی اقوام اور قبائل کے لیے سبھی احکامات خود نافذ کرتا تھا۔ اس نے کسی بھی امیر کو اپنا ایسا منظورِ نظر نہیں بنایا تھا کہ وہ اس کے فیصلوں اور رائے پر اثرانداز ہوسکے۔ کسی بھی نئے ملک کی تسخیر یا ازخود اطاعت گزار بننے کی صورت میں وہ علاقہ اپنے کسی بیٹے یا امیر کو سونپ دیتا۔ اس طرح وہ ملک ایک صوبے کی حیثیت اختیار کرلیتا تھا۔ اس کا حاکم داروغہ کہلاتا اور اس کے ساتھ ایک قاضی بھی مقرر کیا جاتا تھا۔ یہ داروغہ براہِ راست تیمور کے ماتحت ہوتا تھا۔

وقت کی گردش رواں رہی۔ تیمور کے مزاج میں اضطراب کا عنصر بڑھتا ہی جارہا تھا جس کے باعث وہ ناکامی قبول کرنا تہ ہی نقص برداشت کرسکتا تھا۔

مسافروں کی استراحت کے لیے سڑکوں کے کنارے کشادہ مکانات کی تعمیر کی گئی تھی۔ ان مکانات میں دور دراز سے زمین دوز نالیوں کے ذریعے پانی پہنچایا جاتا۔ ہر سڑک کی سطح بالکل ہموار ہوا کرتی۔ صفائی کا یہ عالم تھا کہ کہیں ایک بھی پتھر دکھائی نہ دیتا۔

شاہراہوں پر ہرکارے خچریں لیے ہوئے مسلسل سفر میں رہتے تاکہ تیمور کو مملکت کے حالات سے باخبر رکھا جاسکے۔ ہر صوبے، شہر اور کارواں سرائے میں خبرنویس خفیہ یادداشتیں تحریر کرکے تیمور تک پہنچایا کرتے۔ کسی بھی خبرنویس کی جانب سے غلطی یا کوتاہی پر اسے فوراً قتل کردیا جاتا تھا۔

جائداد اور زمین کی ملکیت کے بارے میں بھی تیمور کے فیصلے ناطق مگر عادلانہ ہوتے تھے۔ سپاہ کو شاہی خزانے سے تنخواہ موصول ہوتی۔ انہیں رعایا سے کوئی محصول وصول کرنے کی اجازت نہ تھی۔ کوئی بھی سپاہی کسی شہری کے گھر میں بلاوجہ داخل ہونے کا مجاز نہیں تھا۔

ان انتظامی اصلاحات کے علاوہ تیمور نے اپنی مملکت میں گداگری کے سدباب کے لیے سرتوڑ کوششیں جاری رکھیں۔ اس نے گداگری کو ممنوع قرار دے کر ان میں گوشت روٹی بٹوانے کا سلسلہ شروع کیا۔ ان اقدامات کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ گداگر شاہی لنگر سے ملنے والی اس سہولت کو اپنا حق سمجھ کر وصول کرلیتے اور اس کے بعد ایک بار پھر گلی گلی کشکول لیے نکل کھڑے ہوتے۔ ان

کی حرکات اور ڈھٹائی سے زچ ہوکر سپاہی انہیں بے دریغ قتل کرنے لگے۔

گداگری کی نسبت چوروں اور ڈاکوؤں کا قلع قمع کرنے میں نسبتاً کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ شاہراہوں پر محافظ دستوں کے افسران اور شہروں میں قاضی اپنے اپنے علاقے میں چوری کے ذمے دار قرار پاتے تھے۔

ان حتی الامکان بہترین اصلاحات کے باوجود کہیں نہ کہیں بغاوت کے شعلے بھڑک اٹھتے۔ تیمور اس بدامنی کے فرو کے لیے جارحانہ پیش قدمی میں بالکل متامل نہ ہوتا۔ اس کی فوج ایک منضبط مشین بن چکی تھی۔ فتوحات کا حصول فطرتِ ثانیہ بننے لگا تھا۔ اپنی فوج کی اسی اعلیٰ کارکردگی کے نتیجے میں تیمور نے ایشیا بھر کو اپنے زیر تسلط لانے کا فیصلہ کرلیا۔

☆☆☆

مملکت وسیع تر ہونے کے بعد تیمور سمرقند میں کم ہی مقیم رہتا تھا۔ پہاڑوں میں شکار کھیلنے کے مواقع بھی کم ہونے لگے تھے۔ سمرقند میں ملکہ سرائے خانم بھرپور حکمنت سے رہائش پذیر تھی۔ جشنیں اس کی قبا کے دامن اٹھائے چلتیں تو حسن و جمال کی مرقع کنیزیں اس کی کلاہ کے مرصع پر سنبھالا کرتیں۔

سمرقند میں ایرانی ماہرین تعمیرات کے بنائے گئے نقشوں کے مطابق مختلف عمارات زیر تعمیر تھیں۔ تیمور اپنے مختصر قیام کے دوران معماروں اور ماہر تعمیرات کی کارکردگی کا جائزہ لیتا۔ چین، ہند اور بغداد سے آئے سفیروں سے ملاقات کرتا اور اپنے پوتوں کے ساتھ وقت گزاری کے بعد چند ایک ضیافتوں کا اہتمام کرتے دوبارہ سفر کا آغاز کردیتا۔ ان دنوں طراغائی سے سنی جانے والی ایک کہاوت اکثر تیمور کے ذہن کے دریچوں پر دستک دیا کرتی۔

''جو کوئی رکاب میں پاؤں رکھتا ہے، اسے گھوڑے کی سواری بھی کرنا پڑتی ہے۔''

تیمور بھی اسی کہاوت کی طرح زیادہ تر حالتِ سفر میں ہی رہتا تھا۔ وہ دورانِ سفر خیموں کا دہرا سامان اپنے ہمراہ رکھتا۔ کسی بھی جگہ خیمے میں آرام کرنے کی صورت میں دوسرے خیمے کا سامان اگلی منزل کی جانب روانہ کردیا جاتا تاکہ وہاں پہنچنے سے قبل ہی خیمہ گاہ کی تنصیب مکمل ہو۔

انتظامی و عسکری اصلاحات کا بہترین نفاذ کرتے ہوئے تیمور اپنی سپاہ کی بنیادی ضروریات سے بھی غافل نہیں تھا۔ وہ اپنے وفادار سپاہیوں کو انعام و اکرام سے خوب نوازتا۔ دربار میں اکثر ایک ہی بات دہرایا کرتا۔

''پرانے سپاہیوں کی خدمات فراموش کرنا بدترین اخلاقی قباحت ہے۔ یہ سپاہی حقیقی معنوں میں عزت و دولت کے حقدار ہوتے ہیں۔ اپنا آرام و آسائش ترک کیے جان قربان کردینے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ ایسے افراد کی تکریم میں کمی یا ان کی بنیادی ضروریات پس پشت ڈالنا احسان فراموشی ہے۔''

تیمور کی احسان شناسی کا ہی نتیجہ تھا کہ اس کی سپاہ بھی دل و جان سے اس کی خدمت و اطاعت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتی۔ یہ وہ وقت تھا جب ایران میں آلِ مظفر کے چند شہزادے ایک بار پھر بغاوت پر آمادہ دکھائی دینے لگے تھے۔ تیمور نے اسی سپاہ کی بہادری اور بے جگری کے نتیجے میں آلِ مظفر کو اس طرح بدترین شکست دی کہ ایران کی مدافعت ختم ہوگئی اور آلِ مظفر کی تباہی پر بھی دائمی مہر ثبت ہوگئی۔

تیمور کے حکم پر اس خاندان کے تمام تر مردوں کو پابند سلاسل کرکے تہ تیغ کردیا گیا۔ اس خاندان میں صرف زین العابدین اور شبلی کو اس قتل عام سے نجات ملی تھی۔ اس ''شفقت'' کی وجہ بہرحال یہ تھی کہ ان دونوں افراد کو آلِ مظفر نے باقاعدہ سازش کے تحت بینائی سے محروم کردیا تھا۔

اہلِ ایران کے لیے جنگجوئے صف شکن کے مزاج کے یہ رنگ بہت حیران کن تھے۔ وہ ایک جانب سفاکی و بربریت میں ہر بار نئی نظیر قائم کرتا تو دوسری سمت ایسا شفیق برتاؤ اور مراعات کی عنایت پہلے روپ کا عکس باطل کردیتی۔ حقیقت تو یہ تھی کہ تیمور کی شخصیت ان دونوں رنگوں کے ہی زیر اثر تھی اور جانے کب تک رہنی تھی۔

☆☆☆

امیر تیمور گورگاں کی ان پے در پے فتوحات نے مغربی سلطنتوں کے بادشاہوں کو سخت تشویش میں مبتلا کر رکھا تھا۔ تیمور ہر بار مشرقی صحرا سے نکل کر کسی زہریلی آندھی کی طرح نمودار ہوتا اور تباہی و بربادی کی نئی داستان رقم کردیتا تھا۔

اس نامہ بری کے نتیجے میں حقائق کا منظر نامہ واضح ہونے لگا۔ شہنشاہ ترکی ان دنوں یورپی مہمات میں الجھا تھا۔ اسے تیمور کے معاملات میں الجھنے کی بالکل فرصت نہیں تھی۔ سلطانِ مصر اس مہم کے لیے خاصا پُرجوش اور فعال دکھائی دیتا تھا۔ دمشق اور بیت المقدس کے علاقوں کا بلاشرکت غیرے مالک ہونے کے باعث اس کی عسکری قوت بھی بھرپور تھی۔ ابتدائی طور پر سلطان بغداد سے اس کا معاہدہ طے پاگیا جس کے تحت ان دونوں کو باہمی طور پر

تیمور سے نبرد آزما ہونا تھا۔

تیمور نے اپنی اس نئی مہم کی جانب پیش قدمی کی تو سب سے پہلے بغداد میں پڑاؤ ڈالا۔ یہ شہر ماضی قریب میں اسلامی دنیا کا مرکز رہ چکا تھا۔ زائرین اور تاجروں کے ہجوم کے باوجود فی الوقت حقیقت یہ تھی کہ بغداد شہر دجلہ کے کناروں پر ایک اکڑی ہوئی لاش کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ گو بغداد کا حکمران سلطان احمد جلایر تاحال امیر المومنین کہلاتا تھا تاہم بغداد کا اصل محافظ مصر کا مملوک سلطان تھا۔ سلطان احمد فطری طور پر ایک شکی اور سفاک انسان تھا۔ اسے ہمہ وقت اپنی شاہی دولت کے چوری ہوجانے کا خدشہ لاحق رہا کرتا تھا۔

تیمور کی بغداد کی جانب پیش قدمی نے اس کے حواس مختل کر دیے تھے۔ اس نے فوری طور پر اپنا خزانہ سمیٹا اور دجلہ کے پار جاتے ہوئے کشتیوں کا پل توڑ دیا۔ تیمور نے اپنی سپاہ سمیت اس لشکر کا تعاقب جاری رکھا۔ سلطان احمد خود تو بحفاظت دمشق پہنچنے میں کامیاب ہوگیا تاہم اس کے اہل وعیال کو تاتاری امراء گرفتار کر کے تیمور کے پاس لے آئے۔ سلطان کی غیر موجودگی میں بغداد نے تیمور کو حکمران تسلیم کر کے خراج کی ادائیگی قبول کر لی۔

تیمور کی واپسی کے بعد سلطان احمد اپنی دولت وحشمت سے محروم ہوگیا تھا۔ وہ اپنی جان بچا کر چھپتا چھپاتا مصر پہنچ گیا۔ سلطان مصر نے اسے پناہ دیتے ہوئے کنیزیں اور غلام بھی مہیا کر دیے۔ کچھ ہی عرصہ گزرا تھا کہ ایک تاتاری سفیر مصر آپہنچا۔ اس نے سلطان مصر کو امیر تیمور کا سلام دیتے ہوئے کہا۔

''چنگیز خان کے دورِ حکومت میں آپ کے آباؤ اجداد اور ہمارے بزرگ جنگ آزمارہ چکے ہیں۔ اس جنگ کے بعد دونوں فریقین میں صلح کا معاہدہ بھی طے پایا۔ اب حالیہ طور پر ایران کے خانہ جنگی کا شکار ہونے کے بعد ہمارے امیر نے امن بحال کر دیا ہے۔ ایران اور مصر کی سرحدیں باہمی متصل ہیں اس لیے ہمارے امیر کی خواہش ہے کہ تاجروں کی آمد ورفت کا سلسلہ بلا نزاع شروع کر دیا جائے۔ والسلام والحمدللہ رب العالمین۔''

''ایک لنگڑے حکمران کی اتنی جرأت ہوگئی ہے کہ وہ بغداد جیسے عالیشان شہر کو میلی آنکھ سے دیکھے۔'' سلطانِ مصر نے کروفر سے کہا۔ ''اس کی آنکھوں میں مغربی سلطنتیں فتح کرنے کے خواب نوچنے کا وقت آگیا ہے۔''

تاتاری سفیر اس اندازِ گفتگو پر جز بز ہو کر رہ گیا تاہم معاملات اس کے تصور وگمان سے زیادہ منتشر ہو چکے تھے۔ فی الوقت اسے علم نہیں تھا کہ مملوکوں کو غیر متوقع طور پر سلطان ترکی بایزید کی حمایت میسر آچکی ہے۔ مصر کے حکمران نے تاتاری سفیر کو قتل کرنے کا حکم صادر کیا اور اپنے حلیفوں کے ساتھ مستقبل کی منصوبہ بندی کے بعد مشرقی علاقوں میں پیش قدمی کا آغاز کر دیا۔

مصری فوج کے لشکر دجلہ کے راستے بغداد پہنچے۔ سلطان احمد ان کے ہمراہ ہی تھا۔ اسے بغداد میں دوبارہ تخت نشین کیا گیا۔ اس بار اس کی حیثیت مصر کے مملوکوں کے صوبیدار کی سی تھی۔ اس تخت نشینی کے بعد سلطان احمد کچھ عرصہ تو مملوکوں کے احکامات کی پیروی کرتا رہا۔ اس کے بعد ایک بار پھر اپنی فطرت کے اصل رنگ اوڑھ لیے۔ اس نے تیمور کے موجودہ حالات معلوم کرنے کے لیے اپنے جاسوس سمرقند روانہ کر دیے۔ کچھ عرصے بعد ایک جاسوس بغداد لوٹا تو اس کے بشرے سے مرعوبیت نمایاں تھی۔

''سمرقند کے کیا حالات ہیں؟'' سلطان نے بے تابی سے دریافت کیا۔ ''مجھے مکمل تفصیل سننی ہے۔''

''یہ سمرقند وہ شہر ہی نہیں جس سے میں کبھی آشنا تھا۔'' جاسوس نے گہری سانس بھرتے ہوئے بتایا۔

سلطان احمد کا تجسس مہمیز ہوگیا۔ وہ مزید ہمہ تن گوش دکھائی دینے لگا تھا۔ جاسوس نے اپنے سلسلۂ کلام کا دوبارہ آغاز کرتے ہوئے بتایا۔

''جس سمرقند سے میں واقف ہوں اس وقت یہ کچی چنائی اور لکڑی کے مکانات پر مشتمل ایک معمولی شہر تھا جہاں جابجا اونٹ بندھے دکھائی دیتے تھے۔ اس وقت تو سمرقند کی شان ہی نرالی ہے۔ ہر جگہ نیلے گنبد اور سنگ مرمر کے صحن دکھائی دیتے ہیں۔ ہم نے اپنی آنکھوں سے وہاں تیمور کو ایک محل کی تعمیر کا معائنہ کرتے دیکھا۔ اسے معماروں کا کام پسند نہ آیا تو اس نے فوری طور پر حکم دے کر پوری عمارت ہی منہدم کروادی۔ اس کے بعد بیس دن تک روزانہ گھوڑے پر سوار ہوکر وہاں پہنچتا اور اپنی ذاتی نگرانی میں محل دوبارہ تعمیر کروالیا۔ پیش طاق اور گنبد بھی ازسرِنو تعمیر ہوئے۔ موجودہ پیش طاق کی اونچائی چوبیس نیزوں پر محیط ہے اور چوڑائی اتنی کہ پچاس آدمی بہ آسانی کھڑے ہوسکتے ہیں۔''

سلطان احمد حیرت سے اپنے ہرکار کے انکشافات سنتا رہا۔

''ہمیں مقامی لوگوں سے بات چیت کے دوران اس بات کا علم ہوا ہے کہ تیمور کو دوسرے ممالک میں جو کچھ پسند

آیا وہ اسے سمرقند کی زینت، بڑھانے کے لیے اٹھا لایا۔ ہر فتح کی یادگار کے طور پر ایک نئی اور عالیشان عمارت تعمیر کروائی۔ جنگ کے لاکھوں قیدیوں، مہندسوں، سائنس دانوں، منجموں، شاعروں اور صوفیوں کو سمرقند میں رہائش فراہم کی، ارباب علم کے لیے اکادمیاں اور کتب خانے قائم کروائے، اہل حرفت کے لیے تجارتی مراکز میں منظم ادارے اور جماعتیں بنوائیں۔''

''اور..... اس کے علاوہ کیا دیکھا ہے؟'' سلطان احمد نے بے تابی سے قطع کلامی کرتے ہوئے دریافت کیا۔

''تیمور سنی اور شیعہ علماء کی مجلس میں بیٹھ کر مسائل زیر بحث لاتا ہے اور ان سے کہتا ہے کہ.....''

''مجھے اس کے مسائل اور نتائج کی داستانیں مت سناؤ۔'' سلطان احمد نے چڑچڑے پن کا مظاہرہ کیا۔ ''مجھے صرف اتنا بتاؤ کہ ان دنوں اس کی کیا مصروفیات ہیں؟''

''تیمور کے متعلق تازہ ترین اطلاع یہ ہے کہ وہ ہندوستان روانہ ہو چکا ہے سلطان معظم!''

جاسوس کی اس اطلاع پر سلطان احمد کو اپنے اعصاب قدرے پُرسکون ہوتے محسوس ہوئے تاہم چٹیل صحرا میں فرار اور تاتاریوں کا تعاقب اسے کسی نہ کسی طور مضطرب ہی رکھتا تھا۔ تیمور سے ایک ہزار میل کی دوری کے باوجود ذہنی انتشار کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنے وزراء کے متعلق ہمہ وقت مشکوک رہنے لگا۔ چند ایک کو تو اس نے اپنے ہاتھ سے ہی قتل کر دیا۔ اپنی حفاظت جان کے خیال سے ایک ویران حرم سرا کے کونے میں رہائش اختیار کر لی۔ اس سے بھی تسلی واطمینان نہ ہوا تو سرکیشیائی غلام اور حبشی غلام بردار اپنی حفاظت پر مقرر کر دیے۔

کچھ وقت مزید گزرا تو اس کی سرگرمیوں میں وحشت نمایاں تر ہونے لگی۔ وہ اکثر محل کے اس بالا خانے میں چلا جاتا جہاں اس کی بیویاں رہائش پذیر تھیں۔ وہ کتنی ہی دیر بالا خانے کے جھروکوں میں کھڑے ہو کر بغداد کے ہجوم کو کشتیوں کے پل سے گزرتے دیکھا کرتا۔

ان خدشات کے زیر اثر اس نے اپنے چند ایک قابل اعتماد سپاہیوں کی نگرانی میں آٹھ گھوڑے بھی دجلہ کے پرلے کنارے پر ایک اصطبل میں بندھوا دیے تاکہ تاتاریوں کی کسی بھی غیر متوقع یلغار کی صورت میں اپنے اہل وعیال اور سامان سمیت فرار ہو سکے۔

ان انتظامات سے کچھ عرصہ پُرسکون انداز میں بیت گیا۔ اس کے بعد سلطان احمد کی ذہنی رو ایک بار پھر انتشار میں مبتلا ہو گئی۔ اس نے اپنے غلاموں کو کمرے میں رسائی سے منع کر دیا۔ وہ ہمہ وقت مختلف جھروکوں سے جھانکتا پایا جاتا۔ وحشت زدہ آنکھوں میں یہی خوف ثبت ہوتا تھا کہ کہیں سے تیمور کی آمد نہ ہو جائے۔ یہ خوف اس قدر بڑھ گیا کہ اس نے اپنا کھانا خوان میں رکھ کر کمرے کے باہر ہی چھوڑ جانے کا حکم صادر کر دیا۔

اشیائے خورونوش کے استعمال میں احتیاط اور ذاتی محافظوں سے دوری اختیار کرنے کے بعد سلطان احمد نے نئی مصروفیات اختیار کر لیں۔ وہ راتوں میں فرار ہونے کی مشق کرنے لگا۔ بھیس بدل کر اس پل سے گزرتا جہاں گھوڑے بندھوائے گئے تھے۔ سلطان احمد کی یہ سرگرمیاں اور ذہنی کیفیت اہل بغداد سے پوشیدہ نہیں رہی تھیں۔ اپنے سلطان کا یہ خوف ان کی ذہنی حالت پر بھی براہ راست اثر انداز ہونے لگا تھا۔ ان کشمکش اور تناؤ زدہ حالات میں چند افراد البتہ ایسے بھی تھے جو کسی نہ کسی طور سلطان کی ہمت بندھائے رکھتے تھے۔ ان افراد میں مشہور شاعر حافظ بھی شامل تھا جسے سلطان احمد نے ہی کچھ عرصہ پہلے بغداد بلایا تھا۔ حافظ نے دلکش فارسی میں ایک قصیدہ لکھ کر سلطان کو ارسال کیا۔

''احمد سلطان اویس کے فرزند
شاہ اور فرزند شاہ
بادہ خواری کا شیدائی
قسمت تیرے در پر لائے
خسرو کا تخت اور چنگیز خان کی شان۔''

اس وحشت واضطراب میں ایک سال کا عرصہ بیت گیا۔ تاتاری آندھی تا حال بغداد کے افق سے دور ہی تھی۔ سلطان احمد کے مضطرب دل کو کہیں نہ کہیں قرار آنے لگا تھا کہ اب تاتاری اس جانب رخ نہیں کریں گے۔ تقدیر اس اطمینان پر خندہ زن تھی کیونکہ تاتاری سیلاب سب کچھ خس وخاشاک کی طرح اپنے ساتھ بہالے جانے والا تھا۔

☆☆☆

تیمور کی ہندوستانی مہم نہایت کامیاب رہی تھی۔ سلطان دہلی کے ساتھ جنگ سے پہلے تاتاریوں نے تقریباً ایک لاکھ قیدیوں کو موت کے گھاٹ اتارا۔ ہندوستانی فوج سے لڑائی اور دہلی کی تسخیر کے لیے ''نارروی'' کا استعمال کرتے ہوئے ہاتھیوں کو منتشر کیا گیا تھا۔ یہ مخصوص آتش گیر ہتھیار درحقیقت بارنطینی ایجاد تھا جس کی خاصیت یہ تھی کہ اس کی برپا شدہ آگ پانی ڈالنے سے بھی نہیں بجھتی تھی۔

تیموری لشکر کے وطن لوٹنے سے قبل ہی شاہی پیغام رساں یہ خبر سمرقند پہنچا چکے تھے۔ اس خوشخبری نے سمرقند بھر میں جشن کا سا سماں پیدا کر دیا۔ عوام کو تیمور کے زورِ بازو پر بھی بھرپور اعتماد تھا۔ اس کی حکمتِ عملیاں امن وخوشحالی کے در وا کر دیتیں جس سے علماء کے اثر ورسوخ میں اضافہ ہونا بھی یقینی تھا۔ تیموری لشکر کی واپسی اگلے موسم بہار میں تخت قراچہ کے راستے ہوئی تھی۔ لشکر کا استقبال شاندار انداز میں کیا گیا۔

مقامی امراء، رؤسا، باہر سے آئے امراء، شہزادوں اور سرائے خانم نے اپنے خدام کے ساتھ شہر سے باہر نکل کر اپنے امیر کا استقبال کیا۔ سرائے خانم کی بے تاب نگاہیں شوہر سے زیادہ اپنے بیٹے شاہ رخ کی دید کی منتظر تھیں۔ خان زادہ بھی زرہ پوش سواروں میں اپنے دونوں بیٹوں شہزادہ محمد سلطان اور شہزادہ پیر محمد کی متلاشی تھی۔ ان دونوں شہزادوں کے قریب سے گزرتے ہی غلاموں نے ان پر سونے کا بورا اور موتی نچھاور کیے۔ تیمور کا گھوڑا قریب آتے ہی اس کے قدموں میں بھی زر وجواہر کا ڈھیر لگا دیا گیا۔

تیمور کا استقبال کرتے عوام وخواص کے لیے اس سے اگلا منظر نہایت حیران کن تھا۔ متفرق رنگوں سے رنگے، اپنی مستی میں جھومتے، گرد کا طوفان اڑاتے عظیم الجثہ ہاتھیوں کی دید نے انہیں ساکت کر دیا تھا۔ ہاتھیوں کے مجموعی طور پر ستانوے غول اپنے سابق مالکان کے خزانوں سے لدے ہوئے تھے۔ اس روز تیمور آٹھویں بار بحیثیت فاتح سمرقند میں داخل ہوا تھا اور ایک مسجد دہلی کی جامع مسجد کی طرز پر تعمیر کرنے والا تھا۔

☆☆☆

تیمور نے اپنی واپسی کے بعد آٹھویں روز مسجد کی بنیاد رکھ دی۔ اس مسجد کا طول وعرض عیدگاہ کے مساوی رکھا گیا تھا تاکہ نماز کے اوقات میں تمام تر اہلِ دربار سما سکیں۔ اس کے بعد پانچ سو سنگ تراشوں نے کدالوں سے سلیں کاٹنے کا آغاز کرنا تھا۔ یہ سلیں بھاری بھرکم پہیوں پر مشتمل ان گاڑیوں پر سمرقند لائی جانی تھیں جن کی نقل وحمل ہاتھیوں نے کرنی تھی۔

ہاتھیوں کی قوت سے بار برداری میں آسانی وسہولت دیکھ کر تیمور کے ذہن میں ایک اور خیال پنپنے لگا۔ اس نے ہندسوں کے سامنے اپنا خیال پیش کر کے ایسی چرخیاں اور جرثقیل تیار کروائے جو ہاتھیوں کے ذریعے چلائے جاتے اور ان کی مدد سے وزنی پتھر بہ آسانی بلندی پر پہنچ سکتے تھے۔

اس کے ہمراہ میدانِ جنگ میں بہادری کے جوہر دکھانے والے سپاہ سالار بھی مسجد کے میناروں، ستونوں اور گنبدوں کی نگرانی میں مصروف تھے۔

اگلے تین ماہ میں یہ مسجد اس حد تک تیار کر لی گئی کہ مؤذن نے اس کے میناروں سے اذان دینے کا آغاز کر دیا۔ منبر سے امیر تیمور کے نام کا خطبہ پڑھا جانے لگا۔ تیمور نے تاحال اپنے لیے شہنشاہ کا لقب اختیار نہیں کیا تھا۔ وہ ہنوز ''امیر تیمور گورگان'' ہی کہلاتا تھا۔ اس نے کبھی چنگیز کی حکمران نسل کے فرد ''ترا'' ہونے کا دعویٰ بھی نہیں کیا تھا۔ اس کی دستاویزات کا آغاز بھی غیر معمولی تھا۔ یہ دستاویزات اکثر ایسے فقرات پر مشتمل ہوتیں۔

''امیر تیمور نے یہ حکم دیا ہے۔''

''میں خدا کا ایک بندہ امیر تیمور یہ کہتا ہوں۔''

تیمور کی اس حکمتِ عملی کے برعکس اس کے پوتے اپنے لیے ''مرزا'' اور ''سلطان'' کے خطابات استعمال کرنے لگے تھے۔ تیمور نے انہیں جاگیر میں کئی سلطنتیں عطا کر رکھی تھیں۔ محمد سلطان جت مقبوضات، پیر محمد کو ہندوستان اور شاہ رخ کو خراسان کی باگ ڈور سونپی گئی تھی۔ معزول میراں شاہ کے لڑکے البتہ مغربی سلطنتوں کی مسندِ اقتدار سنبھالے ہوئے تھے اور فی الوقت یہی مغربی علاقے بدامنی کی زد میں تھے۔

فتوحات، اصلاحات اور تعمیراتی دلچسپیوں میں منہمک تیمور نے تاحال اپنے جانشین کا اعلان نہیں کیا تھا۔ تیمور کی اس بے نیازی نے شاہی مستورات میں بے چینی اور اضطراب پیدا کر رکھا تھا۔ بڑھاپے کی طرف مائل ملکہ سرائے خانم حالات ناموافق ہونے کے باوجود پُرامید تھی کہ تخت وتاج شاہ رخ کا مقدر بنیں گے۔ دوسری جانب خان زادہ بھی اپنے چھوٹے بیٹے خلیل کو مسندِ اقتدار پر براجمان دیکھنا چاہتی تھی۔ اس مقصد کے لیے خان زادہ نے سازشوں اور خوشامد کا سہارا لینے سے بھی گریز نہیں کیا تھا۔ دونوں خواتین کی ان سرتوڑ کوششوں کے باوجود حیران کن بات یہ تھی کہ وہ اس معاملے میں تیمور کے سامنے زبان کھولنے یا کسی قسم کا مطالبہ پیش کرنے کی ہمت نہیں کر پائی تھیں۔ تیمور کے اس کٹر غیر جذباتی رویے نے پوتوں کو بھی کبھی اپنی ''حدود'' سے متجاوز نہیں ہونے دیا تھا۔

جانشین کے معاملے میں مستورات کی ان

خواہشات اور درونِ پردہ کی جانے والی سازشوں سے بے نیاز تیمور کا ایک ہی معمول تھا۔ وہ گھوڑے پر سوار ہوکر تعمیراتی کاموں کی رفتار اور ہاتھیوں سے لیے جانے والے کام کا جائزہ لیا کرتا۔ اس جائزے کے دوران ایک روز اس کے ذہن میں نیا خیال در آیا۔ تیمور نے فوری طور پر اپنے دو امیروں کو طلب کیا اور خیال آرائی کرتے ہوئے کہنے لگا۔

''شہر کا بازار آمد و رفت کے لیے بہت تنگ ہے۔ سمرقند کو اس وقت ایک نئے بازار کی اشد ضرورت ہے۔''

''آپ کی بات بجا امیر! لیکن نیا بازار کہاں تعمیر کیا جائے گا؟'' ایک امیر نے دریافت کیا۔

''ریگستان اور دریا کے درمیانی علاقے میں۔''

تیمور کی اس بات پر دونوں امراء حیرانی سے ایک دوسرے کی جانب دیکھ کر رہ گئے۔

''ریگستان اور دریا کا درمیانی علاقہ کشادہ بازار کے لیے بہترین مقام ہے۔ یہاں دونوں اطراف میں دکانیں تعمیر کی جاسکتی ہیں۔'' تیمور ان کی حیرانی نظر انداز کیے بے نیازی سے کہنے لگا۔

''لیکن امیر! اس علاقے میں واقع مکانات کا کیا کیا جائے گا؟'' ایک امیر جز بز ہوا۔

''مکانات مسمار کروا دینا۔'' اس نے مزید بے نیازی سے جواب دیا۔ ''بازار کی تعمیر کا کام بیس روز میں مکمل ہوجانا چاہیے بصورتِ دیگر تم دونوں کے سر قلم کردیے جائیں گے۔''

تیمور کی اس تنبیہ نے دونوں امراء کو سراسیمہ کردیا۔ انہیں بخوبی علم تھا کہ تیمور اپنی دھمکی پر بہرصورت عمل درآمد کرے گا۔ اسی خوف و اضطراب میں امراء تندہی سے کام میں مشغول ہوگئے۔ مزدوروں کی ایک فوج مکانات مسمار کرنے پر تعینات کردی گئی۔ مالکان سراپا احتجاج بنے چار و ناچار اپنا سامان اٹھائے وہاں سے چلے گئے۔ اس کے بعد ملبا اٹھانے کے بعد زمین ہموار کی گئی، فرش کو سنگی روپ دیتے ہوئے نالیاں نکالی گئیں۔ کام کی جلد از جلد تکمیل کے لیے مزدوروں کی ''باریاں'' مقرر کردی گئی تھیں۔ ایک گروہ دن کے وقت اور دوسرا رات کو مشعلوں کی روشنی میں کام کیا کرتا۔

تیمور کے حکم کے موجب نیا اور کشادہ بازار بیس روز سے قبل ہی تیار کرلیا گیا۔ چھت محراب دار ستونوں پر کھڑی کرنے کے بعد دکانیں بنائی گئی تھیں۔ ہوا اور روشنی کے لیے اس گنبدی چھت میں کھڑکیاں رکھی گئی تھیں۔ تاجروں کو حکم دیا گیا کہ جلد از جلد اپنا مال دکانوں میں سجالیں۔ بازار میں چہل پہل شروع ہوتے ہی تیمور باقاعدگی سے گھوڑے پر سوار ہوکر ہر ایک کارگزاری کا ذاتی طور پر جائزہ لیا کرتا تھا۔

ان سرگرمیوں میں الجھے تیمور نے شہر کے چند قاضیوں کی درخواست پر اپنے مکانات سے محروم شدہ افراد کو معقول معاوضہ ادا کردیا۔ تیمور کی مصروفیات اور رجحانات دیکھتے ہوئے اہلِ سمرقند کے ذہن میں یہی سوچ پنپنے لگی تھی کہ اب وہ کسی نئی جنگ میں ملوث نہیں ہوگا لیکن معاملہ ان سب کی ہر سوچ و خیال کے برعکس تھا۔ حقیقت بہرحال یہ تھی کہ چونسٹھ سالہ تیمور دجلہ کے مغربی علاقے پر دوبارہ قابض ہونے کے لیے بے تاب تھا۔ اس کے ذہن میں برسوں پرانی کہاوت گونجنے لگی تھی۔

''مرد کے سامنے ایک ہی راستہ ہوا کرتا ہے۔''

اس کہاوت پر عمل درآمد کی خواہش کہیں نہ کہیں کچھ زمینی حقائق سے متصادم ہوجاتی تھی۔ حقیقت بہرحال یہ تھی کہ مغرب کے حکمران (قاہرہ کا خلیفہ اسلام، سلطان بغداد اور شہنشاہ ترکی) اسلام کے ستون تسلیم کیے جاتے تھے۔ ان سب میں مشترک پہلو یہ تھا کہ وہ تاتاری فاتح تیمور کو وحشی اور ملحد تصور کرتے تھے۔

ان حالات میں تیمور کا مغربی علاقوں پر لشکر کشی کرنا اسلامی دنیا میں تفرقہ ڈالنے اور کم از کم دس لاکھ مسلمانوں کو آتشِ جنگ میں دھکیلنے کے مترادف تھا۔ اسے یہ بھی علم تھا کہ علماء بہرصورت امن برقرار رکھنے کے لیے کوشاں ہیں۔ وہ تیمور کو غازی کے لقب سے پکارتے اور ہر مسجد میں اس کی فتح و کامرانی کے لیے دعا گو رہتے کیونکہ اس نے اسلام کی سربلندی کے لیے تلوار اٹھائی تھی۔ ان سبھی حقائق کی نزاکت تسلیم کرنے کے باوجود تیمور اس خلش سے نجات حاصل نہیں کرپا رہا تھا کہ اس کے بیٹے کی مملکت پر حملہ کرنے کے علاوہ بغداد سے اس کا مامور کردہ حاکم بے دخل کردیا گیا ہے۔ اس خلش اور احساسِ اہانت نے اسے اس قدر مضطرب کیا کہ وہ سمرقند واپسی کے محض تین ماہ بعد ستمبر 1399ء میں ایک بار پھر اپنے حریفوں پر فوج کشی کے لیے تیار ہوگیا۔

(جاری ہے)

ماخذات: امیر تیمور، از ہیرلڈلیم

اپنے گیلے بالوں کو ایک ہاتھ سے تولیے سے رگڑتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے لوسیا نے کھڑکی کو کھولا اور بڑے اشتیاق سے باہر جھانکا۔ چند سیکنڈ دیکھنے کے بعد اس نے تولیے کو اس کی مخصوص جگہ پر لٹکایا اور پھر سے کھڑکی کے پاس آ گئی۔ یہاں پر کرسی پڑی تھی۔ لوسیا اس پر بیٹھی اور بڑے اطمینان سے باہر جھانکنے لگی۔ اپنے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے وہ اپنے پسندیدہ مشغلے میں مصروف ہوگئی۔ لوسیا کا پسندیدہ مشغلہ تھا کھڑکی کے پاس بیٹھ کر آتے جاتے لوگوں، شاپنگ کرتے گاہکوں، دکانوں کو دیکھنا۔ یہ سب چیزیں اس کے لیے ٹی وی کے مختلف چینلز کی طرح تھیں اور وہ مختلف چینلز بڑے شوق سے دیکھا کرتی تھی۔

لوسیا پیٹر کو اس فلیٹ میں منتقل ہوئے سال سے اوپر ہو چکا تھا۔ اس سے پہلے وہ اسی شہر سے ملحقہ قصبے میں رہتی تھی۔ شوہر سے طلاق کے بعد اکلوتے بیٹے کے ساتھ اس نے زندگی کے کئی برس گزارے پھر جب بیٹا کسی اور شہر جا کر بس گیا تو لوسیا پیٹر نے بھی اپنی رہائش بدل لی اور شہر آ گئی۔ یہاں آ کر اس نے جاب کرنا شروع کر دی۔ یہ جاب اس نے محض وقت گزاری کے لیے کی تھی ورنہ باپ

اپنی کھڑکی سے مناظر دیکھنے والی حسینہ کی دلچسپ کارروائیوں کا ماجرا

یہ دنیا اتفاقات کا مجموعہ ہے... کبھی کبھی خیر سے شر اور شر سے خیر جنم لیتا ہے مگر انسان قدرت کی اس کاوش پر ذرا مشکل سے ہی یقین کر پاتا ہے... بالکل ایسا ہی ان دو مخالفین کے درمیان بھی ہوا... اور پھر ایک دن وہ کچھ ہو گیا جس نے ان کی نگاہوں کا زاویہ بدل ڈالا اور دشمنی کی جگہ دوستی نے لے لی کیونکہ... وہ بات ہی کچھ ایسی تھی کہ انقلاب تو آنا ہی تھا۔

کھڑکی

عتیق بخاری

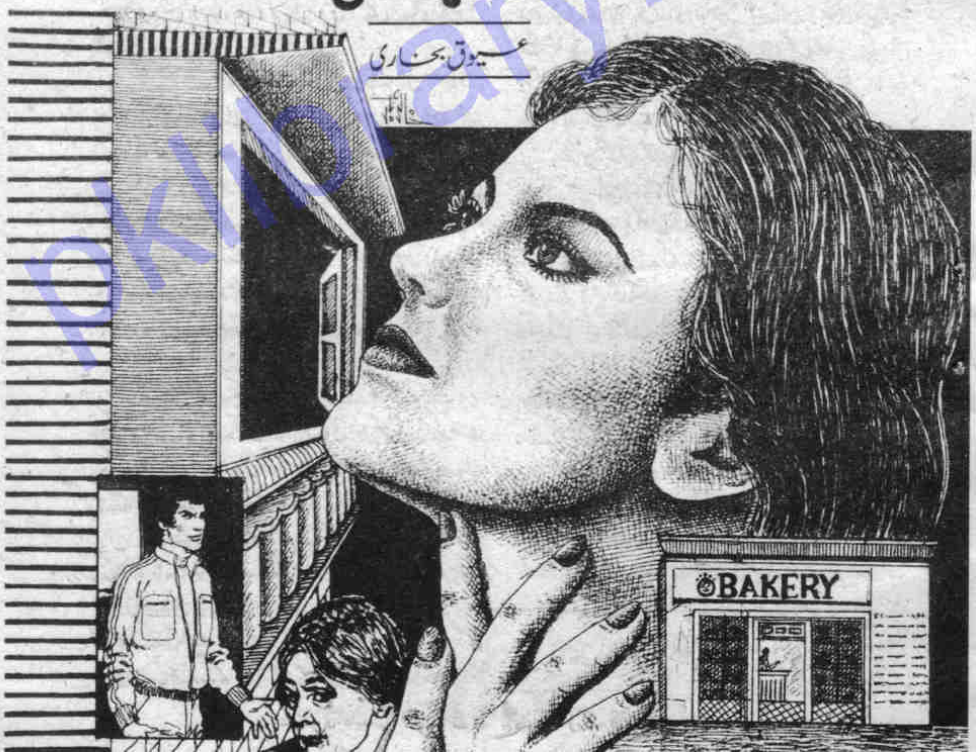

pklibrary.com

سے ملنے والی موروثی جائداد اور طلاق کے بعد شوہر سے ملنے والا حصہ اس کی کئی سالوں کی ضرورتوں۔ سے کئی گنا زیادہ تھا۔ بیٹے کے اپنی دنیا میں مگن ہوجانے کے بعد لوسیا کافی اداس اور تنہا ہوگئی تھی۔ شہر میں آکر فلیٹ خریدا تو اس کے ذہن میں بس اتنا ہی تھا کہ یہاں آکر ماحول کچھ بدل جائے گا۔ کچھ نئے لوگوں سے تعلق بنے گا تو اداسی کم ہوجائے گی لیکن فلیٹ میں منتقل ہونے کے بعد اتنا ہی نہ رہا۔ لوسیا کا صرف ماحول ہی نہیں بلکہ بہت کچھ بدل گیا۔ جاب پر آتے جاتے کئی لوگوں سے ملاقات ہونے لگی۔ آفس میں بھی دوست بن گئے اور سب سے بڑھ کر لوسیا پیٹر کو وہ مشغلہ ملا جو اس کے لیے سب سے دلچسپ تھا۔

اسے فلیٹ میں منتقل ہوئے ابھی پہلی صبح تھی۔ ابھی اس نے جاب پر جانا شروع نہیں کیا تھا۔ ناشتا کرنے سے پہلے اس نے اپنے بیڈروم کی کھڑکی کھولی تو اس کے سامنے بہت خوبصورت و پُررونق منظر تھا۔ مختلف شاپس، بہت سے آتے جاتے لوگ، اسکول جاتے ہوئے اٹکھیلیاں کرتے بچے، مختلف فیشن والی عورتیں، آتی جاتی گاڑیاں..... یہ سب قصبے سے بہت مختلف اور پُررونق تھا۔ لوسیا کافی دیر اس منظر کو دیکھتی رہی اور پھر خود کو گویا زبردستی دھکیل کر کچن میں گئی تاکہ ناشتا کرسکے۔

ناشتے کے بعد وہ نئے گھر کی سیٹنگ میں مصروف ہوگئی۔ فرنیچر اور دیگر بھاری سامان تو پہلے ہی رکھا جاچکا تھا۔ اس نے اپنے کپڑے، جیولری، ضروری کاغذات، کچن کے برتن، گلدان، پینٹنگز وغیرہ سیٹ کیے اور لنچ کرنے باہر گئی کیونکہ اس میں لنچ بنانے کی ہمت نہیں رہی تھی۔ باقی دن وہ آرام کرتی رہی۔ رات کو اس نے پھر کھڑکی کھولی تو اب کی بار اس کے سامنے رنگا رنگ روشنیوں بھرا نظارہ تھا۔ تمام شاپس لائٹس سے چمک رہی تھیں۔ فلیٹ سے کچھ فاصلے پر موجود آئس کریم پارلر پر خوب رش تھا۔

لوسیا مسلسل دیکھ رہی تھی۔ کھڑے کھڑے اسے دیر ہوگئی تو اس نے ایک کرسی وہاں رکھ لی اور کھڑکی کی چوکھٹ پر کہنی ٹکا کر بازار کی رونق دیکھنے لگی۔ وہ اس وقت تک وہاں بیٹھی رہی جب تک اسے نیند نہیں آگئی۔

اس نے جاب پر جانا شروع کیا اور مصروف ہوگئی لیکن صبح ناشتا بنانے، تیار ہونے کی مصروفیت میں بھی وہ چند منٹ کھڑکی سے باہر کا نظارہ ضرور کرتی اور پھر یہ ہوا کہ کھڑکی سے باہر جھانکنے کی اسے عادت پڑگئی اور اس کا فارغ وقت اور چھٹی کے دن کے کافی گھنٹے اس مشغلے میں گزرنے لگے۔ اسے یہ اتنا پسند تھا کہ اس نے کھڑکی کے ساتھ چیئر اور ٹیبل مستقل اس انداز میں لگائیں کہ وہ اس پر اپنا کھانا رکھ لیتی اور فائلز وغیرہ بھی۔ وہ اکثر دوپہر اور رات کا کھانا بھی وہیں کھانے لگی۔ گلی میں سے گزرنے والے بچے و لڑکیاں، باکر اور ساری شاپس اس کی تنہائی کی بہت اچھی ساتھی بن گئیں۔ یہاں سے اسے دیگر فلیٹس اور ان کے مکین بھی نظر آتے تھے۔

اپنے گیلے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے لوسیا پیٹر باہر دیکھ رہی تھی۔ اس بات سے بالکل انجان کہ اس کا یہ معمول کسی کو بری طرح کھٹکتا ہے۔ لوسیا کی کھڑکی کے بالکل سامنے ایک بہت بڑی اور شاندار معیار والی بیکری تھی۔ بیکری کی مالکن کا نام تھا جوزفین تھامسن..... اور جوزفین کو اپنے سامنے والے فلیٹ میں نئی منتقل ہونے والی عورت کے اپنی بیکری کی جانب دیکھنے پر سخت اعتراض تھا۔ وہ چڑتی تھی کہ کیسے ایک عورت اس کے کاروبار کو خوامخواہ دیکھتی رہتی ہے۔

جوزفین تھامسن ایک سڑیل اور خشک مزاج عورت تھی جو کسی نہ کسی بات پر اکثر جلی بھنی رہتی تھی۔ جب سے لوسیا اس کے سامنے شفٹ ہوئی تھی، وہ اس کی باہر دیکھنے کی عادت سے شدید جل بھن رہی تھی۔ دراصل اسے پچھلے چند روز سے کاروبار میں زیادہ منافع نہیں ہو رہا تھا اور یہ لوسیا کے شفٹ ہونے کے بعد ہوا تھا۔ جوزفین تھامسن کو وہم ہوگیا تھا کہ سامنے والی عورت کے بیکری پر بار بار نظر جمانے سے نحوست پڑی ہے۔

''یہ منحوس عورت ہر وقت کھڑکی میں کیوں رہتی ہے؟'' وہ زیرلب بڑبڑاتی۔

''کیسے پاگلوں کی طرح اِدھر اُدھر تکتی رہتی ہے اور میری بیکری پر تو اس کی خصوصی نظر رہتی ہے..... نان سینس کوئی اور کام ہی نہیں ہے۔'' اس کا غصہ بڑھتا جاتا اور اس کے غصے سے بالکل بے خبر لوسیا کبھی سینڈوچ، کبھی سلاد کھاتے ہوئے، کبھی کافی کا کپ تھامے اپنی تنہائی دور کرنے والے ساتھیوں کو محویت سے دیکھتی رہتی۔

☆☆☆

''میم! جو آرڈر آیا تھا، وہ کام ہم نے مکمل کرلیا ہے۔ میں اور جم جہاں سامان پہنچانا ہے، دے آئیں؟'' بیکری میں کام کرنے والی جولی نے جوزفین کے قریب آکر پوچھا تو جوزفین نے فوراً سامنے کھڑکی کی طرف دیکھا جو بند تھی۔

''ہاں ہاں، جاؤ۔ اس کے کھڑکی کھولنے سے پہلے میں نہیں چاہتی کہ میری چیزوں پر اس منحوس کی نظر پڑے۔'' جوزفین نے تیوری چڑھاتے ہوئے بات کی۔ جولی سر

ہلاتے ہوئے پلٹ گئی۔ تھوڑی دیر میں وہ اور جم بڑے بڑے پیکٹ لیے بیکری سے باہر نکلے۔ اسی دوران لوسیا نے باہر جھانکا۔ جوزفین نے دانت پیسے۔

''جلدی چلو تم اور ذرا دھیان سے جانا۔ اس کی نحوست بھری نظر پڑ چکی ہے۔'' جوزفین نے ڈانٹنے والے انداز میں جم اور جولی سے کہا اور خود کھڑکی کی جانب گھورا۔ ادھر لوسیا نے اسے دیکھ کر ہاتھ ہلانا چاہا لیکن جوزفین اسے نظر انداز کر کے اندر چلی گئی۔

☆☆☆

'بیکری کتنی شاندار ہے۔ چیزیں بھی سنا ہے معیاری بنتی ہیں لیکن مالکن کتنی عجیب سی اور روکھے رویے والی ہے۔ کبھی میرے ہاتھ ہلانے کا جواب نہیں دیا۔ عجیب بات ہے، آج تک میں اس کی شاپ پر نہیں گئی۔ کسی روز ٹائم نکالوں گی اور جاؤں گی۔ کیا پتا وہ میری دوست بن جائے۔' لوسیا پیٹر نے بیکری پر نظر جمائے سوچا۔

'کہیں ایسا نہ ہو کہ اپنے روکھے پن کا مظاہرہ کر کے مجھے بھگا دے۔' اس نے فوراً اپنے آپ کو بیکری پر جانے سے روکا۔

'چلو، میں کسٹمر بن کر جاتی ہوں۔' اس نے آئیڈیا سوچا اور باقی دکانوں اور لوگوں کو دیکھنے لگی۔

☆☆☆

''لگتا ہے بارش تیز ہو جائے گی، آثار نظر آ رہے ہیں۔'' جوزفین تھامسن باہر دیکھتے ہوئے بولی۔

''یس میم! پیشگوئی تو یہی ہے۔'' ساتھ کھڑی لڑکی بولی۔

شام کا وقت تھا۔ دن بھر کے چھائے بادلوں سے ہلکی بارش شروع ہوئی اور پھر آہستہ آہستہ تیز ہونے لگی۔ جوزفین نے سامنے لوسیا کی کھڑکی کی طرف دیکھا جو بند تھی۔ اسے سکون سا محسوس ہوا۔ لوسیا کے باہر دیکھنے پر وہ خوامخواہ ہی بے سکون ہو جاتی تھی۔

''اچھا ہے وہ اپنا چہرہ اندر ہی رکھے۔ باہر دیکھے گی تو ایسے ہی اچھے بھلے موسم کا مزہ خراب ہو جائے گا۔'' جوزفین کی سوئی اتنی اچھی بارش میں بھی اسی پر اٹکی ہوئی تھی جو اس کے خیال میں بہت فضول اور منحوس تھی۔

☆☆☆

''ارے، بڑا اچھا موسم ہو گیا ہے۔'' کھڑکی کھولتے ہی لوسیا کے چہرے پر بارش کے قطرے پڑے تو اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

لنچ کے بعد وہ آرام کرنے کے لیے لیٹی تو اسے گہری نیند آ گئی۔ تقریباً دو گھنٹے سونے کے بعد اس کی آنکھ کھلی تو اس نے اپنے لیے کافی بنائی اور کھڑکی کھولی جہاں ایک شاندار نظارہ اس کے سامنے تھا۔ وہ چیئر پر بیٹھ کر کافی پیتے ہوئے بارش دیکھنے لگی۔

تیز گرتے ہوئے قطرے اور دُھلا دُھلا ماحول بہت خوبصورت تھا۔ چھتریاں تھامے لوگ تیز تیز قدموں سے اِدھر سے اُدھر آ جا رہے تھے۔ یہ سب دیکھتے ہوئے وہ ماضی کی کئی یادوں کو کریدنے لگی۔ وہ اپنی یادوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ اسی دوران اس کی نظر بیکری پر پڑی جہاں شیشے کے پار اسے جوزفین نظر آئی۔ اسے واضح لگا کہ وہ اسی کی طرف دیکھ رہی ہے۔ اس نے اسے دیکھ کر ہاتھ ہلانا چاہا لیکن کچھ سوچ کر ایسا نہ کیا۔

☆☆☆

''لو، کھل گئی کھڑکی۔ اب نظریں میری بیکری پر گڑی ہوں گی جو مجھے ہرگز پسند نہیں۔'' ادھر لوسیا نے باہر جھانکنا شروع کیا، اُدھر جوزفین کا کڑھنا شروع ہو گیا۔ وہ شیشے کے دروازے سے باہر دیکھتے ہوئے لوسیا کو باقاعدہ گھور رہی تھی۔ کچھ دیر گھورنے کے بعد بہت خراب موڈ کے ساتھ اس نے اپنی توجہ اپنے کام پر کر لی۔

'اس پر کون سا میرے غصے سے دیکھنے کا کوئی اثر ہو گا۔ میں خوامخواہ اپنا وقت ضائع کر رہی ہوں۔'

☆☆☆

لوسیا نے لباس بدلا، چھتری اٹھائی اور فلیٹ کی سیڑھیاں اترنے لگی۔ بارش تھوڑی ہلکی ہو چکی تھی۔ اس نے سڑک پار کی اور پہلی بار جوزفین کی بیکری میں داخل ہو گئی۔

''میم! آپ..... یہاں کیسے؟'' لوسیا پیٹر کو دیکھتے ہی ایک لڑکی نے بوکھلائے سے انداز میں کہا۔ ان کی مالکن جوزفین سارا دن ان لوگوں کے سامنے لوسیا کو برا بھلا کہتی تھی۔ اسی لیے وہ لڑکی گھبرا سی گئی کہ کہیں کوئی بدمزگی نہ ہو جائے۔

''یہاں کیسے..... کا کیا مطلب؟'' لوسیا ہلکا سا مسکرائی۔ وہ سمجھی کہ لڑکی شاید نئی نئی آئی ہے اس لیے کسٹمر سے بات کرتے ہوئے ابھی اسے دقت ہو رہی ہے۔

''میرا..... مطلب ہے..... کیا چاہیے آپ کو؟'' لڑکی نے خود کو کافی حد تک سنبھال لیا تھا لیکن ساتھ ساتھ وہ اس کونے کی جانب دیکھ رہی تھی جہاں جوزفین کھڑی سیل فون پر کسی سے باتوں میں مصروف تھی۔

''اوہ، تو تمہارا یہ مطلب تھا۔'' لوسیا بیکری کے شیلف اور اردگرد دیکھتے ہوئے بولی۔

''جی..... جی..... تو میم میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں؟'' لڑکی کے چہرے پر پیشہ ورانہ مسکراہٹ اور دل میں یہ تھا کہ وہ جلد سے جلد اس کے آرڈر کو پورا کر کے اسے چلتا کرے۔

''ایک چاکلیٹ کیک۔'' لوسیا نے مختصراً کہا۔ وہ اب بھی بیکری میں موجود چیزوں کا جائزہ لینے میں مصروف تھی۔

''او کے میم!'' لڑکی نے مستعدی سے مصروف ہوتے ہوئے کہا۔

''یہ لیجیے میم! کچھ اور چاہیے کیا؟'' اسے پیکٹ تھماتے ہوئے لڑکی نے شائستگی سے پوچھا۔ لوسیا اب شیشے کے پار مزید ہلکی پڑتی بوندوں کو دیکھ رہی تھی۔

''نہیں، بس۔ مجھے چاکلیٹ کیک بہت پسند ہے اور.....'' لوسیا کا جملہ ادھورا رہ گیا۔

''اور کھڑکی سے باہر جھانکنا بھی..... ہے نا؟'' جوزفین تھامسن نے اس کے قریب آ کر اس کا جملہ اپنی مرضی کے مطابق پورا کیا۔ لوسیا چونک کر مڑی۔

''اوہ، تم..... تم جوزفین تھامسن ہو نا؟ اس بیکری کی مالکن۔ میں یہی دیکھ رہی تھی کہ تم نظر نہیں آ رہیں۔ چلو اچھا ہوا تم سے ملاقات ہو گئی۔'' نہایت خوشدلی سے کہتے ہوئے لوسیا نے ہاتھ بڑھایا۔ جوزفین اس کی طرف بڑے سپاٹ انداز میں دیکھتی رہی۔

''میں لوسیا پیٹر! سامنے والے فلیٹ میں کچھ عرصہ قبل شفٹ ہوئی ہوں۔'' اسے خاموش دیکھ کر لوسیا مزید بولی۔

''ہاں، جانتی ہوں۔ میں اکثر تمہیں دیکھتی ہوں۔'' بڑے خشک انداز میں کہتے ہوئے جوزفین نے گویا بادلِ ناخواستہ ہاتھ ملایا۔

''وہ کھڑکی سے جھانکنے کی کیا بات کر رہی تھیں تم؟'' لوسیا نے مسکراتے ہوئے سوال کیا۔

''تم اکثر اِدھر اُدھر تاکا جھانکی کرتی رہتی ہو۔ اس لیے میں نے کہا کہ تمہیں چاکلیٹ کیک کے علاوہ تاک جھانک کرنا بھی پسند ہے۔'' جوزفین کا چہرہ مسکراہٹ سے بالکل عاری تھا۔

''ہاں، بس یونہی فارغ وقت میں کھڑکی میں آ کر بیٹھ جاتی ہوں۔'' لوسیا کو اس کا لہجہ اور الفاظ دونوں ہی اچھے نہیں لگے تھے پھر بھی وہ نرمی سے بولی۔

''لگتا ہے کافی فارغ وقت ہوتا ہے تمہارے پاس۔ یعنی زیادہ تر تم کھڑکی میں پائی جاتی ہو۔'' جوزفین نے اسی لہجے میں کہا۔ لوسیا چند لمحے کے لیے چپ سی ہو گئی۔

''میں چلتی ہوں۔'' اس نے اپنا پیکٹ اٹھایا۔

''او کے'' کہہ کر جوزفین بیزاری سے آگے بڑھ گئی۔

☆☆☆

'یہ جوزفین تھامسن کچھ عجیب سی لگی ہے۔ جیسے بات کر رہی تھی، کسٹمر سے تو کوئی بھی ایسے نہیں بولتا۔' رات کا کھانا تیار کرتے ہوئے لوسیا سوچ رہی تھی۔

'ہاتھ ملاتے ہوئے کیسا خشک انداز تھا اور میرے کھڑکی کھولنے پر بھی لگ رہا تھا اسے کافی اعتراض ہے۔' کھانا پلیٹ میں ڈالتے ہوئے اس نے ذرا رک کر سوچا۔ جوزفین کے رویے نے اسے ذہنی طور پر ڈسٹرب سا کر دیا تھا۔ وہ تو یہ سوچ کر گئی تھی کہ اپنی ہم عمر عورت سے ہیلو ہائے کرے گی اور شاید دوستی تک بات پہنچ جائے لیکن وہ بیکری مالکن تو اتنی بدمزاج لگی کہ آئندہ اس کی شاپ پر جانے کو بھی دل نہیں کر رہا تھا۔ کھانے کی ٹرے اٹھائے وہ حسبِ معمول کھڑکی کے پاس آئی۔ وہاں پڑی ٹیبل پر ٹرے رکھتے ہوئے اس نے کھڑکی کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا لیکن یکدم رک گئی۔

''زیادہ تر تم کھڑکی میں پائی جاتی ہو۔'' جوزفین تھامسن کے عجیب انداز میں کہے گئے الفاظ اس کے کانوں میں گونجے۔

''آج یہاں بیٹھ کر کھانا نہیں کھاؤں گی۔'' اس نے فیصلہ کیا۔ رات کو سونے سے پہلے اس نے لائٹ آف کی اور آہستگی سے کھڑکی کو تھوڑا سا کھولا۔ چند سیکنڈ باہر دیکھنے کے بعد وہ واپس بیڈ پر آ بیٹھی اور کچھ دیر بند کھڑکی کی طرف دیکھتی رہی۔ جلد ہی اسے نیند آ گئی۔

☆☆☆

''کیسی ہو مسز تھامسن؟'' بیکری کا دروازہ کھولتے ہی بڑی سی مسکراہٹ سجائے روکی نے اونچی آواز میں کہا۔ جوزفین کاؤنٹر کے پاس کہنی ٹکائے کھڑی چند ملازمین کو ہدایات دے رہی تھی۔ روکی کی آواز سن کر وہ اس کی جانب مڑی۔

''آؤ روکی! بڑے دنوں بعد آئے ہو۔ میں نے کیسا ہونا ہے..... بس مصروف ہوں، بہت مصروف۔'' جوزفین نے بڑے دوستانہ انداز میں بولتے ہوئے روکی سے ہاتھ ملایا۔

معصوم و سادہ سا نظر آنے والا روکی جوزفین کا بڑا اچھا دوست تھا۔ لوسیا اور جوزفین والے بازار سے بالکل پیچھے والے بازار میں روکی کی بیکری تھی۔ روکی کا باپ جب مرا تو یہ بیکری بہت معیاری اور اعلیٰ چیزیں بنانے کی وجہ سے خوب نفع دے رہی تھی لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا،

معیار اور نفع دونوں گر گئے۔ روکی اور اس کا بھائی سینڈی وہ معیار برقرار رکھنے میں بُری طرح ناکام رہے جس کے لیے ان کے باپ نے دن رات محنت کی تھی۔ روکی اور سینڈی اب بس جیسے تیسے گزارہ کر رہے تھے اور وہ شاپ جو کسی زمانے میں جوزفین تھامسن کے برابر کی تھی، وہ بہت پیچھے رہ گئی۔ روکی کاروباری رقیب ہونے کے باوجود اپنی سادہ دل طبیعت کی وجہ سے جوزفین کا دوست بن گیا تھا۔

''اور سناؤ، کیسا چل رہا ہے تمہارا کام؟'' جوزفین نے پوچھا۔

''صحیح گزارہ ہو رہا ہے۔ میں اور سینڈی اب پہلے سے زیادہ محنت کرنے کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔ کچھ نئے پلان بنائے ہیں۔'' روکی نے جواب میں بتایا اور ساتھ ہی پوچھا۔

''تم کچھ نیا سناؤ۔ پتا چلا تھا پچھلے دنوں تمہیں کافی فلو رہا ہے۔''

''فلو کو چھوڑو روکی! میں تو ایک نئی بیماری سے پریشان ہوں۔'' جوزفین نے بُرا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔

''نئی بیماری؟'' روکی چونکا۔

''تمہیں بتایا تھا نا کہ ایک عورت سامنے والے فلیٹ میں شفٹ ہوئی ہے اور اکثر باہر جھانکتی رہتی ہے۔'' جوزفین نے کپ میز پر رکھتے ہوئے بات کہنا شروع کی۔

''ہاں، بتایا تھا لیکن پریشانی کیوں ہوئی ہے تمہیں؟'' روکی نے سامنے والے یعنی لوسیا کے فلیٹ کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ عورت مجھے بہت عجیب لگتی ہے..... اور منحوس بھی۔ اب کوئی بھی اتنے گھنٹے کھڑکی کھول کر نہیں بیٹھ سکتا جتنا یہ بیٹھتی ہے۔ اب دیکھو نا، کھانا اور کافی بھی.....'' جوزفین نے بھڑاس نکالنا شروع کی تو کافی دیر بولتی چلی گئی۔ روکی کی نیلی آنکھیں فلیٹ کی بند کھڑکی پر جمی ہوئی تھیں۔

''تو یہ ہے تمہارا مسئلہ، مسز تھامسن!'' وہ مسکرایا۔

''ہاں، اور کیا۔ اب دیکھو نا سامنے بلڈنگز میں کئی کھڑکیاں ہیں لیکن وہ براہِ راست میری دکان کی طرف نہیں کھلتیں اور دوسرا وہاں کے مکین اتنا زیادہ وقت آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر باہر نہیں دیکھتے جتنا یہ فضول سی لوسیا پیٹرو دیکھتی ہے اور پھر یہ کہ یہ کھڑکی میری شاپ کے بالکل سامنے ہے۔ مجھے تو یہ بدنظر بھی لگتی ہے۔ جس روز یہ مسلسل میری شاپ کو دیکھ لے، میرا اس روز کاروبار کم نفع دیتا ہے۔'' جوزفین کے پاس لوسیا کے خلاف بولنے کے لیے کافی مواد تھا۔ روکی ہنس رہا تھا۔

☆☆☆

ناشتے سے پہلے، بعد میں، تیار ہوتے ہوئے، لوسیا نے ایک بار بھی کھڑکی نہیں کھولی جیسا کہ وہ ہر روز کرتی تھی۔ آفس سے آنے کے بعد وہ فریش ہو کر جب کچن میں گئی تو بجائے تازہ دم ہونے کے، اس کا خون کھول رہا تھا۔ فلیٹ میں آتے ہی اسے احساس ہوا کہ جوزفین کے کہے چند جملوں کا اثر لے کر وہ اس کام پر مجبور ہو گئی تھی جو جوزفین کی خواہش تھی۔ یعنی کھڑکی کو بند رکھا جائے۔

'بدمزاج عورت کے لفظوں نے مجھ میں خوامخواہ ایک جھجک سی پیدا کر دی ہے۔ یہ کون ہوتی ہے میرے ہی فلیٹ کی کھڑکی کے بارے میں مجھے ہدایات دینے والی؟ میں بھی کمال کی بے وقوف ہوں۔ کل سے اس کی منشا کے مطابق چل رہی ہوں۔' خون جلاتے ہوئے وہ سوچے جا رہی تھی پھر بڑی تیزی سے ٹرے میں کھانا رکھا اور اپنی من پسند جگہ پر آئی۔ جھٹکے سے کھڑکی کھولی اور میز پر کھانا رکھ لیا۔

''میری مرضی، میں جہاں بیٹھوں، جہاں مرضی میں زیادہ تر پائی جاؤں۔'' اس نے خود سے کہا اور اطمینان سے لنچ کرتے ہوئے باہر دیکھنے لگی۔

☆☆☆

''لو..... میں تو سمجھی تھی کہ یہ عورت سمجھ دار ہے۔ میری باتوں سے کچھ سمجھ گئی ہے۔ اسی لیے تا کا جھانکی چھوڑ دی ہے لیکن اس نے تو بڑی جلدی کھڑکی کھول لی۔ میں خوامخواہ خوش ہو رہی تھی کہ شاید وہ باز آ گئی ہے۔'' لوسیا پر نظر پڑتے ہی جوزفین نے شدید غصہ کرنا شروع کر دیا۔

اگلے ہی دن سے اس نے یہ کام شروع کر دیا کہ اردگرد کے لوگوں کے سامنے لوسیا کی جھانکنے کی عادت پر اعتراض اٹھایا اور کہا کہ اس کا بس چلے تو وہ اس کھڑکی کو بند ہی کروا دے۔ وہ اتنا چڑ گئی تھی کہ کئی کسٹمرز کے سامنے بھی لوسیا کی بُرائیاں کر دیتی۔ روکی یا کوئی فرینڈ ملتا تو اس کے سامنے اپنا دکھڑا بیان کرنے لگتی۔ آہستہ آہستہ پورے بازار میں بلکہ اردگرد یہ مشہور ہو گیا کہ لوسیا پیٹر باہر جھانکتی رہتی ہے۔ خصوصاً سامنے والی بیکری کی طرف اور جوزفین تھامسن کو اس پر شدید اعتراض ہے۔ لوسیا تک اس کے خلاف کی گئی باتیں پہنچ رہی تھیں۔ وہ کچھ دن تو برداشت کرتی رہی لیکن ایک روز اس کے صبر کا بندھن ٹوٹ گیا جب اسے پتا چلا کہ جوزفین نے کہا کہ اگر لوسیا یونہی اپنی عادت پر قائم رہی تو وہ کسی روز جا کر اسے اس کے فلیٹ سے گھسیٹ کر نکالے گی اور پھر اس علاقے سے ہی نکال دے گی۔ لوسیا

تلملاتی ہوئی جوزفین کی بیکری پر پہنچی۔

''کیا یہ سچ ہے کہ تم مجھے میرے ہی فلیٹ سے اور اس علاقے سے نکالنے کا سوچ رہی ہو؟'' اس نے جوزفین کے سامنے پہنچتے ہی اونچی اور غصیلی آواز میں تصدیق چاہی۔

''ہاں، سو فیصد سچ..... اگر تم اپنی تاک جھانک کی عادت سے باز نہ آئیں تو میں ایسا ہی کروں گی۔'' جوزفین نے اطمینان سے جواب دیا۔

''اوہ..... ریئلی.....؟ مسز تھامسن! تم ہرگز یہ اختیار نہیں رکھتی ہو کہ مجھے ایسا کہو یا ایسا کچھ کرو۔ تمہیں مشورہ دے رہی ہوں اپنی حد میں رہو ورنہ کچھ بُرا بھی ہوسکتا ہے۔'' لوسیا کو شدید غصہ آرہا تھا۔

''اور کیا بُرا کرو گی تم؟ ہر وقت میرے کاروبار پر نظریں گاڑ کر کافی نظر تو لگا دی ہے منحوس عورت!'' جوزفین چلائی۔

''زبان بند کرو اور تمیز سے بات کرو۔'' لوسیا چیخی۔

''تمہیں اپنی یہ عادت ترک کرنا ہوگی۔'' جوزفین کاؤنٹر چھوڑ کر اس کے قریب آکر بولی۔

''ایسا ہرگز نہیں ہوگا، جو کرنا ہے کرلو۔ میری کھڑکی ہے، میں کھولوں یا بند رکھوں، تم اپنی دکان کہیں اور شفٹ کرلو۔'' لوسیا نے جواب دیا۔

سارے ملازمین اور کسٹمر لڑائی دیکھ اور سن رہے تھے۔ لڑائی بڑھی اور پھر بڑھتی گئی۔ بات دھمکیوں تک پہنچ گئی۔ قریب تھا کہ دونوں خواتین میں سے کوئی ایک دوسرے پر حملہ کردیتیں کہ اردگرد کھڑے لڑائی سنتے لوگ بیچ بچاؤ کے لیے آگئے۔ دونوں طرف کی بات سنی تو اکثریت لوسیا پیٹر کے ساتھ ہوگئی۔

''اپنی کھڑکی کے سامنے بیٹھنا قانونی جرم ہرگز نہیں ہے۔'' بھورے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے جیری نے جوزفین کو اطلاع دی۔

''لیکن مجھے یہ پسند نہیں۔'' جوزفین نے اپنی طرف سے اسے جرم ثابت کرنے کے لیے دلیل دی۔

''لیکن پسند یا ناپسند کی بنیاد پر ہم کسی کو اس کے گھر کے حصے کیسے استعمال کرنے ہیں کا تو نہیں کہہ سکتے نا۔'' قریب سے سائمن نے جوزفین کو سمجھانے کی کوشش کی۔

''مجھے لگتا ہے اس کا میری شاپ کی جانب دیکھنا میرے لیے منحوس ثابت ہوتا ہے، یعنی میرا معاشی نقصان ہوتا ہے۔'' جوزفین تھامسن نے لوسیا کا ایک اور ''جرم'' بتایا۔

''تمہیں کیا لگتا ہے، کیا نہیں..... اس کی بنیاد پر بھی لوسیا کو کھڑکی کھولنے سے منع نہیں کیا جاسکتا۔'' نیلی آنکھوں والا ہنری چیونگم چباتے ہوئے بولا۔

''آخر کیا وجہ ہے کہ تم سب لوسیا کے ساتھ ہو؟ جوزفین یہاں برسوں سے بزنس چلا رہی ہے۔ ہم اس کے بارے میں اچھی طرح جانتے ہیں۔ تم لوگ کچھ عرصہ پہلے ہی آنے والی کے حمایتی بن کر کچھ اچھا نہیں کررہے۔'' روکی ابھی آیا تھا۔ جونہی اسے پتا چلا کہ کیا ہورہا ہے، اس نے فوراً جوزفین کو سپورٹ کرنا شروع کردیا۔ بحث طول پکڑتی جارہی تھی۔ تنازعہ شدت اختیار کرچکا تھا۔ سب اونچی اونچی آواز میں بول رہے تھے۔ جوزفین اور لوسیا اپنی اپنی بات پر قائم تھیں اور ان کے سپورٹرز اپنے مؤقف کے حق میں گلا پھاڑ پھاڑ کر بول رہے تھے کہ زوردار ہارن سن کر انہیں چپ ہونا پڑا۔ سب نے یکدم مڑ کر باہر کی جانب دیکھا جہاں پروفیسر جونی کی گاڑی کھڑی تھی۔

''میں معذرت خواہ ہوں۔ میں نے جان بوجھ کر تم سب کو متوجہ کرنے کے لیے ہارن زیادہ زور سے بجایا۔'' کیمسٹری کے پروفیسر جونی نے شائستگی سے سب سے مخاطب ہوکر کہا۔ پروفیسر کی رہائش گاہ قریب ہی تھی اور وہ پچھلے چند روز سے جوزفین اور لوسیا کے درمیان کھڑکی کی تنازعہ کے بارے میں سن رہا تھا۔ آج بیکری کے سامنے سے گزرتے ہوئے غیر معمولی رش دیکھا تو تجسس سے رک گیا اور ایک ملازم کو اشارے سے پاس بلا کر تفصیل معلوم کی اور اب سب کو چپ کروا کر ان کے پاس بیکری کے اندر موجود تھا۔

''آؤ پروفیسر! تم بھی ذرا دیکھو یہ.....!'' جوزفین نے تیز تیز بولنا شروع کیا ہی تھا کہ پروفیسر جونی نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید بولنے سے روک دیا۔

''مجھے لگتا ہے یہ معاملہ کافی سنگین ہورہا ہے۔ مارکیٹ میں لڑائی سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ اس معاملے کا حل نکالا جائے۔ اگر تم اجازت دو تو میں تجویز دوں؟'' پروفیسر جونی نے سب کی بالخصوص لوسیا اور جوزفین کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''تجویز جو بھی ہو پروفیسر! بس دھیان رہے کہ لوسیا پیٹر کی کھڑکی ضرور بند ہونی چاہیے۔ مسز تھامسن اس کی وجہ سے ڈسٹرب ہوتی ہے۔'' روکی نے جوزفین کی مکمل سائڈ لیتے ہوئے کہا۔ لوسیا نے اسے گھور کر دیکھا اور کچھ کہنے ہی والی تھی کہ پروفیسر نے تیزی سے بولنا شروع کردیا۔

''میرے خیال میں لوسیا پیٹر! پلیز، آپ محض دو ہفتوں کے لیے کھڑکی بند رکھیں۔ اس دوران مسز جوزفین ذہنی طور پر ذرا ٹھیک ہوجائیں، ان کا غصہ اتر جائے تو ہم

پھر اگلا فیصلہ کریں گے۔'' پروفیسر نے کہا۔

''صرف دو ہفتے کیوں، میں تو کہتا ہوں ہمیشہ.....''

روکی کی بات لوسیا نے تیزی سے کاٹی۔ ''لیکن پروفیسر! یہ تو رہنے، ملنے جلنے کے کسی بھی اصول کے تحت نہیں آتا کہ ذاتی پسند ناپسند کو بنیاد بنا کر کسی کی کھڑکی بند کروائی جائے اور اس بات کا کیا بھروسا کہ یہ عورت دو ہفتوں میں مجھ پر اعتراض کرنے سے رک جانے کے قابل ہو۔'' لوسیا نے احتجاج کیا۔ اردگرد کھڑے لوگوں نے اس کی بھرپور حمایت کی۔

''روکی، پلیز! تم خاموش رہو۔'' پروفیسر نے روکی کو گھورتے ہوئے کہا اور پھر بولا۔

''اگر کسی بات پر تنازعہ پیدا ہو، شدت اختیار کر جائے اور امن وسکون کو خطرات لاحق ہو جائیں تو میرا خیال ہے سب کو مل جل کر ایسا فیصلہ ضرور کر لینا چاہیے جیسا میں نے کیا ہے۔ آپ ذرا اپنی کھڑکی بند کرنے کی بات پر غور کریں مس لوسیا! پلیز، دیکھیں اس طرح لڑائی فوراً بند ہو جائے گی پھر ہم ان دو ہفتوں کے دوران بات چیت کریں گے۔ اردگرد کے ماحول، مسز تھامسن کے مؤقف کو دیکھیں گے پھر کوئی راستہ نکالیں گے۔ فی الحال پلیز، یہ سب بحث ختم کریں۔ ویسے بھی یہ بڑے شرم کی بات ہے کہ ہمارے بازار میں سکون کے درہم برہم ہونے کی وجہ محض ایک کھڑکی ہے۔'' پروفیسر جوئی نے مضبوط لہجے میں بولتے ہوئے سمجھایا۔

''یعنی مسئلے کا حل صرف اور صرف یہی ہے کہ میں کھڑکی بند کر دوں۔ مجھے لگ رہا ہے کہ یہ پابندی تادیر رہے گی کیونکہ دو ہفتوں میں تو اس عورت کا دماغ ٹھیک ہونے سے رہا۔ خیر، امن وسکون کی خاطر میں آپ کا کہنا مانتی ہوں۔ اب آپ کو شکایت کا موقع ہرگز نہیں ملے گا۔'' لوسیا پیٹر نے غصہ و بے بسی دباتے ہوئے اپنی بات مکمل کی اور باہر جانے کے لیے قدم بڑھائے۔

''اوہ تھینک یو..... لوسیا پیٹر! تھینک یو..... میری دوست اب ذہنی دباؤ سے آزاد ہو گی جو ہر وقت تمہارے دیکھتے رہنے کی وجہ سے پیدا ہو چکا تھا۔'' روکی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ لوسیا کے بڑھتے قدم رکے لیکن اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے روکی کو کوئی بھی ردعمل نہ دیا اور سختی سے ہونٹ بھینچے بیکری سے باہر نکل گئی۔ کسی کو معلوم نہ ہو سکا کہ اس کی آنکھوں میں نمی سی تھی۔ بھیڑ چھٹ گئی اور معاملہ مرضی کے مطابق طے ہو جانے پر جوزفین نے خوشی و اطمینان کا اظہار کیا۔

☆☆☆

'میں تنہائی اور اداسی کی لائف گزار رہی ہوں۔ میرا کوئی اپنا میرے پاس نہیں ہے۔ اردگرد دیکھنے کا مشغلہ کافی دلچسپ لگا تو میں اسی میں لگ گئی لیکن ظاہر ہے کسی کو اس کی کیا پروا۔ لعنت ہو جوزفین تم پر۔ میرے ایک بے ضرر سے شوق کا گلا گھونٹ کر ہی تمہیں چین آیا۔' رات کا کھانا ٹیبل پر رکھے لوسیا بڑے دکھ سے سوچ رہی تھی۔ اس نے کھانا اسی ٹیبل پر رکھا ہوا تھا جو کھڑکی کے پاس تھی۔

''بند کھڑکی کے پاس بیٹھ کر کیا مزہ؟'' اس نے کھانا اٹھایا اور لاؤنج میں آ کر بیٹھ گئی۔

'میرا خیال ہے مجھے رہائش بدل لینی چاہیے۔ اب یہاں دل نہیں لگے گا۔' بے دلی سے کھانا کھاتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی۔

☆☆☆

بڑے لوگوں کی بڑی باتیں

زہر۔ مولانا رومیؒ سے کسی نے پوچھا کہ حضرت یہ تو بتائیں کہ زہر کیا ہے؟

آپ نے فرمایا۔ ''ہر وہ چیز جو ہمارے پاس ضرورت سے زیادہ ہو، وہ زہر ہے۔ جیسے قوت، دولت، اقتدار، بھوک، لالچ، محبت، نفرت وغیرہ۔''

معتبر۔ ارسطو سے کسی نے کہا۔ ''میں نے ایک نہایت ہی معتبر آدمی سے تمہارے متعلق بڑی غلط قسم کی باتیں سنی ہیں۔''

ارسطو نے ہنس کر جواب دیا۔ ''بھلے مانس! یہ تو بتاؤ کہ کسی کی غیبت کرنے والا معتبر کیسے ہو سکتا ہے۔''

قانون مکڑی کا وہ جالا ہے جس میں صرف کیڑے مکوڑے پھنستے ہیں۔ طاقتور مجرم تو سرِعام اس جال کو پھاڑتے ہوئے نکل جاتے ہیں۔

خاموشی عظیم نعمت ہے۔ خصوصاً اس وقت جب اختلافات زیادہ ہوں۔ آوازیں بلند ہوں، علم کی کمی ہو اور دلیل کی کوئی اوقات نہ ہو۔

مال و دولت زندگی کی آسائش کے لیے ہے مگر زندگی اس لیے نہیں کہ انسان اپنی زندگی صرف مال و دولت اکٹھی کرنے میں ہی گزار دے۔

انسان کو بچپن میں خواہشیں، جوانی میں خواب، ادھیڑ عمر میں ضرورتیں اور بڑھاپے میں حقیقتیں سونے نہیں دیتیں۔

مرسلہ۔ جاوید اختر رانا، حیدرآباد

pklibrary.com

''میرا چیخنا چلانا، غصہ کرنا رنگ لے ہی آیا اور اس عورت کے منحوس چہرے سے نجات مل گئی جو ہر وقت خوامخواہ نظر آتا رہتا تھا۔'' جوزفین نے بند کھڑکی کی جانب دیکھتے ہوئے روکی سے کہا۔ روکی کچھ دیر پہلے ہی آیا تھا۔

''بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو تم۔'' روکی نے کہا۔ وہ مسلسل بیکری کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔

''تمہاری محنت بھی رنگ لائی ہے اور دیکھو اب تمہارا کاروبار بھی بہت زیادہ اوپر جا رہا ہے۔'' روکی نے ہلکا سا مسکرا کر کہا۔

''واقعی روکی! ایسا ہی ہے۔ اب دیکھو نا ادھر شاپ میں کام کرنے اور آرڈر ڈیلیور کرنے کے لیے مجھے مزید ملازم رکھنے پڑے ہیں۔ پچھلے دنوں کم کام ہوا ہے لیکن پھر بھی زیادہ فرق نہیں آیا۔'' جوزفین تھامسن نے اترا کر بات کی۔

روکی دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسائے چٹخاتے ہوئے جوزفین کو دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

کھڑکی بند ہوئے تیسرا دن تھا۔ لوسیا نے اپنے لیے کافی بنائی اور بیڈ پر آ بیٹھی۔ شام کا وقت تھا۔ وہ بڑی حسرت سے اپنی بند کھڑکی کو دیکھ رہی تھی۔ کپ تھامے وہ آہستہ سے کھڑی ہوئی اور کھڑکی کی جانب یوں بڑھی جیسے کوئی اپنی عزیز از جان ہستی کی طرف جا رہا ہو۔ چند سیکنڈ کھڑے رہنے کے بعد وہ وہاں پڑی اپنی کرسی پر بیٹھ گئی اور یوں پوز بنا لیا جیسے کھلی کھڑکی میں سے باہر دیکھ رہی ہو۔ کافی ختم کر کے اس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا لی اور آنکھیں بند کر لیں۔

''میرا خیال ہے آج رات کا کھانا باہر کھا لیتی ہوں۔ کچن میں جانے کی ہمت نہیں ہو رہی اور اس طرح ذرا گھوم پھر بھی آؤں گی۔'' اس نے فیصلہ کیا۔

''کچھ چیزیں چاہئیں، وہ بھی خرید لوں گی۔'' اس نے باہر رہنے کا وقت تھوڑا سا اور بڑھایا۔

'کل آفس سے آتے ہوئے بینک سے ہوتی ہوئی آؤں گی۔ ذہن میں ہی نہیں رہا ادھر بھی جانا تھا۔' وہ اپنے آپ کو سوچوں میں مصروف کر رہی تھی۔ کبھی آنکھیں بند اور کبھی کھولتے ہوئے، سوچتے ہوئے اسے کافی دیر گزر گئی تو اس نے کرسی چھوڑنے اور شاور لینے کا ارادہ کیا۔

''فضول عورت!'' اس نے غصے سے زیر لب کہتے ہوئے کھڑکی کو دیکھا۔ اچانک وہ اٹھتے اٹھتے رک گئی۔ اسے کچھ خاص نظر آیا تھا۔ کافی پیتے وقت اسے اتنا اندھیرا محسوس نہیں ہوا تھا اس لیے روم کی لائٹ آن نہیں کی تھی لیکن اب اندھیرا کافی بڑھ چکا تھا اور اس اندھیرے میں اسے کھڑکی کے ایک پٹ پر وہ چیز نظر آئی تھی جسے دیکھ کر وہ چونک پڑی۔ وہ تیزی سے کھڑی ہوئی اور اس پر غور کیا۔ وہاں ایک چھوٹا سا سوراخ تھا جو روشنی میں نظر نہیں آتا تھا لیکن اندھیرے میں باہر کی روشنی پڑنے سے بالکل واضح دکھائی دیا۔ سوراخ چھوٹا سا تھا لیکن..... لوسیا پیٹر نے آنکھ لگا کر دیکھا تو اسے باہر کا منظر بڑی وضاحت سے نظر آیا۔ وہ سوراخ بڑے کام کا نکلا۔ لوسیا خوشی سے جھوم اٹھی۔

''ارے، میں نے تو اس پر غور ہی نہیں کیا تھا۔ یہاں سے تو باہر کا نظارہ کیا جا سکتا ہے۔ کھلی کھڑکی والا مزہ تو نہیں لیکن میں یہاں سے باہر جھانک کر اپنی عادت تو پوری کر ہی سکتی ہوں۔ اپنی تنہائی کسی حد تک تو دور کر سکتی ہوں۔ میرا دلچسپ مشغلہ پھر سے شروع ہو جائے گا۔'' تنہائی کی ماری ہوئی اور باہر جھانک کر ادھر اُدھر دیکھنے کی عادت لگا لینے والی لوسیا اس طرح خوش ہوئی جیسے بہت بڑا خزانہ ہاتھ لگ گیا ہو۔

'رات کا کھانا جلدی کھا آؤں پھر رات کی رونق دیکھوں گی۔' سوچتے ہوئے وہ تیار ہونے چلی گئی۔ باہر نکلنے سے پہلے اس نے ایک بار پھر اس سوراخ میں سے باہر جھانکا۔ گویا ایک بار پھر تصدیق کی کہ باہر دیکھا جا سکتا ہے۔ کھانے کے بعد ذرا گھومنے پھرنے کا خیال اس نے ترک کر دیا۔ وہ واپس آئی اور سابقہ معمول کی طرح کھڑکی کے پاس آ بیٹھی۔ اس نے کرسی کو گھسیٹ کر بالکل کھڑکی کے ساتھ جوڑ لیا تاکہ اس پر بیٹھ کر سوراخ سے آنکھ لگا سکے۔ باہر جھانکتے ہی اسے پُررونق بازار نظر آنے لگا۔

''لو کر والو تم اپنی ضد پوری سڑیل عورت! دیکھو مجھے دوسرا راستہ مل ہی گیا۔'' وہ دل ہی دل میں جوزفین سے مخاطب ہوئی۔ اسے لگ رہا تھا اس نے اپنی مخالف عورت کو شکست دے دی ہے۔ لوسیا نے آتے جاتے لوگوں، کھلکھلاتے بچوں، گٹار اٹھائے نوجوانوں کو دیکھا۔ آئس کریم پارلر کے رش کو انجوائے کیا اور متعدد مرتبہ جوزفین کی بیکری کو دیکھا۔ رات کو اسے بھرپور نیند آئی تھی۔

☆☆☆

''گڈ مارننگ مسز تھامسن! کیسی ہو؟'' روکی کی مسکراتی آواز جوزفین کے کانوں میں پڑی۔

''گڈ مارننگ روکی! اتنی صبح کیسے آئے؟ اور کافی خوش بھی لگ رہے ہو۔''

''آج میری سالگرہ ہے۔ میں نے سوچا آج تمہاری شاپ سے کیک خریدوں اور تمہارے ساتھ ہی برتھ ڈے

سلیبریٹ کروں۔ کیا خیال ہے؟'' روکی خوب مسکرا رہا تھا۔

''اچھا خیال ہے لیکن کیا تم ابھی اسی وقت کیک کاٹنا چاہتے ہو؟ میرا مطلب ہے، ہم لنچ یا شام کی چائے کے وقت بھی تو تقریب کر سکتے ہیں۔'' جوزفین نے مشورہ دیا۔ وہ کافی مصروف تھی۔ ابھی دن کا آغاز ہوا تھا۔ وہ چند منٹ بھی ضائع کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔

''ہاں، لیکن دراصل میں ضروری کام سے شہر سے باہر جا رہا ہوں اور چار پانچ روز میں واپس آؤں گا اس لیے اگر زحمت نہ ہو تو پلیز ایک کیک دے دیں اور......'' روکی نے بتایا تو جوزفین بات کاٹتے ہوئے بولی۔

''ہاں ہاں، پھر تو ٹھیک ہے۔ چلو تمہارا برتھ ڈے جلدی سے منا لیتے ہیں۔''

''بہت مزے کا کیک ہے۔'' روکی نے ٹکڑا منہ میں رکھتے ہی تعریف کی۔

''بھئی میری سالوں کی محنت ہے، میری چیزوں کے ذائقے میں۔ ویسے روکی! ایک مشورہ دوں؟ تم اپنی بیکری اپنے بھائی کے حوالے کردو۔ اب اس کا کون سا زیادہ کام ہے جو تم دونوں سنبھالو۔ تم میرے پاس آجاؤ۔ معقول معاوضہ دوں گی۔'' جوزفین نے ہنس کر کہا۔ روکی کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ وہ صرف ہلکا سا مسکرایا تھا۔

☆☆☆

'اگر جوزفین کو معلوم ہوجائے کہ میں اس وقت باہر جھانک رہی ہوں تو نہ جانے اس پر کیا بیت جائے۔' لوسیا نے سوچا۔ وہ اس وقت کھڑکی کے چھوٹے سے سوراخ میں سے باہر جھانکتے ہوئے بہت کچھ دیکھ رہی تھی کہ اچانک ایک ضروری کال آگئی۔ اسے اپنا دلچسپ مشغلہ درمیان میں چھوڑ کر سیل فون پر کافی دیر تک مصروف رہنا پڑا۔ کال ختم ہوئی تو کھانا بنانے کا وقت ہوگیا۔ کھانے کے بعد پھر دو تین ضروری کالز کرنا اور سننا پڑگئیں۔ کھڑکی کے پاس جانے کا موقع ہی نہ ملا اور سونے کا وقت ہوگیا۔ بیڈ کی طرف بڑھتے ہوئے لوسیا اچانک کھڑکی کی جانب مڑی۔

'رونق دیکھنے کا اپنا مزہ لیکن کبھی کبھی رات کا سکون اور اِکا دُکا لوگوں کو آتے جاتے دیکھنا بھی بہت انوکھا نظارہ ہے۔' لوسیا سوچتے ہوئے سوراخ کے پاس بیٹھ گئی۔ بعض اوقات وہ مارکیٹ کے بند ہوجانے کے بعد بھی چند منٹ کے لیے تاک جھانک کرتی تھی۔ دن اور رات کے بھی چند گھنٹے بھری پری رہنے والی سڑک خالی ہوتی اور بڑی پُرسکون اور آرام کرتی دکھائی دیتی۔ لوسیا نے سوراخ سے آنکھ لگائی اور محض دو تین منٹ بعد پیچھے ہٹنے ہی والی تھی کہ اسے کچھ ایسا نظر آیا کہ وہ ساکت سی ہوکر دیکھنے لگی۔ چند لمحے دیکھتے رہنے کے بعد اس نے گویا جھنجوڑ کر سوراخ سے سر ہٹایا۔ وہ تیزی سے کرسی سے اٹھی۔

☆☆☆

''یقین نہیں آرہا یہ...... یہ بھیانک کام تم کرنے والے تھے۔'' جوزفین غصے اور حیرت سے چلائی۔ پوری مارکیٹ بیدار ہوگئی تھی۔ پولیس وین کھڑی تھی اور پولیس اہلکار ان مجرموں کو گرفتار کرکے لے جانے والے تھے جو رات کے اس پہر تاریکی اور لوگوں کے سوجانے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے مسز جوزفین تھامسن کی بیکری کو آگ لگا کر اس کے شہر بھر میں پھیلے کاروبار کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچانا چاہتے تھے۔ آس پاس کے دکاندار، قریبی فلیٹوں کے مکین بشمول لوسیا پیٹر، پروفیسر جونی سب وہاں کھڑے تھے۔ سب حیران تھے کہ جوزفین کو نقصان پہنچانے کی سازش کرنے والا اس کا قریبی دوست ہوگا۔ پولیس کی گرفت میں اس وقت جوزفین کا دوست روکی اور اس کا چھوٹا بھائی سینڈی تھے۔ ان دونوں کو پولیس نے انتہائی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس وقت رنگے ہاتھوں پکڑا جب وہ دونوں بیکری میں مختلف جگہوں پر پیٹرول چھڑک چکے تھے اور آگ لگانے ہی والے تھے۔ دونوں نے بھاگنے کی کوشش کی تھی لیکن ناکام رہے۔

روکی بجائے شرمندہ ہونے کے جھنجلایا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ اسے غصہ آرہا تھا کہ وہ اپنی کاروباری حریف کے کاروبار کو آگ کیوں نہیں لگا سکا۔

''منحوس آدمی! تم تو کہہ رہے تھے کہ چند دن کے لیے شہر سے باہر جا رہا ہوں۔ ہونہہ...... تو یہ پلان تھا تمہارا کہ بظاہر غائب ہوجاؤ اور رات کو یہ کرتوت کرنے کے باوجود بچ جاؤ کہ تم تو شہر سے باہر تھے۔'' جوزفین نے شعلہ برساتی نظروں سے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

''ہاں، ہاں...... یہی پلان تھا...... یہی پلان بنایا تھا تمہیں برباد کرنے کے لیے۔ سالوں سے تم ہمارے کسٹمر اپنی طرف کھینچ رہی ہو۔ چالاک عورت! تم نے ہمارے باپ کی برسوں کی محنت کو بڑی عیاری سے خراب کرڈالا۔ ہم بھائیوں کا جتنا معاشی نقصان ہوا ہے، اس کی ذمے دار صرف تم ہو...... صرف تم...... اسی لیے آج میں نے یہ سب کرنے کا ارادہ کیا۔ سوچا تو کئی روز سے تھا لیکن عمل آج کرنا تھا لیکن مجھے افسوس ہے کہ میں یہ سب نہ کرسکا۔'' روکی چلّایا۔ وہ

pklibrary.com

کہیں سے بھی سیدھا سادہ پہلے والا معصوم روکی نہیں لگ رہا تھا۔ مسز تھامسن شدید مشتعل ہو کر آگے بڑھی اور زوردار طمانچہ روکی کے منہ پر جڑ دیا۔

''گھٹیا آدمی! کس طرح ہر معاملے میں میرے حمایتی بنتے تھے لیکن تمہارے اندر میرے خلاف اتنا زہر بھرا ہوا ہے۔ تم جو بھی کرتے، پکڑے تو تم نے جانا ہی تھا۔ میں بھی اپنے مجرم کو نہ چھوڑتی۔'' جوزفین نے قہر آلود لہجے میں کہا۔

''نہیں، بالکل نہیں۔ ہم بالکل نہ پکڑے جاتے۔ ہمیں پتا تھا کہ مخالفت کی وجہ سے لوسیا پر ہی شک جائے گا۔'' سینڈی نے ایک اور بات اگلی۔

''اوہ!'' پروفیسر جونی نے لوسیا پیٹر کی جانب ترحم بھری نظروں سے دیکھا۔ لوسیا ہلکا سا مسکرائی۔

''لوسیا؟'' پولیس والا چونکا۔ ''کہیں یہ وہ خاتون تو نہیں جنہوں نے ہمیں فون پر اطلاع دی تھی کہ کچھ لوگ مسز تھامسن کی شاپ کو آگ لگانے والے ہیں۔''

''جی، میں ہی ہوں وہ لوسیا پیٹر جس نے آپ کو فون پر اطلاع دی تھی۔'' لوسیا نے شائستگی سے کہا۔ جوزفین و دیگر نے شدید حیرت سے اس کی جانب دیکھا۔

''میڈم! ویل ڈن، آپ کی بروقت اطلاع پر ہم نے بیکری کو جلنے سے بچالیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو نہ صرف مسز تھامسن کی بیکری بلکہ آس پاس کی عمارتوں کو بھی شدید نقصان پہنچنے کا خدشہ تھا۔ یہ دونوں بھائی حسد و کاروباری رقابت میں بہت بھیانک کارروائی کرنے والے تھے۔'' پولیس والا لوسیا کو خراج تحسین پیش کرتی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ لوسیا نے مسکراتے ہوئے ہلکا سا سر جھکایا۔ پولیس وین روکی اور سینڈی کو لے کر چلی گئی۔

''لوسیا! تم..... تم نے فون کر کے میری شاپ بچائی..... تھینک یو..... میں تہ دل سے تمہارا شکریہ ادا کرتی ہوں۔'' جوزفین کے چہرے پر ممنونیت اور اپنے گزشتہ دنوں کے رویے پر شرمندگی نظر آرہی تھی۔

''ارے کوئی بات نہیں۔ زیادہ احسان مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ جرم کہیں پر بھی ہوتا دیکھ کر کوئی بھی انسان ایسا ہی کرتا ہے۔'' لوسیا نے متانت سے کہا۔

''ہاں..... لیکن..... وہ دراصل..... میرا مطلب ہے میرے اور تمہارے اختلافات.....'' جوزفین چپ ہوگئی۔ اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ کیا بولے۔

''میرا خیال ہے میرے اور تمہارے اختلافات اتنے سنگین نہیں کہ میں تمہاری شاپ کو جلتا دیکھ کر خوش ہوجاؤں۔'' لوسیا نے ہنستے ہوئے کہا۔ اردگرد کھڑے لوگ بھی ہنستے ہوئے لوسیا کو عزت کی نظر سے دیکھ رہے تھے۔

''میڈم لوسیا! جب یہ سب ہوا، پوری مارکیٹ بند تھی۔ سب سو رہے تھے۔ آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ روکی اور سینڈی کچھ غلط کرنے والے ہیں؟ یعنی آپ نے کیسے دیکھا نہیں، کیا آپ اس وقت کہیں سے آرہی تھیں؟'' پروفیسر جونی نے اچانک بڑا اہم سوال کر ڈالا۔

''ہاں لوسیا! تمہیں کیسے پتا چلا ان منحوسوں کے کرتوت کا؟'' جوزفین نے بھی پوچھا۔ لوسیا چپ ہو کر سب کی طرف دیکھتی رہی پھر اس نے لب کھولے۔

''وہ..... میں نے..... کھڑکی کھولے بغیر ایک اور طریقے سے دیکھ لیا تھا۔'' لوسیا نے نظریں جھکا کر آہستہ آہستہ بولتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب..... کیسے دیکھا؟'' پروفیسر جونی نے حیرانی سے پوچھا۔

''میں نے یہ سب خود تو نہیں کیا تھا لیکن..... اچانک مجھے ایک دن.....'' لوسیا پیٹر نے تفصیل سے سوراخ نظر آنے اور پھر اس کے ذریعے اپنی عادت جاری رکھنے کا اعتراف کیا۔ اس کا لہجہ ایسا تھا جیسے روکی، سینڈی کا جرم نہیں بلکہ اس کی کوئی چوری پکڑی گئی ہو۔ وہ بے حد شرمسار نظر آرہی تھی۔ اس کا جی چاہا کہ کہے کہ میں جلد ہی وہ سوراخ بند کردوں گی۔ اتنے سارے لوگوں کے سامنے کھڑکی بند کرنے کا وعدہ کر کے وہ ایک طرح سے کھڑکی کھولے ہوئے تھی۔ وہ نظریں جھکائے بول رہی تھی جبکہ اردگرد کھڑے لوگ بشمول جوزفین تھامسن بے اختیار مسکرا دیے تھے۔

''لوسیا! تم شرمندہ کیوں ہو رہی ہو؟ تم نے کچھ غلط نہیں کیا..... غلط تو میں تھی۔ خوامخواہ ضد پر اڑ گئی۔ ایسے ہی کھڑکی بند کروانے کے پیچھے پڑ گئی۔ تمہاری بے ضرر سی عادت کو یہ کہا کہ اس سے میری شاپ پر منحوس نظر پڑتی ہے اور جس روز سے تم جھانک رہی ہو، میرا معاشی نقصان ہو رہا ہے، وغیرہ وغیرہ..... لیکن مجھے آج پتا چلا کہ بدنظر تو وہ منحوس روکی تھا جو اوپر سے اچھا بنتا تھا لیکن اندر سے مجھ سے جلتا تھا۔ اتنا کہ اندر کی آگ آج میری شاپ میں لگانے لگا تھا۔ کتنا زیادہ اچھا ہوا کہ تم نے انہیں پیٹرول چھڑکتے دیکھ کر پولیس کو انفارم کر دیا اور میں بہت بڑے معاشی نقصان سے بچ گئی۔'' جوزفین نے لوسیا کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بات کی۔

''یعنی تم اس بات پر ناراض نہیں ہو کہ میں نے پھر

سے جھانکنا شروع کر دیا ہے؟'' لوسیا نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے ہلکا سا مسکرا کر پوچھا۔

''ناراض؟ ارے لوسیا! میں تو اس بات پر تمہارا شکریہ ادا کر رہی ہوں کہ تم نے اس عادت کو پھر سے اپنایا تو میرا بہت فائدہ ہو گیا۔ اگر یہ عادت نہ ہوتی تو میرا آج نقصان ہو چکا ہوتا اور میرا کاروبار برباد ہو جاتا۔'' جوزفین نے سچے دل سے اعتراف کیا کہ لوسیا کچھ غلط نہیں کرتی۔

''اس سوراخ میں سے کھڑکی کی طرح اِدھر اُدھر زیادہ دیکھنا تو ممکن نہ تھا لیکن اس میں سے سامنے والی شاپس اور اس کی حدود میں آنے والی سڑک نظر آ جاتی تھی۔ میرے لیے تو یہی بہت بڑی خوشی بن گئی کہ چلو کچھ تو دیکھ سکتی ہوں۔ مجھے یہ بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ اس سوراخ کے ذریعے میں اتنا بڑا کام بھی کر لوں گی۔'' لوسیا اب کھل کر ہنس رہی تھی۔ جوزفین آگے بڑھی اور اسے گلے لگاتے ہوئے بولی۔

''لوسیا! میں اپنے گزشتہ رویے پر شرمندہ ہوں۔ تم نے میرے لیے جو کچھ کیا، میں اس پر تمہاری شکر گزار ہوں۔ تم چاہتیں تو خاموشی سے اپنی مخالف کے کاروبار کو برباد ہوتا دیکھتی رہتیں لیکن تم نے ایسا نہیں کیا۔ تم ایک اچھی خاتون ہو اور..... پلیز! اب تم فوراً اپنی کھڑکی کھول لو..... میرا مطلب ہے کہ جب جی چاہے کھول سکتی ہو۔''

''واقعی؟'' لوسیا نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''ہاں..... تم نے کہا تھا کہ کیا دو ہفتوں میں جوزفین کا دماغ ٹھیک ہو جائے گا..... لو دیکھ لو میرا دماغ ٹھیک ہو گیا ہے۔'' جوزفین ہنس رہی تھی۔ اردگرد کھڑے سب لوگ تالیاں بجا رہے تھے۔ لوسیا پیٹر کو خراجِ تحسین پیش کرنے اور تنازع ختم ہونے کی خوشی میں۔ سب اپنی نیند پوری کرنے کے لیے اپنے اپنے گھر چلے گئے۔

☆☆☆

'آج شام کی چائے کھڑکی میں سے باہر جھانکتے ہوئے پیوں گی۔' لوسیا نے آفس سے آتے ہی پلان بنا لیا تھا۔ صبح اسے جلدی جانا پڑا تھا اس لیے پسندیدہ جگہ پر وقت نہیں گزار سکی تھی۔

وہ چائے بنا رہی تھی کہ ڈور بیل بج اٹھی۔ دروازے پر جوزفین کیک اور پھول لیے کھڑی تھی۔ اس نے بڑے احترام سے وہ لوسیا کو تھمائے۔

''لیکن آج تو میرا برتھ ڈے نہیں ہے۔'' لوسیا نے مذاق کیا۔

''لیکن مجھے تو لگ رہا ہے کہ بیکری جلنے سے بچ جانے کی وجہ سے میں آج پھر سے پیدا ہوئی ہوں۔ تو لوسیا ڈیئر! تم میرے ''برتھ ڈے'' کا کیک کھاؤ۔'' جوزفین نے بڑے جذباتی انداز میں کہا اور جلدی واپس چلی گئی کیونکہ اسے شاپ پر بہت کام تھا۔

لوسیا نے چائے بنائی، چائے اور کیک لے کر کھڑکی کے پاس پڑی ٹیبل پر رکھا، کرسی سیدھی کی اور کھڑکی کھولنے لگی۔ اچانک اسے کوئی خیال آیا۔ اس نے رک کر اس ننھے سے سوراخ کو دیکھا جس نے جوزفین کی شاپ جلنے سے بچائی اور لوسیا کو پھر سے پسندیدہ مشغلہ دیا۔ اس سوراخ پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے لوسیا نے پوری کھڑکی کھولی اور باہر کا منظر دیکھنے لگی۔ وہ کیک کا ٹکڑا منہ میں رکھ رہی تھی کہ سامنے جوزفین نظر آ گئی۔ لوسیا نے ہاتھ کے اشارے سے ''کیک بہت اچھا ہے'' بتایا۔ جواباً جوزفین نے مسکرا کر ہاتھ ہلایا۔

☆☆☆

جوزفین تھامسن اپنی شاپ کے دروازے کے قریب کھڑی تھی کہ اسے شیشے کے پار لوسیا نظر آئی۔ وہ آفس جا رہی تھی۔ جوزفین نے جلدی سے ڈور کھولا اور باہر نکل آئی۔ جوزفین پر نظر پڑتے ہی لوسیا نے مسکرا کر ہاتھ ہلایا۔

''لوسیا! جلدی فارغ ہو کر آؤ۔ آفس سے واپس آ کر اردگرد تاک جھانک کرو اور دیکھو کیا کیا ہو رہا ہے۔ تمہاری تاک جھانک کی عادت تو بڑے کام کی ثابت ہوئی ہے۔'' جوزفین نے ہاتھ ہلاتے ہوئے گویا فرمائش کی۔ لوسیا رک گئی۔

''ٹھیک ہے مسز تھامسن..... اور کچھ؟'' لوسیا نے پوچھا۔

''اوہ ہاں..... خوب یاد دلایا۔ تم کہہ رہی تھیں نا کہ تم تنہا ہو۔ کبھی کبھی بہت ڈپریس ہو جاتی ہو تو ایسا کرو فارغ وقت میری بیکری میں آ جایا کرو۔ جو کام پسند آئے وہ کر لیا کرو۔ اس کے عوض گپ شپ اور چاکلیٹ کیک مل جایا کرے گا۔'' جوزفین مذاق کرتے ہوئے لوسیا کو دوستی کی آفر کر رہی تھی۔

''ضرور..... ضرور۔ میں اس آفر پر غور کیے بغیر قبول کرتی ہوں۔'' لوسیا نے مسکرا کر کہا اور آگے جانے کے لیے قدم بڑھائے۔

''لیکن تاک جھانک نہیں چھوڑنی۔'' جوزفین پیچھے سے چلائی۔

لوسیا نے قہقہہ لگایا اور سکون و خوشی کا سانس لیتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔

⌘⌘⌘

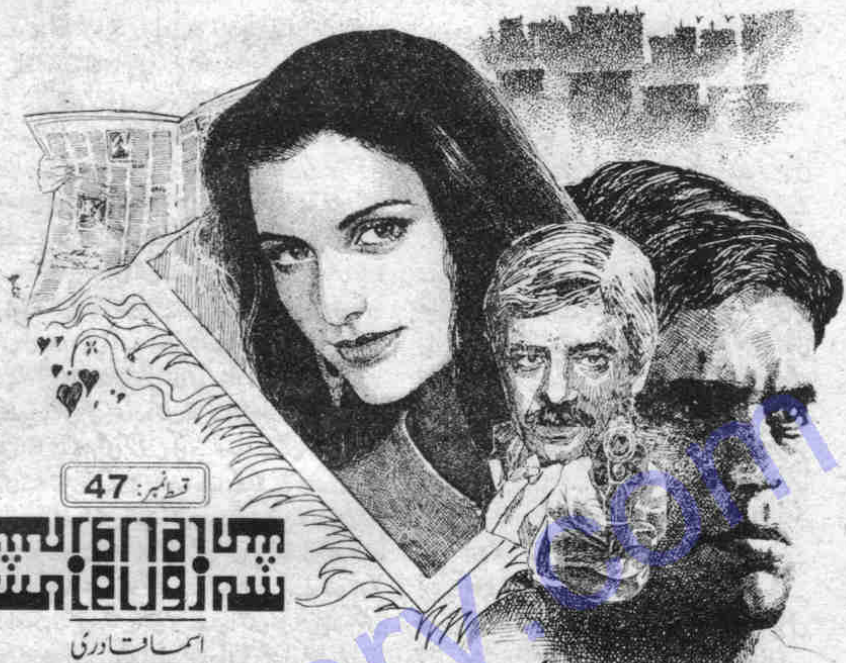

قسط نمبر: 47

اسما قادری

زندگی پیار کا گیت ہے مگر... صرف وہاں جہاں معاشرہ ناہمواریوں کا شکار نہ ہو... جہاں انصاف اور توازن عنقا نہ ہوں اور بدقسمتی سے وہ جس معاشرے میں رہتا تھا وہاں ناانصافیوں کی تندوتیز آندھیوں نے اسے محض سراپا انتقام بنا دیا تھا... ایک طرف فنون حرب و ضرب کے ماہر ہاتھوں نے اسے ناقابل شکست بنایا تو دوسری طرف ظلم و جبر کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والے اس پرعزم نوجوان کو حرف غلط کے مانند مٹائے جانے کے منصوبے بنائے جا رہے تھے... اس کی زندگی جوالمیوں کا شکار... اندھیروں کے قریب اور روشنی سے دور تھی لیکن... بے خبری میں جنم لینے والے عشق کی لو اسے تیرگی میں بھی راستہ دکھا رہی تھی... رفتہ رفتہ وہ ایک ایسے طوفان کا روپ دھار گیا جس میں شعلوں کی لپک اور بجلی کی چمک تھی... اس کی بے قراریوں کو قرار دینے کے لیے اس کا جنون، اس کا پیار اس کے ساتھ تھا... پھر وہ کیسے زمانے کی چیرہ دستیوں کے آگے ہار مان لیتا... اگرچہ تار عنکبوت نے طاقت اور گھمنڈ کے نشے میں چور لوگوں پر پردہ ڈالا ہوا تھا لیکن وہ ہر وار کا توڑ کرتا حق و باطل کی ازلی جنگ یوں لڑتا رہا کہ واردات قلب بھی اس کے فرض کی راہ میں حائل نہ ہو سکی...

اپنے حریفوں پر قہر بن کر نازل ہونے والے ایک سراپا انتقام نوجوان کی تحیر انگیز داستان

pklibrary.com

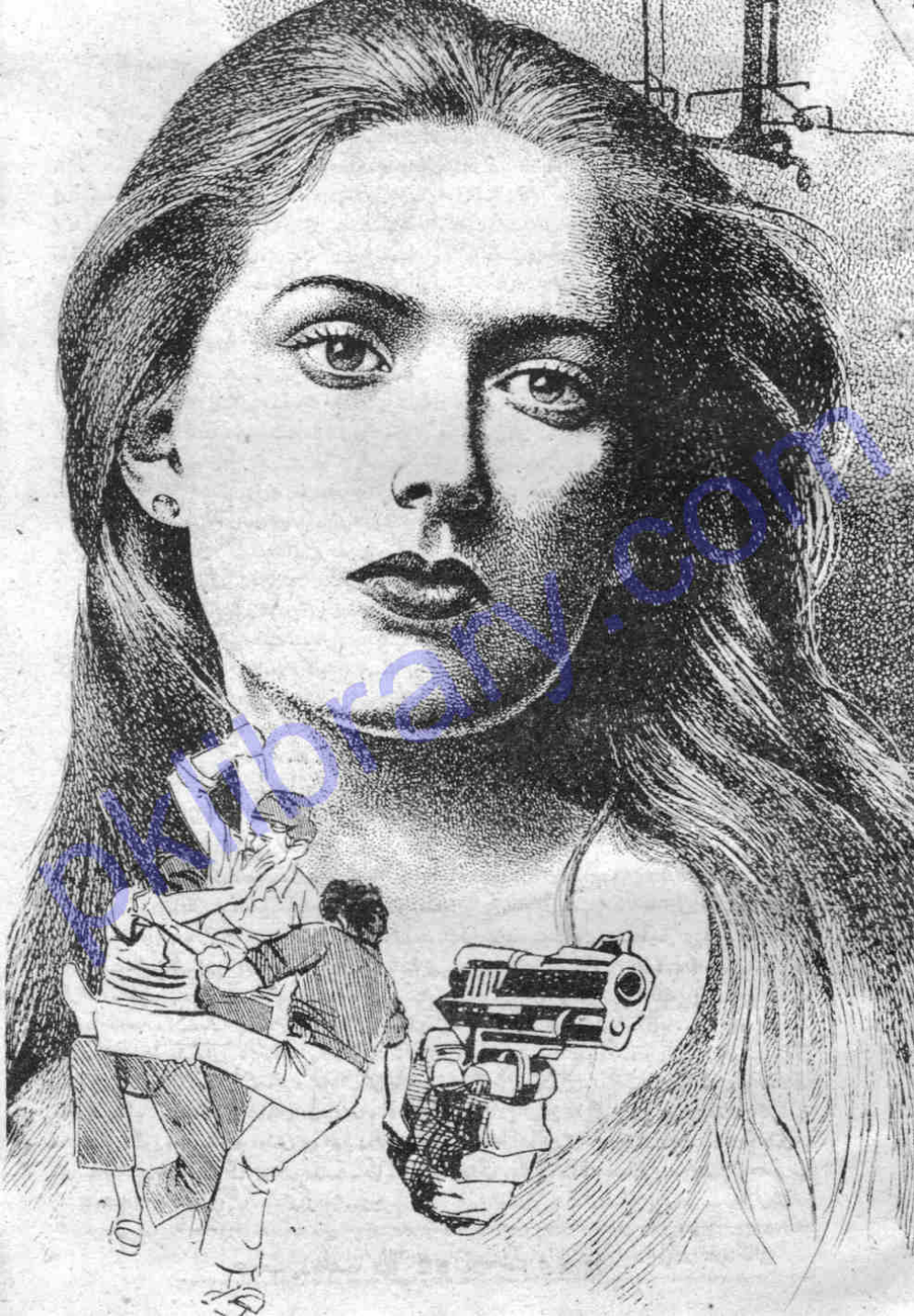
pklibrary.com

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

معاذ ایک ذہین لیکن متلون مزاج لڑکا یونیورسٹی کا طالب علم ہے لیکن ساتھ ساتھ اس نے دیگر کئی مشاغل بھی پال رکھے ہیں۔ آج کل اس پر مارشل آرٹ سیکھنے کا شوق سوار ہے اور اس نے باقاعدہ ایک ادارہ جوائن کیا ہوا ہے۔ معاذ کے والد سرکاری افسر ہیں اور اچھے عہدے پر فائز ہیں۔ ایک شام معاذ اسٹی ٹیوٹ سے واپس آرہا تھا تو وہ چند لڑکوں کو سڑک پر کھڑی ایک لڑکی کو اغوا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھ لیتا ہے۔ وہ لڑکی یونیورسٹی ہی میں پڑھتی ہے اور لڑکوں کا تعلق بھی وہیں سے ہے۔ اپنی نڈر فطرت کے باعث وہ اس معاملے میں کود پڑتا ہے اور بشریٰ نامی اس لڑکی کو بچانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ بشریٰ ماس کمیونی کیشن کی طالبہ ہے اور ایک اخبار کے لیے کالم وغیرہ لکھتی ہے۔ اس ویران جگہ پر بھی وہ ایک زیر تعمیر رہائشی منصوبے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے ہی آئی تھی۔ معاذ بشریٰ کو بہ حفاظت اس کے گھر پہنچا دیتا ہے اور خود اس واقعے کو فراموش کر دیتا ہے لیکن جن رئیس زادوں سے اس نے ان کا شکار چھینا تھا، وہ اس واقعے کو فراموش نہیں کرتے اور موقعے کی تلاش میں رہتے ہیں۔

ایک دن جنگل کی سیر کے دوران وہ فوٹو گرافی کے شوق میں سب سے الگ تھلگ ہو جانے والے معاذ کو بے خبری میں گھیر کر بری طرح زدوکوب کرتے ہیں اور بلندی سے اسے دھکا دے دیتے ہیں۔ معاذ کے واپس نہ آنے پر انتظامیہ کے افراد، پولیس اور ریسکیو ذرائع کی مدد سے اسے تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہ کامیاب نہیں ہوتے۔ ادھر معاذ کو ہوش آتا ہے تو وہ خود کو ایک جوگی کی جھونپڑی میں پاتا ہے۔ جوگی اپنی خاص جڑی بوٹیوں کی مدد سے اس کا علاج کرتا ہے۔ وہاں رہتے ہوئے جوگی کی شخصیت اس کے لیے دلچسپی کا باعث بن جاتی ہے، جوگی بھی اسے پسند کرنے لگتا ہے اور ایک دن اسے بتاتا ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے ہے جنہیں قدرت کچھ خاص صلاحیتوں سے نواز کر دنیا میں بھیجتی ہے۔ معاذ سے خاصی بات چیت کے بعد وہ اسے پراسرار علم سکھانے کی حامی بھر لیتا ہے اور معاذ اس یہ علم سیکھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ادھر جائے وقوعہ سے ملنے والے معاذ کے کیمرے سے جب تصویریں نکلوائی جاتی ہیں تو ایک ایسی تصویر بشریٰ کی نظر میں آجاتی ہے جس میں بہت دور ایک درخت کے پیچھے سے ایک چہرہ جھانکتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ کافی کوشش کے بعد اس چہرے کو پہچان لیتی ہے۔ یہ وہی لڑکا ہوتا ہے جو اس کو اغوا کرنے کی کوشش کرنے والوں میں شامل تھا۔ اصل میں وہ لڑکا کامران اسی شخص کا بیٹا ہے جس کے پروجیکٹ کے غیر قانونی ہونے کے سلسلے میں بشریٰ تحقیق کر رہی تھی۔ بشریٰ کے اپنے والد جرنلسٹ ہوتے ہیں۔ اس انکشاف کے بعد وہ پولیس سے رابطہ کرتی ہے۔ اس کی پاداش میں بشریٰ کو کافی نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ اس کی ماں کو بے آبرو کر کے مار دیا جاتا ہے جبکہ باپ صدمے سے جان دے دیتا ہے۔ اس سب میں باذل نامی غنڈے کا ہاتھ ہوتا ہے۔ بشریٰ انتقام لینے کی ٹھان لیتی ہے۔ ان تکلیف دہ دنوں میں ہی معاذ واپسی کا ارادہ کرتا ہے تاہم ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ ڈاکو اسے پہچان کر اس کا سودا عرفان اللہ اور یزدانی سے کرنا چاہتے ہیں۔ معاذ کو وقاص نامی ایک لڑکا وہاں سے نکال لے جاتا ہے۔ ادھر باذل اچانک بشریٰ کو چھاپ لیتا ہے اور اسے بے آبرو کر دیتا ہے۔ معاذ کو واپس لانے کے لیے اوچھے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہوئے اس کے بھائی کو اغوا کر لیا جاتا ہے اور اسے واپس آنے کا پیغام دیا جاتا ہے۔ معاذ دشمنوں کے پاس خود حاضر ہو جاتا ہے۔ وہ لوگ کسی دوسری پارٹی سے اس کا سودا کر کے اسے ان کے حوالے کر دیتے ہیں۔ قید میں معاذ سے معلومات کے نہ بتانے پر اس کے بھائی کا ایک گردہ نکال لیا جاتا ہے۔ مجبوراً معاذ کو سب بتانا پڑتا ہے۔ ادھر بشریٰ بھی سونیا خان سے مل جاتی ہے اور اس کی ٹریننگ شروع ہو جاتی ہے۔ معاذ کے دوست عالم شاہ کے بہنوئی کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ معاذ کئی فنون میں مہارت حاصل کر لیتا ہے۔ اسے ہپناٹائز کرکے اس کے دماغ پر کنٹرول کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تاہم وہ فیضو سے حاصل الوکھے علم کی بدولت ان کا معمول نہیں بنتا۔ عالم شاہ اور اس کا نوکر سرمد، باذل کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ عالم شاہ، باذل کی قید میں موجود ایک زخمی شخص کی مدد سے وہاں سے فرار ہو جاتا ہے۔ ادھر بشریٰ دبئی پہنچ جاتی ہے۔ وہاں وقاص اسے بار بی کے روپ میں پہچان لیتا ہے۔ وہ سلطان کو مارنا چاہتی ہے۔ ادھر عالم شاہ، باذل کی قید سے نکل کر اس کا پیچھا کرتا ہے۔ وہ وہاں معاذ کو دیکھتا ہے۔ معاذ کو اس کے گھر والوں سے ملنے کی اجازت دے دی جاتی ہے۔ وہ ایک مشن پر سونیا کے ساتھ انڈیا روانہ ہوتا ہے تاہم کچھ لوگ سکھ یاتریوں سے بھری بس کو یرغمال بنا لیتے ہیں۔ معاذ اور سونیا تہہ خانے کے تمام افراد کو ٹھکانے لگا دیتے ہیں۔ عالم شاہ، سہیل اور سرمد انڈیا روانہ ہو جاتے ہیں۔ ائرپورٹ سے گھر روانگی پر راستے میں کچھ لٹیرے انہیں لوٹ لیتے ہیں۔ گھر پہنچنے پر پولیس کی ریڈ ہوتی ہے اور وہ عالم شاہ اور سرمد کو لے جاتے ہیں۔ ادھر بشریٰ اور وقاص باذل کو اسپتال میں مارنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ بچ جاتا ہے۔ معاذ اور سونیا اپنے سہولت کاروں سے مل جاتے ہیں۔ عالم شاہ اور سرمد کو تشدد کا نشانہ بنا کر ویرانے میں پھینک دیا جاتا ہے۔ وہ لوگ واپس اپنے میزبانوں کے ہاں پہنچ جاتے ہیں۔ انہیں پتا لگتا ہے کہ ان کے ساتھ جو کچھ ہوا اس میں اجالا اور اس کا عاشق شامل ہوتے ہیں۔ وہ چھپ کر ان کی باتیں سن رہا ہوتا ہے کہ اسے چھاپ لیا جاتا ہے۔ تاہم وہاں مار مار کی ہوتی ہے اور اجالا کا عاشق مارا جاتا ہے۔ پولیس ان کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ ان کے کزن انہیں اپنے دوسرے خفیہ ٹھکانے پر پہنچا دیتے ہیں۔ وہ وہاں سے بحفاظت نکل جاتے ہیں۔ ادھر معاذ ایک مشن میں زخمی ہو جاتا ہے اور اسے ہندو سادھو اپنی کٹیا میں لے جاتا ہے جہاں اس کی اچھی دیکھ بھال ہوتی ہے۔ سونیا کے آدمی معاذ کو تلاش کرتے ہیں مگر ناکام ہو جاتے ہیں۔ ادھر عالم شاہ اور سرمد خفیہ ذریعے سے بارڈر پار کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ دھر لیے جاتے ہیں اور ''را'' کی قید میں پہنچ جاتے ہیں۔ بشریٰ باذل کو مارنے کی کوشش میں خود نشانہ بن جاتی ہے۔ معاذ سادھو کی مدد سے ایک انڈین ہیروئن کے گھر پہنچ جاتا ہے۔ وہیں اسے عالم اور سرمد کی گرفتاری کا پتا چلتا ہے۔ معاذ ڈاکٹر

فردوس سے ملتا ہے اور اسے سجل کی مدد کرنے کا کہتا ہے۔ علینہ اور وقاص وغیرہ کو لالہ عیسیٰ ملک سے باہر نکال دیتا ہے علینہ پاکستان میں ثوبیہ سے رابطہ کرتی ہے جو ان کے لیے مصیبت بن جاتا ہے۔ ثوبیہ پر تیزاب پھینک دیا جاتا ہے۔ وقاص، علینہ اور اس کے گھر والوں کو مار دیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر فردوس معاذ کو دیوانا نامی شخص سے مدد لینے کا کہتی ہے۔ معاذ اپنے کزن کو پاکستان کال کرتا ہے تو اسے پتا چلتا ہے کہ اس کے گھر والوں کو مار دیا گیا ہے۔ وہ اپنے دشمنوں سے انتقام لینے کی ٹھان لیتا ہے۔ ادھر ڈاکٹر فردوس کو اس کے سسرال والے سجل کو بھگانے کی پاداش میں تشدد کا نشانہ بناتے ہیں۔ معاذ، عالم اور سرمد کی رہائی کے لیے کارروائی کرتا ہے اور انہیں "را" کی قید سے نکالنے میں کامیاب ہو جاتا ہے لیکن عالم اور سرمد کو دیوا کے آدمی کسی دوسری جگہ پہنچا دیتے ہیں۔ سونیا معاذ کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ ادھر باذل ایک جگہ لالہ عیسیٰ کی موجودگی پر کارروائی کرتا ہے تاہم لالہ خود کو گولی مار کر ختم کر لیتا ہے۔ ڈاکٹر فردوس کا انتقال ہو جاتا ہے۔ دیوا گینگ ڈاکٹر فردوس کی میت اٹھنے پر وہاں فائرنگ کر دیتے ہیں۔ پولیس دیوا کو گھیر لیتی ہے۔ معاذ دیوا اور اس کے آدمیوں کو نکالنے کے عوض عالم کا پتا معلوم کر لیتے ہیں۔ سونیا اور معاذ حیدر آباد نواب بدرالدین کی حویلی پہنچ جاتے ہیں۔ وہ نواب صاحب کی حویلی میں عالم اور سرمد کی رہائی کے لیے کارروائی کر کے انہیں رہا کرا لیتا ہے۔ وہ لوگ ٹھکانے پر پہنچتے ہیں تو وہاں معاذ سے ملنے جارو نامی شخص آتا ہے۔ اسے معاذ نے "را" کی قید سے نکالا ہوتا ہے۔ جارو اور معاذ، سجل سمیت اسپتال جاتے ہیں اور پہچان لیے جانے پر پولیس ان کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ پولیس سے مقابلے کے بعد وہ ایک بستی میں پناہ کے لیے گھس جاتے ہیں اور دو لوگوں کو یرغمال بنا کر ان کی جھونپڑی میں قیام کرتے ہیں۔ ادھر سونیا معاذ کی تلاش میں نکلتی ہے اور اسے بستی میں پہنچنے پر معاذ کا سراغ ملتا ہے۔ معاذ اور جارو وغیرہ انوپ نامی شخص کے ساتھ اس کے مالک کے بنگلے میں قیام کرتے ہیں۔ سونیا بھی معلومات حاصل کرتی ہوئی مذکورہ بنگلے تک پہنچ جاتی ہے۔ عالم شاہ اور سرمد بھی سونیا کا پیچھا کرتے ہوئے وہیں پہنچ جاتے ہیں۔ ادھر لالہ، وقاص، علینہ و دیگر لوگ زندہ ہوتے ہیں۔ وقاص حلیہ بدل کر گھوڑا باڑی گارڈ بنتا ہے۔ وہ معاذ کو تلاش کرنے کے لیے انڈیا روانہ ہوتا ہے۔ وہاں اس کی گل خان سے ملاقات ہوتی ہے اور معاذ کا سراغ ملتا ہے۔ سونیا، معاذ اور دیگر ساتھیوں سے مل جاتی ہے تاہم وہ جس بنگلے میں ہوتے ہیں وہ دشمن کا ہوتا ہے۔ دشمن سب کو بے ہوش کر کے کہیں لے جا رہے ہوتے ہیں کہ ان کی گاڑی کو حادثہ پیش آ جاتا ہے۔ ان سب کو چینی بکشو طبی امداد دیتے ہیں اور ان سے پوچھ گچھ کی جاتی ہے۔ سجل کی حالت تشویشناک ہوتی ہے اور اسے وہاں موجود ایک وید دیکھتا ہے۔ ادھر لالہ واپس اپنے لوگوں میں پہنچ کر ایکشن میں آ جاتا ہے۔ باذل، معاذ وغیرہ کے ٹھکانے سے باخبر ہو جاتا ہے۔ ادھر لالہ کے آدمی میڈم ایکس کی نگرانی کے چکر میں مارے جاتے ہیں۔ لالہ اپنے آدمیوں کو انڈر گراؤنڈ کر دیتا ہے۔ باذل، معاذ کا پیچھا کرتا ہے اور چینیوں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ معاذ چینیوں کے ساتھ مل کر دشمنوں کے خلاف کارروائی کرتا ہے۔ وہ لارا نامی عورت کو بھی گرفت میں لے لیتے ہیں اور اسی سے معلومات لیتے ہیں۔ ادھر لالہ عیسیٰ، اعظم کو دشمن کی گرفت سے نکالنے کے لیے کارروائی کرواتا ہے اور موی اور نیلی، اعظم کو نکالنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ معاذ دشمنوں کے کیمپ پر حملہ کر کے وہاں قبضہ کر لیتا ہے۔ موی اور نیلی کی گاڑی پر حملہ ہوتا ہے تاہم ماراماری کے بعد وہ صداقت شاہ کے پاس پہنچنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ لالہ عیسیٰ صداقت شاہ کو حویلی پر ریڈ کا بتاتا ہے۔ صداقت شاہ اعظم کے تحفظ ٹھکانے کے لیے قربان شاہ کو فون کرتے ہیں۔ اعظم کو وہاں سے نکال لیا جاتا ہے اور دوسری جگہ منتقل کر دیا جاتا ہے۔ ادھر معاذ بیجنگ پہنچ جاتا ہے اور وہاں کے کرتا دھرتاؤں سے بات کر کے پاکستان پہنچنے کی اجازت چاہتا ہے۔ ادھر موی اور نیلی کو پولیس گھیر لیتی ہے اور فائرنگ میں موی مارا جاتا ہے۔ وہ اعظم کو لے جاتے ہیں اور نیلی زخمی حالت میں ان کے قبضے میں آ جاتی ہے۔ معاذ اور وکی وغیرہ پاکستان پہنچ جاتے ہیں اور اعظم کی بازیابی کے لیے منصوبہ بندی کرتے ہیں۔ موی کی تدفین ہو جاتی ہے۔ ادھر باذل، لالہ کی قید سے بھاگ جاتا ہے۔ معاذ، ڈی ایس پی ظہیر کے بنگلے پر دھاوا بولتا ہے اور ڈی ایس پی کو قابو کرنے کے بعد اس سے معلومات لیتا ہے۔ وہ لوگ ظہیر خان کو لے کر وہاں سے نکل جاتے ہیں۔ باذل قید سے نکل کر جہاز کے پاس پہنچتا ہے اور اسے تشدد کا نشانہ بناتا ہے۔ نیلی قید میں موجود ظہیر کو ٹھکانے لگا دیتی ہے۔ بشریٰ قبرستان جاتی ہے۔ وہاں اس کی دوست ملتی ہے۔ بشریٰ اپنی دوست کے ساتھ جا رہی ہوتی ہے کہ باذل کے آدمی اسے اغوا کر لیتے ہیں۔ ادھر معاذ سارے معاملوں کو جلد حل کرنے کے لیے دشمن کے آگے ہتھیار ڈال دیتا ہے مگر اس کے خیر خواہ اسے میڈم ایکس کے شکنجے سے نکال لیتے ہیں اور اعظم کو بھی بازیاب کر لیتے ہیں۔ زن ہوا سے اپنے ساتھ لے جاتی ہے اور وہاں کرنل سکندر بخت سے ملاقات ہوتی ہے۔ معاذ انہیں دشمنوں کے خلاف کارروائی کرنے کا کہتا ہے۔ باذل، بشریٰ کو لے کر انڈر گراؤنڈ ہو جاتا ہے۔ ادھر وقاص باذل کا پتا چلانے کے لیے ایک کال گرل سیمی کے گھر کارروائی کر کے باذل کے ٹھکانے پر پہنچ جاتا ہے۔ وہاں وکی کے ساتھی اور کوئی اور گروپ حملہ کر دیتے ہیں۔ وکی زخمی ہو جاتا ہے۔ ادھر باذل، عرفان اللہ کو گولی مار دیتا ہے اور خود بھی شدید زخمی ہو جاتا ہے۔ باذل کے ساتھی اسے ایک اسپتال کے آگے چھوڑ دیتے ہیں۔ وہیں وکی اور بشریٰ بھی داخل ہوتے ہیں۔ معاذ باذل کو پہچان کر اسے بھی وہیں ایڈمٹ کرا دیتا ہے۔ عرفان اللہ جاں بحق ہو جاتا ہے۔ عرفان اللہ کی سیکریٹری صوفیہ کو خفیہ ادارے کے لوگ اٹھا لیتے ہیں لیکن صوفیہ وہاں اپنی جان دے دیتی ہے۔ صداقت شاہ اور ان کی اہلیہ کنول کے پاس پہنچ جاتے ہیں۔ عالم، نیلی اور اعظم بھی وہیں ہوتے ہیں۔ سجل اسپتال میں زیر علاج ہوتی ہے۔ باذل کو معذوری کی حالت میں ایک چوک پر پھینک دیا جاتا ہے۔ معاذ وقاص وغیرہ کے ساتھ علینہ کے پاس پہنچ جاتا ہے اور وہیں کچھ دن گزارتا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

معاذ اپنے گھر والوں کے ساتھ وقت بتا رہا تھا۔ علینہ کو ذمے داریاں اٹھاتا دیکھ کر وہ حیران اور جذباتی ہو گیا تھا اور علینہ سے مخاطب تھا۔

''مشکل تو ہوتی ہوگی۔ میرا مطلب ہے یہاں جدید زندگی کی کوئی سہولت نہیں ہے اور نہ ہی کاموں کو آسان بنانے کے لیے مشینیں..... بلکہ یہاں تو بجلی بھی پورا سال نہیں ملتی ہے۔ مجھے علم ہوا ہے کہ سردیوں میں جب برف جم جاتی ہے تو یہاں قائم بجلی گھر کام کرنا چھوڑ دیتا ہے۔'' وہ اس طرز زندگی کے لیے تھوڑی سی تشویش میں مبتلا تھا۔

''دریا بہنا بند کر دے تو ٹربائن نہیں چل پاتے نا لیکن اس سے کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہوتا۔ حالات کے حساب سے سارے انتظامات کر لیتے ہیں لوگ۔'' علینہ نے مگن سے انداز میں اسے جواب دیا اور اسی بڑے سے ہال نما کمرے کے ایک کونے میں رکھے جھولے کی طرف بڑھ گئی۔ جھولے میں سویا اس کا بچہ کسمسا رہا تھا۔ وہ اسے تھپکیاں دے کر سلانے لگی۔

''تم اتنے فکرمند مت بنو میاں! بندہ شروع شروع جب شہر سے اس طرف آتا ہے تو اسے لگتا ہے کہ یہاں زندگی بہت مشکل اور سست ہے لیکن پھر آہستہ آہستہ وہ اس ماحول میں رچنے بسنے لگتا ہے اور اسے اندازہ ہونے لگتا ہے کہ سادگی میں کتنی سہولت اور آسانی ہے۔ یہاں چند بنیادی سہولیات کے ساتھ بہت مزے سے گزارہ ہو جاتا ہے۔ کوئی اسٹیس کی ریس نہیں ہے اور زندگی کو بہت سکون سے جیا جاتا ہے۔'' لالہ عیسیٰ نے اس کی کیفیت کو بھانپ لیا کہ وہ باپ اور بہن کے اس بالکل مختلف اور غیر ترقی یافتہ جگہ پر رہنے سے کچھ پریشان ہے اس لیے اسے تسلی دینے لگا۔

''یہاں ضرورت سے کچھ زیادہ ہی سادگی ہے۔ مجھے تو کوئی باقاعدہ بازار تک دکھائی نہیں دیا۔'' وہ حیران تھا کہ یہاں معاملات کیسے چل رہے ہیں۔

''کیونکہ یہاں اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی جاتی۔ یہاں ہر شخص اپنا نائی، دھوبی، موچی خود ہے۔ دودھ، انڈوں اور گوشت کے لیے جانور خود پالتا ہے، خود سبزیاں اگاتا ہے۔ اکثر گھروں میں کھڈی پر کپڑا بھی بنا جاتا ہے۔ جو لوگ اپنی ضرورت کی کوئی چیز خود پیدا نہیں کر پاتے وہ اشیاء کے بدلے اشیاء کے اصول کے تحت معاملات چلا لیتے ہیں پھر باہر کی دنیا میں جانے اور آنے والے لوگ بھی ہیں جن سے حسب خواہش اور ضرورت کچھ بھی منگوایا جا سکتا ہے۔'' وہ اسے یہاں کے طرز زندگی سے آگاہ کر رہا تھا۔

''لالہ عیسیٰ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں بیٹا! تم ہمارے لیے پریشان نہ ہو۔ ہم نے یہاں ایڈجسٹ کر لیا ہے اور مزے سے ہیں۔'' اس بار خاور احمد نے بھی لالہ کا ساتھ دیا۔

''مگر ابو..... تعلیم وغیرہ.....!'' وہ اب بھی ہچکچاہٹ کا شکار تھا۔

''سب ہو جاتا ہے۔ تمہارے خیال میں یہاں کے سارے لوگ اَن پڑھ ہیں۔ ایسا بالکل بھی نہیں ہے بیٹا۔ یہاں اسکول ہے جسے دو بہت ہی محنتی اساتذہ مل کر چلا رہے ہیں۔ کچھ عرصے سے میں بھی ان کے ساتھ شامل ہو گیا ہوں اور مطمئن ہوں کہ یہاں کم از کم اسکول کی سطح پر تو اچھی تعلیم دی جا رہی ہے۔ جن کو آگے پڑھنا ہو، وہ شہروں میں چلے جاتے ہیں۔ اب ہم نے سعد کو بھی تو بھجوایا ہے نا تعلیم کے لیے۔''

''خاور بھائی ٹھیک کہہ رہے ہیں معاذ! تم ان سب معاملات کی طرف سے بالکل بے فکر رہو۔ اگر کہیں کوئی کمی بیشی ہوئی تو میں اسے دیکھ لوں گا۔ دھندا چھوڑ کر یہاں آ بیٹھا ہوں تو اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے نا کہ بالکل بے اختیار ہو گیا ہوں۔ اب بھی اتنا دم ہے مجھ میں کہ تمہارا بھانجا دنیا کے جس بھی اسکول، کالج یا یونیورسٹی میں پڑھنا چاہے گا، میں اس کا ایڈمیشن وہاں کروا دوں گا۔'' لالہ نے بھی خاور احمد کی تائید کرتے ہوئے اسے یقین دہانی کروائی۔

''شکریہ لالہ! آپ کے ہونے سے بہت تسلی ہے مجھے۔ یوں تو کچھ اور لوگ بھی ہیں جو یہاں کے معاملات پر نظر رکھیں گے لیکن آپ کی بات الگ ہے۔'' معاذ کو واقعی لالہ کی موجودگی سے اطمینان تھا۔

''اصل حفاظت کرنے اور خیال رکھنے والی ذات اللہ کی ہے۔ باقی بندے تو بس اپنی اپنی ڈیوٹیاں بھگتاتے ہیں۔ اب چاہے وہ ڈیوٹی دینے والے وردی میں ہوں یا مجھ جیسے غنڈے موالی۔'' لالہ اپنی بات کہہ کر ذرا سا ہنسا۔

''خود کو اس طرح انڈر اسٹیمیٹ نہ کریں۔ میری نظر میں آپ کی بہت عزت ہے۔ آپ کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جن کی بنیاد میں اچھائی ہوتی ہے۔ ایسے لوگ کیچڑ میں رہ کر بھی کنول کے پھول کی طرح ہی ہوتے ہیں۔'' اس نے لالہ کے متعلق جو کچھ کہا تھا، اس سے وہاں موجود ہر فرد کو اتفاق تھا۔

''بس اب باتیں چھوڑ کر دھیان سے ناشتا کرو۔ میری بیٹی نے اتنی محنت سے ناشتا بنایا ہے اور تم ہو کہ اسے باتوں میں ٹھنڈا کیے جا رہے ہو۔'' وہاں ہونے والی اس ساری گفتگو کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ اس میں کسی دن معاذ کے وہاں سے رخصت ہو جانے کا ذکر چھپا تھا اور خاور احمد جانتے

تھے کہ یہ ذکر علینہ کو افسردہ کر دیتا ہے اس لیے اسے ٹوک کر اس موضوع کو ختم کرنے کا اشارہ دیا۔

''کوئی مسئلہ نہیں ہے ابو! مجھے یقین ہے کہ ٹھنڈا ہو کر بھی یہ ناشتا اتنا ہی لذیذ رہے گا۔ آخر میری بہن نے اتنی محبت سے بنایا ہے اسے اور اس کے ہاتھ میں بالکل امی کے ہاتھ کا ذائقہ ہے۔'' معاذ نے لقمہ بنا کر منہ میں رکھتے ہوئے تعریف کی تو علینہ کا بجھا ہوا چہرہ کھل اٹھا۔ باقی کا ناشتا ہلکی پھلکی خوش گپیوں میں ختم کیا گیا۔ ناشتے کے بعد علینہ برتن سمیٹنے اور صفائی ستھرائی کے کاموں میں مصروف ہو گئی اور وہ سب مرد اٹھ کر باہر آ گئے۔

''اچھا بھئی، میں ذرا اپنی مرغیوں کا حال احوال لے لوں۔ آج اسکول کی چھٹی ہے تو دڑبے کی ذرا تفصیلی صفائی کر دوں گا۔'' باہر آ کر خاور احمد یہ کہتے ہوئے مکان کے احاطے میں ہی بنائے گئے مرغیوں کے دڑبے کی طرف بڑھ گئے۔

''مجھے بھی اپنی کیاریوں کو دیکھنا ہے۔'' لالہ بھی جس نے یہاں آنے کے بعد موسم کی سبزیوں کی نئی پنیریاں لگائی تھیں ان سے الگ ہو گیا۔ وکی کے سفر کے لائق ہونے تک وہ لوگ شہر میں ہی رہے تھے۔ وہاں قیام کے اس عرصے میں معاذ تو زیادہ تر اپنی ٹریننگ میں مصروف رہتا لیکن لالہ نے تو گویا اسپتال میں ہی بوریا بستر لگا لیا تھا اور اسی وقت وہاں سے ٹلا تھا جب وکی کو وہاں سے ڈسچارج کیا گیا تھا۔

''آپ اگلی بار یہاں آئیں گے تو میں بھی آپ کو یہی سب کرتا نظر آؤں گا۔'' وکی نے جو کافی دیر سے مسلسل خاموش تھا، جھلائے ہوئے انداز میں تبصرہ کیا۔

''یہ کوئی بُرے کام تو نہیں ہیں۔ ان کاموں سے زندگی کی بنیادی ضروریات پوری ہوتی ہیں اور مفت کی سائیکو تھراپی الگ ہے۔ اب تو ماہرین خود ایسے مشاغل اختیار کرنے کو انسان کی جسمانی اور ذہنی صحت کے لیے مفید قرار دے رہے ہیں۔'' وہ وکی کی جھلاہٹ کی وجہ جانتے ہوئے بھی بے نیازی سے بولا اور قدم باہر کی طرف بڑھائے۔ وہ جانتا تھا کہ یہ گفتگو یہیں ختم نہیں ہو گی اور وہ سب کے سامنے وکی سے گفتگو کر کے ان کو ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''آپ کو شاید ایسا لگتا ہے کہ میں فزیکلی فٹ نہیں ہوں اس لیے آپ نے مجھے اپنے ساتھ لے جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا ہے لیکن میرا یقین کریں کہ میں بالکل ٹھیک ہوں اور آپ کا پورا پورا ساتھ دے سکتا ہوں۔'' گاؤں کے کچے پکے راستوں پر چلتے ہوئے وکی نے وہی گفتگو شروع کر دی تھی جس کی اسے اس سے توقع تھی۔

''نہیں، تم پوری طرح فٹ نہیں ہو۔ تمہارے صرف زخم بھرے ہیں لیکن ڈاکٹر نے صاف بتایا ہے کہ تمہیں لمبے عرصے تک احتیاط کرنا ہو گی۔''

''ڈاکٹر کون ہوتا ہے میرے بارے میں فیصلہ کرنے والا۔ یہ میرا جسم ہے اور میں اس کے بارے میں زیادہ اچھی طرح جانتا ہوں۔'' وکی کے لہجے میں ایک ضدی تھی۔

''تم محض جذباتیت سے کام لے رہے ہو ورنہ تمہاری ساری رپورٹس وہی کہہ رہی ہیں جو ڈاکٹر نے کہا ہے اور اگر طبی وجوہات نہ بھی ہوتیں تو بھی میں تمہیں اپنے ساتھ شامل نہ کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔''

''وہ کیوں؟'' اسے معاذ کے جواب نے دھچکا لگایا۔

''کئی وجوہات ہیں جن میں سے سب سے اہم وجہ یہ ہے کہ میں چاہتا ہوں کہ میرے پیچھے خاندان کی دیکھ بھال کرنے کے لیے کوئی موجود ہو۔ یہ ٹھیک ہے کہ ابو اور لالہ یہاں موجود ہیں لیکن علینہ اور تمہارے بچے کے لیے جو تم ہو، وہ کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ میری بہن کو چھوٹی عمر میں بڑے غموں اور مسائل سے گزرنا پڑا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اس کی آگے کی زندگی پُرسکون ہو۔''

''لیکن یہ تو خود غرضی ہے۔'' وکی نے احتجاج کیا۔

''کوئی خود غرضی نہیں ہے۔ لازم نہیں ہے کہ ملک کے لیے ساری قربانیاں ایک ہی خاندان دے۔ میرے گھر والوں کا بھی زندگی کی خوشیوں پر حق ہے اور میں تم سمیت کسی کو بھی ان کا یہ حق چھیننے کی اجازت نہیں دوں گا۔'' اس کے دوٹوک انداز نے وکی کو پل بھر کے لیے گنگ ہی کر دیا۔ معاذ نے ماضی میں تو کبھی اس انداز سے گفتگو نہیں کی تھی۔

''ایک اور اہم وجہ یہ بھی ہے کہ ہم نے تمہیں اس مشن کے لیے پوری طرح اہل نہیں پایا ہے۔ شیوز بان کو سیکھنا ایک ٹیسٹ تھا اور تم اس ٹیسٹ میں قابلِ ذکر کارکردگی کا مظاہرہ نہیں کر سکے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ تم میں نئی زبانوں کو تیزی سے سیکھنے کی صلاحیت موجود نہیں ہے جبکہ یہ بہت اہم ہے۔ کسی نئی جگہ خود کو ایڈجسٹ کرنے اور اپنی بقا کی جنگ لڑنے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ آپ بہت اچھی طرح نہ سہی، گزارے لائق وہاں کی زبان جانتے ہوں۔'' وہ اس وقت کسی بھی طرح کی مروت سے کام نہیں لے رہا تھا کیونکہ جانتا تھا کہ جہاں نرم پڑا، وہیں وکی کا اصرار زور پکڑ لے گا۔

''وہ تو میں زخمی ہونے کی وجہ سے پوری طرح فوکس.....'' وکی نے جھینپ کر اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش

کی لیکن معاذ نے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روک دیا۔

''اس کام میں ایسے آرگیومنٹس کی گنجائش نہیں ہوتی۔ یہ پورے ہوش و حواس میں رہ کر مرجانے یا مار ڈالنے کا کھیل ہے اور ویسے بھی.....''

''ویسے بھی کیا؟'' وکی سے اس کا لمحے بھر کا توقف بھی برداشت نہیں ہوا۔

''کرنل صاحب خود ٹیم کا انتخاب کر چکے ہیں۔ اس ٹیم میں کتنے اور کون کون لوگ شامل ہیں، یہ میں ابھی نہیں جانتا لیکن یہ طے ہے کہ وہ پروفیشنلز اور بہترین ہوں گے۔''

یہ آخری بات تھی جس کے بعد وکی کے پاس کچھ بھی کہنے کی گنجائش ختم ہوگئی اور اس کا منہ لٹک گیا۔ معاذ کو اسے یوں مایوس اور اداس دیکھنا اچھا نہیں لگا۔ اس لیے چلتے چلتے رک گیا اور اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے قدرے نرم لہجے میں بولا۔

''تم بہت باصلاحیت اور بہادر جوان ہو وکی لیکن یہ ضروری تو نہیں ہے کہ کوئی شخص دنیا کا ہر کام کر سکے۔''

''میں آپ کے ساتھ رہنا چاہتا تھا۔'' وہ بچوں کی طرح بسورا۔

''جدائی اس کائنات کی اٹل حقیقتوں میں سے ایک حقیقت ہے۔ ہم زندگی کے ہر نئے موڑ پر چاہتے یا نہ چاہتے ہوئے اپنی زندگی میں آنے والے کئی کرداروں کو چھوڑنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ میں نے بھی اپنی زندگی میں کئی قیمتی رشتے اور دوست کھوئے ہیں۔ تم بشریٰ ہی کی مثال لے لو۔ کیا کچھ نہیں کیا اس لڑکی نے میرے لیے۔ میرا بہت دل تھا کہ ایسے حالات میں جبکہ وہ اپنا بہت کچھ کھو چکی ہے، میں اس کا سہارا بنوں اور اسے زندگی کی بہت ساری خوشیاں دوں لیکن دیکھ لو کہ میں یہ سب نہیں کر سکا اور اس نے مجھ سے کوئی شکوہ کیے بغیر اپنی زندگی کی نئی راہ کا تعین کر لیا۔ اب میں اس کے لیے صرف یہ دعا کر سکتا ہوں کہ وہ جہاں بھی رہے، محفوظ اور پُرسکون رہے۔'' وہ بہت رسان سے اسے سمجھا رہا تھا۔ بالآخر وکی کے چہرے کے تاثرات بدلے اور ایسا لگا کہ وہ قائل ہونے لگا ہے۔

''اگر تم بھی بشریٰ کی طرح مجھے کسی گلٹ میں ڈالے بغیر ہنسی خوشی رخصت کی اجازت دو گے تو میں خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کروں گا۔'' اس نے لوہا گرم دیکھ کر ایک اور ضرب لگائی۔

''لیکن میں آپ کو بہت مس کروں گا۔'' وکی بے اختیار نم آنکھوں کے ساتھ اس کے گلے لگ گیا۔

''مس تو میں بھی سب کو کروں گا یار! لیکن اس اطمینان کے ساتھ کہ دنیا کے ایک خطے میں میرا چھوٹا سا خاندان آباد ہے اور اس خاندان کے افراد جب جب دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے ہیں، ان دعاؤں میں میرا نام ہوتا ہے۔'' اس نے وکی کے خلوص کے جواب میں گرمجوشی کا مظاہرہ کیا۔ قریب سے گزرتی بچوں کی ایک ٹولی نے دلچسپی سے اس منظر کو دیکھا اور بلاوجہ ہی زور سے ہنس دیے۔ ان کے ہونٹوں پر یہ بے فکر ہنسی اسی لیے تھی کہ معاذ اور معاذ جیسے کئی بے نام سپاہی ان کی بقا کے لیے اپنے سروں پر کفن باندھے دشمنوں سے برسرِ پیکار تھے۔

☆☆☆

''بس اب مزید انتظار کی گنجائش نہیں ہے۔ اب کوئی حتمی فیصلہ کرنا ہی ہوگا۔'' سفید بالوں اور سفید ہی بھوؤں والے یوان منگ نے اپنے سامنے بیٹھے عالم شاہ سے کہا تو اس کی آنکھوں میں تشویش کے رنگ تھے۔ آج سجل کو پڑنے والے بیہوشی کے دورے کے بعد عالم شاہ کو ڈاکٹر کے کمرے میں بلایا گیا تو اسے قطعی اندازہ نہیں تھا کہ وہاں اس کی یوان منگ سے ملاقات ہو جائے گی۔

''کیسا فیصلہ؟'' عالم شاہ نے ایسی سہمی ہوئی آواز میں پوچھا جیسے وہ خود اپنے سوال کا جواب نہ چاہتا ہو۔

''تمہاری بہن کی حالت کے بارے میں ہم نے پہلے بھی تمہیں بے خبر نہیں رکھا اور اب بھی تم خود دیکھ رہے ہو کہ اس کی حالت ہر گزرتے دن کے ساتھ بگڑتی جا رہی ہے۔ درد کی شدت بڑھ رہی ہے اور بیہوشی کے درمیانی وقفے گھٹتے جا رہے ہیں۔ پین کلرز نے بھی کام کرنا بند کر دیا ہے اور شاید آنے والے دنوں میں وہ سجل کی اذیت کم کرنے میں کوئی مدد نہ کر سکیں۔'' یوان منگ جو کچھ کہہ رہا تھا، وہ سب واقعی اس کے سامنے تھا لیکن اس کی زبان سے سننا زیادہ خوفناک لگ رہا تھا۔

''پھر..... پھر کیا ہو سکتا ہے؟'' الفاظ اٹک اٹک کر اس کے حلق سے برآمد ہوئے۔

''آپریشن!'' یوان منگ نے یک لفظی جواب دیا۔

''لیکن..... لیکن اس میں تو بہت رسک ہے نا؟''

اس بار بولنے سے پہلے اسے تھوک نگل کر اپنا حلق تر کرنا پڑا تھا۔ لاڈلی بہن کے ہاتھ سے زندگی کی ڈور چھوٹتی جا رہی تھی اور وہ بے بسی سے یہ سب دیکھنے کے سوا کچھ بھی کرنے سے قاصر تھا۔

''رسک تو ہے اور تمہیں یہی فیصلہ کرنا ہے کہ اس کے

سسک سسک کر مرنے کا انتظار کرو گے یا آپریشن کی اجازت دو گے۔ آپریشن کی صورت میں وہ ایک جھٹکے میں مر بھی سکتی ہے اور کوئی طبی معجزہ بھی رونما ہو سکتا ہے۔'' یوان منگ کی صاف گوئی نے اسے سر پکڑ لینے پر مجبور کر دیا۔ اس کے سامنے انتخاب ہی کیا تھا..... موت..... صرف اور صرف موت۔ اذیت بھرے زندگی کے چند دن گزار لینے کے بعد ملنے والی موت یا پھر ایک ہی جھٹکے میں آجانے والی موت۔

''آپریشن کی صورت میں ہمارے سامنے ایک نیا آپشن آیا ہے جس کی وجہ سے ہم کچھ امید باندھ سکتے ہیں لیکن اس آپشن کا استعمال تمہاری مرضی اور اجازت پر منحصر ہوگا۔'' یوان منگ نے ایک مختصر سے وقفے کے بعد جو کہا، اس نے اسے سر اٹھانے پر مجبور کر دیا۔

''اگر کوئی امید موجود ہے تو میں ایسے کسی آپشن کو استعمال کرنے سے کیوں انکار کروں گا؟'' وہ حیران تھا۔

''کیونکہ وہ آپشن خود اپنی جگہ ایک رسک ہے۔''

''پلیز، پہیلیاں نہ بجھوائیں۔ جو کہنا چاہتے ہیں وہ ایک بار میں ہی کہہ دیں۔'' وہ تھوڑا سا جھنجلا گیا۔

''اس سرجری کے لیے ہماری نگاہِ انتخاب پروفیسر اینڈریو پر جا ٹھہری ہے۔ خاص طور پر مجھے لگتا ہے کہ اینڈریو ہی وہ شخص ہے جو اس خطرناک کام کو کامیابی سے انجام دے سکتا ہے۔''

''آپ کا مطلب ہے وہ..... وہ پروفیسر اینڈریو جسے معاذ اور آپ کے ساتھی گرفتار کر کے لائے تھے اور جو ایک برف زار میں انسانوں پر گنی پگس کی طرح تجربات کرتے ہوئے انہیں کسی قصائی سے بھی زیادہ بے رحمی سے موت کے حوالے کر رہا تھا؟'' یوان منگ کے جواب نے اسے حیرت سے بھی زیادہ صدمے میں مبتلا کر دیا اور یوں اسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا جیسے اس کی دماغی حالت پر شبہ ہو۔

''اس عرصے میں میری اینڈریو سے کئی ملاقاتیں ہوئی ہیں۔ اس نے بے شک انسانی اور طبی اخلاقیات کو بری طرح پامال کیا ہے جس کے لیے میں اسے بُری طرح ناپسند بھی کرتا ہوں لیکن اس کی انسانی دماغ کے بارے میں معلومات اور مہارت ناقابلِ تردید ہے۔ وہ اس موضوع سے دیوانگی کی حد تک محبت کرتا ہے۔ ہمارے ماہرین اس پر ہر طرح کا ذہنی اور جسمانی طور پر تشدد کر کے بھی اسے اس کی مرضی کے خلاف ایک لفظ بولنے پر مجبور نہیں کر پائے لیکن جب میں اس سے انسانی دماغ پر بات کرتا ہوں تو وہ معلومات کے دریا بہا دیتا ہے۔''

''ایسا شخص کتنا ہی لائق اور ماہر ہو، اس پر کسی صورت بھروسا نہیں کیا جا سکتا اور ہمارا شمار تو ایک طرح سے اس کے دشمنوں میں ہوتا ہے۔ وہ بھلا کیوں ہماری مدد کرے گا؟'' عالم شاہ نے زور زور سے نفی میں سر ہلایا۔ اینڈریو کی جو گھناؤنی حرکات اس کے علم میں آئی تھیں، اس کے بعد وہ اس پر بھروسا کر بھی نہیں سکتا تھا۔

''میں نے اس سے سجل کا کیس ڈسکس کیا تھا۔ رپورٹیں وغیرہ بھی دکھائی تھیں اور تم اندازہ کرو کہ جس معاملے میں، میں اور میرے دیگر ہم پیشہ ننانوے فیصد ناامید ہیں، وہ اس میں تیس فیصد کامیابی کی امید رکھتا ہے۔'' یوان منگ ایک طرح سے اسے قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''اس بات کی کیا ضمانت ہوگی کہ وہ اخلاق سے عاری شخص بددیانتی سے کام نہیں لے گا اور جان بوجھ کر سجل کو موت کے منہ میں نہیں دھکیلے گا۔'' عالم شاہ کا لہجہ تلخ اور تیز تھا۔

''پہلی بات تو یہ ہے کہ اس کی سجل سے براہِ راست کوئی دشمنی نہیں ہے جو وہ اس کی جان کے درپے ہو جائے اور دوسری اس سے اہم بات ہے اس کا اپنے کام میں جنون۔ اسے لوگوں کی زندگی اور موت سے بے شک دلچسپی نہیں ہے لیکن وہ اپنی پرفیکشن ثابت کرنے کے خبط میں مبتلا ہے۔ سجل کا کیس بھی اس کے لیے ایک چیلنج کی طرح ہے اور وہ خود مجھ سے اس سرجری کے لیے خواہش ظاہر کر چکا ہے۔'' یوان منگ نے پوری صورتِ حال اس کے سامنے رکھی۔

''میں اکیلا اتنا بڑا فیصلہ نہیں لے سکتا۔ مجھے اس سلسلے میں اپنے والد سے بات کرنا ہوگی۔'' اس نے مہلت چاہی۔

''ضرور، لیکن یاد رکھنا کہ ہر گزرتا لمحہ صورتِ حال کو مزید خراب اور پیچیدہ کرتا جا رہا ہے۔'' یوان منگ نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے اسے جانے کی اجازت دے دی۔ عالم شاہ اعصاب زدہ سی کیفیت میں وہاں سے باہر نکلا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ یوان منگ، پروفیسر اینڈریو والے آپشن کی وجہ سے ہی بطورِ خاص اس سے ملنے آیا تھا اور پوری طرح قائل نہ کر سکنے کے باوجود اسے بہرحال سوچنے پر مجبور کر چکا تھا۔

''عالم صاحب!'' وہ بے خیالی میں سوچتا ہوا سجل کے کمرے سے کچھ آگے نکل گیا تھا۔ ایک نسوانی پکار نے اسے پلٹ کر دیکھنے پر مجبور کیا۔ نیلی سا ہوا چہرہ لیے اسی کی جانب دیکھ رہی تھی۔ اماں اور بابا سائیں کو تو وہ ملاقات کے اوقات کے علاوہ اسپتال میں رکنے نہیں دیتا تھا لیکن نیلی کو اعظم کی وجہ سے بطورِ خاص اجازت ملی ہوئی تھی۔ وہ اعظم کے ساتھ

ملحقہ کمرے میں موجود رہتی تھی اور جب جب سجل، اعظم سے ملنے کی خواہش کا اظہار کرتی تھی، اسے اس سے ملانے لے جاتی تھی۔ یہ ایک مرتے ہوئے انسان کو دی جانے والی خصوصی رعایت تھی۔

''کیا بات ہے نیلوفر! سب ٹھیک تو ہے؟'' کسی انہونی کا احساس اس کے دل کو دھڑکا گیا کہ نیلی کے چہرے پر لکھا اسے اچھے اشارے نہیں دے رہا تھا۔

''سجل.....'' وہ ایک لفظ ادا کر کے رک گئی۔

''کیا ہوا ہے سجل کو؟'' اس کے دل نے ایک پل کے لیے دھڑکنا ہی چھوڑ دیا اور یوں لگا کہ جس کے ہو جانے کا ڈر ہر دم جان کو سولی پر لٹکائے رکھتا ہے، وہ سانحہ ہو گزرا ہے۔

''سجل کے دائیں ہاتھ نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے۔ ڈاکٹرز کا کہنا ہے کہ ٹیومر نے ان نروز کو متاثر کیا ہے جو دماغ سے ہاتھ تک پیغام لے کر جاتی ہیں۔'' نیلی نے تفصیل بتائی تو اسے سمجھ نہیں آئی کہ بدترین کے نہ ہونے پر خوش ہو یا جو ہو چکا ہے اس پر افسوس کرے۔

واقعی اب کوئی حتمی فیصلہ ناگزیر ہو چلا تھا۔

☆☆☆

وہ اپنی جگہ ساکت لیٹی ایک ایک سیکنڈ گن رہی تھی۔ اس کا وجود اتنا ساکت تھا کہ جسم میں سانس لینے کا ارتعاش بھی پیدا نہیں ہو رہا تھا اور وہ دیکھنے میں ایسی تھی گویا کوئی مُردہ وجود لیکن اس مُردے کی ساری جان اس کی ساعتوں میں اتر آئی تھی۔ ایک ایک آہٹ پر کان لگائے وہ آس پاس کی دنیا کو ایسے محسوس کر رہی تھی جیسے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہو۔ سیل کے باہر ٹہلتا سپاہی دائیں سے بائیں جا رہا ہے یا بائیں سے دائیں، اسے اچھی طرح علم تھا۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ وہ ایک چکر لگانے کے لیے کتنے قدم چلتا ہے اور کتنے سیکنڈز میں یہ فاصلہ طے کرتا ہے لیکن اسے اس سپاہی کے معمول سے کچھ لینا دینا نہیں تھا۔ وہ دراصل اس سپاہی کی منتظر تھی جو روزانہ مقررہ اوقات میں اس کے لیے ناشتا، کھانا لے کر آتا تھا۔ آخر کار اس کا یہ انتظار ختم ہوا اور اس نے پہلے سپاہی کے قدموں کی چاپ کے ساتھ آنے والے کی چاپوں کو ملتے سنا۔ یہ نئی چاپ عین اس کے سیل کے دروازے پر آ کر رک گئی اور اس ان بریک ایبل شیشے کی سلائیڈ کے کھسکنے کی آواز سنائی دی جو محض "10"x10 کی تھی اور دن میں تین بار مقررہ اوقات میں کھلا کرتی تھی۔ اس دس انچی چوکھٹے کے آگے فائبر کا ایک مختصر پلیٹ فارم تھا جس پر کھانے کی ٹرے کھسکانے کے بعد سلائیڈ کھٹ سے بند ہو جاتی تھی۔ آج بھی اس معمول کو دہرایا گیا لیکن وہ معمول کے مطابق اپنی جگہ سے اٹھ کر ٹرے اٹھانے کے لیے نہیں گئی۔

''ماش کی دال اور لوکی کی بھجیا۔'' اس کی تیز قوتِ شامہ نے فوراً خوشبوؤں کا تجزیہ کر کے اسے ٹرے میں موجود کھانے کے بارے میں آگاہ کر دیا۔ رات کے کھانے میں دال سبزی ملنا بھی ایک معمول تھا جو اس کے یہاں قیام کے عرصے میں کبھی نہیں بدلا تھا۔ سرخ گوشت، مچھلی یا مرغی پر مشتمل کھانے دوپہر میں فراہم کیے جاتے تھے جبکہ ناشتے میں عموماً ڈبل روٹی، انڈے، مکھن، دودھ اور جیم کو ادل بدل کر پیش کیا جاتا تھا۔ قید میں اتنی معیاری اور متوازن غذا کی فراہمی ایک نعمت تھی لیکن یہ نعمت اسے محدود مقدار میں فراہم کی جاتی تھی چنانچہ اس بات کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ وہ موٹی ہو سکے۔ خود اسے بھی اپنی فٹنس کا بہت خیال رہتا تھا اس لیے اس مختصر جگہ پر بھی ممکنہ ورزشیں ضرور کرتی تھی۔

اسے علم تھا کہ جب وہ ورزش کرتی ہے تو باہر ٹہلتے سپاہی کے قدموں کی رفتار شیشے کی چوکھٹی سلائیڈ کے پاس سے گزرتے ہوئے دھیمی ہو جاتی ہے۔ صبح اور رات کی شفٹ میں ڈیوٹی دینے والے سپاہیوں کے معمول میں کبھی تبدیلی نہیں آتی تھی لیکن سہ پہر سے رات بارہ بجے تک ڈیوٹی دینے والا سپاہی اپنے دونوں ساتھیوں سے مزاجاً مختلف تھا اور جب وہ رات کے کھانے کے تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد اپنی معمول کی ہلکی پھلکی ورزشیں شروع کرتی تھی تو اس کے قدموں کی آوازیں واضح طور پر مدھم ہوتی محسوس کرتی تھی۔ سپاہی کی خود میں دلچسپی محسوس کر کے اس نے غیر محسوس طور پر اس سے دوستی کا آغاز کیا تھا۔ پہلے ایک دو دن محض مسکراہٹوں کا تبادلہ ہوا تھا پھر ہلکی پھلکی اشارے بازی ہونے لگی تھی اور آخر کار نوبت یہاں تک آ گئی تھی کہ رات گیارہ سے بارہ کے درمیان جب اس خاموش جگہ کی خاموشی، ویرانی میں بدل جاتی تھی، شیشے کا چوکھٹا کھسکتا تھا اور وہ دونوں اس کے آر پار کھڑے ہو کر ایک دوسرے سے باتیں کرتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی بے معنی اور بظاہر بے ضرر باتیں..... ان باتوں کے نتیجے میں وہ جانتی تھی کہ اس سپاہی کا نام شفیع محمد تھا۔ وہ پنجاب کے کسی چھوٹے سے گاؤں کا رہنے والا تھا اور اپنے ڈھیر سارے بہن بھائیوں کے درمیان محرومی کی زندگی گزارتا کسی نہ کسی طرح میٹرک کر کے فوج میں آ گیا تھا۔ فوج کی اس معمولی سی ملازمت نے نہ تو اسے آسودہ کیا تھا اور نہ ہی اس کی محرومی کا ازالہ۔ وہ

پچھلے کئی سالوں سے خود بے حد قناعت سے گزارہ کرتا تنخواہ کا بڑا حصہ گاؤں بھجوا رہا تھا تاکہ وہاں موجود اس کی اوپر تلے کی بہنیں بیاہی جاسکیں۔ تین بہنوں کو ان کے گھر کا کردینے کے باوجود اس کی شادی کا مستقبل قریب میں کوئی امکان نہیں تھا کیونکہ اول ابھی مزید ایک بہن شادی کے لیے باقی تھی، دوم ماں کی خواہش تھی کہ اس کی شادی سے پہلے گھر کی مرمت کرنے کے ساتھ ساتھ ایک کمرا مزید ڈال لیا جائے۔ وہ اپنی بے کیف اور بے رنگ زندگی سے بیزار تھا اور اس کے لیے یہی بہت بڑی بات تھی کہ ایک حسین ترین عورت کے حسن سے آنکھیں سینکنے کے ساتھ ساتھ اس سے بات چیت کا موقع بھی مل رہا تھا۔

اس نے شفیع محمد کو اپنے بارے میں جو معلومات فراہم کی تھیں، ان میں اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ اسے کسی بڑی غلط فہمی کے تحت گرفتار کیا گیا ہے ورنہ وہ ایک عام پاکستانی شہری ہے جس کا اس کے شوہر کی وفات کے بعد کوئی سہارا نہیں رہا تھا اور وہ شوہر کے بعد اپنے طور پر اس کے چھوڑے ہوئے کاروبار کو سنبھالنے کی کوشش کررہی تھی۔ اسے اپنی گرفتاری کی جو واحد وجہ سمجھ آتی تھی وہ یہ تھی کہ شادی سے قبل وہ افغان شہری تھی اور اس کا شوہر اپنے کاروباری دورے کے دوران اسے افغانستان سے بیاہ کر لایا تھا۔ شفیع محمد اس کے اس خیال سے اتفاق کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے لیے دل میں ہمدردی بھی محسوس کرنے لگا تھا اور اس وقت تو بالکل ڈھے جاتا تھا جب وہ آنکھوں میں آنسو بھر کر بھرائی ہوئی آواز میں کہتی تھی۔

''تمہیں نہیں معلوم شفیع کہ جب وہ مجھے انویسٹی گیشن روم میں لے جاتے ہیں تو میں کس ذہنی اور جسمانی اذیت سے گزاری جاتی ہوں۔ کبھی کبھی میرا دل چاہتا ہے کہ خودکشی کرلوں لیکن یہاں خودکشی کا سامان بھی تو میسر نہیں۔''

''رب سے مایوس نہیں ہوتے جی۔ مجھے پوری امید ہے کہ وہ آپ بے گناہ کو یہاں سے ضرور رہائی دلائے گا۔''

وہ اس کی خودکشی کی خواہش سن کر ڈر جاتا تھا اور اسے تسلی دلانے کے ساتھ ساتھ کھانا لے کر آنے والے کو بار بار یاددہانی کرواتا تھا کہ کھانے کی ٹرے میں ایسی کوئی شے موجود نہیں ہونی چاہیے جس سے وہ خود کو کوئی نقصان پہنچاسکے۔ یہ احتیاط پہلے ہی کی جاتی تھی اور ٹرے سمیت کھانے کے برتنوں میں کہیں بھی دھات کا استعمال نہیں تھا۔ چھری، کانٹوں کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا، چمچے بھی محض فائبر کے ہی مہیا کیے جاتے تھے۔

ایک روز اس نے کہا۔ ''کبھی کبھی مجھے تم سے بھی ڈر لگتا ہے شفیع! خیال آتا ہے کہ تمہارے اوپر والوں نے تمہیں مجھے ٹریپ کرنے کے لیے تعینات کیا ہے۔ شاید وہ سمجھتے ہیں کہ دوستی کے جال میں پھنس کر میں باتوں ہی باتوں میں تمہیں اپنے بارے میں کوئی کلیو دے دوں گی لیکن یقین کرو کہ ایسا کچھ ہے ہی نہیں تو میں بتاؤں گی کیا؟''

''نہ جی نہ۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اوپر والے ہم عام سپاہیوں کو عقل سے کورا سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک ہم اس لائق ہی نہیں ہیں کہ ایسا کوئی مغز ماری کا کام کرسکیں۔ ہمیں ''جاگدے رہنا تے ہوشیار رہنا'' سے آگے اوپر سے کوئی حکم ہی نہیں ملتا ہے۔'' اس کے شکوک وشبہات سے گھبرایا شفیع اپنی صفائی دینے کے چکر میں یہ بھی بھول گیا کہ وہ تو محض تاکا جھانکی کرتا تھا۔ اس تاکا جھانکی میں اشارے بازی شامل کرکے اسے دوستی تک لانے میں سارا کردار اس کا تھا۔

ایک دن اس نے پوچھا تھا۔ ''کیا یہ ٹھیک ہے شفیع کہ میرے سیل میں کوئی کیمرا یا خفیہ مائک نصب نہیں کیا گیا ہے؟''

''بالکل ٹھیک ہے جی۔ ادھر اول تو عورتیں لائی ہی بہت کم جاتی ہیں اور کبھی کوئی لائی جائے تو اس پر کیمرا نہیں لگاتے جی۔ اوپر والے مزاج کے تیکھے اور سخت بے شک ہیں پر عورت کا احترام ہر حال میں کرتے ہیں۔'' شفیع نے اپنے اعلیٰ افسران کی خوبیاں جوش وخروش سے بیان کیں جس کے جواب میں اس نے اپنی تیکھی ناک ایک ادا سے چڑھائی تھی اور زور کی ''اونہہ'' کرتے ہوئے منہ بنا کر بولی تھی۔

''سب دکھاوا ہے جو تم چھوٹے رینک کے لوگوں کو متاثر کرنے کے لیے کیا جاتا ہے ورنہ میں جو ہر دوسرے دن انویسٹی گیشن کے نام پر بلائی جاتی ہوں، مجھ سے بڑھ کر ان کے اخلاق وکردار سے بھلا کون واقف ہوسکتا ہے۔'' اس کے اس انکشاف پر شفیع کا منہ بہت دیر تک بے یقینی کے انداز میں کھلا رہا تھا لیکن اس دن کے بعد اس نے دل میں فیصلہ کرلیا تھا کہ اگر اسے اس مظلوم لڑکی کو اس قید سے نکالنے کا موقع ملا یا اس نے ایسی کوئی فرمائش کی تو وہ اس کا ہر ممکن ساتھ دے گا۔

ابھی تک دونوں میں سے کوئی بھی صورت پیش نہیں آئی تھی اس لیے روزانہ کا معمول اور شفیع کی تاک جھانک جاری تھی۔ آج بھی کھانا مہیا کرنے والے سپاہی کو واپس گئے گھنٹا بھر گزرا ہوگا کہ شفیع کی پُراشتیاق نظروں نے شیشے کے چوکھٹے سے اندر کا نظارہ کرنے کے لیے بھٹکنا شروع کردیا لیکن نظریں پلیٹ فارم پر دھری بھری ہوئی ٹرے

سے ٹکرائیں تو وہ ٹھٹک گیا۔ وہ چاہے کتنی ہی مایوسانہ باتیں کرتی تھی لیکن ایسا ایک بار بھی نہیں ہوا تھا کہ اس نے فراہم کردہ کھانا قبول نہ کیا ہو۔

شفیع کے اندر بہت سے اندیشے جاگے اور اس نے بے قراری سے قریب جا کر شیشے لگے چوکھٹے سے اندر جھانکا۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد وہ اسے اپنے فرشی بستر پر ساکت لیٹی ہوئی دکھائی دی۔ اس کی تشویش میں مزید اضافہ ہوگیا۔ جب سے وہ اس کی پہریداری پر مقرر ہوا تھا، اس نے کبھی اسے یوں بے وقت آرام کرتے نہیں دیکھا تھا۔

کچھ دیر گومگوں کی کیفیت میں رہنے کے بعد اس نے رپورٹ کرنے کا فیصلہ کیا۔ جب تک ایک کیپٹن ڈاکٹر سمیت وہاں پہنچا، شفیع محمد متعدد بار سیل کے اندر جھانک چکا تھا۔ کیپٹن آیا اور سیل کا لاک کھلا تو سب سے پہلے اندر جانے والا شخص سپاہی شفیع محمد تھا۔ اس نے ڈاکٹر سے بھی پہلے اس کا بے جان سا پڑا ہاتھ تھام کر نبض ٹٹولنے کی کوشش کی۔ نبض پر انگلیاں جمتیں اس سے قبل اس کی کنپٹی پر جما کر ایک ہاتھ پڑا اور اپنے گھومتے سر کو سنبھالنے کی کوشش میں اسے علم ہی نہیں ہوسکا کہ کب اس کے ہولسٹر سے گن نکل کر اس کے ہاتھ میں چلی گئی ہے اور وہ اسپرنگ کی طرح اچھل کر بستر سے ڈاکٹر تک کا فاصلہ طے کر چکی ہے۔

''کسی نے کوئی غلط حرکت کرنے کی کوشش کی تو ڈاکٹر کی کھوپڑی اس کی گردن پر سلامت نہیں رہے گی۔'' اس کی آواز میں جو غراہٹ تھی، اس نے شفیع کے چکراتے سر کو مزید چکرا کر رکھ دیا۔ کل تک وہ جس کی بے گناہی اور مظلومیت کے قصے سن رہا تھا، آج وہ شیرنی بنی سب کو آنکھیں دکھا رہی تھی۔

''کیا چاہتی ہو تم؟'' سب سے پہلے کیپٹن نے ہی اپنے حواس سنبھالے۔

''سیف ایگزٹ و دو سواری۔'' اس نے بھی بنا تامل اپنا مطالبہ سامنے رکھ دیا۔

''یہ نہیں ہوسکتا۔ یہاں سے نکلنا اتنا آسان نہیں ہے۔'' کیپٹن نے فوراً انکار کیا۔

''اس صورت میں ڈاکٹر زندہ نہیں رہے گا اور اسے تم میری لاسٹ وارننگ سمجھو۔'' وہ پہلے سے زیادہ خطرناک لہجے میں غرائی۔

''اس طرح تم اپنی مصیبت مزید بڑھا لوگی۔'' کیپٹن اس سے ہر صورت مذاکرات کر کے ہتھیار چھوڑ دینے پر راضی کرنے یا خود چھیننے کا موقع تلاش کر رہا تھا۔

''میں جن الزامات کے ساتھ یہاں ہوں، اس کے بعد اپنے لیے کسی آسانی کا سوچ بھی نہیں سکتی۔'' وہ صاف مرنے یا مارو دینے پر تلی ہوئی تھی۔

''مجھے اپنے آفیسر سے بات کرنا ہوگی۔'' کیپٹن نے بے بسی کا اظہار کیا۔

''میرے جانے کے بعد کرتے رہنا۔ ابھی میری راہ روکی تو نہ تم زندہ بچو گے، نہ یہ ڈاکٹر۔'' اس کا لب و لہجہ اور تیور ایسے تھے کہ شفیع ایک کونے میں کھڑا بس ٹکر ٹکر اس کی شکل ہی دیکھے جا رہا تھا۔

''باہر چلو۔'' اس نے کسی جواب کا انتظار کیے بغیر ڈاکٹر کو ٹہوکا لگایا۔ اس نے لاچاری سے کیپٹن کو دیکھا اور اس کی آنکھوں میں بھی بے بسی دیکھ کر چپکے سے قدم آگے بڑھا دیے۔ وہ خود کو پوری طرح ڈاکٹر کی آڑ میں چھپائے جس مہارت سے آگے بڑھ رہی تھی، اس سے اس کے مکمل تربیت یافتہ ہونے کا احساس ہو رہا تھا۔ اس عمارت میں بہت زیادہ لوگ نہیں تھے لیکن جو موجود تھے، ان کے لیے بھی کوئی موقع نہیں تھا کہ اسے بے بس کر کے ڈاکٹر کو اس سے نجات دلا سکیں۔ آس پاس بھگدڑ مچی تھی۔ ہاتھوں میں ہتھیار تیار تھے لیکن کسی کو ایسا کوئی زاویہ نہیں مل رہا تھا کہ ڈاکٹر کو زد میں آنے سے بچا کر صرف اور صرف اسے نشانہ بنا سکیں۔

''تمہاری گاڑی کون سی ہے؟'' باہر کھلے میں آکر اس نے وہاں موجود تین گاڑیوں کو دیکھتے ہوئے ڈاکٹر سے پوچھا۔

''وہ۔'' ڈاکٹر نے ایک سفید ٹویوٹا کرولا کی طرف اشارہ کیا۔

''چابی نکالو۔'' اس نے ڈاکٹر کو حکم دیا اور اردگرد منڈلاتے سایوں پر ایک نظر ڈال کر بلند آواز میں بولی۔

''میرے پاس موت یا آزادی کے سوا کوئی تیسرا آپشن نہیں ہے لیکن یاد رکھنا کہ اگر مجھے موت کو چننا پڑا تو سب سے پہلے ڈاکٹر کی موت کو یقینی بناؤں گی۔''

''لاک کھولو۔'' اعلان کر چکنے کے بعد اس نے ڈاکٹر کو نیا حکم دیا اور اس کے لاک کھولنے کے دوران بھی اس کے ساتھ جڑی رہی۔ ہتھیاروں کی لبلبی پر انگلی جمائے بیٹھے ہوئے افراد کے لیے اب واحد امید یہی تھی کہ وہ ڈاکٹر کو ڈرائیونگ سیٹ پر بٹھا کر خود دوسری سمت سے بیٹھنے کے لیے گھوم کر آئے گی تو وہ اسے نشانہ بنا سکیں گے لیکن اس نے یہ موقع بھی فراہم نہیں کیا۔ جیسے ہی ڈرائیونگ سائڈ کا دروازہ کھلا، وہ ڈاکٹر کو اپنے ساتھ ہی گھسیٹتی ہوئی اسی جانب سے پہلے خود اندر داخل ہوئی پھر ڈاکٹر کو بھی بٹھا لیا۔ یہ کام اس نے اتنی پھرتی سے کیا تھا کہ تاک میں بیٹھے افراد دیکھتے ہی رہ گئے

تھے۔ اس نے ڈاکٹر کو گریبان سے پکڑ کر کچھ اس انداز میں اپنے ساتھ ساتھ اندر گھسیٹا تھا کہ ڈاکٹر کا جسم اس کے لیے ڈھال بن گیا تھا۔ بیٹھنے کے بعد بھی وہ ممکنہ حد تک ڈاکٹر کے قریب رہی تھی اور اس کی کنپٹی پر گن کی نال رکھی ہوئی تھی۔ کنپٹی پر رکھا یہ ہتھیار نہ صرف ڈاکٹر کو ہر ہدایت خاموشی سے ماننے پر مجبور کر رہا تھا بلکہ آس پاس والوں کو بھی تھامے ہوئے تھا۔ وہ سب ہتھیار شناس تھے اور جانتے تھے کہ اگر انہوں نے اسے نشانہ بنایا تو وہ خود گولی نہ بھی چلائے تو گولی لگنے کے نتیجے میں اس کے جسم کو لگنے والے جھٹکے سے یہ کام خودکار طور پر بھی ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹر جیسے قابل اور معزز شخص کی زندگی بچانے کے لیے وہ خون کے گھونٹ پینے پر مجبور تھے۔ گیٹ بھی کھولنا پڑا۔ جیسے ہی ٹویوٹا کرولا گیٹ سے باہر نکلی، انہوں نے وہاں کھڑی باقی دو گاڑیوں کی طرف دوڑ لگائی۔ کھٹا کھٹ گاڑیوں کے دروازے کھلے، انجن غرائے اور تعاقب شروع ہو گیا۔

''موبائل فون ہے تمہارے پاس؟'' اس نے اپنے تعاقب میں آتی گاڑیوں کو ایک نظر دیکھا اور پھر ڈاکٹر سے سوال کیا۔ جواب اثبات میں ملا تو اگلا حکم صادر کیا۔

''اپنے کیپٹن کو کال ملاؤ اور فون اسپیکر پر ڈالو۔''

ڈاکٹر کے پاس تعمیل کے سوا کیا چارہ تھا۔ ڈرائیونگ کرنے کے ساتھ ساتھ اس نے یہ کام بھی سرانجام دیا۔

''اپنی گاڑیاں ڈاکٹر کی گاڑی سے دور رکھو۔ اگر مجھے کوئی قریب دکھائی دیا تو اس چلتی سڑک پر ایسے گولیاں برساؤں گی کہ انسانی جانیں جانے کے ساتھ ساتھ سارا ٹریفک درہم برہم ہو جائے گا اور تمہاری گاڑیوں کو راستہ نہیں ملے گا۔'' دھمکی دے کر اس نے خود ہی سلسلہ منقطع کر دیا۔

فوراً ہی فون دوبارہ بجنے لگا۔ اس نے اسے اٹھا کر باہر پھینکا اور پیچھے آتی گاڑیوں کا جائزہ لینے لگی۔ اچھے خاصے ٹریفک کے باوجود وہ اپنی تعاقب کار دونوں گاڑیوں کو پہچان سکتی تھی۔ دونوں گاڑیوں نے فاصلہ کافی بڑھا لیا تھا لیکن تعاقب بدستور جاری تھا۔

''تمہاری گاڑی میں ٹریکر لگا ہے؟'' اس نے ڈاکٹر سے سوال کیا جس کا جواب اس نے محض اثبات میں سر ہلا کر دیا۔

''ٹریکر لگا ہے، اسٹوپڈز پھر بھی پیچھا کر رہے ہیں۔'' وہ بڑبڑائی اور یکدم ہی اپنا اور گن کا رخ بدل کر ایک فائر کیا۔ پیچھے سے آتی ایک تیز رفتار گاڑی نشانہ بن کر بری طرح لہرائی۔ اس کے قریب سے گزرتی بائیک ہٹ ہو کر سڑک پر پھسلی اور بائیکر اچھل کر ایک دوسری گاڑی کے بونٹ پر جا گرا۔ وہ اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنا چکی تھی اور باقی کام لوگوں کی بوکھلاہٹ نے کر دیا تھا۔ وہاں جو افراتفری مچی تھی اس کے بعد امید نہیں تھی کہ ان کے تعاقب میں آنے والی گاڑیوں کو آگے آنے کا راستہ مل سکے گا۔

''یہ اچھا نہیں کیا تم نے۔ کئی لوگ زد میں آ گئے ہوں گے۔ شاید کوئی مر بھی گیا ہو۔'' ڈاکٹر نے افسوس کا اظہار کیا۔

''اس میں میرا نہیں، تمہارے لوگوں کا قصور ہے۔ اگر وہ میری بات مان لیتے تو اس کی نوبت نہیں آتی۔'' بے نیازی سے جواب دے کر اس نے ڈاکٹر کو سفر کی سمت سے آگاہ کیا۔ اب وہ پہلے کے مقابلے میں کافی ریلیکس تھی۔ اتفاقاً کوئی دیکھ بھی نہیں سکا تھا کہ فائر کس نے کیا ہے اس لیے سفر آرام سے جاری تھا۔

''وہ ٹریکر کے ذریعے بھی ہماری لوکیشن معلوم کر سکتے ہیں۔''

''اس کے لیے تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔'' اس کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ چمکی جسے ڈاکٹر نہیں دیکھ سکا اور اس کی ہدایت کے مطابق سفر جاری رکھا۔ چند منٹوں میں گاڑی ایک الیکی ندی پر بنائے گئے پل پر چڑھ گئی جس میں صاف پانی صرف شدید بارش کے دنوں میں ہی نظر آتا تھا ورنہ سارا سال سیوریج کے پانی کی شمولیت کے باعث آلودہ ہی دکھائی دیتی تھی۔

انسان اگر... تو...

☆ محبت کر سکتا ہے...... اگر وہ حسد چھوڑ دے۔
☆ مطمئن رہ سکتا ہے...... اگر قناعت کرے۔
☆ عزت کروا سکتا ہے...... اگر زبان قابو میں رہے۔
☆ انصاف کر سکتا ہے...... اگر موت کو یاد رکھے۔

ہم سے پوچھیے

☆ محبوب بے وفا ہو جائے تو کیا کرنا چاہیے؟
○ اپنا صدقہ اتارنا چاہیے کہ شیر کی کچھار سے زندہ نکل آئے۔
☆ کنواروں کو کرائے کے مکان کیوں نہیں ملتے؟
○ تاکہ اردگرد کے مکان خالی نہ ہو جائیں یا پھر مکان جہیز میں نہ دینا پڑ جائے۔
☆ عورت شادی سے پہلے سپنوں کی رانی ہوتی ہے اور بعد میں؟
○ کبھی نہ ختم ہونے والی بے سُری کہانی۔
☆ مرد رشتہ چھوڑتے ہیں اور عورت؟
○ قرضہ۔

(مرسلہ: محمد انور ندیم۔ اسلام نگر، حویلی لکھا، اوکاڑہ)

pklibrary.com

''یقیناً تم اپنی رہائی کے سلسلے میں سوچ رہے ہوگے؟''

''لازمی سی بات ہے۔''

''زندگی سے رہائی چاہتے ہو یا اس سے؟'' اس نے گن ذرا کی ذرا ڈاکٹر کی نظروں کے سامنے کی۔ سڑک پر آنے کے بعد سے اس نے گن ڈاکٹر کی کمپٹی سے ہٹا کر پسلیوں سے لگادی تھی کہ کسی کی نظروں میں نہ آسکے۔

''کک..... کیا مطلب؟'' ڈاکٹر اس کے سوال پر بوکھلا گیا۔

''سیدھا سا مطلب ہے، میرے ساتھ تعاون کروگے یا نہیں؟''

''اتنی دیر سے اور کیا کر رہا ہوں۔'' وہ بھنا گیا۔

''اپنی جان بچا رہے ہو۔'' اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

''تو آگے بھی میرا خودکشی کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔'' ڈاکٹر کا لہجہ جلا کٹا تھا۔

''اچھی بات ہے۔ انسان کو سب سے زیادہ اپنی زندگی کا ہی خیال ہونا چاہیے۔'' اس نے ڈاکٹر کو سراہا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔

''پل سے اترنے کے بعد تم مجھے گاڑی سے اتار دوگے اور خود سیدھے شارع فیصل تک جاؤ گے۔ وہاں پہنچنے سے پہلے تم نے کہیں رکنا نہیں ہے۔ خیال رہے میں پیچھے رکشے میں تم پر نظر رکھوں گی اس لیے مجھے دھوکا دینے کی کوشش نہ کرنا۔ شارع فیصل پر پہنچنے کے بعد تم آزاد ہوگے کہ جس کو چاہو اپنے بارے میں اطلاع دیتے پھرو۔''

''جب تمہیں رکشے میں میرے پیچھے پیچھے وہاں تک آنا ہی ہے تو بہتر ہے ساتھ ہی چلی چلو۔'' ڈاکٹر کو اس کا پروگرام کچھ سمجھ نہیں آیا اور الجھ کر بولا۔

''تم سے تمہاری رائے نہیں مانگی ہے۔'' اس نے روکھے لہجے میں جواب دیا اور پھر مطالبہ کیا۔

''اپنا والٹ میرے حوالے کردو۔'' ڈاکٹر کو بادل ناخواستہ یہ مطالبہ بھی پورا کرنا پڑا۔ اس کا پھولا ہوا والٹ بتا رہا تھا کہ اندر اچھی خاصی رقم موجود ہے۔

''بس، یہیں اتار دو۔'' اس نے پل ختم ہوتے ہی ایک قطار میں کھڑے رکشے دیکھ کر مطالبہ کیا۔ ڈاکٹر نے فوراً گاڑی کو ایسے بریک لگائے جیسے جانے کب سے اسی ایک حکم کا منتظر ہو۔ وہ گاڑی سے اتری اور لپک کر ایک رکشے میں بیٹھ گئی۔

''اس سفید کرولا کے پیچھے چلو۔'' ڈاکٹر اسے اتارتے ہی گاڑی آگے بڑھا لے گیا تھا۔ اس نے رکشے والے کو تیز لہجے میں حکم دیا۔

''کیا لفڑا ہے بی بی؟'' اس نے ٹراؤزر اور ٹی شرٹ میں ملبوس لڑکی کو شک سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کوئی لفڑا نہیں ہے۔ وہ میرا شوہر ہے اور غصے میں مجھے یہاں اتار گیا ہے۔ مجھے اس کے پیچھے جانا ہے۔'' جلدی جلدی بتا کر اس نے والٹ سے ہزار کا نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھایا تو رکشے والے نے دانت نکالتے ہوئے نوٹ تھاما اور تیزی سے رکشا آگے بڑھا دیا۔ اسے گاڑی سے اترتے ہوئے تو بہرحال وہ دیکھ ہی چکا تھا اس لیے اس کے بیان پر زیادہ شک نہیں گزرا تھا۔ اپنے پاس موجود سب سے مشکوک شے یعنی گن گاڑی سے اترتے ہوئے وہ اتنی ہوشیاری سے گاڑی میں ہی چھوڑ آئی تھی کہ ڈاکٹر کو خبر بھی نہیں ہوسکی تھی۔

''اس کے بالکل سر پر پہنچنے کی ضرورت نہیں ہے لیکن اتنے قریب ضرور رہنا کہ اسے مرر میں تمہارا رکشا دکھائی دیتا رہے اور وہ جان لے کہ میں اس کے پیچھے ہوں۔'' سفید کرولا سمیت ہر جانب نگاہ رکھے اس نے اس کی تیز رفتاری پر ٹوکتے ہوئے مکمل ہدایت دی تو اس نے ایک بار پھر دانت نکالے اور رفتار قدرے کم کردی۔ آگے وہ ایک ایسی سڑک پر پہنچ گئے جہاں ٹریفک کا بہت زور تھا اور گاڑیوں کی رفتار خود بخود ہی بہت ہلکی ہوگئی تھی۔

''میں یہاں اتر رہی ہوں لیکن تمہیں شارع فیصل تک کرولا کا پیچھا جاری رکھنا ہے۔ بے ایمانی کا سوچنا بھی نہیں۔ میں نے نمبر نوٹ کرلیا ہے۔ کام پورا نہ ہوا تو تم اور تمہارا رکشا دونوں پولیس اسٹیشن پہنچ جاؤ گے۔'' اس نے پانچ سو کا نوٹ مزید اسے تھمایا اور ساتھ دھمکی بھی لگائی۔

''آپ بے فکر رہو بی بی! اپن اپنی روزی حلال کر کے کھاتا ہے۔'' رکشا ڈرائیور نے اسے یقین دہانی کروائی لیکن وہ اس کی بات پوری سنے بغیر ہی دھیمی رفتار سے چلتے رکشے سے اتر چکی تھی۔ رکشا ڈرائیور کو اس کی پھرتی نے حیران کیا لیکن پھر وہ سر جھٹک کر آگے بڑھ گیا۔ وہ بھی چلتے ٹریفک میں راستہ بناتی سڑک پر بائیں جانب نکل گئی اور وہاں سے ایک ٹیکسی میں بیٹھ گئی۔ کئی سواریاں بدلنے کے بعد وہ مچھیروں کی ایک بستی میں داخل ہوئی تو رات اپنا اچھا خاصا سفر طے کر چکی تھی لیکن بستی میں جگہ جگہ لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ لوگ ٹی شرٹ اور ٹراؤزر میں ملبوس اس تنہا

عورت کو دیکھ کر چونکے تو ضرور تھے لیکن اس کا بے خوف و بااعتماد انداز انہیں اس کی راہ میں آنے کی ہمت نہیں کرنے دے رہا تھا۔ اس نے بستی کے ایک دروازے پر دستک دی تو متجسس آنکھوں نے جان لیا کہ وہ کیوں اتنی بے خوف دکھائی دے رہی تھی۔ اس دروازے تک آنے والے مہمان کو چھیڑنے کی کسی میں بھی جرأت نہیں تھی۔

☆☆☆

وہ پوری جانفشانی سے صحن میں رکھے لکڑیوں کے ڈھیر سے نبرد آزما کلہاڑی کی مدد سے انہیں چھوٹے ٹکڑوں میں کاٹنے میں مصروف تھا۔ مشقت سے اس کے ماتھے پر پسینا چمک رہا تھا اور ہونٹ تھوڑے سے بھنچے ہوئے تھے لیکن وہ ہاتھ روکے بغیر مسلسل اپنے کام میں مصروف تھا۔ اس مصروفیت میں دروازے پر ہونے والی بلند دستک نے خلل ڈالا۔

''بیٹا! دروازے پر دیکھو، کون ہے۔'' باورچی خانے سے زرینہ گل کی مصروف سی آواز سنائی دی تو اسے مجبوراً کلہاڑی ہاتھ سے رکھ کر دروازہ کھولنے جانا پڑا۔ سامنے خوش رنگ ملبوسات میں دو خواتین کھڑی تھیں۔ ان میں سے ایک خاتون کو وہ پہلے بھی دو ایک بار یہاں آتے ہوئے دیکھ چکا تھا اس لیے بنا کوئی سوال کیے انہیں اندر آنے کا راستہ دے دیا۔

''کون ہے عمار؟'' اندر سے زرینہ گل نے آواز لگا کر پوچھا۔

''ہم ہیں چچی جان!'' آنے والیوں میں سے ایک نے آواز لگا کر بتایا۔ وہ کسی کی بھی طرف توجہ دیے بغیر ایک بار پھر پہلے والی جگہ پر جا کھڑا ہوا اور کلہاڑی اٹھا کر دوبارہ اپنا کام شروع کرنے کا ارادہ کیا لیکن چہرے پر نظروں کی تپش نے اسے نظر اٹھا کر دیکھنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اٹھارہ انیس سال کی گلابی رنگت والی ایک لڑکی پُرتجسس نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ نظریں ملیں تو ایک پل کے لیے تھوڑی سی گڑبڑا گئی پھر سنبھل کر مسکراتے ہوئے بولی۔

''میں پری وش ہوں۔''

''جی اچھا۔'' اس نے سنجیدگی سے جواب دیا اور لکڑی کے ایک بڑے ٹکڑے پر کلہاڑی کا وار کیا۔ لڑکی جو شاید تعارف کے بعد اس کی طرف سے کسی خوشگوار ردعمل کی منتظر تھی، اس روکھے لہجے پر تھوڑی سی بجھ کر رہ گئی اور تیزی سے رخ موڑ کر اندر کی طرف چلی گئی۔ اس نے اس صورتِ حال پر ایک گہری سانس لی۔ جب سے یہاں آیا تھا کچھ اسی طرح کی صورتِ حال کا سامنا تھا۔ لوگ آتے تھے، اس سے اپنا تعارف کرواتے تھے اور جب وہ انہیں شناخت کرنے میں کامیاب نہیں ہو پاتا تھا تو مایوس سے ہو جاتے تھے۔

''عمار بیٹا! اندر آؤ۔'' اسے کچھ دیر تک اندر خواتین کے ملنے اور علیک سلیک کی آوازیں سنائی دیتی رہیں پھر زرینہ گل نے اسے پکارا۔ وہ کلہاڑی ایک جانب رکھ کر ماتھے پر آیا پسینا رومال سے پونچھتا اندر کی طرف بڑھا۔

''حکم بی بی جان!'' خواتین کی پُرتجسس نگاہوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اس نے زرینہ بی بی سے پوچھا۔

''حکم کیسا بیٹا! بس تمہیں پری وش سے ملنے بلایا تھا۔ یاد ہے نا یہ تمہیں؟ اس کے ساتھ تو تم نے اپنے بچپن کا سب سے زیادہ وقت بتایا ہے۔''

''وہ جو بنٹے کھیلتے ہمیشہ مجھ سے جیت جاتی تھی۔'' زرینہ بی بی کے تعارف کروانے پر وہ بے ساختہ بول پڑا اور اس کے اتنا بولنے پر ہی پری وش کا چہرہ کھل اٹھا۔

''لو بھئی، تم خوامخواہ اداس ہو رہی تھیں کہ عمار تمہیں بالکل بھول گیا ہے۔ اب دیکھ لو، اسے تم یاد ہو کہ نہیں یاد ہو۔'' زرینہ بی بی نے چہک کر پری وش کو جتایا تو اس کی مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی۔

''تو، تو بڑی خوش نصیب ہے پری وش! ہم نے تو عمار کو اتنا کچھ یاد کروانے کی کوشش کی تھی لیکن اسے کچھ یاد نہیں آیا تھا۔ تجھے تو فوراً پہچان گیا۔'' عمر میں پری وش سے چھ سات سال بڑی کچھ اس سے ملتے جلتے نقوش والی جوان العمر عورت نے شکوہ کرنے کے انداز میں کہا تو وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

''بچپن کے نقوش گہرے بھی تو زیادہ ہوتے ہیں نا پھر تم تو پندرہ برس کی عمر میں شادی ہو کر یہاں سے چلی بھی گئی تھیں۔ تمہارا بھی کبھار کا آنا، نکل گیا ہوگا اس بیچارے کے دماغ سے۔'' زرینہ بی بی صفائیاں پیش کر رہی تھیں اور مسلسل مسکراتی ہوئی پری وش کو دیکھ کر اس کا بھی ایک صفائی پیش کرنے کا دل چاہ رہا تھا۔ وہ اسے بتانا چاہتا تھا کہ تم میری یادداشت کے کسی خانے میں موجود نہیں ہو اور ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے جس بات کا حوالہ دیا ہے، وہ ان باتوں کی وجہ سے ذہن میں آئی تھی جو یہاں آمد کے بعد سے زرینہ بی بی اور آغا گل مسلسل کرتے رہے تھے۔ ان چند دنوں میں ماضی کے کئی واقعات اور حوالے دہراتے وہ دونوں گویا اپنے عمار کا بچپن دوبارہ جیتے رہے تھے یا پھر یہ تھا کہ اس بہانے وہ اس کی یادداشت لوٹانے کی کوشش کر رہے تھے۔

pklibrary.com

''عمار بیٹا! تم منہ ہاتھ دھو کر آجاؤ تو پھر کھانا لگاتے ہیں۔ تمہارے آغا جان بھی بس آتے ہی ہوں گے۔'' زرینہ بی بی اب اس سے مخاطب تھیں۔ وہ زبان سے کچھ کہنے کے بجائے سر ہلا کر خاموشی سے پلٹ گیا۔

''بہت تبدیل ہوگیا ہے عمار!'' پلٹتے ہوئے اس نے پیچھے سے کسی کا تبصرہ سنا اور بے ساختہ ہی پوری بات سننے کے لیے دروازے کے باہر رک گیا۔

''وقت کے ساتھ ہر انسان میں تبدیلی آجاتی ہے اور وہ بیچارہ تو پتا نہیں کن کن حالات سے گزرا ہے۔ ہمیں ہر وقت اس پر تبصرے کرنے کے بجائے اس کا ساتھ دینا چاہیے۔ مجھے یقین ہے کہ یہاں سب کے درمیان رہتے ہوئے آہستہ آہستہ اسے بہت کچھ یاد آجائے گا۔'' وہ پری وش تھی جو بہت رسان سے دوسروں کو سمجھا رہی تھی۔

'لڑکی سمجھ دار ہے۔' اس نے دل میں سوچا۔

''پری بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے۔ ویسے بھی میں تمہیں بتاؤں کہ میرا عمار صرف ظاہری طور پر بدلا ہے، فطرت اس کی وہی پہلے والی نیک ہے۔ جب سے آیا ہے مجھے لگتا ہے وہی پرانے دن لوٹ کر آگئے ہیں۔ پہلے ہی کی طرح بھاگ بھاگ کر گھر کے سارے کام کرتا ہے۔ سونے سے پہلے میرے اور اپنے آغا جان کے پاؤں دبانے کی عادت ابھی تک قائم ہے۔ آج بھی دیکھو، صبح سے لکڑیاں کاٹ کر رکھ رہا ہے کہ سیزن شروع ہونے سے پہلے سارا انتظام ہوجائے۔'' زرینہ بی بی کا لہجہ فخر و محبت میں ڈوبا ہوا تھا۔ ان کے اس انداز پر اس کا اپنا دل عجیب سا ہونے لگا اور خاموش قدموں سے چلتا وہاں سے دور ہٹ گیا۔ منہ ہاتھ دھو کر تازہ دم ہونے میں خاصا وقت لگا کر واپس آیا تو دسترخوان لگ چکا تھا اور دسترخوان کی رونق بتا رہی تھی کہ زرینہ بی بی کے تیار کردہ کھانے کے علاوہ بھی کافی کچھ موجود ہے۔ شاید وہ لوگ اپنے ساتھ کھانا بنا کر لائی تھیں۔

''آغا جان نہیں آئے ابھی تک؟'' خواتین کے درمیان تنہا بیٹھنے اور موضوعِ گفتگو بننے کے خیال سے اسے کوفت ہو رہی تھی۔

''لو آگئے ہیں۔ وہ کبھی اپنے دیے ہوئے وقت سے تاخیر نہیں کرتے، جب ہی تو میں نے دسترخوان لگوا لیا تھا۔'' اسی پل دروازے کی طرف سے کھٹ پٹ سنائی دی تو زرینہ بی بی بول پڑیں۔ وہ جلدی سے باہر کی طرف لپکا اور حسبِ عادت کچھ ساز و سامان کے ساتھ واپس لوٹنے والے آغا جان کی مدد کرنے لگا۔ چند منٹوں میں ہی وہ اس کی مدد سے منہ ہاتھ دھو کر تازہ دم ان سب کے درمیان موجود تھے۔ مہمان خواتین نے سلام کیا تو چونک گئے۔

''پری وش بیٹی بھی آئی ہے۔''

''جی آغا جان!'' وہ جلدی سے ان کے قریب آئی۔

''کالج سے چھٹیاں ہوگئیں کیا؟'' انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

''نہیں آغا جان! فون پر اسے عمار کی واپسی کی اطلاع دی تھی تو بس اس سے صبر نہیں ہوا اور دوڑی چلی آئی۔'' یہ جواب پری وش کی بڑی بہن گل وش کی طرف سے آیا تھا۔

''عمار کہاں بھاگا جا رہا تھا۔ آرام سے بتا دیتیں اسے۔ ایسے بیچ میں چھٹی لے کر آنے سے اس کی تعلیم کا حرج ہوگا۔'' ان کے چہرے پر ناپسندیدگی کے آثار دکھائی دیے۔

''کوئی بات نہیں آغا جان! میں کور کرلوں گی۔'' ان کے تاثرات کی وجہ سے پری وش کی مسکراہٹ سمٹ سی گئی تھی۔

''ہمیں ڈاکٹرز اور خصوصاً لیڈی ڈاکٹرز کی بہت ضرورت ہے بیٹی اس لیے خیال رکھا کرو کہ تمہاری ذرا سی بے پروائی تمہاری راہ میں رکاوٹ نہ بن جائے۔'' ان کی سنجیدگی اب بھی برقرار تھی۔

''چلیں ہوگئی غلطی۔ آئندہ خیال رکھے گی۔ ابھی کھانا تو کھالیں۔ آپ کے انتظار میں ٹھنڈا ہو رہا ہے۔'' زرینہ بی بی نے درمیان میں دخل دے کر فضا پر طاری بوجھل پن کم کرنے کی کوشش کی۔

''ہاں بھئی، بھوک تو بہت لگ رہی ہے اور خوشبوئیں بتا رہی ہیں کہ گل وش بیٹی نے ہمارے دسترخوان کی رونق بڑھا رکھی ہے۔'' انہوں نے اپنا لہجہ اور موڈ تبدیل کرلیا۔ ان کے بیٹھتے ہی کھانے کا سلسلہ شروع ہوا۔

''یہ جو گل وش ہے نا، یہ کھانا بنانے میں اور پری وش باتیں بنانے میں بہت ماہر ہیں۔ تمہیں تو اب یاد نہیں ہوگا لیکن جب تم لوگ چھوٹے تھے تو یہ شرارتی بلی باتیں بنا بنا کر تمہارے حصے کی چیزیں بھی کھا جاتی تھی۔'' کھانے کے دوران آغا گل نے ہلکی پھلکی گفتگو کا آغاز کردیا اور خوشگوار لہجے میں اسے بتانے لگے۔

''آغا جان.....!'' کیونکہ ان کی گفتگو پری وش کو چھیڑنے والی تھی اس لیے وہ احتجاجاً ذرا سا کسمسائی۔

''ارے تو عمار سے کیا چھپا ہے؟ یہ بیچارہ تو تمہارا سب سے بڑا شکار تھا۔'' گل وش بھی ان کی شرارت میں شامل ہوئی۔

''پر ابھی تو وہ بھول گیا ہے نا، پھر کیا ضروری ہے اسے یہ سب یاد دلانا۔'' اس نے منہ بسورا۔

''بھئی ہم اس کی یادداشت واپس لانے میں اس کی مدد کر رہے ہیں۔ اس طرح کے واقعات یاد دلانے سے ہوسکتا ہے دوسری باتیں بھی یاد آجائیں۔'' گل وش اس کی کیفیت سے پورا پورا لطف لے رہی تھی۔

''یاد دلانا ہی ہے تو وہ اپنی بچی کھچی ہنڈکلیاں یاد دلاؤ نا۔ کیسے کیسے تجربے کیے ہیں تم نے ماضی میں ہم معصوموں پر۔ تمہیں یاد ہے عمار..... ایک بار تو تمہیں اس کا بنایا پلاؤ کھا کر الٹیاں ہی لگ گئی تھیں۔ مٹھیاں بھر بھر کر تو نمک ڈالا تھا اس نے اس پلاؤ میں۔'' جوش میں وہ براہ راست اس سے مخاطب ہوگئی۔ پہلے تو وہ یوں مخاطب کیے جانے پر ذرا سا گڑبڑایا پھر دھیمے سے مسکراتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا۔

''بس کردو پری وش بچے! یہ لوگ جان بوجھ کر تمہیں چھیڑ رہے تھے اور ہر بار کی طرح تم ان کی چڑھائی میں آکر شروع ہوگئی ہو۔'' زرینہ بی بی نے درمیان میں مداخلت کرتے ہوئے اسے احساس دلایا تو وہ جھینپ سی گئی پھر خجالت مٹانے کے لیے بولی۔

''کیا کروں۔ میں ان کی طرح چالاک جو نہیں ہوں۔ بس جو دل میں آئے کہہ ڈالتی ہوں۔''

''ہا..... بدتمیز!'' گل وش نے حیرت کے اظہار کے لیے پورا منہ کھول دیا۔ ''تم آغا جان کو چالاک کہہ رہی ہو؟''

''کوئی نہیں۔ میں صرف تمہیں کہہ رہی تھی۔'' وہ بوکھلا گئی۔

''لیکن بات تو ہم دونوں کی ہی ہو رہی تھی۔'' گل وش بھی اسے بخشنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ زرینہ بی بی اور آغا گل دونوں بہنوں کی اس بحث سے لطف لیتے بھی ہنس پڑتے اور بھی بات بڑھتی دیکھ کر معاملہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرنے لگتے۔ ایسے ہی ہنستے بولتے کھانا ختم کرلیا گیا۔ اس نے براہِ راست ان دونوں بہنوں سے کوئی بات نہیں کی لیکن مسکراتا ضرور رہا۔ مسکراتے ہوئے اس کی نظر کئی بار پری کی نگاہوں سے ملی تھی۔ ان نگاہوں میں بڑا شوخ تاثر تھا۔ وہ ہر بار اس سے نظر چرا گیا۔

''اچھا بھئی اب ذرا آپ خواتین اچھا سا قہوہ تیار کرلیں۔ ہم اتنی دیر میں کچھ ضروری امور پر تبادلہ خیال کرلیتے ہیں۔'' دسترخوان سمیٹا جارہا تھا تب آغا گل نے اعلان کیا۔

''خفیہ میٹنگ۔'' پری وش نے فوراً آنکھیں نچائیں۔

''نہیں بھئی کوئی خفیہ میٹنگ نہیں ہے۔ بس عمار سے اس کے مستقبل کے متعلق تھوڑی بات چیت کرنی ہے۔ ظاہر ہے ہمارا گبرو جوان کوئی گھر میں تو بیٹھا نہیں رہے گا۔ اس کی روزی روٹی کا بھی تو کچھ انتظام کرنا ہے تو بس اسی سلسلے میں اس کی رائے لینی ہے۔'' آغا گل نے اسے وضاحت دی پھر عمار کو اپنے ساتھ لیے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ وہ اپنا ہر کام خود کرنے کے عادی تھے لیکن اسے ان کی خدمت کر کے اچھا لگتا تھا اس لیے کمرے میں پہنچ کر انہیں پھرتی اور نرمی سے تکیوں کے سہارے بستر پر بٹھایا۔

''بہت شکریہ بیٹا! لیکن یہ سب نہ کیا کرو۔ عادتیں بگڑ گئیں تو آگے زندگی زیادہ مشکل لگے گی۔'' انہوں نے جس انداز سے یہ جملہ ادا کیا، اس کے اندر کرب سا بھر گیا۔

''معذرت چاہتا ہوں۔ میری بات نے شاید تمہیں تکلیف پہنچائی ہے۔'' وہ اس کے چہرے کے تاثرات نہیں دیکھ سکتے تھے لیکن خاموشی سے احساسات بھانپ گئے۔

''برا نہیں لگا، بس یہ سوچ کر اداس ہوگیا ہوں کہ میں کبھی اپنے سے وابستہ ہوجانے والوں کے لیے وہ نہیں کرپاتا جو کرنا چاہتا ہوں یا جس سے انہیں خوش کرسکتا ہوں۔'' وہ ایک موڑھا گھسیٹ کر ان کے سامنے بیٹھ گیا۔

''جس کی منزل متعین ہو، اسے راہ میں آنے والے کسی پڑاؤ پر مستقل قیام کی اجازت نہیں ہوتی۔ تم بھی اپنی منزل پر نظریں جما کر سفر جاری رکھو۔'' انہوں نے اسے نصیحت کی پھر موضوع گفتگو بدلتے ہوئے بولے۔

''آج میں بخیامین سے ملا تھا۔ اس سے تمہاری ملازمت کے لیے بات کرلی ہے۔ نیم رضامند ہے لیکن اتنی شرط رکھی ہے کہ پہلے تمہارا تفصیلی انٹرویو لے گا پھر قابلیت وغیرہ کا اندازہ کرنے کے بعد تنخواہ طے کرے گا۔ دوست ہونے کے ناتے میں اس سے جتنی بات منوا سکتا تھا، منوا چکا ہوں۔ آگے اب سب کچھ تم پر منحصر ہے۔''

''آپ کا اتنا تعاون ہی بہت ہے۔ آگے ان شاء اللہ میں خود سب سنبھال لوں گا۔'' ان کی دی اطلاع اس کے لیے بہت کارآمد تھی جسے سن کر وہ کھل اٹھا۔

''اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو اور کامیابی تمہارے قدم چومے۔'' انہوں نے بہت خلوص سے اسے دعا دی۔ اسی وقت فضا میں قہوے کی خوشبو پھیلی اور وہ چھم سے کمرے میں چلی آئی۔

''آغا جان تو ایسے دعائیں دے رہے ہیں جیسے تمہیں ملازمت کے بجائے جہاد پر بھیج رہے ہوں۔'' اندر آتے ہوئے اس نے ان کے الفاظ سن لیے تھے اس لیے ممکن نہیں

تھا کہ ان پر تبصرہ نہیں کرتی۔

''فی زمانہ رزقِ حلال کمانا بھی کسی جہاد سے کم نہیں ہے اس لیے دعا بہت ضروری ہے۔'' آغا گل نے سنجیدگی سے اسے جواب دیا۔

''ہم کشمیریوں کے لیے تو پیدا ہونے، اسکول کالج جانے، روزگار تلاش کرنے، شادی بیاہ کرنے بلکہ سانس لینے تک، ہر کام ایک جہاد ہی ہے جسے نہ جانے کب تک جاری رہنا ہے۔''

پری وش کی شوخ رنگ شخصیت میں پہلی بار اداسی کے رنگ جھلکے جو اسے بالکل اچھے نہیں لگے اور دل میں تمنا جاگی کہ کاش وہ اس کے لیے کچھ کر پاتا لیکن اس ''کاش'' کے آگے بے بسی کے سوا کچھ تھا ہی نہیں۔

☆☆☆

دروازے کے لاک میں چابی بالکل بے آواز گھومی تھی اور آنے والا کوئی کو بغیر کسی چرچراہٹ کے دھکیل کر کوئی چاپ پیدا کیے بنا ہی برآمدے سے گزر کر باورچی خانے تک آیا تھا لیکن باورچی خانے میں کام کرتی عورت نے توے پر پھولتی روٹی کی مہک کے ساتھ گھلتی ملتی اس کی مہک کو اس کے پہلے قدم کے ساتھ ہی محسوس کر لیا تھا اس لیے جونہی وہ اس کی پشت پر آ کر کھڑا ہوا، بنا چونکے مسکراتے لہجے میں بولی۔

''آ گئے آپ؟''

''تمہیں بھلا سوال کی کیا ضرورت۔'' وہ اس صورتِ حال پر بدمزہ ہونے کے بجائے خوش ہو کر مطمئن لہجے میں بولا۔

''سارا آپ کی سنگت کا کمال ہے۔ آپ سے ہی سیکھا ہے کہ مصروف رہتے ہوئے بھی کیسے اپنے سارے حواس کو جگائے رکھنا ہے۔'' اس نے روٹی سینک کر ہاٹ پاٹ میں رکھتے ہوئے جواب دیا۔

''لیکن یہ تو حواسِ خمسہ بلکہ چھٹی حس سے بھی آگے کا معاملہ لگتا ہے۔ یہ تو میں مانوں گا نہیں کہ میں نے کوئی آہٹ پیدا کی ہوگی جس نے تم تک رسائی حاصل کر لی ہو۔'' اس نے سلاد کی پلیٹ میں سے کھیرے کا ایک ٹکڑا اٹھا کر اپنے منہ میں رکھا۔ اپنی بے حد منظم زندگی میں ان چھوٹی موٹی بے ترتیبیوں کی گنجائش اس نے خود پیدا کی تھی کہ یہ بے ترتیبیاں تعلق کی بے تکلفی کو جنم دیتی ہیں۔

''آپ ان دو کانوں کا امتحان لیتے ہیں جبکہ ہم آپ کو یہاں سے سنتے ہیں۔'' اس نے پہلے اپنے دونوں کانوں کو چھوا پھر سینے پر دل کے مقام پر ہاتھ رکھا۔

''ویری رومانٹک۔ کاش اس وقت رومانس جھاڑنے کا موقع محل ہوتا۔'' وہ بے حد ٹھنڈی سانس بھر کر بولا تو وہ ہنس دی۔ بچوں کے اسکول سے آنے کا وقت ہو چکا تھا اور کوئی دم نہیں جاتا تھا کہ وہ گھر پہنچ جاتے۔

''اچھا ہوا آپ وقت پر گھر پہنچ گئے۔ میں سوچ ہی رہی تھی کہ جانے آپ لنچ پر مجھے اور بچوں کو جوائن کر بھی سکیں گے یا نہیں۔'' تیزی سے کچن کاؤنٹر صاف کرتے ہوئے وہ اس سے گفتگو بھی کرتی جا رہی تھی۔

''سوری یار! آج میں تم لوگوں کے ساتھ لنچ نہیں کر سکوں گا۔''

''وہ کیوں؟ کیا دوبارہ کہیں جانا ہے؟'' وہ اس کا جواب سن کر چونکی اور حرکت کرتے ہاتھ خود بخود ہی رک گئے۔

''نہیں نہیں جانا۔ میرے ساتھ ایک مہمان ہے۔ اسے باہر والی بیٹھک میں بٹھا کر آیا ہوں اور چونکہ کھانے کا وقت ہے تو ظاہر ہے کھانا اسی کے ساتھ کھاؤں گا۔ تم ٹرے تیار کر دو۔'' اس نے اطلاع دینے کے ساتھ ساتھ ہدایت بھی دی تو وہ ہاتھ روک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''کیا کوئی خاص معاملہ ہے؟ آج آپ کی روانگی بھی بغیر کسی پروگرام کے ہوئی تھی اور اب یہ بغیر پیشگی اطلاع کے آنے والا مہمان!''

''تفصیلات بعد میں فرصت سے بتاؤں گا۔ پہلے تم وہ کر دو جو کہا ہے۔'' اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ فی الحال کچھ نہیں بتائے گا اس لیے اس نے مزید اصرار نہیں کیا اور وہی کرنے لگی جو اس نے کرنے کو کہا تھا۔ ابھی ٹرے تیار نہیں ہوئی تھی کہ بچے گھر پہنچ گئے۔ ماں باپ سے وعا سلام کر کے وہ حسبِ معمول اپنے کمرے کا رخ کرتے اس سے پہلے ہی اس نے انہیں مہمان کی موجودگی اور اس کے ساتھ کھانا کھانے کی اطلاع دیتے ہوئے آج لنچ پر ساتھ دینے سے معذرت کر لی۔

''اُس اوکے بابا!'' انہوں نے سلجھے ہوئے لہجے میں جواب دیا اور اپنے کمرے میں چلے گئے۔ اس دوران وہ ٹرے تیار کر چکی تھی۔ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ ٹرے اس کے ہاتھوں سے لے کر وہ باہر نکل گیا تو وہ اپنے اور بچوں کے لیے کھانے کی ٹیبل تیار کرنے لگی۔ اس کے اس کام کو انجام دینے تک بچے فریش ہو کر آ گئے۔ ان کے ساتھ کھانا کھاتے ہوئے وہ ان سے دن بھر کی روداد بھی سنتی رہی۔ آج کیا پڑھایا گیا، کون سی نئی بات سیکھی، کسے کتنے اسٹارز ملے یا کس کلاس فیلو کو کس بات پر تنبیہہ کی گئی۔ ان کے پاس روزانہ ہی

سنانے کے لیے بے شمار واقعات ہوتے تھے جنہیں وہ دونوں میاں بیوی ہی دلچسپی سے سنا کرتے تھے اور جہاں ضرورت ہوتی تھی وہاں اپنا تبصرہ بھی دیتے تھے۔ کبھی کبھی کوئی چھوٹی موٹی نصیحت یا تنبیہ کرنے کی بھی ضرورت پیش آجاتی تھی لیکن مجموعی طور پر بچے بہت مہذب تھے۔

جب اس کی شادی ہوئی تھی تو اس کی تعلیم بھی نسبتاً کم تھی اور وہ طرزِ زندگی بھی قدرے انجانا تھا جس کا اس کا شوہر عادی تھا۔ اس نے بغیر کسی دباؤ کے بہت محبت سے اس زندگی کو سیکھا تھا اور اپنی تعلیمی استعداد میں بھی بتدریج اضافہ کرتی چلی گئی تھی۔ یہ سب کرنے میں اس کے شوہر نے اس کے ساتھ بھرپور تعاون کیا تھا لیکن ساتھ ہی یہ بھی بتادیا تھا کہ اگر وہ یہ سب نہ بھی کرنا چاہے تو اسے کوئی اعتراض نہیں ہوگا اور وہ اسے جوں کا توں بھی عزت و محبت کے ساتھ قبول کرے گا۔

وہ اس سے یہ سب نہ بھی کہتا تو وہ اس بات کو جانتی تھی لیکن اسے خود کو اس کے رنگ میں رنگنا خوبصورت لگتا تھا اس لیے سب کچھ کرتی چلی گئی تھی اور آج اس لائق تھی کہ اعلیٰ طبقے کی خواتین کے ساتھ بیٹھ کر گفتگو کرتی تو کوئی محسوس بھی نہیں کرسکتا تھا کہ وہ کسی پسماندہ گاؤں میں رہنے والے ان پڑھ والدین کی اولاد ہے بلکہ اسے ان اعلیٰ طبقے کی خواتین پر یہ فضیلت حاصل تھی کہ وہ، وہ کچھ بھی جانتی تھی جس کا وہ تصور بھی نہیں کرسکتی تھی۔ پھرتی، چستی اور بے خوفی میں بھی وہ اس کے پاسنگ نہیں تھیں کیونکہ انہوں نے وہ سب نہیں دیکھا تھا جس سے گزر کر وہ یہاں تک آئی تھی اور نہ ہی انہیں ایسا جیون ساتھی میسر تھا جو ناتراشیدہ ہیرے کو کسی جوہری کی طرح تراشنے کا ہنر جانتا تھا۔

''امی! بابا کے مہمان کون ہیں؟ کیا وہ ہمیں ان سے ملوائیں گے؟'' بچوں کے پاس اسکول سے متعلق گفتگو ختم ہوگئی تو دھیان مہمان کی طرف چلا گیا۔

''میں اس بارے میں نہیں جانتی بیٹا! اگر بابا نے مناسب سمجھا اور ضرورت محسوس کی تو آپ کی ان سے ملاقات کروادیں گے۔'' بچوں کے ساتھ مصروف ہونے کے باوجود اس کا اپنا دھیان مہمان میں ہی اٹکا ہوا تھا۔ اس کی چھٹی حس اسے بتارہی تھی کہ یہ کوئی عام مہمان نہیں ہے۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اس کا شوہر بظاہر سب معاملات سے الگ ہونے کے باوجود اس چور کی طرح اپنے مقصد سے جڑا ہوا ہے جو چوری سے تو جاتا ہے لیکن ہیرا پھیری سے نہیں۔ اپنی اس ہیرا پھیری کی عادت کی وجہ سے وہ ظاہری ریٹائرمنٹ کی زندگی گزارتے گزارتے بھی کئی ایک خطرناک کاموں میں حصہ لے چکا تھا اور دو تین بار تو اس نے بھی اس کے ساتھ عملی طور پر حصہ لیا تھا۔ ایسے ہر مشن کے بعد وہ پوری دلجمعی سے کہتا تھا کہ سپاہی ریٹائر ہو بھی جائے تو آن ڈیوٹی ہی ہوتا ہے اور وطن کی پکار پر لبیک کہے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس نے اس کی اس بات سے کبھی اختلاف نہیں کیا تھا، نہ کبھی کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ اس لیے اسے معلوم تھا کہ اس کی چھٹی حس غلط اشارے نہیں دے رہی تھی اور آنے والا مہمان اپنے سنگ کوئی ہنگامہ لے کر آیا تھا۔

''میں نے اندر آتے ہوئے بیٹھک کی کھڑکی سے مہمان کی جھلک دیکھی تھی۔ ان کی بہت بڑی بڑی اور زبردست مونچھیں تھیں۔ بابا نے اگر ان سے ہماری ملاقات کروائی تو میں ان سے ان کی اتنی شاندار مونچھوں کا راز ضرور پوچھوں گا۔'' یہ چھوٹا حسیب تھا جو ماں کی سوچوں سے بے فکر اپنا پروگرام بتا رہا تھا۔

اس نے حسیب کو محبت پاش نظروں سے دیکھا پھر دونوں بچوں کو کھانا جلدی ختم کرنے کی نصیحت کرنے لگی تاکہ معمول کے مطابق ظہر کی نماز ادا کرکے کچھ دیر آرام کرسکیں۔ شام کے اوقات میں انہیں ہوم ورک اور اسپورٹس دونوں کو مینیج کرنا ہوتا تھا۔ بچے اس کی تنبیہ کے بعد جلد ہی کھانا ختم کرکے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ وہ بھی اپنے معمولات سے فارغ ہوکر ذرا سا ستانے کے لیے لیٹی تو وہ چلا آیا۔

''چلا گیا آپ کا مہمان؟'' اس کی کوشش تھی کہ بہت زیادہ متجسس محسوس نہ ہو اس لیے موبائل اٹھا کر بے وجہ اسکرولنگ کرتے ہوئے بظاہر بے نیازی سے سوال کیا۔

''نہیں، اب وہ یہیں رہے گا۔'' جواب نہیں، دھماکا تھا جس نے اسے گنگ کردیا۔ ان کے ساتھ گھر کے افراد کے سوا کبھی کوئی مستقلاً نہیں رہا تھا۔ یہاں تک کہ ملازمین بھی نہیں۔ گھر کے عام کام کاج میں مدد کرنے والوں سے لے کر مالی تک سب ہی جز وقتی کام کرنے والے تھے۔ یہاں تک کہ چوکیدار کی جگہ بھی خودکار حفاظتی نظام اور اپنی ذات پر انحصار کیا جاتا تھا۔

''لیکن کیوں؟'' مشکل سے سوال اس کے ہونٹوں سے نکلا۔

''یہ پوچھنے سے پہلے یہ پوچھو کہ آخر وہ ہے کون جسے میں اپنے ساتھ رکھنے پر اتنے آرام سے تیار ہوگیا ہوں۔'' وہ گویا اس کی حالت سے حظ اٹھا رہا تھا۔

"کون ہے وہ؟" اس کا دل بلاوجہ ہی دھڑکا۔ جواب میں اس نے اسے ایک نام بتایا۔

"خان...... سچ سچ خان آیا ہے آپ کے ساتھ؟" نام جان کر وہ پُرجوش ہوگئی۔ زمانہ گزر گیا تھا ماضی سے تعلق رکھنے والی جانی پہچانی شکلوں کو دیکھے۔

"کیسے ملا وہ آپ کو؟ کیا اچانک ہی سامنا ہوگیا؟"

"اچانک سامنا نہیں ہوا۔ میں نے خود اس سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔" جواب معنی خیز تھا۔

"لیکن کیوں؟ کیا آپ نے اس سے اپنا تعارف کروایا تھا؟" جوش میں وہ معمول سے زیادہ سوالات کررہی تھی ورنہ یہ بات اسے بھی معلوم تھی کہ ضرورت کی ہر بات وہ خود اسے بتائے گا۔

"تعارف کی ضرورت نہیں تھی اور رہی کیوں کی بات تو اس کا جواب ذرا تفصیلی ہے۔" وہ بے حد سنجیدہ محسوس ہورہا تھا۔

"اس نے آپ کو پہچانا نہیں؟" تجسس اور جوش انسان کو بچہ بنادیتے ہیں، وہ بھی بنی ہوئی تھی۔

"وہ پہلے نہیں پہچان سکا تھا تو اتنے برسوں بعد کیسے پہچان جاتا۔ اب تو میں اور بھی زیادہ تبدیل ہوچکا ہوں۔"

"لیکن مجھے تو پہچان لے گا۔" اس نے خدشہ ظاہر کیا۔

"میں نے اسے بتادیا ہے کہ میری بیوی پردہ کرتی ہے اس لیے اسے احتیاط کرنی ہوگی اور خود کو گھر کے بیرونی حصے تک ہی محدود رکھنا ہوگا۔ وہ وضع دار آدمی ہے اس لیے مجھے معلوم ہے ہر ممکن احتیاط کرے گا۔" اس نے ذرا سا توقف کیا پھر مزید بولا۔ "ویسے بھی بس چند دن کی ہی بات ہے پھر میں اور تم بہت مصروف ہوجائیں گے، ہوسکتا ہے آگے جاکر لمبے عرصے تک گھر ہی واپس نہ آسکیں۔ ایسے میں خان کا یہاں ہونا مجھے مطمئن رکھے گا۔"

"مطلب ہم کسی مشن پر جارہے ہیں؟" اس نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے نتیجہ اخذ کیا۔ جواباً اس نے صرف اثبات میں سر ہلایا۔ اس بار وہ بھی کچھ بولنے کے بجائے ماتھے پر ہلکی ہلکی شکنیں لیے سوچ میں ڈوبی بیٹھی رہی۔

"اگر تم نہ جانا چاہو تو منع بھی کرسکتی ہو۔"

"لیکن میں کیوں جانا نہیں چاہوں گی؟" وہ اس پیشکش پر حیران ہوئی۔

"میں نے سوچا شاید بچوں کی وجہ سے۔"

"بچوں کے لیے جس نے آج تک اچھا انتظام کیا ہے، آگے بھی وہ سب سنبھال لے گا۔ بچے مجھے عزیز ضرور ہیں لیکن میں خود کو ان کی یا ان کو خود کی کمزوری نہیں بنانا چاہتی۔ اللہ نے چاہا تو ہمارے پیچھے بھی ان کی اچھی دیکھ بھال ہوجائے گی۔"
وہ درمیان میں ہی اس کی بات کاٹ گئی۔

"میرے ذہن میں بھی یہ بات تھی اس لیے اس حوالے سے بھی کچھ نہ کچھ بندوبست کرآیا ہوں۔ کل ایک خاتون یہاں آئیں گی۔ تم انہیں ضروری ہدایات دے دینا۔ اچھا ہے ہماری روانگی سے قبل ان کی ٹریننگ اور بچوں سے اٹیچمنٹ دونوں ہوجائیں تاکہ بچے زیادہ ڈسٹرب نہ ہوں۔" اس کا ہر ایک شے پر دھیان تھا۔

"مشن کے متعلق کوئی تفصیل......؟"

"آہستہ آہستہ دوران تربیت بریفنگ ملتی رہے گی۔ تم اس بارے میں زیادہ فکر کرنے کے بجائے بچوں کی ذہن سازی پر توجہ دو۔ ہماری دوری ان کے لیے صدمہ نہیں بننی چاہیے۔" وہ بچوں کی طرف سے فکرمند تھا۔

"میں انہیں سمجھادوں گی بلکہ پہلے بھی باتوں باتوں میں کئی بار باور کرواچکی ہوں کہ ہوسکتا ہے کبھی مجھے اور تمہارے بابا کو اعلیٰ تعلیم کے لیے ملک سے باہر جانا پڑ جائے تو تم لوگ اداس نہیں ہونا اور ہماری کامیابی کی دعا کرنا۔" وہ بے حد اعتماد کا مظاہرہ کررہی تھی لیکن اندر سے جانتی تھی کہ سب سے مشکل مرحلہ بچوں کو چھوڑ کر جانے کا ہی ہے۔ مشکلیں ان کا اور وہ مشکلوں کا انتخاب کرتے ہی رہتے تھے۔

☆☆☆

نجل نے اپنے سامنے موجود ایک ایک چہرے کو غور سے دیکھا۔ ماں، باپ، نیلی اور نیلی کی گود میں موجود اس کا اکلوتا لخت جگر اعظم شاہ۔ سب کے چہروں سے پھسلتی اس کی نظریں اعظم کے چہرے پر پڑیں تو تھم سی گئیں۔ اس لیے نہیں کہ وہ ان سب چہروں میں اس کو سب سے پیارا تھا بلکہ اس لیے کہ یہ واحد چہرہ تھا جس پر مسکراہٹ کے ساتھ ساتھ بے فکری کے رنگ پھیلے تھے۔ موت کے خوف سے سپید پڑے چہروں کے درمیان زندگی کے رنگوں سے رنگا یہ چہرہ امید کا استعارہ تھا۔

"اسے مجھے دو۔" اس نے اپنا واحد حرکت کرنے والا ہاتھ آگے بڑھا کر نیلی سے اعظم کو مانگا۔ نیلی نے بے حد احتیاط سے اعظم کو اس کے حوالے کیا اور مزید احتیاط برتتے ہوئے بیڈ کے قریب ہی کھڑی رہی کہ کہیں وہ شرارت اور اچھل کود میں نجل کے قابو سے باہر ہوکر نیچے نہ گرجائے۔

"اعظم اما کو ایک پاری کرو۔" بیٹے کو گود میں لے کر اس نے پہلے اسے ایک بوسہ دیا پھر اس سے فرمائش کی۔

pklibrary.com

اعظم کی اس مختصر عرصے میں اس سے کئی ملاقاتیں کروائی گئی تھیں اس لیے اب وہ نہ صرف اسے پہچاننے لگا تھا بلکہ بہت تیزی سے قریب بھی ہوا تھا۔ شاید ماں کی فطری کشش نے خود بخود ہی درمیانی عرصے کا خلا دور کر دیا تھا۔ اب بھی سجل کی فرمائش پر اس نے جھٹ اس کے رخسار پر بوسہ دیا اور اپنی توتلی زبان میں کچھ کہنے لگا۔

'اس زندگی میں لاکھ درد سہی پھر بھی یہ خوبصورت ہے کیونکہ اس میں تم ہو۔' سجل نے اس کے چہرے کو نظروں میں سموتے نم پلکوں اور مسکراتے لبوں کے ساتھ سوچا۔ اس کی سوچ کا عکس اس کے چہرے پر اتنا واضح تھا کہ درد سکینہ شاہ کے لیے ناقابلِ برداشت ہو گیا اور لبوں سے ایک دبی دبی سی سسکاری نکلی۔ فوراً ہی عالم کا ہاتھ دلاسا دینے کے لیے ان کے شانے پر آیا جبکہ صداقت شاہ نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبا کر ایک خاموش تنبیہ کی۔ ان کی بیٹی زندگی کی جنگ لڑنے جا رہی تھی اور وہ چاہتے تھے کہ اس کے پاس زادِ راہ کے طور پر صرف اور صرف ہمت و حوصلہ ہو۔ وہ آنسوؤں کو درمیان میں لا کر اس کی امید کو کم نہیں کرنا چاہتے تھے۔

''میں اعظم سے صرف ایک طرف پیار لے کر جا رہی ہوں اماں سائیں! دوسرے گال پر اس وقت پیار لوں گی جب آپریشن کے بعد آنکھیں کھول کر اس کا چہرہ دیکھوں گی۔'' اس نے سکینہ شاہ کی دبی دبی سسکی سن لی تھی اور اب انہیں بڑی حوصلہ دیتی نگاہوں سے دیکھتی دل میں امید جگا رہی تھی۔

''کیوں نہیں دھی رانی! رب سائیں کے حکم سے تیری یہ چاہ ضرور پوری ہوگی۔'' سکینہ شاہ کو اپنی آواز کی بھراہٹ پر قابو پا کر اسے جواب دینے میں خاصی مشکل پیش آئی تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ جب سے انہیں اس کی بیماری کی نوعیت اور ڈاکٹرز کے خدشات کا علم ہوا تھا، وہ مسلسل روتی رہی تھیں۔ ان کی طبیعت بھی کافی بگڑ گئی تھی لیکن پھر صداقت شاہ نے انہیں باور کروا دیا تھا کہ اگر وہ اسی طرح کے رویے کا مظاہرہ کرتی رہیں تو وہ انہیں واپس پاکستان بھجوا دیں گے اور ظاہر ہے اس صورت میں وہ سجل سے دور ہو جاتیں اس لیے خاصی حد تک اپنے اعصاب پر قابو پا لیا تھا۔

''کاش مومل بھی یہاں ہوتی۔'' اسے اس وقت چھوٹی بہن کی کمی بہت محسوس ہوئی۔

''سمجھو یہیں ہے۔ لو اس سے بات کر لو۔'' اپنے سیل فون پر مسلسل مصروف عالم نے فون کی اسکرین اس کے سامنے کی تو وہ مومل کا چہرہ نظروں کے سامنے پا کر کھل اٹھی۔

مومل بھی باقی سب کی طرح اداس اور پریشان تھی لیکن اس سے اپنے جذبات چھپائے ہلکے پھلکے لہجے میں باتیں کرتی رہی۔ چند منٹ کی اس ویڈیو کال میں اس نے دو بار سب کو ہنسنے پر بھی مجبور کر دیا۔ اس کال کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا تھا کہ کمرے کا ماحول خاصا بدل گیا تھا اور تناؤ میں واضح کمی دیکھی جا رہی تھی۔

کال ختم ہونے کے بعد سب اس سے باری باری ملے اور بہت ساری دعائیں دیں۔ وہ حوصلے سے مسکراتی سب کا پیار اور دعائیں قبول کرتی رہی۔ یہ اس کا ہی حوصلہ تھا کہ جو فیصلہ سارے مل کر نہیں کر پا رہے تھے، اس نے منٹوں میں کر لیا تھا اور اس فیصلے کے نتیجے میں پروفیسر اینڈریو سے اپنا ٹیومر آپریٹ کروانے جا رہی تھی۔

''میرے اعظم کا بہت خیال رکھیے گا اوا سائیں!'' جب عالم اس سے ملنے لگا تو اس کی آواز ذرا سی کانپی۔

''بالکل بھی نہیں۔ یہ کام تمہیں خود کرنا ہوگا۔'' ضبط کی کوشش میں عالم کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔

''جو رب سائیں کی رضا۔'' بوڑھے ماں باپ کے کمزور دلوں کا خیال کر کے اس نے خود کو مضبوط کر لیا تھا لیکن مضبوط جوان بھائی کا سر پر رکھا ہاتھ اسے کمزور کرنے لگا تھا۔

''رب سائیں ضرور ہم پر مہربانی کرے گا۔'' عالم نے اسے یقین دلایا اور بے ساختہ گلے سے لگا لیا۔ سجل کی آنکھوں سے کئی آنسو نکل کر اس کے شانے پر گرے۔ صداقت شاہ اس لمحے سے پہلے سکینہ شاہ کو تھام کر کمرے سے باہر لے گئے تھے کہ ان کے لیے اب مزید ضبط سے کام لینا مشکل ہو گیا تھا۔

''اعظم پریشان ہو رہا ہے۔'' نیلی نے دھیرے سے ان دونوں کی توجہ مبذول کروائی تو وہ خود کو سنبھالنے لگے پھر عالم نے بسورتے ہوئے اعظم کو گود میں لے کر چوما۔

''میں اپنے ہیرو کو لے جا کر چاکلیٹس دلاتا ہوں۔ موڈ بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔''

''چاکلیٹس بچوں کے لیے نقصان دہ ہوتی ہیں۔'' نیلی نے اسے ٹوکا۔

''کبھی کبھی کی بے احتیاطی چلتی ہے۔'' وہ ان سنی کرتا ہوا باہر نکل گیا۔ کچھ دیر بعد سجل کو آپریشن کے لیے لے جایا جانے والا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ جاتے جاتے وہ اپنے بیٹے کا خوش اور مسکراتا ہوا چہرہ دیکھ کر جائے۔

''آپ بہت لکی ہیں کہ آپ کے مشکل وقت میں آپ کے سارے چاہنے والے آپ کے قریب ہیں۔''

نیلی، عالم کے اس انداز پر ہنسی اور سجل سے بولی۔

''سب کہاں؟ کوئی ہے جو قریب نہیں ہے۔'' سجل کی آواز سرگوشی سے بلند نہیں تھی لیکن نیلی چونک سی گئی اور اس کی چھٹی حس نے اسے بتایا کہ وہ اس سے کچھ بہت خاص کہنے جارہی ہے۔

''کون؟ کس کی بات کررہی ہیں آپ؟'' تجسس کے باوجود اس نے سوال کرنے میں دھیمے پن سے کام لیا۔

''وہی جو زبان سے جتاتا نہیں ہے لیکن جس کا اپنے لیے فکرمند ہونا مجھے ہمیشہ محسوس ہوتا ہے۔''

''تعلق گہرا ہو تو زبان سے جتانے کی ضرورت ہی کہاں پڑتی ہے۔'' نیلی دل کے راگ کا شعور رکھتی تھی اس لیے بہت تیزی سے اس کی بات سمجھ گئی۔

''ٹھیک کہا تم نے لیکن ایسا تعلق سامنے والے کو بہت مقروض کردیتا ہے۔ میرا بھی بال بال قرض میں جکڑا ہوا ہے۔''

''کیا اس قرض کی ادائیگی کی کوئی سبیل نکالنا چاہتی ہیں؟'' اس نے دنیا دیکھی تھی، کیسے نہ سمجھتی کہ سجل شاہ ایک ایسے موقع پر جبکہ موت اس سے چند قدموں کے فاصلے پر ہی کھڑی تھی، کچھ بوجھ اتارنا چاہتی تھی۔

''یہ اس تک پہنچا دینا۔ اعظم اب محفوظ ہاتھوں میں ہے لیکن ان کو ابھی ایک لمبی جنگ لڑنی ہے۔ انہیں اس کی اعظم سے کہیں زیادہ ضرورت ہے۔'' اس نے کپڑے میں لپٹا وہ طلسماتی پتھر نیلی کے حوالے کیا جو ایک ہندو جوگی نے معاذ کو دیا تھا اور معاذ نے اعظم کی حفاظت کے خیال سے اپنی پروانہ کرتے ہوئے اسے اعظم کے بازو پر باندھ دیا تھا۔

''بس یہی پہنچانا ہے؟'' نیلی کو کسی ادھورے پن کا احساس ہوا۔

''یہ بھی پہنچا دینا۔'' سجل نے ایک تہ کیا ہوا بند لفافہ کانپتے ہاتھوں سے اس کے حوالے کیا۔ لفافہ تھماتے ہوئے اس کا چہرہ اتنا جھکا ہوا تھا کہ نیلی اس کی آنکھوں میں نہیں دیکھ پارہی تھی۔

''یہ ایک مناسب فیصلہ ہے سجل جی! لمبی راہ کے مسافر کے پاس کچھ تو زادِ راہ ہونا ہی چاہیے۔'' نیلی نے آہستہ سے اس کا ہاتھ دبایا۔ وہ اندازہ کرسکتی تھی کہ ایک مخصوص ماحول میں پرورش پانے والی لڑکی جو ہمیشہ پردے میں رہی تھی اور جس نے ہمیشہ بڑوں کی مرضی پر اپنا سر جھکایا تھا، اپنے دل کی ذرا سی مان لینے پر کس کیفیت کا شکار ہوگی۔

''میں جانتی ہوں، اسی لیے تو اتنی ہمت کی ہے۔ اب یہ تمہاری ذمے داری ہے کہ میرے وقار پر کوئی آنچ آئے بغیر یہ کام انجام دے سکو۔'' عزت و ناموس کی فکر اب بھی دامن گیر تھی۔

''میں سب سمجھتی ہوں۔ آپ نے مجھ پر بھروسا کیا ہے تو بس بے فکر بھی ہوجائیں۔'' نیلی نے اسے تسلی دی۔

اس کے بعد ان کے درمیان اس موضوع پر مزید گفتگو نہیں ہوئی۔ موقع ہی نہیں ملا کہ عملے کے ایک مرد نے آکر مطلع کردیا تھا کہ اب فیملی اینڈ فرینڈز سے ملاقات کا وقت ختم ہوچکا ہے اور عملے کو اپنی کارروائی کا آغاز کرنا ہے۔ اس لمحے کے بعد وہ سب بس دور سے ہی اسے آپریشن تھیٹر میں جاتا ہوا دیکھ سکے۔

جدید طرز کے اس آپریشن تھیٹر میں داخل ہونے کے بعد اس نے بھی باہر موجود ہر فرد سے اپنی توجہ ہٹالی۔ اب وہ اپنی ساری توانائیاں موت سے پنجہ لڑانے میں صرف کرنا چاہتی تھی۔

''ہیلو بے بی! امید ہے تم خوفزدہ نہیں ہوگی۔'' مستعد عملہ ماہرانہ انداز میں اپنا کام شروع کرچکا تھا۔ اس کے جسم سے کئی نالیاں اور مشینوں کے تار منسلک کیے جاچکے تھے جب اس نے انگریزی میں کہا گیا یہ جملہ سنا اور آواز کے ماخذ کی تلاش میں اپنی نظریں اِدھر اُدھر گھما گیں۔

''میں آپ کو اینستھیسیا دینے لگا ہوں۔ خود کو مکمل پُرسکون رکھنے کی کوشش کریں۔'' اس کے سر کی جانب کھڑے شخص نے بھی اسے انگریزی میں ہی مخاطب کیا تھا لیکن لہجہ اور تلفظ بالکل مختلف تھا۔

''سنا ہے سکون صرف قبر میں ملتا ہے۔'' یہ ہنستی ہوئی طنزیہ اور بے رحم آواز وہی پہلے والی تھی۔ اس بار بولنے والا اسے دکھائی بھی دے گیا۔ سرجنز کے مخصوص لباس میں، چہرے پر ماسک لگائے وہ اپنے سفید براق بالوں کو مخصوص کیپ سے ڈھانپ رہا تھا۔ سجل کو ایسا لگا اس نے موت کے فرشتے کو مجسم دیکھ لیا ہو۔ اس نے اس کی گرفت میں آنے سے قبل اٹھ کر بھاگنا چاہا لیکن دماغ پر چھائی دھند نے بے بس کرکے رکھ دیا۔ اسے بے ہوشی کی دوا دی جاچکی تھی اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ واپس ہوش کی دنیا تک کا سفر طے بھی کرسکے گی یا نہیں۔

☆☆☆

وہ دو بچوں کی مسکراتی ہوئی تصویر تھی۔ لڑکا عمر میں بڑا تھا اور تصویر میں بھی اندازہ ہورہا تھا کہ اس کے ہاتھ میں کوئی نقص ہے۔ اس کے چہرے کے تاثرات بھی عام بچوں سے قدرے مختلف تھے۔ دراصل وہ ذہنی طور پر پوری طرح

نارمل نہیں تھا لیکن اسے ایک اچھی زندگی دینے کی پوری پوری کوشش کی گئی تھی اور یہ کوشش اس کے صاف ستھرے لباس اور مسکراہٹ دونوں سے عیاں تھی۔

لڑکے کے مقابلے میں لڑکی زیادہ خوبصورت اور شوخ و چنچل دکھائی دیتی تھی۔ اس کی چمک دار آنکھوں سے ذہانت اور شرارت پھوٹی پڑ رہی تھی۔ صاف محسوس ہوتا تھا کہ اس کے ہونٹوں پر موجود مسکراہٹ اپنی کسی شرارت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے پھوٹی ہے۔

''تم دونوں چند برس کے لیے ہی میرے آنگن میں پھول بن کر مہکے لیکن آج بھی میرے روم روم میں تمہاری خوشبو بسی ہوئی ہے۔'' تصویر والا البم ہاتھ میں لیے بیٹھی عورت نے اس پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جیسے انگلیوں سے ان بچوں کے نقوش کو چھونے کی کوشش کی۔ وہ عورت ماہ بانو تھی، شہریار عادل کی ماہ بانو..... جس نے ایک طویل دورِ آشوب کے بعد شہریار کی چھپر چھاؤں میں سکون پایا تھا لیکن وہ شاید ان لوگوں میں سے تھی جنہیں خدا آزمائشوں کے لیے چُن لیتا ہے۔

اس کی نئی آزمائش اس حادثے کی صورت آئی تھی جو اس سے مجاہد اور عائشہ دونوں کو چھین کر لے گیا تھا۔ کتنے عرصے تک تو دونوں میاں بیوی کو سمجھ ہی نہیں آ سکا تھا کہ ان کے ساتھ کیا ہو چلا ہے پھر دھیرے دھیرے دونوں نے ایک دوسرے کی خاطر جینا سیکھ لیا تھا۔ ایک دوسرے کو سنبھالتے وہ پہلے سے بھی زیادہ ایک دوسرے کے قریب آ گئے تھے۔ کچھ سہارا ان فلاحی کاموں کی مصروفیات نے دیا تھا جو انہوں نے شادی کے آغاز سے ہی اختیار کر لی تھیں پھر ایک دن شہریار، صہیب اور حسیب کو لے آیا تھا۔ ان دونوں بھائیوں نے اپنے والدین ایک حادثے میں کھو دیے تھے۔ یوں دو ادھورے خاندان مل کر ایک مکمل خاندان بن گئے تھے اور زندگی میں مسکراہٹیں لوٹ آئی تھیں۔ ان مسکراہٹوں کی گہرائی میں جو درد تھا، اسے کوئی بھی نہیں چھیڑتا تھا لیکن بعض اوقات درد کو خود بخود ابھر آنے کا موقع مل جاتا ہے۔ مشابرم خان کی آمد کے بعد یہی ہوا تھا۔ اس دن شہریار کے ساتھ دوپہر کے کھانے کے وقت گھر آنے والا شخص وہی مشابرم خان تھا جس نے شہریار کے ساتھ ہمیشہ وفا نبھائی تھی لیکن اپنی بدلی ہوئی زندگی میں وہ اسے شامل نہیں کر سکا۔ اس کے نزدیک شہریار عادل مر چکا تھا۔

جیتے جی خود کو مار لینے کا یہ فیصلہ اس نے وطن کی محبت اور اوپر والوں کے مشورے کے تحت کیا تھا۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو وہ جن مگرمچھوں کو زک پہنچا چکا تھا، وہ اس کی بو سونگھتے ہوئے اس تک پہنچ جاتے اور اس کی زندگی کا سکون تہ و بالا کر کے رکھ دیتے۔

ماموں، ممانی جنہوں نے ہمیشہ شہریار کے لیے والدین کا کردار ادا کیا تھا، جب تک زندہ رہے خود ہی خاموشی سے آ کر ان لوگوں سے مل جاتے تھے۔ مجاہد اور عائشہ میں ان کی جان تھی۔ خصوصاً عائشہ تو زیادہ ہی لاڈلی تھی۔ ماموں بچوں والے حادثے سے پہلے دنیا سے چلے گئے تھے اور ماموں کے بعد ویسے ہی تنہا پڑ جانے والی ممانی نے اس غم کو ایسے سینے سے لگایا تھا کہ دس دن بھی مشکل ہی سے جی سکی تھیں۔ جب تک وہ دونوں زندہ تھے، شہریار اور اس کی عدم موجودگی میں بچوں کے پاس رہنے آ جاتے تھے۔ صہیب اور حسیب کی آمد کے بعد سے یہ پہلا موقع تھا کہ شہریار کسی مشن پر ماہ بانو کو اپنے ساتھ لے جا رہا تھا اور اس موقع پر مشابرم خان کو یہاں لا کر اس نے اہتمام کر لیا تھا کہ بچوں کے پاس کوئی اپنا موجود رہے۔

بچے اتنے ناسمجھ نہیں تھے کہ انہیں اپنے والدین یاد نہ ہوتے۔ ان دونوں نے بھی ایسی کوئی کوشش نہیں کی تھی کہ وہ اپنے والدین کو بھول جائیں۔ وہ بس اس درد اور احساسِ محرومی کو دور کرنے کی کوشش کرتے رہے تھے جس سے یتیم ہو جانے والے بچے گزرتے ہیں۔ صہیب اور حسیب کی پراعتماد اور نکھری ہوئی شخصیت گواہ تھی کہ وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب رہے ہیں۔ ان کا ان بچوں سے لگاؤ کسی صورت اپنے سگے بچوں سے کم نہیں تھا اور اب جبکہ بچوں سے نامعلوم مدت کے لیے بچھڑنے کا وقت آیا تھا تو ماہ بانو ویسے ہی پریشان اور اداس تھی جیسے کوئی بھی ماں اپنے بچوں سے دور ہونے پر ہوتی۔ اس اداسی کے زیرِ اثر ہی وہ آج بہت دنوں بعد مجاہد اور عائشہ کی تصویریں نکال کر بیٹھ گئی تھی۔

''ہم اندر آ جائیں امی؟'' دروازے پر ہونے والی دستک کے ساتھ سنائی دینے والی حسیب کی آواز نے اسے سوچوں سے نکالا۔

''بالکل آ جاؤ بیٹا!'' اس نے جلدی سے آنکھوں کی نمی صاف کر کے انہیں جواب دیا لیکن البم ہاتھ سے نہیں رکھا۔ بچے اس کی طرف سے اجازت پاتے ہی نیم وا دروازے کو دھکیل کر اندر آ گئے۔ ان کی تربیت اس انداز میں کی گئی تھی کہ چاہے دروازہ کھلا ہوا بھی ہو تو وہ بلا اجازت ان کی خواب گاہ میں داخل نہیں ہوتے تھے۔

''آپ مجاہد اور عائشہ کی تصویریں دیکھ رہی تھیں؟'' صہیب نے اندر آتے ہی اس کے ہاتھ میں موجود البم کو نوٹس

کرلیا۔

''ہاں، سامان کی پیکنگ کرتے ہوئے البم ہاتھ میں آگیا تو دیکھنے لگی۔'' اس نے سرسری لہجے میں جواب دیا اور اپنے قریب ان دونوں کے بیٹھنے کے لیے جگہ بنائی۔ وہ دونوں دسیوں بار اس البم کو دیکھ چکے تھے لیکن ہر بار اسی ذوق وشوق سے دیکھتے تھے۔ کون سی تصویر مجاہد اور عائشہ کی کون سی سالگرہ کے دن کی ہے، کس میں وہ کس مقام پر پکنک منانے گئے ہوئے ہیں یا کون سی تصویر اسکول کے کس فنکشن پر لی گئی ہے، انہیں سب ازبر تھا۔

''آپ یہ البم اپنے ساتھ لے کر جائیں گی امی؟'' تصویریں دیکھتے دیکھتے اچانک حسیب نے پوچھا۔

''نہیں..... لیکن آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟''

''اس البم میں آپ کی اور بابا کی بھی تصویریں ہیں نا۔ جب آپ لوگ یہاں نہیں ہوں گے اور آپ کی زیادہ یاد آئے گی تو ہم یہ تصویریں دیکھ لیا کریں گے۔'' اس نے نہایت معصومیت سے جواب دیا تو ماہ بانو نے بے اختیار اسے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے اس کا ماتھا چوم لیا۔

''آپ ہمارے جانے سے اداس ہورہے ہو؟''

''جی۔'' اس نے ایک لفظی جواب دیتے ہوئے ساتھ میں گردن بھی ہلائی۔

''میں اور بابا بھی آپ لوگوں کو بہت مس کریں گے لیکن کبھی کبھی بڑے مقاصد کے حصول کے لیے تھوڑی قربانی دینا پڑتی ہے اور جو بہادر لوگ ہوتے ہیں نا، وہ قربانی دینے سے نہیں گھبراتے۔ میرے دونوں بیٹے تو بہت بہادر ہیں نا؟''

''جی۔'' دونوں نے بیک وقت اس کی تائید کی۔

''تو بس پھر بہادروں کی طرح ہنسی خوشی امی اور بابا کو رخصت کرنے کی تیاری کرو اور مجھ سے وعدہ کرو کہ ہمارے پیچھے بھی اسی روٹین پر چلو گے جو میں نے سیٹ کی ہوئی ہے۔ نماز، ورزش، کھانا پینا اور پڑھائی۔ کسی بھی کام میں کوئی کوتاہی نہیں ہونی چاہیے۔ ہماری واپسی تک سائرہ آنٹی یہاں موجود رہیں گی اور ہر چیز پر چیک رکھیں گی۔''

اس نے ان خاتون کا حوالہ دیا جنہیں ان کی عدم موجودگی میں یہاں رہنا تھا۔ شہریار نے اسے بتایا تھا کہ سائرہ کوئی عام گھریلو ملازمہ نہیں تھی۔ وہ ایک پڑھی لکھی اور تربیت یافتہ عورت تھی جو ہتھیار چلانا بھی جانتی تھی۔ مشاہر خان کی موجودگی کے باوجود ایسی خاتون کا انتظام کرنا شہریار کی محتاط طبیعت اور بچوں کے لیے بے حد فکر کی وجہ سے تھا۔ اگر انہیں جوڑی کی شکل میں جانے کی حاجت نہ ہوتی تو وہ ماہ بانو کو بچوں کے ساتھ چھوڑنا زیادہ مناسب سمجھتا۔

آپ پریشان نہ ہوں امی! ہم آپ کی ہر بات پر عمل کریں گے۔ آپ چاہیں تو بیچ بیچ میں سائرہ آنٹی سے کال پر پوچھتی بھی رہیے گا۔'' اسے یہ تسلی دینے والا صہیب تھا۔ سائرہ نے چونکہ وہاں آنا شروع کردیا تھا تو بچے اس سے مانوس ہونے لگے تھے اور وہ بھی ماہ بانو کی زیر نگرانی تیزی سے سیکھ رہی تھی کہ اس گھر کو کیسے چلانا ہے۔

''کال.....'' ماہ بانو کو اچانک ایک سنگین مسئلے کا احساس ہوا۔ پاکستان سے نکلنے کے بعد انہیں پاکستان سے کوئی تعلق نہیں رکھنا تھا اس لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ لوگ یہاں کال کرپاتے۔

''کیا آپ ہم سے بات کرنے کے لیے ہمیں کال نہیں کریں گی؟'' صہیب چونکا۔

''بات یہ ہے بچوں کہ کچھ مسائل کی وجہ سے ہمارا آپ سے ٹیلی فون پر بات کرنا مناسب نہیں ہوگا لیکن آپ فکر نہ کریں۔ میں آپ کو خط لکھا کروں گی۔ آپ لوگ بھی ہمیں خط لکھا کرنا۔'' اس نے بچوں کو بہلایا۔ حقیقت یہ تھی کہ خطوط کا تبادلہ کسی صورت ممکن نہیں تھا۔ بس اس نے بچوں کی تسلی کے لیے احتیاطاً کچھ خطوط لکھ کر رکھ دیے تھے جو وہ جانے سے پہلے سائرہ کے حوالے کردیتی۔ اس انتظام کو اب تھوڑا سا اور بڑھانا تھا۔ اسے امید تھی کہ سائرہ اس کی لکھائی کی مشق کرلے گی۔ اس صورت میں وہ بچوں کے لکھے گئے خطوط کا جواب بھی دے سکتی تھی۔

''آپ کس سوچ میں گم ہیں امی؟'' حسیب نے اسے پکار کر اپنی جانب متوجہ کیا۔

''میں سوچ رہی تھی کہ جانے سے پہلے ہم سب مل کر کہیں پکنک پر چلتے ہیں تاکہ ایک یادگار دن گزار سکیں۔'' اس نے حسیب کو پیار کرتے ہوئے ایسی بات کہی کہ بچے سب کچھ بھول بھال کر اس حوالے سے پلاننگ کرنے لگے۔ ان کی چہکاریں سنتے ہوئے اس نے بہت خاموشی سے البم بند کرکے الماری میں واپس رکھ دیا۔ جو دو چلے گئے تھے، یہ دو ان سے کم پیارے نہیں تھے۔ بس فرض پکار رہا تھا اور ذاتی مفاد پر قومی واجتماعی مفاد کو ترجیح دینے کی آزمائش ان کے حصے میں آگئی تھی۔

ظلم وجبر کے سامنے سینہ سپر نوجوان
کی داستان جو غلط کاروں کے لیے غضب
ناک تھا باقی واقعات آیندہ ماہ پڑھیے

فریسنیس جیل کے ساتھ ساتھ چلتی سڑک جس کا علامتی نام ایونیو دی لا لابرتے تھا، بچے لا بریوندی کے تیل والے پانیوں میں پتھر پھینک رہے تھے اور شور مچا رہے تھے۔ پولیس والے نے بیزار ہو کر کھڑکی بند کر دی۔ وہ کافی پریشان لگ رہا تھا۔ اس نے کھڑکی پر انگلیاں بجائیں پھر مڑا اور بیڈ پر بیٹھے اس شخص کی طرف قدم بڑھایا۔

"یہ تمہارے لیے بہتر ہوگا اگر تم اعتراف کر لو۔ تمہارے ڈیفنس کی بنیاد ہی مضحکہ خیز ہے۔ اگر تم اپنے جرم کا

تشنہ کام

عائشہ نصیر

بعض مجرم اپنی شاطرانہ چالوں سے قانون کے رکھوالوں کو تگنی کا ناچ نچاتے ہیں لیکن کبھی کبھی خود بھی اپنی ہی چالوں کے اسیر ہو جاتے ہیں یہ اور بات کہ ... آخری دم تک انہیں یقین نہیں آتا کہ بازی پلٹ چکی ہے۔ ایسے میں وہ تشنہ کام کسی بھی کام کے نہیں رہ پاتے۔

اپنی ہی جان کے دشمن ایک دھوکے باز مجرم کی راہ فرار کا انوکھا قدم

pklibrary.com

اقرار کرلو تو میں یقین دلاتا ہوں کہ تم اب بھی اپنی کھال بچا سکتے ہو۔"

"میں آپ سے کہہ رہا ہوں میں بے قصور ہوں۔" اس آدمی کے چہرے پر گھبراہٹ تھی۔ اس کے بال سامنے سے اڑ چکے تھے جس کے باعث پیشانی کچھ زیادہ ہی کشادہ لگ رہی تھی۔ اس کی گہری آنکھیں بے چین لگ رہی تھیں۔

ایک دوسرے پولیس والے نے جو بیڈ پر بیٹھا تھا، کندھے اچکائے لیکن کچھ بولا نہیں۔

"تم جھوٹ بول رہے ہو۔" پہلے پولیس والے نے بات جاری رکھی۔ "اب بول بھی دو تم نے اپنی کزن کو کیوں مارا؟"

"میں بے قصور ہوں۔" اس شخص کا نام مارسل لیموئن تھا۔ کانپتے ہوئے ہاتھ سے اس نے سگریٹ ہونٹوں تک بڑھایا۔ اس کی انگلیاں لمبی اور پتلی تھیں اور اس کے داہنے انگوٹھے پر سرخ نشان تھے۔ یہ خون نہیں تھا بلکہ ورملین پینٹ تھا۔ لیموئن ایک فنکار تھا۔

نازک جسم کے باوجود اس کے اعصاب مضبوط تھے لیکن انسپکٹر نے یہ مانتے ہوئے کہ وہ بس پھٹ پڑنے کو ہے، دباؤ برقرار رکھا۔

"تم نے ایسا کیوں کیا، تمہارا مقصد کیا تھا؟"

"میں نے کچھ نہیں کیا۔" اس کی آواز پہلے کی نسبت پُرسکون تھی۔

اس پولیس والے نے غصے کے عالم میں اپنا ہاتھ یوں اٹھایا جیسے وہ اسے مارنے والا ہو۔

"تم مجھ پر یوں دباؤ نہیں ڈال سکتے۔ یہ قانون نہیں ہے۔" لیموئن کی آواز چیخ سے مشابہ تھی۔

انسپکٹر نے اپنا بازو نیچے کیا، چٹکی میں تھوکا اور بولا۔ "دیکھو لیموئن.....!"

مگر لیموئن اپنے اعصاب کھو بیٹھا تھا، وہ اٹھا اور دروازے کی طرف بھاگا۔

"ہے..... ہے۔ تم کہاں جا رہے ہو؟"

"بہت ہوا، میں بے قصور ہوں۔ کتنی بار بتا چکا ہوں۔ مجھے حق ہے کہ میں مزید تمہارے سوالوں کے جواب دینے سے انکار کر دوں۔ ویسے بھی مجھ پر کوئی چارج نہیں لگایا گیا، نہ ہی میرے خلاف کوئی ثبوت ہے۔"

"ثبوت کی بات مت کرو، وہ بھی ہمیں بہت جلد مل جائے گا۔"

"مجھے یہاں سے نکلنا ہے۔" لیموئن چلّایا۔ "کیا تم نے سنا؟ مجھے فوراً جانے دو۔"

"لیموئن!" بیڈ پر بیٹھے پولیس والے نے اسے آواز دی۔

لیموئن ہچکچایا۔

"صرف ایک سوال اور..... سادہ سا۔"

انسپکٹر تکیے پر سر رکھ کر لیٹ گیا اور چھت کی طرف دیکھنے لگا۔

"چلو مانا تم بے قصور ہو۔ اس صورت میں یقیناً تم ہماری مدد کرنے سے تو انکار نہیں کر سکتے۔ ہے نا؟"

"لیکن میں کچھ نہیں جانتا۔"

"رکو، شروع سے شروع کرتے ہیں۔ آج صبح آٹھ بجے تمہارے والد مسٹر جین لیموئن اور تمہارے چچا مسٹر ربنی لیموئن اسٹیشن جانے کے لیے گھر سے نکلے جہاں سے انہیں پیرس کے لیے ٹرین لینا تھی۔ دس منٹ بعد تمہاری کزن ملی یوویٹ کا منیجر ایم کیفیر کار سے آیا۔ اس نے تھوڑی دیر یہاں اوپر تم سے بات کی اور پھر گراؤنڈ فلور پر تقریباً ایک گھنٹا اپنی منگیتر ملی کے ساتھ گزار کر نو بج کر پندرہ منٹ پر وہ یہاں سے نکلا۔ ملی اسے گیٹ تک چھوڑنے بھی گئی تھی پھر اپنے کمرے میں واپس چلی گئی۔ تب سے تم اپنی کزن کے ساتھ گھر میں اکیلے تھے۔ دونوں نوکر جین نول اور اس کی بیوی اینا گھر کے سامنے والے باغ میں کچھ کام کر رہے تھے۔ ہمیں کئی گواہ سے معلوم ہوا ہے کہ جین اور اینا ساڑھے دس بجے تک گارڈن میں ہی رہے اور جب اینا دوپہر کے کھانے کی تیاری کے لیے اندر گئی تو اس نے ملی کو اس حال میں دریافت کیا کہ وہ کمرے کے فرش پر زخمی حالت میں پڑی تھی۔ اینا نول نے بھاگ کر اپنے شوہر کو بلایا، کچھ پڑوسی دوڑتے ہوئے آئے، ڈاکٹر کو بلایا گیا۔ معائنے کے دوران پتا چلا کہ ملی کی دائیں کنپٹی پر ایک کند آلے سے وار کیے گئے تھے مگر وہ آلہ کہیں دریافت نہ ہو سکا۔"

مارسل لیموئن نے بے چینی سے اپنا وزن ایک ٹانگ سے دوسری ٹانگ پر منتقل کیا۔

"اس وقت اس کے بیڈ کے پاس ایک ڈاکٹر، ملی یوویٹ کے انکل اور اس کا منیجر بھی موجود تھا جب وہ زخموں کی شدت سے بے ہوش گئی تھی لیکن جس وقت وہ نیم بے ہوش تھی تب....."

"ہر چیز کو بیس بار دہرانے کا کیا فائدہ؟" مارسل لیموئن نے غصے سے پوچھا۔ "تم مجھ سے وہ پوچھو جو تمہیں پوچھنا ہے۔"

"میں وہیں آ رہا ہوں۔ گھر کی عقبی اور اطراف کی تمام کھڑکیاں اندر سے بند تھیں۔ گھر کے ملازم میاں بیوی

سامنے کی طرف تھے۔ انہوں نے کسی کو داخل ہوتے نہیں دیکھا۔ جب ہم نے تحقیق کی تو پتا چلا کہ گھر کے اندر کوئی چھپا ہوا بھی نہیں تھا۔ سوا نو بجے تک ملی پوویٹ زندہ تھی اور ساڑھے دس بجے تک وہ تقریباً مردہ پائی گئی۔

''سو، نو سے ساڑھے دس کے درمیان صرف دو لوگ گھر کے اندر تھے۔ تم اور تمہاری کزن۔ اگر حملہ آور تم نہیں تھے تو مجھے بتاؤ کہ وہ کون تھا اور اس نے یہ کیسے کیا؟''

''یہ میں کیسے بتا سکتا ہوں؟'' لیموئن کے لہجے میں حیرت تھی۔ ''ان سوالوں کے جواب تلاش کرنا تمہارا کام ہے۔ میں پولیس والا نہیں ہوں۔ میں ایک پینٹر ہوں۔''

وہ ایزل پر رکھے کینوس کے پاس گیا۔ یہ اس کا تازہ ترین کام تھا۔ ایک طرح کا ڈراؤنا خواب..... جنگل، جس میں سڑتا ہوا سبزہ تھا اور بیچ میں ایک پیلا تالاب۔ مکمل طور پر ایک خیالی منظر نامہ۔

''میں اس پینٹنگ پر کام کر رہا تھا۔ میں نے کچھ نہیں سنا۔ مجھے صرف ملازموں کی چیخوں سے حملے کا علم ہوا۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ ہر چیز میری طرف اشارہ کرتی ہے لیکن میں بے قصور ہوں۔ میں نے بھلا ملی کی جان لینے کی کوشش کیوں کی ہوگی۔ میں تو اس سے پیار کرتا تھا۔ میرا مطلب ہے وہ میری کزن ہے اور ایک لمحے کے لیے یہ مان بھی لیا کہ اس سب کے پیچھے میرا کوئی مقصد تھا، تب بھی میں پاگل تو نہیں تھا کہ ایسے وقت میں اس پر حملہ کرتا جب سب یہ جانتے تھے کہ میں ملی کے ساتھ گھر میں اکیلا ہوں؟''

اسی لمحے دروازہ کھلا اور ایک خوش شکل نوجوان دروازے میں آموجود ہوا۔ یہ کیفیر تھا، ملی کا منگیتر۔ یہ بڑی کار کمپنی کا سیلز مین تھا۔

''جلدی کیجیے، ملی کو ہوش آ گیا ہے۔'' اس نے آتے ہی ہیجان خیز لہجے میں ان تک اطلاع پہنچائی اور پلٹ کر واپس دوڑا۔

وہ دونوں فوراً ہی اپنی جگہ سے اچھل کر نیچے کی طرف بھاگے۔ پولیس کو آتے دیکھ کر ڈاکٹر کچھ بڑبڑایا تھا۔

ملی نے آنکھیں کھولی تھیں۔ انسپکٹر اس پر جھکا۔ ''کیا تم مجھے سن سکتی ہو؟ کیا تم ہمیں بتا سکتی ہو تم پر حملہ کس نے کیا؟''

اس کی پلکیں پھڑ پھڑانے لگی تھیں پھر اس کے ہونٹ ہلے۔ شاید وہ بات کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

ڈاکٹر اور انسپکٹر ایک ساتھ اس پر جھک گئے اور دونوں نے اس کی ہلکی سرگوشی میں الفاظ سنے۔

''میرے ماموں.....''

انسپکٹر نے فوراً ہی سب کو کمرے سے نکلنے کو کہا۔ ڈاکٹر نے ملی کی بے نور آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ ملی ایک خوبصورت لڑکی تھی۔ چھوٹے بالوں کے ساتھ اس کی شکل اس معروف فلمی اداکارہ سے ملتی تھی جس نے جوانی میں ہی موت کو گلے لگا لیا تھا، بالکل اس کی طرح۔ اس کا سنگِ مرمر سا سفید چہرہ ابھی سے ٹھنڈا پڑنے لگا تھا۔

''تو یہ ماموں تھے۔'' انسپکٹر نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ ''اور اب ہمیں محرک تلاش کرنا ہے..... آہ..... کیا غیر معمولی کیس ہے۔''

لیموئن اور ڈاکٹر خاموش کھڑے ملی کے بے جان چہرے کو تک رہے تھے۔

انسپکٹر نے پینٹر کو اپنا ہاتھ پیش کیا۔ ''تمہیں دی گئی تکلیف کے لیے معافی چاہوں گا۔''

لیموئن بے اختیار رو پڑا۔

☆☆☆

اس کیس میں واقعی ایک مسئلہ تھا مگر اس طرح کا نہیں جیسے اس انسپکٹر کو توقع تھی یعنی قتل کا محرک..... کیونکہ یہاں وہ واضح تھا۔

اٹھارہ سالہ ملی لیموئن کے والدین چار سال پہلے گزر گئے تھے۔ اب مارسل لیموئن کا باپ اور اس کا چچا ہی اس کے سرپرست تھے۔ وہ اپنی بھانجی کی وراثت کو اس کے بالغ ہونے تک سنبھالنے کے بھی ذمے دار تھے۔

مگر اب مسٹر جین لیموئن جو اسٹاک ایکسچینج میں تھے، انہیں کافی نقصان اٹھانا پڑا تھا اور رینی لیموئن ایک مستند اور ذہین سائنس دان نے اپنے بھائی کا اعتماد حاصل کرتے ہوئے انہیں اپنی ریسرچ میں پیسا لگانے پر آمادہ کر لیا تھا۔ یہ ایک شاندار ایجاد ہوتی۔ ایک انتہائی ہلکا الیکٹریکل کنڈیسر جو ہوائی جہاز لے جانے والے بڑے ایندھن کے ٹینکوں کو راتوں رات تبدیل کرنے کے قابل تھا اور ان کی رینج کو دوگنا کر سکتا تھا اور ظاہر ہے اس سے ہونے والے منافع کی توقع بھی بہت زیادہ تھی۔

درحقیقت ان کا کوئی بے ایمانی کا ارادہ نہیں تھا۔ ٹیسٹ مہنگے تھے مگر اس سے انہیں کامیابی کی سو فیصد امید تھی۔ تو ملی کی دولت میں سے دو لاکھ فرانک لینا کوئی بُرا آئیڈیا نہیں تھا کیونکہ جونہی انہیں اس ٹیسٹ میں کامیابی ملتی وہ یہ رقم دوگنا کر کے بھی ملی کو واپس کر سکتے تھے۔

انہوں نے ملی سے اس ''قرض'' کے بارے میں بات بھی کی تھی تاکہ بعد میں اکاؤنٹ کی تفصیلات سامنے

آنے پر انہیں کسی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

مگر تب ہی ملی کی زندگی میں کارسلز مین کیفیر آیا۔ اس کے پاس نہ تو رینی لیموئن جیسی ذہانت تھی اور نہ ہی مارسل جیسی حساسیت..... لیکن وہ بوروترا کی طرح ٹینس کھیلتا تھا، ٹارس کی طرح تیراکی کرتا تھا، چیرون کی طرح گاڑی چلاتا تھا اور پیرس کو جانتا تھا۔ خاص طور پر رات کے وقت پیرس کو گائیڈز سے بہتر جانتا تھا۔ اس کے چمکدار سفید دانت، سنہرے بال اور نیلی آنکھیں اسے ایک خوبصورت نوجوان بناتے تھے۔

ملی سے اس کی ملاقات پیالیس ڈی جسٹس کی راہداریوں میں ہوئی تھی۔ ملی وہاں کام کے سلسلے میں موجود تھی۔ وہ پروفیسر چیپلین کی اسسٹنٹ تھی جو پولیس سائنٹیفک کے نامور ماہر تھے۔

جہاں تک قتل کے محرک کا تعلق تھا، یہ واضح تھا کہ ملی کی دولت سے لیے گئے دو لاکھ فرانک انہیں ملی کو واپس کرنے تھے۔ اب جب وہ کیفیر سے دو ہفتوں میں شادی کرنے والی تھی اور کیفیر بھی اپنی بیوی کی دولت کو الیکٹرک کنڈینسر پر ضائع نہیں ہونے دیتا۔ اگر چہ جین اور رینی لیموئن نے کئی بار ملی کے لیے اپنے گہرے پیار کا ثبوت دیا تھا مگر دونوں افراد کو شک سے پاک کرنے کے لیے یہ وجہ کافی نہیں تھی۔

مگر مشکل یہی تھی کہ قتل کے وقت دونوں افراد پیرس میں سوسائٹی جنرل کے دفتر میں تھے۔ وہاں ڈائریکٹر، اسسٹنٹ ڈائریکٹر ایک قابل مدتی قرض کے لیے ان کے مطالبے پر غور کر رہے تھے جو اپنی ممکنہ ایجاد کے لیے انہیں چاہیے تھا۔ یہ بظاہر ناممکن لگتا تھا کہ جین اور رینی لیموئن نے جرم کا ارتکاب کیا ہو۔

''ہوسکتا ہے لڑکی کو غلط فہمی ہوئی ہو؟'' تفتیشی افسر نے اس پر تبصرہ کیا۔

دونوں لوگوں نے بھرپور طریقے سے اپنی بے گناہی کا اعلان کیا۔ ان کے مطابق ملی کے آخری الفاظ کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ وہ اپنے حملہ آور کا نام بتا رہی ہے بلکہ وہ اپنے ماموں کے لیے کوئی استدعا کوئی الوداعی پیغام بھی ہوسکتا ہے۔ پولیس کو شک ہی رہا۔ اس کے باوجود کہ ان کے پاس اپنی غیر موجودگی کے بڑے ٹھوس ثبوت موجود تھے۔

مسٹر جین اور مسٹر رینی کو چھوڑ دیا گیا تھا لیکن ان پر نظر رکھی جارہی تھی۔

یہی وہ وقت تھا جب پروفیسر چیپلین نے اپنے طور پر اس کیس کو دیکھنے کا فیصلہ کیا۔ اس کی بڑی وجہ یہی تھی کہ مقتولہ ملی ان کی اسسٹنٹ رہ چکی تھی اور وہ اپنے دل میں اس کے لیے نرم گوشہ رکھتے تھے۔

سب سے پہلے اس نے ملی کے گھر کی مکمل تلاشی لی جس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ اس کے بعد اس نے انسٹی ٹیوٹ میڈیکو لیگل میں باڈی کا معائنہ کیا۔ تقریباً فوراً ہی اس نے دریافت کیا کہ پولیس سنگین پیشہ ورانہ غفلت کی مرتکب ہوئی ہے۔ ملی یونیورسٹی کے ناخنوں کے نیچے جن کی وہ جانچ کرنے میں ناکام رہے تھے، اس نے کئی بالوں کے تراشے دریافت کیے۔ یہ بال سنہری تھے۔

مکمل معائنہ کرنے کے بعد پروفیسر چیپلین اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ بال جن میں شیمپو، کارنیشن لوشن کی خوشبو پائی گئی تھی، ملی کے مگیتر کیفیر کے تھے۔ قتل سے تین دن پہلے کیفیر اپنے معمول کے حجام کے پاس گیا تھا جو یہی شیمپو اور کارنیشن لوشن استعمال کرتا تھا۔

پروفیسر چیپلین اب سمجھ گیا تھا کہ کس طرح ابتدائی غلطی نے پولیس کو غلط راستے پر ڈال دیا تھا۔ کیفیر قاتل تھا۔ رخصت ہونے کے بعد وہ دوبارہ گھر واپس آیا ہوگا (نولز یا پڑوسیوں کے دیکھے بغیر وہ کس طرح اندر داخل ہوا، اس کا تعین کرنا ابھی باقی تھا)۔ کیفیر نے اپنی مگیتر پر پیچھے سے حملہ کیا۔ ہوسکتا ہے کہ اس نے رومال یا اسکارف سے اپنا چہرہ بھی ڈھانپ لیا ہو۔ ملی نے بھرپور جدوجہد کی تھی۔ اسی مزاحمت کے دوران اس کی انگلیوں نے حملہ آور کے بالوں کو پکڑ لیا۔ اس بہادر نوجوان لڑکی نے اس عالم اذیت میں بھی وہ سبق یاد رکھے جو لیبارٹری میں اس کے پروفیسر نے اسے سکھائے تھے۔ حملہ آور کو شناخت نہ کرنے کی صورت میں ایک ایسا اشارہ جس سے اس کی پہچان ہوسکے۔

اس نے کہنے کی کوشش کی تھی۔ ''میرے ناخن.....''

لیکن انسپکٹر یہی سمجھے کہ وہ کہہ رہی ہے۔ ''میرے ماموں۔''

لیکن یہاں بھی کیفیر کے پاس جائے وقوعہ سے اپنی عدم موجودگی کا ثبوت تھا۔ اس کے مطابق ملی کے گھر سے نکلنے کے بعد وہ ایک کلائنٹ سے ملنے کے لیے اریا جون چلا گیا تھا۔ اگرچہ اس حقیقت کی تصدیق ہوچکی تھی کہ کیفیر کافی دیر سے وہاں پہنچا تھا مگر اس کی وضاحت اس نے یہ دی کہ اس کی گاڑی بورگ لا رائن کے قریب ایک دیہی علاقے میں خراب ہوگئی تھی۔ اس نے اس جگہ کی نشاندہی بھی کی مگر بدقسمتی سے اس سڑک پر کام کرنے والے دو ورکرز نے قسم کھائی کہ وہ سارا وقت سڑک کے کناروں کی صفائی کرتے رہے تھے۔ اگر وہاں کوئی گاڑی خراب ہوتی تو ان کی نظر

سے چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔

اس کا مطلب یہی تھا کہ کیفیر نے جھوٹ بولا تھا۔ پوچھ گچھ کے دوران اس نے بہت کچھ تسلیم کیا لیکن یہ بتانے سے انکار کر دیا کہ وہ پینتیس منٹ کے لیے غائب ہونے کے دوران کہاں تھا۔ اس کے مطابق وہ ایک عورت سے ملنے گیا تھا مگر جب اس عورت کا نام اور پتا اس سے پوچھا گیا تو وہ کوئی جواب نہ دے سکا۔

اسی بنیاد پر کیفیر کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس نے پراسپر لیپک کو اپنا دفاعی وکیل مقرر کیا تھا۔

☆☆☆

''مونسیور لی پروفیسر! یہاں ایک معما ہے جسے آپ جیسا ماہر ہی حل کر سکتا ہے۔ میں اپنے کلائنٹ کی بے گناہی پر مکمل طور پر قائل ہوں۔ اس نے مجھے اپنے اعتماد میں لیا ہے۔ پینتیس منٹ کے وقفے کے لیے اس نے جو وضاحت پیش کی.....''

''عورت والی؟'' پروفیسر نے اس کی بات کاٹی۔ ''وہ جھوٹی وضاحت ہے۔ اس نے الزام سے بچنے کے لیے جھوٹا ڈراما رچایا۔ گاڑی کے خراب ہونے کا، کسی عورت سے ملنے کا۔ سچ تو یہ ہے کہ ملی یوویٹ کے ناخنوں سے ملنے والے بالوں کے نمونے اسی کے ہیں۔ کیفیر ایک قاتل ہے۔''

پراسپر لیپک ایک منٹ تک اپنی پرفان زدہ نظروں سے انہیں گھورتا رہا پھر اس نے سر ہلایا اور بولا۔ ''یہاں اس نے جھوٹ بولا، میں مانتا ہوں لیکن مونسیور لی پروفیسر، کیفیر کے کچھ راز ہیں جن کو میں یہاں ظاہر نہیں کر سکتا۔ پینتیس منٹ کے لیے گمشدہ ہونا بھی انہی رازوں کا ایک حصہ ہے مگر میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس کا موجودہ کیس سے کوئی تعلق نہیں۔ اس نے اپنی منگیتر کا قتل نہیں کیا۔''

''ایسے بھی کیا راز ہیں کہ وہ قتل کے الزام میں گرفتار ہونا تو گوارا کر سکتا ہے مگر وہ راز ظاہر نہیں کر سکتا؟'' پروفیسر نے طنزیہ لہجے میں دریافت کیا۔

''یہاں آگے کنواں پیچھے کھائی والا معاملہ ہے۔ اگر وہ اس بارے میں کچھ بتاتا ہے تب بھی وہ پھنسے گا۔ اسی غیر یقینی صورتِ حال کے پیشِ نظر اس نے خاموش رہنے کو ترجیح دی۔''

''بالوں کے تراشے کیفیر کے ہیں۔'' پروفیسر دھیمے سے بڑبڑایا۔

''کیا میں آپ سے ایک اور سوال پوچھ سکتا ہوں؟'' پراسپر لیپک نے پوچھا۔

''ضرور۔''

بہترین تحریریں، لاجواب روداد اور
اصلی داستانیں پڑھنے والوں کے لیے
سرگزشت کا مطالعہ ضروری ہے

کراچی
ماہنامہ
سرگزشت

شمارہ دسمبر 2023ء
کی جھلکیاں

نوائے حریت
عالمی شہرت یافتہ فلسطینی شاعر کی داستانِ حیات

داستان فلسطین
فلسطین میں چل رہی نسل کشی کی مختصر سی تاریخ

چاکلیٹی ہیرو
وحید مراد کا دلچسپ قصہ حیات

کاروان زیست
مقبول فلمکار طاہر جاوید مغل کی کہانی، انہی کی زبانی

یادش بخیر
معروف ادیب فارغ بخاری کا دلچسپ زندگی نامہ

سزا
دل و دماغ جھنجھوڑ دینے والی جہلم سے بھیجی گئی سچ بیانی

اس کے علاوہ

رگوں میں لہو کی گردش تیز کر دینے والی طویل سرگزشت ''اسیر جنوں'' اور بہت سی سچ بیانیاں، سچے واقعات اور دلچسپ داستانیں جنہیں آپ پڑھنا چاہتے ہیں، آپ کو پڑھنا چاہیے

''آپ نے دیکھا کہ کیفیر کے بالوں کے جو حصے ملی کے ناخنوں کے نیچے پائے گئے ان میں سے کوئی بھی بال قدرتی طور پر ٹوٹا ہوا نہیں تھا اور کہیں بھی جڑ سمیت مکمل بال نہیں ملے۔ کیا یہ عجیب بات نہیں ہے؟''

''اس کی ایک آسان سی وضاحت ہے۔ پوویٹ اپنے ناخنوں کے نیچے اپنے حملہ آور سے کئی بال اکٹھا کرنے میں کامیاب رہی لیکن چھوٹے حصے آسانی سے ناخنوں میں پھنسے رہ جاتے ہیں۔ لمبے بالوں کے لیے ایسا نہیں ہے۔ لمبے بال اس وقت اس کی مٹھی یا ناخنوں سے نکل گئے ہوں گے جب اسے بستر پر لے جایا جا رہا تھا۔ اس وقت کسی نے یہ دیکھنے کی زحمت نہیں کی۔ میں پہلے ہی انسپکٹرز کی انتہائی غفلت پر تبصرہ کر چکا ہوں۔''

''شکریہ پروفیسر لی! ایک آخری درخواست..... کیا آپ ایک دن کے لیے ان نمونوں میں سے چند مجھے دینا چاہیں گے؟ مجھے اس معاملے میں اپنی پوری تسلی کرنی ہے۔''

''شوق سے۔'' پروفیسر نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔

☆☆☆

چوبیس گھنٹے بعد پروفیسر چیپلین کو پراسپر لیپک کا کالنگ کارڈ شکریہ کے پیغام کے ساتھ رجسٹرڈ پوسٹ کے ذریعے موصول ہوا۔

بالوں کے نمونے کو احتیاط سے کاغذ کا استعمال کرتے ہوئے ایک علیحدہ کارڈ کے ساتھ منسلک کیا گیا تھا۔

اسی شام دو لوگ ایک میز پر آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ ایک جوان اور دبلا پتلا مگر مضبوط جسامت کا مالک تھا، یہ وکیل پراسپر لیپک تھا۔ دوسرا اس سے بھی زیادہ دبلا اور ذرا جھک کر بیٹھا تھا۔

''دیکھو دوست! بعض اوقات ضرورت سے زیادہ اسمارٹ بننے پر انسان مشکل میں بھی پڑ سکتا ہے۔ باریک بینی ایک اچھی چیز ہے لیکن تم کچھ زیادہ ہی باریکی میں چلے گئے۔ اگر پروفیسر چیپلین کو نتیجے پر پہنچنے کی اتنی جلدی نہ ہوتی تو وہ سچائی کا پتا لگا لیتا۔''

''کون سی سچائی؟ مجھے نہیں معلوم آپ کس کے بارے میں بات کر رہے ہیں؟'' مقابل کی بھنچی ہوئی کمر سیدھی ہوئی۔

شام کا وقت تھا اور ڈوبتے سورج کی آخری کرنیں کھڑکیوں کے شیشوں سے میز پر چھن رہی تھیں۔

''ذرا سنجیدہ ہو کر بات کریں؟'' لیپک نے بات جاری رکھی۔ ''میں یہاں دشمن کے طور پر نہیں آیا۔ تمہیں یہ سمجھنا ہوگا، میں ایک وکیل ہوں، پولیس والا نہیں۔ اس وقت جیل میں ایک بے گناہ آدمی ہے اسی لیے میں تم سے ملنے آیا ہوں، مسٹر قاتل۔''

سامنے بیٹھا شخص اچھل کر رہ گیا۔ ''کیا.....؟ کیا تم پاگل ہو؟ میں جا رہا ہوں۔'' وہ اٹھنے لگا۔

''تم خاموش بیٹھ کر میری بات سنو گے، سکون سے اور اپنے ہاتھ میز پر رکھ دو۔ ویری گڈ..... اب سنو..... قتل کے الزام کی بنیاد بالوں کے وہ نمونے ہیں جو مقتولہ کی انگلیوں کے نیچے پائے گئے۔ پروفیسر چیپلین نے ان کی جانچ کی اور انہیں کیفیر کے بالوں کے طور پر شناخت کیا اور کیفیر کو گرفتار کر لیا گیا۔ پروفیسر چیپلین، کیفیر کا نام سامنے آتے ہی مزید گہرائی میں نہیں گئے اور کیفیر کو ہی قاتل فرض کر لیا لیکن میں کیفیر کا وکیل ہوں اور میرے لیے یہ بات اتنی سیدھی نہیں تھی۔ مجھے مزید جاننے کا تجسس تھا۔ میں نے پروفیسر چیپلین سے بالوں کے وہ تراشے لے کر ایک ماہر کیمسٹ کے حوالے کیے جس سے میں نے سوال کیا تھا کہ انہیں کب کاٹا یا نوچا گیا تھا۔

''اس نے دریافت کیا کہ انہیں قتل کی واردات سے تقریباً دس دن پہلے کاٹا گیا تھا۔ اس لیے انہیں تین دن پہلے نوچے جانا ممکن ہی نہیں تھا۔ مزید پوچھ گچھ سے ثابت ہوا کہ کیفیر کا حجام پچھلے تین ہفتوں سے شہر سے باہر تھا۔

''تو پھر سوال یہ اٹھا کہ وہ کون تھا جس نے کیفیر کے بال کاٹے؟'' لیپک میز پر پڑے پیپر ویٹ کو اپنی باتوں کے دوران مسلسل ادھر ادھر گھما رہا تھا۔

''اور اگر انہیں ملی کے قتل سے دس دن پہلے کاٹا گیا تھا تو یہ ملی کے ناخنوں کے نیچے کیسے پہنچے؟''

یہ کہتے ہوئے لیپک نے اچانک ہی آگے جھکتے ہوئے اس بھاری پیپر ویٹ کو مخالف کے اس ہاتھ پر مارا جس میں نہ جانے کہاں سے ایک چھوٹا پستول آ گیا تھا۔ لیپک کے اس وار کے ساتھ ہی وہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گرا۔

اس شخص کی کراہ ابھری، پہلے حیرت اور پھر درد سے۔ اسے شاید لیپک سے اتنی پھرتی کی امید نہیں تھی۔

''میں جانتا تھا تم ایسی کوئی حرکت ضرور کرو گے۔'' لیپک مسکرایا۔ ''اب اپنی بے وقوفیوں کو لگام دو اور میری بات دھیان سے سنو۔''

اس شخص نے اپنی کہنیوں کو میز پر رکھا اور اس پر اپنے سر کو گرا لیا۔ اس کمرے کی دیواروں پر عجیب و غریب مناظر کی تصویریں، عجیب سے رنگوں میں رنگی ہوئی تھیں اور مدھم

سی روشنی میں کچھ اور بھی منحوست زدہ لگ رہی تھیں۔

''مارسل لیموئن! تم نے اپنی کزن کو قتل کیا ہے۔ تم شاید یہ منصوبہ کافی عرصے سے بنا رہے تھے۔ تم نے اسے انجام دینے کے لیے جان بوجھ کر وقت بھی ایسا چنا جب تم اپنی کزن کے ساتھ گھر میں بالکل اکیلے تھے۔ تمہارے پاس کیفیر کے سر کے بالوں کے تراشے تھے جو تم نے دس دن پہلے کاٹے تھے۔ ایک رات جب وہ تمہارے اسٹوڈیو میں سو رہا تھا جیسا کہ اکثر رات گئے اس کی آمد کے دوران ہوا کرتا تھا، قتل والے دن تم اپنی کزن کے کمرے میں اس کے علم میں آئے بغیر داخل ہوئے۔ تم نے پیچھے سے اس پر حملہ کیا۔ وہ تمہیں دیکھ نہیں پائی اور تم نے سوچا کہ وہ مر چکی ہے لیکن ملی یوویٹ صرف بے ہوش ہوئی تھی۔ تم بے ہوشی کی حالت میں اس نے محسوس کیا، اس کی انگلیوں کی نوکوں کے ساتھ کچھ کیا جا رہا ہے۔ بالوں کے تراشے ناخنوں کے نیچے پھنسانا اتنا بھی آسان کام نہیں۔ کیوں، ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟'' لیپک نے ایک لمحہ رک کر اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

''خیر، شاید اسی وقت وہ کراہنے لگی۔ تم گھبرا گئے اور تب تم نے اس پر دوسری بار وار کیا۔ تم کتنے خوش ہوئے ہوگے جب پروفیسر چیپلین کو بالوں کے وہ تراشے ملے۔ انہیں کہاں معلوم تھا کہ تم نے انہیں دریافت کرنے کا بھی انتظام کر رکھا ہے۔ بلکہ تم نے یہ سارا کھیڑ اگ پھیلایا ہی اسی لیے تھا کہ وہ دریافت ہوں اور کیفیر قتل کے الزام میں پھنسے۔ تمہارے لیے ملی کی موت کافی نہیں تھی۔ تم کیفیر کو بھی برباد کرنا چاہتے تھے کیونکہ تم اس سے جلتے تھے۔ تمہیں اس سے اسی دن سے نفرت ہوگئی تھی جس دن ملی نے تمہیں چھوڑ کر اسے چنا۔ تم اسے پیار کرتے تھے، دنیا کی ہر چیز سے زیادہ۔ یہاں تک کہ اپنے فن سے بھی زیادہ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ تم نے ملی سے اس کا اظہار بھی کیا۔ میں تصور کر سکتا ہوں کہ جب اس نے تمہیں مسترد کیا تو تمہارے دل پر کیا گزری ہوگی۔ ایک تشنہ کام عاشق، نازک احساسات رکھنے والا، خواب دیکھنے والا لیکن حقیقت میں ہر اس چیز سے بے حد حسد کرتا تھا جو زندہ دل ہو، چمکتی ہو اور خوبصورت ہو۔ تمہیں کیفیر سے کتنی نفرت ہوئی ہوگی، ایک عام آدمی جو حساسیت اور فن میں تمہاری ٹکر کا نہیں تھا لیکن اس قدر خوش مزاج اور زندگی سے بھرپور کہ اس کی ایک سادہ سی مسکراہٹ بھی لڑکیوں کا دل جیت لیتی۔''

مارسل لیموئن اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھامے خاموش بیٹھا تھا۔

''اپنے غصے اور احساسِ کمتری کا شکار، غیر صحت مند تصویریں بناتے ہوئے، ایک فنکار ہوتے ہوئے بھی خوش مزاجی سے عاجز۔ تم انتظار میں تھے۔ تم نے کیفیر کی جاسوسی کی اور تب ہی تمہارے ہاتھ اس کی ایک کمزوری لگی۔ یہ تمہاری سب سے بڑی فتح تھی جب تم نے دریافت کیا کہ کیفیر چوروں کے ایک گروہ میں شامل ہے۔ کیا تم نے ملی یوویٹ کو اس کے بارے میں بتایا تھا اور اس نے کیا جواب دیا؟ یہی نا کہ وہ پھر بھی کیفیر سے شادی کرے گی اور اسے ایک ایماندار آدمی بنائے گی اور جب تمہیں پتا چلا کہ کیفیر کو اس دن صبح سوا نو سے دس بجے کے درمیان اپنے ساتھیوں سے ملنا ہے جس دن تمہارے والد اور انکل بھی پیرس میں ہوں گے تو تم نے اپنے منصوبے پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا اور تم کامیاب رہے۔

''پھر اگلے دن تم نے اس کے گینگ کا ایک رکن بن کر اسے فون کیا، اس پیغام کے ساتھ کہ اگر تم اپنی منگیتر کے قتل میں ملوث ہو تو جائے واردات سے اپنی عدم موجودگی کے لیے تم جو چاہے بہانہ بناؤ لیکن اس میں ہمارا یا گینگ کا نام نہیں آنا چاہیے۔ اس وقت سے کیفیر خاموش ہو گیا تھا۔ وہی پینتیس منٹ جو اس کی بے گناہی کا ثبوت ہو سکتے تھے، اس کے بارے میں اس نے اپنی زبان بند رکھی۔''

لیپک نے اپنی کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اور ایک گہری سانس لی۔ ''تو لیموئن! مرد بنو، تمہارے جرم کی سزا کم ہو سکتی ہے اگر تم خود سرینڈر کر دو۔ کم از کم اپنے کیے کا کفارہ دینے کی ہمت تو رکھو۔ گرفتاری دو اور میں تمہارا دفاع کروں گا۔ ایک جان لے چکے ہو، خود کو بچانے کے لیے ایک بے گناہ کو سزا مت ہونے دو۔ جیوری میری جیب میں ہوگی۔ تم پانچ سال میں باہر ہو گے۔ کیا تم مجھے سن رہے ہو..... پانچ سال!'' لیپک نے لیموئن کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''پانچ سال سے ایک دن بھی اوپر نہیں۔'' اپنی بات پر زور دینے کے لیے لیپک نے اس کا شانہ دوستانہ انداز میں ہلایا۔

کرسی ہلی اور لیموئن کی گردن لڑھک گئی۔

گھبرا کر اس کی ساکن نبض ٹٹولتے ہوئے لیپک کی نظر اس کے دائیں ہاتھ میں پہنی انگوٹھی پر گئی جہاں نگینے کی جگہ خالی تھی۔

''لعنت ہو۔'' لیپک بڑبڑایا۔

انگوٹھی میں محفوظ سارا زہر وہ حساس فنکار اپنے حلق میں اتار چکا تھا۔

⌘⌘⌘

دستور شکن

ملک صفدر حیات

حقیت تو یہ ہے کہ "دنیا عبرت سرائے دہر" ہے یہاں ایک سے بڑھ کر ایک دستور شکن پیدا ہوتا رہا ہے... وہ جو خود کو بہت عقلمند سمجھا کرتے تھے... نادانی میں قدم قدم پر کم عقلی کا ثبوت دے کر بھی جانے کس خوش فہمی کا شکار تھے کہ دھیرے دھیرے ملک صاحب کے پھیلائے ہوئے جال میں قید ہوتے چلے گئے اور احساس تک نہ ہو پایا کیونکہ... مجرم ہزار چالاکیوں کے باوجود تھوڑی بہت بے وقوفی بھی کر جاتا ہے... بس اسی مقام سے قانون اپنی موجودگی کا احساس دلاتے ہوئے انہیں انجام تک لے جاتا ہے...

جرم کی دنیا میں خیر اور شر کے درمیان ہونے والی معرکہ آرائی

آج میں آپ کو اپنی پیشہ ورانہ زندگی کا ایک ایسا واقعہ سنانے جا رہا ہوں جس نے میرے دماغ کی چولیں ہلا کر رکھ دی تھیں۔ اس کیس کی کڑوی، کسیلی اور زہریلی یادیں ایک طویل عرصے تک کسی آسیب کے مانند میری سوچ کی ہم رکاب رہی تھیں۔

وہ ماہِ فروری کا آغاز تھا اور سہ پہر تیزی سے شام کی جانب بڑھ رہی تھی۔ میں تھانے میں بیٹھا روزمرہ کے امور نمٹا رہا تھا کہ ایک کانسٹیبل نے آکر مجھے بتایا۔

"ملک صاحب! ایک جوڑا آپ سے فریاد کرنے آیا ہے۔"

ان دنوں میری تعیناتی ضلع گوجرانوالہ کی تحصیل حافظ آباد کے ایک دور دراز علاقے "جلال پور بھٹیاں" کے تھانے میں تھی اور مجھے یہاں آئے ہوئے ابھی چار ماہ ہی ہوئے تھے۔

"احمد علی!" میں نے کانسٹیبل کی اطلاع کے جواب میں سوال کیا۔ "تم ہنسوں کے جوڑے کی بات کر رہے ہو یا پھر کبوتروں کے جوڑے کی؟"

"نہیں ملک صاحب! میں انسانوں کے جوڑے کی بات کر رہا ہوں۔" وہ جلدی سے وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "ایک مرد اور ایک عورت۔ وہ دونوں میاں بیوی ہیں۔ ڈاکوؤں نے انہیں لوٹ لیا ہے اسی لیے وہ آپ کے پاس آئے ہیں۔ میرا مطلب ہے تھانے میں اس واردات کی رپورٹ لکھوانے آئے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ "تو بھیجو انہیں اندر۔"

"او کے سر!" کانسٹیبل احمد علی نے فرمانبرداری سے کہا۔

"اور ہاں.....!" وہ دروازے تک پہنچا تو میں نے اضافہ کر دیا۔ "چمن شاہ سے بھی کہو کہ میرے پاس آجائے۔"

احمد علی اثبات میں گردن ہلا کر کمرے سے نکل گیا۔

حوالدار چمن شاہ اس تھانے میں سب سے سینئر تھا اور ایک فرض شناس پولیس آفیسر بھی۔ میں چونکہ یہاں نیا تھا اس

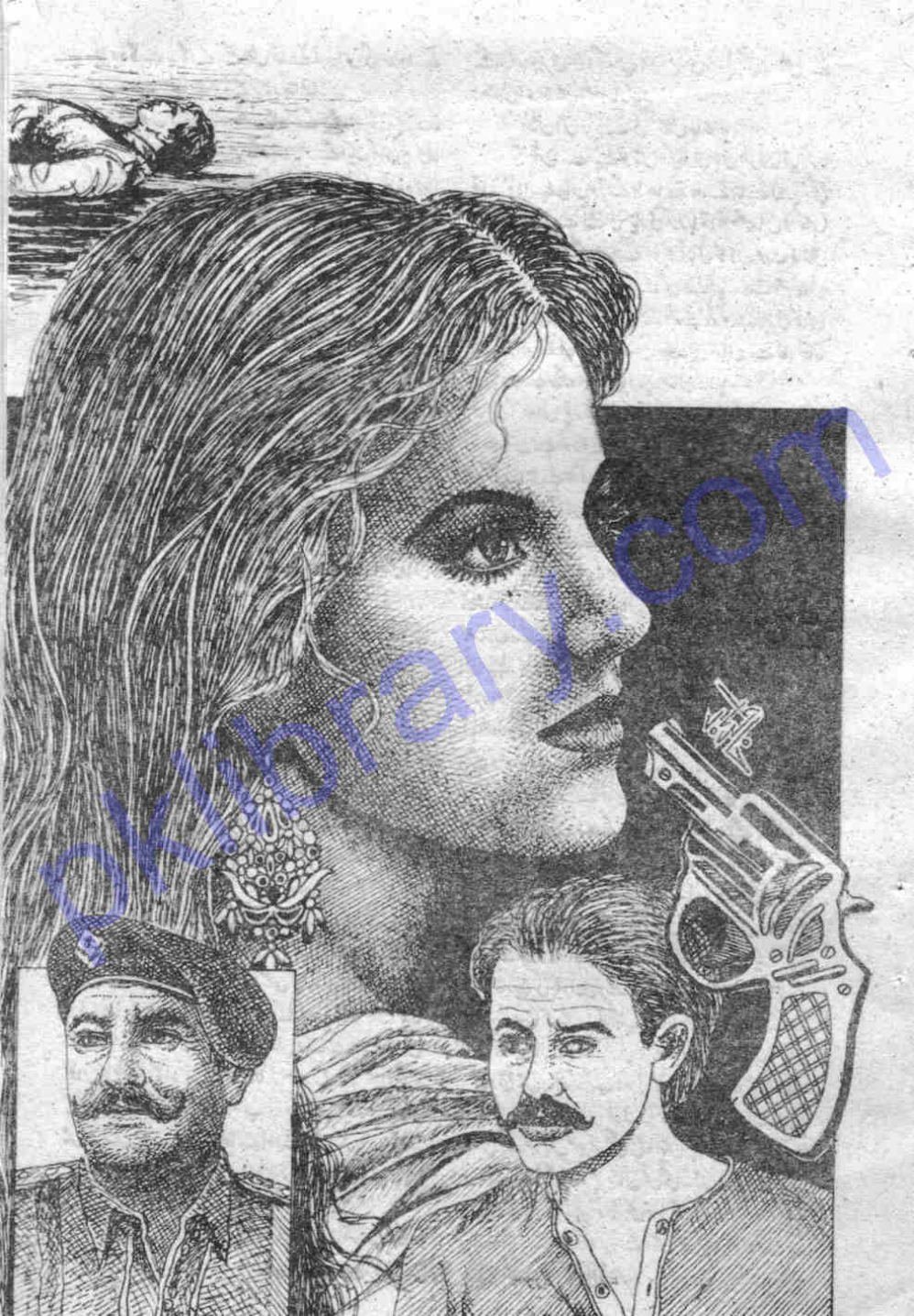
pklibrary.com

لیے وہ گاہے بہ گاہے مجھے اس تھانے اور اس کی حدود کے حوالے سے معلومات فراہم کرتا رہتا تھا۔

دونوں فریادی اور چمن شاہ آگے پیچھے میرے کمرے میں داخل ہوئے۔ حوالدار مجھے سلام کر کے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے ان میاں بیوی کو بیٹھنے کے لیے کہا تو وہ میرا شکریہ ادا کرنے کے بعد بیٹھ گئے۔ میں گہری نظر سے ان کا جائزہ لینے لگا۔

مرد کی عمر چالیس کے آس پاس تھی۔ وہ گندمی رنگت والا ایک دراز قامت شخص تھا۔ اس نے صاف ستھرے شلوار قمیص پر گرم سوئیٹر اور اس کے اوپر کوٹ پہن رکھا تھا۔ پاؤں میں بند جوتے تھے۔ وہ اپنے حلیے اور لباس سے آسودہ حال نظر آتا تھا۔ اس کی بیوی ایک میانہ قد اور گوری چٹی عورت تھی۔ اس نے سیاہ برقع پہن رکھا تھا تاہم اس کا نقاب اٹھا ہوا تھا۔ وہ ایک خوش شکل اور پُرکشش عورت تھی۔ ان کے پاس ایک درمیانے سائز کا اٹیچی کیس بھی تھا جس میں یقیناً انہوں نے اپنے کپڑے اور ضرورت کا دیگر سامان بھر رکھا ہوگا۔ بعدازاں مجھے ان کے نام داؤد اور نسیم عرف چھیماں معلوم ہوئے۔

میں نے ایک منٹ سے بھی کم وقت میں ان کا ظاہری معائنہ کرلیا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”مجھے بتاؤ، تم لوگوں کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا ہے؟“

”تھانیدار صاحب! میرا نام داؤد ہے اور یہ میری بیوی نسیم ہے۔“ وہ اپنا تعارف کراتے ہوئے بولا۔ ”ہمارا تعلق گوجرانوالہ شہر کے علاقے باغبان پورہ سے ہے۔ وہاں پر میرا پیتل اور تانبے کے برتن بنانے کا ایک کارخانہ ہے۔ دادا کے زمانے میں ہم لوگ جلال پور بھٹیاں کے ایک گاؤں ”کوٹ غازی کلاں“ میں رہتے تھے۔ اس گاؤں میں ہماری دس ایکڑ آبائی زرعی اراضی ہے۔ دادا کے انتقال کے بعد والد صاحب ہمیں لے کر گوجرانوالہ چلے گئے تھے مگر انہوں نے اپنی زمین کو فروخت نہیں کیا بلکہ اسے حیات محمد عرف بابا حیاتا نامی مزارع کے حوالے کردیا تھا۔ جب تک والد صاحب زندہ تھے تو وہ سال میں ایک چکر کوٹ غازی کلاں کا ضرور لگا لیا کرتے تھے تاکہ مزارع سے فصل وغیرہ کا حساب کرسکیں۔ والد صاحب کی وفات کے بعد یہ کام میں نے اپنے ذمے لے رکھا ہے اور آج بھی میں اسی مقصد سے اس طرف آیا تھا لیکن کوٹ غازی کلاں پہنچنے سے پہلے ہی ہمیں ایک حادثہ پیش آگیا۔“

وہ اپنی بات کو نامکمل چھوڑ کر متذبذب نظر سے مجھے تکنے لگا۔ میری نگاہ مسلسل اسی پر جمی ہوئی تھی۔ میں نے معتدل انداز میں استفسار کیا۔

”میں اس حادثے کی تفصیل جاننا چاہتا ہوں۔“

”آج سے پہلے تو میں اکیلا ہی اس طرف آیا کرتا تھا۔“ وہ اپنے بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے بتانے لگا۔ ”صبح جب میں گھر سے نکلنے کی تیاری کررہا تھا تو چھیماں (نسیم) نے ضد کی کہ وہ بھی میرے ساتھ آبائی گاؤں کوٹ غازی کلاں جائے گی۔ سو، میں اسے بھی لے آیا۔ جب ہم جلال پور بھٹیاں کے اڈے پر بس سے اترے تو کوٹ غازی کلاں جانے والا آخری تانگا کچھ دیر پہلے ہی وہاں سے نکلا تھا۔ اس بات نے مجھے بہت زیادہ پریشان کردیا.....“

”جلال پور بھٹیاں سے کوٹ غازی کلاں کم و بیش سات میل ہے اور اس طرف جانے والا تانگا عصر کے فوراً بعد نکل جاتا ہے تاکہ اندھیرا ہونے سے پہلے وہ اپنی منزل پر پہنچ جائے۔“ میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ”کیا اتنی اہم بات تمہارے ذہن میں نہیں تھی؟“

”یہ سارا حساب میرے ذہن میں تھا جناب اور میں ہمیشہ ظہر کے آس پاس یہاں پہنچ جایا کرتا تھا۔“ وہ رسان بھرے لہجے میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”لیکن آج کا دن پہلے سے بہت مختلف ثابت ہوا ہے۔ ہم حسب معمول مقررہ وقت پر بس میں بیٹھ گئے تھے۔ گوجرانوالہ سے حافظ آباد اور فتح پور تک سب ٹھیک رہا لیکن جب ہماری بس آگے بڑھی تو نوروز پور کے قریب خراب ہوگئی۔ ”نوروز پور“ فتح پور اور ”رسول پور تارڑ“ کے تقریباً درمیان واقع ہے یعنی اس وقت ہم جلال پور بھٹیاں سے لگ بھگ سات میل پیچھے تھے۔ اتنا زیادہ فاصلہ پیدل چل کر طے نہیں کیا جاسکتا تھا لہٰذا ہم بس کے ٹھیک ہونے کا انتظار کرتے رہے۔ ڈرائیور اور کنڈیکٹر کی مشترکہ کوشش اور محنت کے باوجود بھی اس کام میں دو ڈھائی گھنٹے لگ گئے۔“ لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا کہ اس وقت تک کوٹ غازی کلاں جانے والا آخری تانگا روانہ ہوچکا تھا۔ ہم اسی شش و پنج میں تھے کہ شب بسری کا کیا بندوبست کیا جائے۔ پہلے تو میں جب بھی اس طرف آتا تھا تو ایک رات اپنے مزارع کے گھر میں ٹھہر کر اگلی صبح واپس چلا جاتا تھا لیکن آج صورتِ حال مشکل اور پریشان کن تھی۔ میں اپنی اس مشکل کو حل کرنے کے لیے سوچ ہی رہا تھا کہ دو گھڑسوار ایک طرف سے آئے اور انہوں نے ہمیں گھیر لیا۔ وہ دونوں مسلح

تھے اور اپنے حلیے سے وہ ڈاکو اور لٹیرے ہی دکھائی دیتے تھے۔ انہوں نے اپنی بندوقوں کے بل پر ہمیں لوٹ لیا تھانیدار صاحب!''

وہ بولتے بولتے اچانک رکا تو میں نے پوچھ لیا۔ ''وہ تمہارا کیا لے گئے؟''

''میرے پاس ڈیڑھ ہزار روپے تھے جو میں نے اس بکسے کے اندر کپڑوں کی تہوں میں چھپا رکھے تھے۔'' وہ اپنے اٹیچی کیس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے دکھی لہجے میں بولا۔ ''ان کمینوں نے بڑی بیدردی سے اس بکسے کی تلاشی لی اور میری رقم کو اپنے قبضے میں کر لیا۔ اس کے علاوہ.....'' اس نے ایک افسردہ سانس خارج کی پھر افسوسناک انداز میں گردن ہلاتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

''چھیماں کے طلائی زیورات بھی انہوں نے بزورِ بندوق اتروا لیے جن میں چار طلائی چوڑیاں، جھمکے، گلے کا ہار اور دو انگوٹھیاں شامل ہیں۔ انسان کے لیے اس کی جان سب سے زیادہ قیمتی ہوتی ہے تھانیدار صاحب! سو ہم نے خود کو بچا کر باقی سب کچھ ان کے حوالے کر دیا۔''

''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں داؤد!'' میں نے تسلی بھرے لہجے میں کہا۔ ''وہ جو کوئی بھی ہیں، میں انہیں بہت جلد اپنی حراست میں لے لوں گا۔ تم مجھے ان کے قد کاٹھ اور حلیے وغیرہ کے بارے میں تفصیلاً بتاؤ؟''

آئندہ پانچ منٹ میں داؤد نے مذکورہ دونوں ڈاکوؤں کے حوالے سے جو وضاحت کی، اسے دیکھ کر یہی لگا جیسے وہ ان سے کئی بار مل چکا ہو۔ میں نے ایک بات خاص طور سے محسوس کی کہ اس دوران میں خوالدار کے چہرے پر کئی ایک رنگ آ کر گزر گئے تھے جن میں شناسائی کا رنگ سب سے نمایاں تھا۔ مجھے یہ سمجھتے ہوئے کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا کہ چمن شاہ ان ڈاکوؤں کو پہچان چکا تھا۔

''کچھ ذہن میں آ رہا ہے شاہ جی؟'' میں نے حوالدار کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''میں ایک سو ایک فیصد وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ ماکھا اور راجو ڈاکوؤں کے گروہ کے لوگ تھے۔'' چمن شاہ نے سرسراتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ ''ان سب کا سرغنہ کانا جما ہے ملک صاحب!''

''کانا جما!'' داؤد نے اضطراری لہجے میں کہا۔ ''یہ نام ان دونوں میں سے ایک ڈاکو نے بھی لیا تھا تھانیدار صاحب!''

جمال دین عرف کانا جما ایک نامی گرامی ڈاکو تھا جو اپنے گروہ کے ساتھ وارداتیں کیا کرتا تھا۔ ایک آنکھ والے کانا جما کے لیے میں ماضی کا صیغہ اس لیے استعمال کر رہا ہوں کہ وہ بدنام زمانہ ڈاکو اس وقت میری حراست میں تھا۔

کانا جما کی گرفتاری کے لیے مجھے واقعتاً پاپڑ بیلنا پڑے تھے۔ اس تھانے میں تعیناتی کے بعد یہ میرا ایک بڑا کارنامہ تھا۔ آج چار فروری کی تاریخ تھی۔ میں نے کانا جما کو گزشتہ روز یعنی تین فروری کو گرفتار کیا تھا۔ وہ زیرِ تفتیش تھا۔ ایک دو روز میں، میں اس کے خلاف مقدمہ تیار کر کے اسے عدالت میں پیش کرنے والا تھا۔

''تھانیدار صاحب! یہ کانا جما کون ہے؟'' داؤد نے الجھن زدہ لہجے میں مجھ سے پوچھا۔ ''اس کے بندوں نے ہمیں کیوں لوٹا ہے..... آخر ہم نے ان کا کیا بگاڑا تھا؟ میں نے تو کانا جما کا نام اس سے پہلے کبھی نہیں سنا۔''

''کانا جما کا اصل نام جمال دین ہے۔ وہ ایک آنکھ سے کانا ہے اسی لیے اسے ''کانا جما'' کہا جاتا ہے۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''کانا جما ایک بہت ہی خطرناک ڈاکو ہے اور اس گروہ کی آپ لوگوں سے کوئی دشمنی نہیں۔ ڈاکوؤں کا کام ہوتا ہے لوٹ مار اور ڈکیتی کرنا۔ وہ اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے دوست اور دشمن کے فرق کے چکر میں نہیں پڑتے۔ بہرکیف، میں نے کانا جما کی مجرمانہ سرگرمیوں کے آگے بند باندھ دیا ہے۔ اس وقت وہ میری تحویل میں ہے۔ میں اس کے ساتھیوں کو بھی بہت جلد گرفتار کر لوں گا۔''

''یہ تو آپ نے خوشی کی خبر سنائی ہے تھانیدار صاحب!'' داؤد کا چہرہ کھل اٹھا۔ ''جن دو ڈاکوؤں نے ہمیں لوٹا ہے، اگر وہ آپ کے ہتھے چڑھ گئے تو میرے پیسے اور چھیماں کے طلائی زیورات بھی برآمد ہو جائیں گے۔''

''ان شاء اللہ..... ضرور!'' میں نے پورے یقین کے ساتھ کہا۔ ''ویسے میں تمہاری یادداشت کی داد دیتا ہوں داؤد!''

اس کا چہرہ لمحے بھر کے لیے متغیر ہوا پھر اس نے الجھن زدہ لہجے میں پوچھا۔ ''وہ کس لیے تھانیدار صاحب؟''

''جب ماکھا اور راجو تم دونوں کو لوٹ رہے تھے تو یقیناً تم حد سے زیادہ گھبرا گئے ہو گے۔'' میں نے داؤد کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔ ''اس کے باوجود بھی تم نے ان کا قد کاٹھ، حلیہ اور دیگر تفصیلات کو ایسے یاد رکھا جیسے تم انہیں کافی عرصے سے جانتے ہو۔''

''وہ بات دراصل یہ ہے تھانیدار صاحب!'' وہ اضطراری لہجے میں بولا۔ ''یہ سچ ہے کہ میرا حافظہ بہت مضبوط ہے۔ میں آج پہلی مرتبہ آپ سے ملا ہوں۔ اگر دس

سال کے بعد بھی ہماری دوسری ملاقات ہوگی تو میں دیکھتے ہی نہ صرف آپ کو پہچان لوں گا بلکہ یہ بھی بتادوں گا کہ آپ کا وزن اور قد کتنا ہے اور ان دس سالوں میں آپ کے اندر کیا کیا تبدیلیاں آئی ہیں۔ میرے تمام جاننے والے میری اس صلاحیت کی بہت تعریف کرتے ہیں۔''

''داؤد بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے تھانیدار صاحب!'' اس کی بیوی نسیم عرف چھیماں نے تصدیقی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''سب کو اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ کسی انسان کا دماغ اس قدر تیز بھی ہوسکتا ہے۔''

''اللہ تعالیٰ نے انسان کے وجود میں روح کے بعد سب سے زیادہ حیرت انگیز شے اس کے دماغ کو بنایا ہے بی بی!'' میں نے نسیم کی بات کے جواب میں کہا۔ ''اسی لیے اس اہم عضو کی حفاظت کے لیے اسے کھوپڑی جیسے مضبوط قلعے کے اندر رکھا گیا ہے۔ بس اللہ اپنے جس بندے پر مہربان ہوتا ہے، اسے عام لوگوں سے زیادہ ذہنی صلاحیت عطا کردیتا ہے۔ اس لحاظ سے تمہارا خاوند داؤد بڑا قسمت والا ہے۔''

''یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں تھانیدار صاحب!'' وہ جلدی سے بولی۔ ''داؤد واقعی بہت اچھا انسان ہے۔ ہماری شادی کو سولہ سال ہوگئے ہیں۔ ہم ایک بے اولاد جوڑا ہیں۔ داؤد کی جگہ اگر کوئی اور مرد ہوتا تو وہ کب کا دوسری شادی کرچکا ہوتا لیکن داؤد نے کبھی اس بارے میں سوچا نہیں۔ میں نے کئی بار اس سے کہا بھی کہ اولاد کی خواہش ہر انسان کو ہوتی ہے۔ اگر تم راضی ہوجاؤ تو میں خود تمہاری دوسری شادی کروادوں گی مگر یہ کسی بھی صورت دوسری شادی کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ بس اس کی زبان پر ہر سوال کا ایک ہی جواب ہے..... ''چھیماں! اگر میری قسمت میں اولاد ہے تو سوہنا رب تم ہی میں سے مجھے اولاد دے گا۔''

''تم تو واقعی نصیب والی ہو بی بی جو تمہیں اتنا وفادار اور صابر و شاکر خاوند ملا ہے۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''ساری زندگی اس کی قدر کرنا۔''

''جی ضرور۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی پھر ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں اضافہ کردیا۔ ''تھانیدار صاحب! کیا آپ نے واقعی کانا جما کو گرفتار کرلیا ہے؟''

''ہاں، بالکل۔ وہ اس وقت میرے تھانے کی حوالات میں بند ہے۔'' میں نے معتدل انداز میں جواب دیا۔ ''کیا تمہیں میری بات کا یقین نہیں آیا؟''

''ایسا نہیں ہے جی۔'' وہ گڑبڑائے ہوئے لہجے میں بولی۔ میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ ''پھر کیسا ہے؟''

''وہ بات دراصل یہ ہے تھانیدار صاحب.....!'' وہ ہچکچاہٹ آمیز انداز میں بولی۔ ''میں نے ڈاکوؤں کے بہت سے قصے اور کہانیاں سن رکھی ہیں لیکن آج پہلی بار حقیقی ڈاکوؤں سے واسطہ پڑا ہے۔ جب وہ دونوں بدبخت ہمیں بندوق دکھا کر لوٹ رہے تھے تو میری عقل گم ہوگئی تھی۔ میں ان پر ذرا سا بھی دھیان نہیں دے سکی حالانکہ میری یہ شدید خواہش رہی ہے کہ کبھی کسی ڈاکو کو روبرو دیکھوں۔ کیا آپ مجھے.....'' لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''کیا آپ مجھے کانا جما کو دیکھنے کا موقع دے سکتے ہیں؟''

''چھیماں! تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا؟'' داؤد نے اسے جھڑکا۔ ''کانا جما کوئی ہیرو نہیں جو تمہیں اسے دیکھنے کا شوق چڑھا ہے۔ وہ ایک خطرناک ڈاکو ہے۔ پتا نہیں اس نے کتنے بے گناہ انسانوں کو موت کے گھاٹ اتارا ہوگا۔'' پھر وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''تھانیدار صاحب! چھیماں کی بات پر توجہ دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ پاگل تو ایسی ہی الٹی سیدھی بولتی رہتی ہے۔''

''داؤد! تمہاری گھر والی کی فرمائش پوری کرنے میں مجھے کوئی قباحت نظر نہیں آتی۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''کانا جما میری تحویل میں ہے۔ میں کسی بھی وقت چھیماں کو اس کا دیدار کراسکتا ہوں لیکن اس سے پہلے ایک اور مسئلے کو حل کرنا ضروری ہے۔''

''کون سا مسئلہ تھانیدار صاحب؟'' داؤد نے چونکے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

''اس مسئلے کا تعلق تم دونوں میاں بیوی سے ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اس وقت شام ہورہی ہے۔ اس وقت واپس گوجرانوالہ جانے کے لیے تم لوگوں کو کوئی بس یا ویگن نہیں ملے گی اور کوٹ غازی کلاں کی طرف جانے والا آخری تانگا تم مس کرچکے ہو۔ اگر میرے پاس کوئی متبادل انتظام ہوتا تو میں تمہیں کوٹ غازی کلاں ضرور پہنچوادیتا۔ سمجھ میں آرہا ہے نا، میں کیا کہنا چاہ رہا ہوں؟''

''جی..... میں اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔'' وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''مسئلہ ہمارے رات گزارنے کا ہے اور ہم اس علاقے میں یعنی یہاں آس پاس کسی کو نہیں جانتے۔'' اس نے الجھن زدہ انداز میں توقف کیا پھر معتدل انداز میں بولا۔

''تھانیدار صاحب! کیا آپ ہم سے تھوڑا تعاون

کر سکتے ہیں؟''

''ہاں، بولو۔'' میں نے پوچھا۔ ''تم مجھ سے کس قسم کا تعاون چاہتے ہو؟''

''اگر آج کی رات گزارنے کے لیے ہمیں آپ کے تھانے میں تھوڑی سی جگہ مل جائے تو یہ آپ کا ہم پر بہت احسان ہوگا۔'' وہ منت ریز لہجے میں بولا۔ ''ہم سورج اگتے ہی یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔ ہم سیدھے سادے، امن پسند لوگ ہیں۔ آپ کو ہماری وجہ سے کوئی پریشانی نہیں ہوگی جناب!''

تھانے میں باہر کے کسی بندے کا رات بھر کے لیے رک جانا کوئی نئی یا اچنبھے کی بات نہیں تھی اور یہ جوڑا تو مصیبت زدہ تھا۔ کانا جما کے گروہ کے دو ڈاکوؤں نے ان کی ساری رقم اور طلائی زیورات لوٹ لیے تھے۔ سچی بات تو یہ کہ ان کے پاس کہیں جانے کے لیے کرایہ بھی نہیں بچا تھا۔

''فکر مند ہونے کی بالکل ضرورت نہیں ہے داؤد!'' میں نے تسلی آمیز انداز میں کہا۔ ''تم میاں بیوی کو باقاعدہ منجی بستر ملے گا۔ اس کے علاوہ رات کا کھانا اور صبح کا ناشتا بھی فراہم کیا جائے گا۔ تم اطمینان سے تھانے میں رات گزار سکتے ہو۔ سمجھ لو کہ آج کی رات تم میاں بیوی ہمارے مہمان ہو۔''

''بہت شکریہ تھانیدار صاحب!'' داؤد نے تشکرانہ انداز میں کہا۔ ''شکر ہے آپ نے ہمارے لیے ''سرکاری مہمان'' کے الفاظ استعمال نہیں کیے۔''

''سرکاری مہمان'' کی اصطلاح ان خطرناک مجرموں کے لیے استعمال کی جاتی ہے جنہیں تفتیش کے دوران میں حوالات میں بند رکھا جاتا ہے اور پوچھ تاچھ کے لیے انہیں ٹرائل روم میں لے جا کر خوب ''خاطر داری'' کی جاتی ہے۔

''تم لوگ ہمارے ذاتی مہمان ہو۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''سرکاری مہمان تو ڈاکوؤں کا سرغنہ کانا جما ہے جو گزشتہ روز سے گاہے بہ گاہے ہماری ''مہمان نوازی'' کا ''لطف'' اٹھا رہا ہے۔'' میں لمحے بھر کے لیے رکا پھر ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

''ویسے تم لوگوں کا ارادہ کیا ہے۔ میرا مطلب ہے کل صبح تم کوٹ غازی کلاں کا رخ کرو گے یا واپس اپنے گھر گوجرانوالہ لوٹنے کا پروگرام ہے؟''

''ہم کوٹ غازی کلاں ہی جائیں گے تھانیدار صاحب!'' داؤد نے کہا۔ ''ہمارے ساتھ جو ہونا تھا، وہ تو ہو چکا۔ ہم جس مقصد سے یہاں آئے ہیں، اسے پورا کرنا بھی ضروری ہے۔ میں ایک روز اپنے مزارع بابا حیاتا کے پاس ضرور گزاروں گا۔ چھیماں پہلی مرتبہ گاؤں دیہات کی فضا میں آئی ہے۔ اسے یہاں کے ماحول کو بھی اچھی طرح دیکھنا چاہیے۔''

''ٹھیک ہو گیا۔'' داؤد کے خاموش ہونے پر میں نے کہا۔ ''تم لوگ باہر جا کر برآمدے میں بیٹھو۔ میں تمہارے لیے شب بسری کا معقول بندوبست کرواتا ہوں۔''

''بہت بہت شکریہ تھانیدار صاحب!'' داؤد اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اس نے اپنا بکسا بھی اٹھا لیا۔

اس کی تقلید میں چھیماں نے بھی اپنی جگہ چھوڑ دی۔ جب وہ لوگ باہر جانے کے لیے دروازے کی طرف پلٹے تو میں نے اطمینان بھرے لہجے میں کہا۔

''کوٹ غازی کلاں سے واپسی پر یہاں آنا نہیں بھولنا۔ آج تمہارا جو نقصان ہوا ہے، اسے میں نے اپنے ذہن میں محفوظ کر لیا ہے۔ میری یہی کوشش ہوگی کہ تمہارے گوجرانوالہ جانے سے پہلے میں ماکھا اور راجو کو گرفتار کر لوں۔ وہ دونوں خبیث میرے ہتھے چڑھ گئے تو پھر ان کے اندر سے ڈکیتی کا سارا مال نکالنا بہت آسان ہو جائے گا۔ میری نیت تو یہی ہے آگے جو اللہ کی مرضی۔''

''اللہ آپ کو کامیابی عطا فرمائے تھانیدار صاحب!'' چھیماں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''ویسے ہمارا نقصان کوئی معمولی نوعیت کا نہیں ہے۔ اگر آپ کی کوشش سے ہماری رقم اور زیورات واپس مل جاتے ہیں تو ہم آپ کو انعام ضرور دیں گے۔''

چھیماں اپنے طلائی زیورات اور داؤد کی نقد رقم کے بارے میں غلط نہیں کہہ رہی تھی۔ اس زمانے کے ڈیڑھ ہزار روپے آج کے ساڑھے سات لاکھ سمجھ لیں اور ساٹھ سال پہلے سونا زیادہ سے زیادہ سو روپے تولہ مل جاتا تھا۔ نیم عرف چھیماں کی چار چوڑیاں، دو انگوٹھیاں، گلے کا ہار اور کانوں کے جھمکے کل ملا کر پانچ تولے سونے کے زیورات تھے۔ آج ان کی قیمت کسی بھی طرح لاکھوں سے کم نہیں تھی۔ آج کے حساب سے ان لوگوں کا اچھا خاصا نقصان ہو گیا تھا جو ظاہر ہے کوئی معمولی بات نہیں تھی۔

''میں کسی انعام کے لالچ میں اپنی پیشہ ورانہ خدمات انجام نہیں دیتا بی بی!'' میں نے واشگاف الفاظ میں چھیماں سے کہا۔ ''ایک تھانہ انچارج ہونے کے ناتے یہ سب میرے فرائض میں شامل ہے۔ آپ لوگ قانون پر بھروسا

رکھیں اور دعا کریں میں کانا جما کی زبان سے ماکھا اور راجو کے ٹھکانے کا پتا لگانے میں کامیاب ہو جاؤں۔ اس کے بعد ساری مشکلات خود بخود آسان ہو جائیں گی۔''

وہ دونوں میرا شکریہ ادا کر کے کمرے سے نکل گئے۔ ان کے جانے کے بعد میں نے حوالدار چمن شاہ سے کہا۔ ''شاہ جی! آپ ان میاں بیوی کے کھانے پینے اور چارپائی بستر وغیرہ کا انتظام کر کے میرے پاس آجائیں۔ مجھے آپ سے چند ضروری باتیں کرنا ہیں۔''

''جو حکم ملک صاحب!'' وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور پوچھا۔ ''ان مہمانوں کی چارپائیاں برآمدے میں لگوادوں یا کسی اندرونی کمرے میں؟''

''میرے خیال میں اب سردی میں وہ دسمبر اور جنوری والی شدت باقی نہیں رہی اس لیے ان کی شب بسری کے لیے برآمدہ زیادہ مناسب رہے گا۔'' میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''البتہ یہ خیال رکھنا کہ بستر وغیرہ گرم ہو۔''

''سمجھ گیا ملک صاحب!'' اس نے اثبات میں گردن ہلا کر میرے حکم کی تعمیل کا یقین دلایا اور کمرے سے نکل گیا۔

میں موجودہ صورتِ حال پر غور کرنے لگا۔

☆☆☆

چمن شاہ کی واپسی کم و بیش آدھے گھنٹے کے بعد ہوئی تھی۔ اس دوران میں، میں نے نمازِ مغرب ادا کر لی تھی۔ وہ میرے سامنے آکر بیٹھا اور مؤدبانہ انداز میں کہا۔

''سب ہو گیا ملک صاحب! اس وقت وہ دونوں کھانا کھا رہے ہیں۔ ان کی چارپائیاں برآمدے کے ایک کونے میں پہلو بہ پہلو لگا دی ہیں۔ مچھیاں پوچھ رہی تھی کہ اسے کانا جما کی شکل کب دکھائیں گے؟ میں نے کہہ دیا کہ تم لوگ کھانا کھانے کے بعد آرام سے سو جاؤ۔ صبح تمہاری یہ خواہش پوری کر دی جائے گی۔''

''شاباش! یہ تم نے بہت اچھا کیا شاہ جی!'' میں نے ستائشی نظر سے حوالدار کی طرف دیکھا۔ ''آج کی رات ہم نے کانا جما کو کڑی تفتیش سے گزارنے کا پروگرام بنایا تھا تاکہ کل میں اس کا تفصیلی بیان قلم بند کرنے کے بعد اس کے خلاف سخت ترین چالان تیار کر کے اسے عدالت میں پیش کر دوں۔ اس کے جیسے خطرناک مجرموں کو لمبے عرصے تک حوالات میں بند رکھنا ٹھیک نہیں ہوتا اور موجودہ حالات میں تو یہ اور بھی ضروری ہو گیا ہے کہ میں جلد از جلد اپنا کام نمٹانے کے بعد اس کانے مردود کو حوالۂ عدالت کروں۔''

''موجودہ حالات سے آپ کی مراد داؤد اور اس کی بیوی چھیماں کے ساتھ پیش آنے والا واقعہ ہے نا؟''

''بالکل یہی بات ہے شاہ جی!'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''کانا جما ہماری کسٹڈی میں ہے۔ یہ بات اس کے گروہ کے تمام لوگ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان کا سرغنہ تھانے سے عدالت اور عدالت سے سیدھا جیل جائے گا۔ اس کے باوجود بھی اس کے دو بندوں ماکھا اور راجو نے ہمارے تھانے سے تھوڑے ہی فاصلے پر ایک سنگین واردات کی ہے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں۔ یہ واقعہ بادی النظر میں تو ماکھا اور راجو کی ہمت اور حوصلے کو ظاہر کرتا ہے لیکن میں اس سے زیادہ کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔''

''آپ کی بات میں وزن ہے ملک صاحب!'' چمن شاہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''مجھے بتائیں آپ ''زیادہ'' کیا سوچ رہے ہیں تاکہ میں اندازہ لگا سکوں کہ میرے ذہن میں جو چل رہا ہے، وہ آپ کی سوچ سے کس حد تک مطابقت رکھتا ہے۔''

''ہوں۔'' میں نے ایک گہری سانس خارج کرنے کے بعد ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ہم نے بڑی تگ و دو کے بعد کانا جما کو گرفتار کیا ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ہمیں جنگل کے بیچوں بیچ دشوار گزار سفر کرنا پڑا ہے۔ بالآخر ہم اس کے خفیہ ڈیرے تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ دو طرفہ فائرنگ کے نتیجے میں ایک گولی کانا جما کی ٹانگ میں لگی اور وہ زخمی ہو جانے کے باعث... یہ آسانی ہمارے قابو میں آگیا۔ اس کے باقی ساتھی ہمیں جُل دے کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ انہوں نے رات کی تاریکی کا بھرپور فائدہ اٹھایا اور ہماری پہنچ سے دور نکل گئے۔ ہم کانا جما کو گرفتار کر کے اپنے ساتھ تھانے لے آئے۔ ہم بہت مطمئن تھے کہ اس گندے تالاب کی سب سے بڑی مچھلی ہمارے ہاتھ لگ گئی ہے۔ اس کی زبان کھلوانے کے بعد ہمیں دوسرے ڈاکوؤں کا سراغ بھی مل جائے گا لیکن ابھی تک اس بدبخت نے اپنے ساتھیوں کے بارے میں کچھ پھوٹ کر نہیں دیا اور.....'' میں سانس ہموار کرنے کی غرض سے متوقف ہوا پھر ان الفاظ میں اپنی بات مکمل کر دی۔

''اور اب ماکھا اور راجو کی مذموم کارروائی سے یہ ظاہر ہو گیا ہے کہ کانا جما کے گروہ کے بندے ہمارے تھانے کے گرد و نواح میں موجود ہیں اور یہ کوئی اطمینان بخش بات نہیں ہے شاہ جی!''

''کانا جما کی زبان کا جندرا (تالا) کیسے کھلوانا ہے،

یہ میں اچھے سے جانتا ہوں ملک صاحب!'' وہ پُراعتماد لہجے میں بولا۔ ''آج کی رات میں اس کا خصوصی ''علاج'' کرنے والا ہوں۔ کل کا سورج طلوع ہونے سے پہلے میں اس کے اندر کا تفصیلی احوال جاننے کے بعد اس کی رپورٹ آپ کی خدمت میں پیش کردوں گا۔ اس حوالے سے آپ کو فکرمند ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ باقی جہاں تک کانا جما کے گروہ کے لوگوں کا معاملہ ہے تو.....'' اس نے پُرسوچ انداز میں توقف کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''اس حوالے سے میں آپ سے مکمل اتفاق کرتا ہوں ملک صاحب! ان لوگوں کی طرف سے کوئی بھی غیر قانونی اور اوچھی حرکت کی امید رکھی جاسکتی ہے لہٰذا ہمیں کم از کم آج کی رات پوری طرح چوکنا رہنا ہوگا۔ کل تو آپ کانا جما کو ویسے بھی عدالت میں پیش کردیں گے۔''

''اگر کانا جما کے ساتھی قانون کو اپنے ہاتھوں میں لینے کی حماقت کریں گے تو ہم بھی یہاں کوئی چوڑیاں پہن کر نہیں بیٹھے ہوئے۔'' میں نے کڑوے مگر پُرعزم لہجے میں کہا۔ ''میں نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں ایسے کئی واقعات بھگتائے ہیں جب خطرناک مجرموں نے اپنے کسی زیرِ تفتیش ساتھی کو چھڑانے کے لیے تھانے پر چڑھائی کردی تھی۔ میں نے ایسے دستور شکن لوگوں کو ہمیشہ ٹف ٹائم دیا ہے۔ ادھر سے اگر ایک اینٹ آئی تو میں نے جواب میں ان پر پتھروں کی بارش کردی۔ نتیجتاً انہیں گھٹنے ٹیکتے ہی بنی۔ اگر کانا جما کے آدمیوں نے ایسی کوئی حماقت کی تو انہیں نہ صرف منہ کی کھانا پڑے گی بلکہ وہ سب پوری طرح ہمارے قبضے میں بھی آجائیں گے لیکن احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ ہمیں اپنی حفاظت کا عملی بندوبست کرلینا چاہیے۔''

''بجا فرمایا آپ نے۔'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''اس سلسلے میں آپ کا کیا حکم ہے ملک صاحب؟''

''ہم دونوں کے علاوہ ہمارے اسٹاف میں چار کانسٹیبلز ہیں۔'' میں نے اپنے منصوبے سے حوالدار کو آگاہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ہم ان کی ڈیوٹی لگادیتے ہیں کہ وہ تھانے کے چاروں طرف رات بھر گزا پہرا دیں۔ وہ سادہ لباس میں تھانے کے باہر تھوڑے فاصلے پر موجود رہیں گے اور اپنے ماحول میں نظر آنے والی کسی بھی غیر معمولی سرگرمی پر اپنی توجہ مرکوز رکھیں گے اور اگر کوئی بندہ بشر زبردستی تھانے کی حدود میں داخل ہونے کی کوشش کرے تو وہ بزورِ بازو اسے روکنے کی کوشش کریں گے اور اگر ضرورت محسوس ہوئی تو گولی چلانے میں کسی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کریں گے۔''

''اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ہمارے سادہ پوش جوان مسلح ہوں گے؟'' حوالدار نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

''بالکل۔'' میں نے قطعی لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ ''ہمارے تھانے میں اتنی بندوقیں تو ہیں نا؟''

''جی، اس سے زیادہ ہی ہیں۔'' چمن شاہ نے بتایا۔

''جو بھی شخص زور زبردستی سے تھانے کے اندر گھسنے کی کوشش کرے گا اس کے بارے میں دو باتیں وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہیں۔'' میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''نمبر ایک، وہ کوئی شریف النفس انسان نہیں ہوگا۔ نمبر دو، اس کے پاس کسی بھی نوعیت کا آتشیں اسلحہ ضرور ہوگا۔ ایسی صورت میں.....'' میں نے ذرا سا توقف کرکے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''ایسی صورت میں ہم اپنے اسٹاف کو خالی ہاتھ ان جرائم پیشہ لوگوں کے مدمقابل نہیں لاسکتے۔ یہ تو اپنی نفری کو موت کے منہ میں دھکیلنے کے مترادف ہوگا۔ امید ہے تم میری بات سمجھ گئے ہوگے۔''

''بالکل سمجھ گیا ملک صاحب!'' وہ توانا لہجے میں بولا۔ ''اگر سمجھ گئے ہو تو چاروں کانسٹیبلو کو یہاں لے آؤ۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

وہ ''اوکے سر'' کہتے ہوئے میرے کمرے سے نکل گیا۔

آئندہ پندرہ منٹ کے اندر میں نے ان چاروں افراد کو ان کی ''اسپیشل ڈیوٹی'' کے بارے میں آگاہ کرتے ہوئے کہا۔

''نصیر احمد! تم تھانے کی دائیں جانب والی دیوار کے نزدیک موجود رہوگے اور خادم حسین! تمہاری ڈیوٹی بائیں دیوار کے ساتھ ہے۔ احمد علی! تم تھانے کے سامنے والے حصے میں پہرا دو گے اور احسان اللہ! تم میرے کوارٹر کی عقبی سمت نگرانی کا کام کروگے۔''

سب نے باری باری اثبات میں گردن ہلا کر میرے حکم کی تعمیل کا یقین دلایا۔ میں نے مزید کہا۔

''تم سب سادہ لباس میں اس مہم کو سرانجام دوگے اور تمہارے پاس بندوقیں بھی ہوں گی۔ رات کی تاریکی میں کوئی ٹیڑھا آدمی ہی غیر قانونی انداز میں تھانے میں داخل ہونے کی کوشش کرسکتا ہے اور تم لوگوں نے ایسے ہی لوگوں کو روکنا ہے۔ اگر وہ تمہاری پکار یا للکار کو خاطر میں نہ لائے تو تم اس پر گولی چلانے کے لیے پوری طرح آزاد ہو..... کوئی سوال؟''

میں نے ان چاروں کو اس ''نائٹ مشن'' کے بارے میں اتنی تفصیل سے بتا دیا تھا کہ کسی نے مجھ سے سوال کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ میں نے احسان اللہ کو اپنے پاس روک کر باقی تین کو جانے کے لیے کہہ دیا۔ جب وہ اپنی ''ڈیوٹی'' سنبھالنے کے لیے میرے کمرے سے نکل گئے تو میں نے حوالدار کو مخاطب کرتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔

''شاہ جی! آپ کی ڈیوٹی تھانے کے اندرونی حصے میں ہوگی اور نظر خاص طور پر کانا جما پر جمی رہنا چاہیے..... ٹھیک ہے؟''

''جی ملک صاحب!'' وہ فرمانبرداری سے بولا۔

''میں اپنے کوارٹر میں جا رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''کھانا کھانے کے بعد میں عشا کی نماز ادا کروں گا۔ اس دوران میں تم حوالاتی کا ''مزاجِ حال'' دریافت کر لو پھر ہم مل کر اس کا ''خصوصی'' انٹرویو کریں گے۔''

''سمجھ گیا ملک صاحب!'' وہ سر کو تعظیمی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ''آپ بے فکر ہو کر کوارٹر میں جائیں۔ میں کانا جما کی زبان کے تانکے کھولنے کی کوشش کرتا ہوں۔''

''اور ہاں.....!'' میں نے ایک فوری خیال کے تحت کہا۔ ''تمام کانسٹیبلو سے یہ بھی کہہ دو کہ وہ رات کا کھانا کھانے کے بعد اپنی مہم پر نکلیں کیونکہ رات بھر انہیں چوکنا رہ کر تھانے کے بیرونی ماحول کی نگرانی کرنا ہے۔''

''چاروں کانسٹیبلو کھانا کھا چکے ہیں ملک صاحب!'' چمن شاہ نے معتدل انداز میں جواب دیا۔ ''صرف میں اور آپ ہی بچے ہیں۔''

''اچھی بات ہے۔'' میں نے اپنی کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا پھر احسان اللہ کی طرف دیکھتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔ ''تم بھی لباس تبدیل کر کے بندوق کے ساتھ میرے کوارٹر میں آ جاؤ، میں تمہیں سمجھا دوں گا کہ کہاں ڈیوٹی کرنا ہے۔''

''جو حکم ملک صاحب!'' وہ جلدی سے بولا۔

میں اپنے کمرے سے نکل کر کوارٹر کی سمت بڑھ گیا جو تھانے کے عقبی حصے میں بنا ہوا تھا۔

میں نے رات کا کھانا کھایا اور عشا کی نماز کے لیے کھڑا ہو گیا۔ جب میں نے نماز ادا کر لی تو ایک اچھوتا خیال میرے ذہن میں ابھرا۔ اس خیال کا تعلق کوٹ غازی کلاں کے وسنیک مزارع حیات محمد عرف بابا حیاتا سے تھا۔ جب کانسٹیبل احسان اللہ میرے کوارٹر پر آیا تو میں نے اس سے کہا۔

''تمہاری سائیکل کہاں ہے احسان اللہ؟''

''تھانے میں کھڑی ہے ملک صاحب!'' اس نے بتایا۔

''تمہارا مشن دوسروں سے مختلف ہے۔'' میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''تم یونیفارم پہن کر اپنی سائیکل پر سوار ہو اور سیدھا کوٹ غازی کلاں روانہ ہو جاؤ اور اپنے ساتھ بندوق لے جانے کی ضرورت نہیں۔''

''مگر آپ نے تھانے میں تو یہ کہا تھا کہ میں آپ کے کوارٹر کے عقبی حصے کی نگرانی کروں گا؟'' اس نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا۔

''ہاں کہا تھا لیکن اب میں نے اپنا پروگرام بدل دیا ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''کیا تمہیں میرے نئے پروگرام سے کوئی تکلیف ہے؟''

''نہیں ملک صاحب!'' وہ جلدی سے بولا۔ ''وہ تو میں نے بس ایسے ہی کہہ دیا تھا۔''

''بس تو پھر تم ''ایسے ہی'' کوٹ غازی کلاں روانہ ہو جاؤ۔'' میں نے تاکیدی انداز میں کہا۔ ''تم نے وہاں جا کر بابا حیاتا نامی ایک مزارع سے ملنا ہے اور اسے اپنے ساتھ لے کر واپس تھانے آنا ہے۔ اگر کوئی سواری مہیا نہ ہو سکے تو تم بابا حیاتا کو اپنی سائیکل کے کیریئر پر بٹھا کر یہاں لاؤ گے۔ تم صحت مند اور جوان جہان ہو۔ مجھے یقین ہے تم یہ کام بہ آسانی کر لو گے۔''

''وہ تو میں کر لوں گا جناب!'' وہ متذبذب انداز میں بولا۔ ''لیکن اگر بابا حیاتا نے اتنی رات میرے ساتھ آنے سے انکار کر دیا تو میں اس سے کیا کہوں گا؟''

''تمہارے بدن پر سجی ہوئی پولیس کی وردی بابا حیاتا کو چوں کرنے دے گی اور نہ ہی چاں۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر دباؤ ڈالتے ہوئے کہا۔ ''اور اگر اس نے زیادہ زبان لانے کی کوشش کی تو کہہ دینا کہ میں نے اسے تھانے بلایا ہے۔ اس سے کانا جما اور اس کے گروہ کے بارے میں کچھ پوچھ تاچھ کرنا ہے۔''

''جی، میں سمجھ گیا۔'' وہ جلدی سے بولا۔

''سمجھ گئے ہو تو پھر مہم پر نکل جاؤ۔'' میں نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ ''کوشش کرنا کہ صبح سے پہلے تم بابا حیاتا کو لے کر واپس آ جاؤ۔''

''جی، میری یہی کوشش ہوگی۔'' وہ فرمانبرداری سے بولا اور مجھے سیلوٹ کر کے رخصت ہو گیا۔

مزارع حیات محمد کو تھانے بلانے کی دو وجوہات تھیں۔ نمبر ایک، موضع کوٹ غازی کلاں دریائے چناب

کے کنارے پر واقع تھا۔ اس چھوٹے سے گاؤں اور دریائے چناب کے درمیان ایک گھنا جنگل تھا اور میں نے اسی جنگل میں سے کانا جما کو گرفتار کیا تھا۔ اس کے گروہ کے تمام افراد رات کی تاریکی کا فائدہ اٹھا کر اِدھر اُدھر نکل گئے تھے۔ ڈاکوؤں کے ٹھکانے سے نزدیک ترین علاقہ کوٹ غازی کلاں ہی تھا۔ اغلب امکان اس بات کا تھا کہ ان میں سے بیشتر نے اسی گاؤں میں خفیہ پناہ لی ہوگی۔ داؤد کے بیان کے مطابق بابا حیاتا اور اس کا خاندان سالہا سال سے کوٹ غازی کلاں میں رہ رہا تھا۔ میں اسی لیے اس مزارع سے سنجیدہ گفتگو کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ ہوسکتا ہے وہ کوئی ایسی راہ سجھادے جو کانا جما کے ساتھیوں کو چھاپے میں میری مدد کرے۔ دوسری وجہ بابا حیاتا کے مہمان تھے۔ داؤد اور اس کی بیوی چھیماں بابا حیاتا سے ملنے کوٹ غازی کلاں جانے کا ارادہ رکھتے تھے لیکن کانا جما کے گروہ کے دو افراد نے انہیں اس بری طرح مونڈ ڈالا تھا کہ وہ کہیں کے نہیں رہے تھے۔ میں انہیں اکیلے کوٹ غازی کلاں نہیں بھیجنا چاہتا تھا مبادا راستے میں وہ کسی اور مصیبت کا شکار ہوجائیں۔

انسان اپنی طرف سے تو اچھا ہی سوچتا ہے۔ یہ الگ بات کہ بعض اوقات اس کے سوچنے کے انداز میں کوئی کمی یا کجی رہ جاتی ہے جس کے نتیجے میں اچھا سوچا ہوا بھی حسبِ توقع نتائج نہیں لا پاتا۔ اس کے برعکس اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ نتائج امید سے کہیں زیادہ حاصل ہوجاتے ہیں۔ ایسے مواقع کے لیے مثلاً کہا جاتا ہے..... آگ لینے گئے تھے اور پیغمبری مل گئی۔

بابا حیاتا کے معاملے میں بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔

☆☆☆

رات بتدریج اپنے نصف کی جانب سرک رہی تھی۔ میں اپنے کوارٹر میں بیٹھا موجودہ حالات پر غور و فکر کر رہا تھا۔ وقفے وقفے سے میں باہر نکل کر گردوپیش کا جائزہ بھی لے رہا تھا۔ میرے کوارٹر کے عقب میں تاحدِ نگاہ تاریکی کی چادر اوڑھے کھیت ہی کھیت تھے۔ اس طرف مجھے کسی قسم کی ہلچل دکھائی دی اور نہ ہی کوئی غیر معمولی حرکت نظر آئی۔ ماحول پُرسکون اور فضا خاموش تھی لیکن میرے اندر اضطراب پھیلا ہوا تھا۔ آج کی پوری رات مجھے جاگ کر گزارنا تھی۔

یہ رات عام راتوں سے کافی مختلف اور سنسنی خیز تھی۔ ایک بھی لمحے کے لیے آنکھ لگانا ممکن نہیں تھا۔ علاقے کا سب سے خطرناک ڈاکو جمال دین عرف کانا جما میرے تھانے کی حوالات میں بند تھا۔ جب تک داؤد اور چھیماں کے لٹنے کی خبر مجھ تک نہیں پہنچی تھی، میں ذہنی طور پر کافی مطمئن تھا لیکن ماکھا اور راجو کی ''سرگرمیوں'' نے مجھے ریڈ الرٹ کر دیا تھا۔ جب کسی بھی مجرموں کے گروہ کے سردار کو گرفتار کیا جاتا ہے تو اس کے گماشتے اور چیلے چانٹے عموماً کوئی بھی محفوظ ٹھکانا دیکھ کر روپوش ہوجاتے ہیں اور کچھ عرصہ منظرِ عام پر نہیں آتے لیکن ماکھا اور راجو نے اس کے برعکس ردِعمل کا اظہار کیا تھا۔ نہ صرف انہوں نے چھپنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی بلکہ وہ میرے تھانے کے انتہائی نزدیک راہزنی کی وارداتیں بھی کرتے پھر رہے تھے۔ ان کی یہ دیدہ دلیری میرے لیے کسی کڑے چیلنج سے کم نہیں تھی جس نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ وہ بدذات اور کمینہ خصلت جرائم پیشہ لوگ کسی بھی حد تک جاسکتے تھے۔

تھوڑی دیر پہلے تک ٹرائل روم کی جانب سے کانا جما کے چیخنے چلّانے اور بلبلانے کی آوازیں بڑے تواتر سے آرہی تھیں لیکن اب اس طرف خاموشی چھا چکی تھی۔ اس پراسرار سناٹے کا واضح مطلب یہی تھا کہ چمن شاہ نے حوالاتی کی زبان پر پڑے ہوئے تمام قفل کھول ڈالے تھے اور اسے کسی ریکارڈ کے مانند بجنے کے قابل بنا دیا تھا۔

میں اپنے کوارٹر سے نکلا اور تھانے کی جانب بڑھ گیا۔ جب میں برآمدے سے گزرا تو میں نے داؤد اور چھیماں کو جاگتا ہوا پایا۔ ان کی چارپائیاں برآمدے کے ایک دور افتادہ حصے میں بچھائی گئی تھیں اور وہ دونوں اپنی چارپائیوں پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔

''کیا بات ہے؟'' میں نے ان کے نزدیک جاکر رسانیت بھرے لہجے میں پوچھا۔ ''تم لوگوں کو نیند کیوں نہیں آرہی؟''

''تھانیدار صاحب! تھانے کے اندرونی حصے سے کسی بندے کے رونے دھونے کی کرب میں ڈوبی ہوئی آوازیں مسلسل آرہی ہیں۔'' داؤد نے سراسیمہ لہجے میں جواب دیا۔ ''ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی انسان کو کند چھری سے ذبح کرنے کی کوشش کی جارہی ہو۔ اس قسم کی بھیانک صورتِ حال میں کیا خاک نیند آئے گی سرکار!''

''اب تو وہ شور شرابا ختم ہوچکا ہے۔'' میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''تم چاہو تو آرام سے سوسکتے ہو۔''

''ویسے وہ تھا کیا تھانیدار صاحب؟'' چھیماں نے سراسیمہ لہجے میں دریافت کیا۔

''وہ کانا جما کی آہ و بکا تھی بی بی!'' میں نے معتدل

انداز میں کہا۔ ”حوالدار اس سے گروہ کے دوسرے لوگوں کے بارے میں پوچھ تاچھ کر رہا تھا اور وہ کانا شیطان اپنی زبان کھولنے کو تیار نہیں تھا لہٰذا حوالدار کو تھوڑی سختی کرنا پڑی۔ بس، اتنی سی بات ہے۔“

”آپ اسے ”اتنی سی بات“ کہہ رہے ہیں تھانیدار صاحب!“ وہ سہمی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”حوالدار کی تھوڑی سی سختی سے اگر کسی مجرم کا یہ حال ہو جاتا ہے تو جب حوالدار زیادہ سختی کرتا ہوگا تو بیچارہ مجرم اپنی جان ہی سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہوگا۔“

”ایسی بات نہیں ہے بی بی!“ میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔ ”ہم صرف خطرناک مجرموں کی زبان کھلوانے کے لیے ہی تفتیشی حربے آزماتے ہیں اور اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا ہے کہ ان تفتیشی مراحل سے گزرنے کے دوران میں ان کی زندگی کو کوئی خطرہ لاحق نہ ہو۔ یہ سب ہماری مجبوری ہے کیونکہ جرائم پیشہ افراد آپ لوگوں کی طرح سیدھے اور شریف النفس نہیں ہوتے کہ ایک طمانچہ کھانے کے بعد وہ اپنے جرائم کا اعتراف کر لیں۔ بہرحال، اب کانا جما کی ماتمی آواز آپ لوگوں کا سکون برباد نہیں کرے گی۔ تم سونے کی کوشش کرو۔“

”ٹھیک ہے تھانیدار صاحب!“ داؤد نے معتدل انداز میں کہا۔ ”آپ کی مہربانی ہے جو ہمیں اپنے تھانے میں رات گزارنے کی اجازت دے دی۔“

”باقی باتیں صبح ہوں گی۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا اور ٹرائل روم کی جانب بڑھ گیا۔

مجھ پر نگاہ پڑی تو چن شاہ نے کہا۔ ”ملک صاحب! اچھا ہوا کہ آپ آ گئے۔ میں ابھی آپ ہی کو بلانے جا رہا تھا۔“

”اس کا مطلب ہے تم نے کانے جن کو بولنے کے لیے آمادہ کر دیا ہے؟“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

”جی بالکل۔ یہ بجتے کو تو تیار ہے مگر اپنی مرضی کے مطابق۔“ چن شاہ نے بتایا۔ ”اس کا کہنا ہے یہ اپنے گروہ کے آدمیوں کے ٹھکانے کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔“

”ایسا کیوں جما؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ”جب وہ سب تمہارے بندے ہیں تو پھر تم ان کے بارے میں کیوں نہیں جانتے؟ کیا تم ہمیں اتنا ہی بے وقوف سمجھتے ہو.....ہیں؟“

”تھانیدار صاحب!“ وہ نقاہت بھری آواز میں بولا۔ ”آپ کے حوالدار نے میرے ساتھ بہت برا سلوک کیا ہے۔ اگر میں اپنے گروہ کے لوگوں کے ٹھکانے سے واقف ہوتا تو ضرور بتا دیتا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ہمارا صرف ایک ہی خفیہ ٹھکانا تھا جہاں سے آپ نے مجھے گرفتار کیا تھا اور وہ بھی میرے زخمی ہو جانے کی وجہ سے ورنہ.....!“

وہ بولتے بولتے اچانک تھما تو میں نے گرج دار آواز میں استفسار کیا۔ ”ورنہ تم کیا کر لیتے کانے سؤر؟“

”اگر میرے ساتھی اندھیرے جنگل میں پولیس کی آنکھوں میں دھول جھونک کر فرار ہو سکتے ہیں تو میں کیوں نہیں۔“ وہ عجیب سے تکبرانہ انداز میں بولا۔ ”ٹانگ میں گولی لگ جانے کی وجہ سے میں مجبور ہو گیا تھا ورنہ آپ میری دھول کو بھی نہیں پا سکتے تھے۔“

”رسی جل گئی مگر بل نہیں گیا۔“ میں نے نفرت بھری نظر سے اسے گھورا اور معاندانہ لہجے میں کہا۔ ”یہ مت سمجھنا کہ میں تمہاری زخمی ٹانگ کا لحاظ کرتے ہوئے تمہارے ساتھ سختی نہیں کروں گا۔ اگر تم نے ماکھا، راجو اور دیگر ڈاکوؤں کے پتے ٹھکانے کے بارے میں نہ بتایا تو مجھے مجبوراً تمہاری ٹانگ کے زخم پر مرچیں بھروانا پڑیں گی اور یہ میں کوئی مذاق نہیں کر رہا۔ تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ سب کچھ سچ سچ بتا دو۔“

”جو سچ تھا، وہ میں نے آپ کو بتا دیا ہے تھانیدار صاحب!“ وہ بیزاری سے بولا۔ ”میں واقعی نہیں جانتا کہ میرے لوگ اس وقت کہاں چھپے ہوئے ہیں۔“

”وہ چھپے ہوئے نہیں بلکہ بڑی جرأت سے تھانے کے آس پاس وارداتیں کرتے پھر رہے ہیں۔“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”میرا اشارہ ماکھا اور راجو کی طرف ہے۔ تمہیں حوالدار نے بتایا ہوگا کہ آج شام ان دونوں نے دو مسافروں کو لوٹا ہے۔ وہ ان کے طلائی زیورات اور نقدی سب لے گئے۔ متاثرہ میاں بیوی کے پاس کہیں آنے جانے کا کرایہ بھی نہیں بچا تھا اور وہ بے چارے شام کے بعد جاتے بھی کہاں۔ میں نے ان پر ترس کھا کر انہیں تھانے ہی میں رات گزارنے کی اجازت دے دی ہے۔ وہ اس وقت برآمدے میں چارپائیوں پر سو رہے ہیں۔“

”یہ تو آپ نے بڑا نیکی کا کام کیا ہے تھانیدار صاحب!“ اس نے قدرے مطمئن لہجے میں کہا۔ ”کسی بھولے بھٹکے اور لٹے پٹے مسافر کو پناہ دینا تو ایک عظیم کارنامہ ہے سرکار! جب آپ کو یہ پتا چل چکا ہے کہ ماکھا اور راجو تھانے کے آس پاس ہی کہیں موجود ہیں تو آپ اپنے عملے کے تمام لوگوں کو تھانے کے گرد و نواح میں پھیلا دیں۔ اس طرح انہیں گرفتار کرنے میں آپ کو آسانی ہو جائے گی۔“

کانا جما کی باتوں سے تحقیر جھلکتی تھی۔ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔

"مجھے تمہارے مشوروں کی ضرورت نہیں کانا جما! میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ مجھے کس وقت کیا کرنا ہے۔ بہرحال......" لحاتی توقف کر کے میں نے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"میں تمہیں ایک گھنٹے کی مہلت دے رہا ہوں اور میری طرف سے یہ آخری مہلت ہے۔ اچھی طرح سوچ لو کہ تم نے قانون کے ساتھ تعاون کرنا ہے یا ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی مشکلات میں اضافہ کرنا ہے۔ ایک گھنٹے کے بعد اگر تم نے میرے سوال کا معقول جواب نہیں دیا تو میں تمہاری زخمی ٹانگ کے گھاؤ میں پسی ہوئی مرچیں بھروانے میں کسی پس وپیش سے کام نہیں لوں گا۔"

کانا جما کے چہرے پر خوف کے سائے لہرانے لگے۔ مجھے اس کی آنکھوں میں بھی سراسیمگی ہلکورے لیتی نظر آئی۔ میں نے اس پر ایک معاندانہ نگاہ ڈالی اور ٹرائل روم سے نکل کر اپنے کمرے میں آگیا۔ پانچ منٹ کے بعد حوالدار چمن شاہ بھی میرے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے گمبھیر لہجے میں پوچھا۔

"ملک صاحب! آپ کو کیا لگتا ہے، یہ کانا دجال حقیقت بیانی سے کام لے رہا ہے یا ہمیں بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہا ہے؟"

"شاہ جی! ایک بات ذہن میں رکھیں کہ کانا جما کوئی سڑک چھاپ معمولی غنڈا نہیں ہے۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "وہ ایک بدنام زمانہ ڈاکو، لٹیرا، قاتل اور جانے کیا کیا ہے۔ اس لیول کے مجرم بڑے سخت جان اور ڈھیٹ نسل کے ہوتے ہیں اس لیے وہ آسانی سے زبان نہیں کھولتے۔ گرفتاری، تھانہ، کچہری اور جیل ان کی زندگی کا لازمی جزو تصور کیے جاتے ہیں چنانچہ کانا جما کے بارے میں سردست کوئی حتمی رائے قائم نہیں کی جاسکتی۔ البتہ......" میں نے لحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"البتہ میں سمجھتا ہوں اس کی ٹانگ کے زخم میں مرچیں بھرنے والا آئیڈیا ضرور کام کرے گا۔ وہ یہ تکلیف برداشت نہیں کر سکے گا اور سچائی خود بخود اس کی زبان سے جاری ہوجائے گی۔"

"یعنی ایک گھنٹے کے بعد ہم حقائق تک رسائی حاصل کرنے والے ہیں۔" اس نے پوچھا۔

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

2023ء کے
الوداعی لمحات
جاسوسی کی
ہمہ رنگ کائنات

اولین سوغات

سیاست وعشق سے شباب ومے کدے تک کا سفر کرنے والے ایک بھیڑیے کی دل خراش داستان...... **نجمہ مودی** کے قلم سے سڈنی شیلڈن کے مشہور ناول کی تلخیص

قاتل مسیحا

پسندیدہ کردار عمران جونیئر کے کرشماتی کارنامے...... مسیحاؤں کے بھیس میں سفاک قاتلوں کا گھناؤنا کھیل
طاہر جاوید مغل کے قلم سے

دبر

قدم قدم پر بڑھتی مصیبتوں کا مقابلہ کرنے والے ایک دلیر نوجوان کی کوچہ گردی
حسام بٹ کے قلم سے سلسلے وار کہانی

سرورق کے رنگ

پہلا رنگ

فطری ماحول کی آغوش میں...... اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ رواں دواں زندگی کے تیکھے رنگ

دوسرا رنگ

ایک دلکش وحسین دوشیزہ کی گمشدگی سے شروع ہونے والی سنسنی خیز کہانی

چینی نکتہ چینی

آپ کے تبصرے... مشورے... محبتیں... شکایتیں... اور نئی نئی دلچسپ باتیں... کتھائیں

''بالکل!'' میں نے اٹل لہجے میں جواب دیا۔ ''آپ اس دوران میں پسی ہوئی مرچوں کا انتظام کرلیں۔ ہم ضرورت پڑنے پر ٹانگ کے گھاؤ کے علاوہ اس کی دونوں آنکھوں میں بھی مرچیں بھر سکتے ہیں۔''

ان لمحات میں میری آنکھوں اور آواز سے سفاکی ٹپک رہی تھی۔ حوالدار نے اثبات میں سر ہلایا اور سپاٹ آواز میں بولا۔

''وہ ابنِ ابلیس صحیح معنوں میں ایسے ہی بدترین سلوک کا مستحق ہے۔ جہاں تک پسی ہوئی مرچوں کا معاملہ ہے تو وہ میرے پاس وافر مقدار میں رکھی ہوئی ہیں۔''

''ویری گڈ!'' میں نے توصیفی نظر سے اسے دیکھا۔

''ویسے کانا جما کا آئیڈیا اتنا بُرا بھی نہیں کہ ہم اسے یکسر نظر انداز کردیں۔'' چمن شاہ نے کہا۔

''کون سا آئیڈیا؟'' بے ساختہ میں نے پوچھ لیا۔

''وہی..... ماکھا اور راجو کی تلاش میں اپنے عملے کو سرگرمِ عمل کرنا۔'' چمن شاہ نے جواب دیا۔

''ہم اس آئیڈیے کو قطعی نظر انداز نہیں کررہے چمن شاہ!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اس وقت ہم دونوں کے علاوہ ہمارے تھانے کا سارا عملہ باہر اسپیشل ڈیوٹی دے رہا ہے۔ ہمیں ایک گھنٹے تک انتظار کرنا ہوگا۔ مجھے امید ہے مرچوں والا ''طریقۂ علاج'' کانا جما پر ضرور اثر کرے گا اور اگر.....'' میں سانس ہموار کرنے کی غرض سے متوقف ہوا پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''اگر واقعتاً کانا جما اپنے آدمیوں کے ٹھکانے اور ان کے محلِ وقوع کی خبر نہیں رکھتا تو پھر ہمیں مجبوراً ماکھا اور راجو کی تلاش میں قرب و جوار کا علاقہ کھوجنا ہوگا۔ ان دونوں بدمعاشوں کا ہمارے ہتھے چڑھنا بہت ضروری ہے۔ میں نے داؤ دار چھیماں سے وعدہ کیا ہے کہ اس شام انہوں نے جو کچھ بھی کھویا ہے، وہ میں انہیں واپس لاکر دوں گا اور یہ کام اسی وقت ممکن ہوگا اگر ماکھا اور راجو کو ہم چھاپے میں کامیاب ہوجائیں۔''

حوالدار چند لمحے خاموش رہنے کے بعد تائیدی انداز میں بولا۔ ''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں ملک صاحب!''

ہمارے درمیان حالاتِ حاضرہ پر گفتگو کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ کانسٹیبل احمد علی کمرے میں داخل ہوا۔ میں نے احمد علی کو تھانے کے سامنے والے علاقے میں تعینات کررکھا تھا۔ وہ وہاں سے تھانے کے گیٹ اور اس کے آس پاس کے حصے پر نگاہ رکھے ہوئے تھا۔

''کیا ہوگیا احمد علی؟'' میں نے کانسٹیبل کو بوکھلاہٹ میں مبتلا دیکھ کر استفسار کیا۔ ''تمہارے چہرے کا رنگ کیوں اڑا ہوا ہے، کیا تم نے کسی چھل پیری کو دیکھ لیا ہے؟''

''نہیں ملک صاحب!'' وہ نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولا۔ ''ایسی بات نہیں ہے۔''

''پھر کیسی بات ہے؟'' میں نے کڑے لہجے میں پوچھا۔

''وہ دراصل.....'' وہ اپنے انداز میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''تھانے سے ایک میل دور چھوٹے چودھری رب نواز کے توڑی (بھوسے) کے گودام میں آگ لگ گئی ہے۔ یہ ایک ہنگامی صورتِ حال ہے جناب! کیا ہمیں فوراً وہاں پہنچ کر ان کی مدد نہیں کرنا چاہیے؟''

''بالکل نہیں!'' میں نے رد کھے اور دوٹوک انداز میں جواب دیا۔ ''یہ تھانہ ہے، فائر بریگیڈ اسٹیشن نہیں کہ ہم ایک میل دور کسی توڑی کے ذخیرے میں لگی آگ کو بجھانے کے لیے نکل کھڑے ہوں گے۔ اس کام کے لیے چودھری رب نواز کے پاس افرادی قوت کی کمی نہیں ہوگی۔ وہ اپنی رعایا کو آگ بجھانے کے کام پر لگا سکتا ہے۔ ویسے بھی آتشزدگی کے اس واقعے میں کسی انسانی جان کے جانے کا کوئی خطرہ نظر نہیں آرہا اس لیے چودھری رب نواز کو اس معاملے سے خود ہی نمٹنا چاہیے اور جہاں تک ہنگامی صورتِ حال کی بات ہے تو کیا ہم تھانے میں بیٹھے اور تم لوگ باہر ٹھنڈے ٹھار موسم میں خوامخواہ ہی پہرا دے رہے ہو؟''

''نہیں ملک صاحب! آپ نے ہمیں ایک اہم کام سونپ رکھا ہے۔'' وہ جلدی سے بولا۔

''تو پھر تم اسی اہم کام پر اپنی توجہ مرکوز رکھو۔'' میں نے حتمی لہجے میں کہا۔ ''اگر چودھری رب نواز کے بھوسے کا ڈھیر جل کر راکھ میں تبدیل ہوگیا تو اس کی صحت اور جیب پر کوئی خاص اثر نہیں پڑے گا لیکن اگر تم لوگوں کی غفلت سے کوئی جرائم پیشہ شخص تھانے کے اندر گھس آیا تو سمجھ لو میری ساری محنت گئی گھوہ کھاتے۔ بات سمجھ میں آرہی ہے یا گھول کر پلاؤں؟''

''میں چنگی طرح سمجھ گیا ملک صاحب!'' وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔ ''مجھے معاف کردیں۔ میں اپنی ڈیوٹی پر واپس جارہا ہوں۔''

''شاباش!'' اتنی ڈانٹ پھٹکار کے بعد میں نے کانسٹیبل احمد علی کے عزائم کو سراہنا ضروری جانا۔ ''مجھے تم سے یہی امید تھی احمد علی! تم ایک محنتی اور فرض شناس پولیس اہلکار ہو۔''

اس نے میرا شکریہ ادا کیا اور مجھے سیلوٹ کرنے کے

بعد تیز قدموں سے چلتے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔

''ملک صاحب! مجھے تو یہ ناکھا، راجو اور ان کے دیگر ساتھیوں کی چال لگ رہی ہے۔'' کانسٹیبل کے جانے کے بعد حوالدار چمن شاہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''وہ لوگ تھانے کے اندرونی معاملات سے ہمارا دھیان ہٹانا چاہتے ہیں تاکہ انہیں کسی مذموم کارروائی کا موقع مل سکے۔ آپ کا کیا خیال ہے جناب؟''

''شاہ جی! میں بھی آپ ہی کے انداز میں سوچ رہا ہوں۔'' میں نے گمبھیر لہجے میں جواب دیا۔ ''وہ لوگ چاہے کچھ بھی کرلیں لیکن ہماری توجہ کا پہلا مرکز صرف اور صرف ''کانا جما'' ہی ہے۔ باقی سب معاملات اس کے بعد۔'' میں لمحے بھر کو رکا پھر ان الفاظ میں اضافہ کردیا۔

''آپ نے دیکھ ہی لیا ہے، میں نے احمد علی کو کس قسم کا جواب دیا ہے۔ میرے واشگاف الفاظ سے آپ کو بخوبی اندازہ ہوگیا ہوگا کہ میری پہلی ترجیح کیا ہے۔''

''جی بالکل!'' وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ''میں سمجھ سکتا ہوں ملک صاحب!''

''شاید آپ نے کانا جما کے مشورے کی تہ میں نہیں جھانکا شاہ جی!''

''تھوڑی وضاحت کردیں تو مہربانی ہوگی جناب کی۔'' وہ شائستہ لہجے میں بولا۔ ''آپ کا اشارہ کس طرف ہے؟''

''اس نے تھوڑی دیر پہلے ہمیں مشورہ دیا تھا کہ جب ہمارے بقول ماکھا اور راجو تھانے کے قرب و جوار ہی میں کہیں موجود ہیں تو پھر ہمیں اپنے عملے کے تمام افراد کو ان کی تلاش اور گرفتاری کے لیے آس پاس کے علاقے میں پھیلا دینا چاہیے۔'' میں نے یاد دلانے والے انداز میں کہا۔ ''یعنی اس کی دلی خواہش ہے کہ اس تھانے کا سارا عملہ باہر چلا جائے تاکہ اگر اس کے ذہن میں کوئی خطرناک شیطانی منصوبہ پل رہا ہے تو اس پر عمل کرنا آسان ہوجائے۔''

''اوہ۔'' حوالدار بے ساختہ اضطراری سانس چھوڑتے ہوئے بولا۔ ''اس طرف تو واقعی میرا دھیان نہیں گیا تھا۔ یہ کانا دجال تو بہت ہی چالباز اور منصوبہ ساز مجرم ہے ملک صاحب!''

''لیکن ہم ان کی کوئی چال اور کوئی منصوبہ پھلنے نہیں دیں گے شاہ جی!'' میں نے چٹانی لہجے میں کہا۔

وہ پُرعزم دل سے بولا۔ ''ان شاء اللہ!''

ہمارے درمیان سنجیدہ نوعیت کی گفتگو چل ہی رہی تھی کہ حوالدار نے مجھ سے پوچھ لیا۔ ''ملک صاحب! آپ نے

ماں تجھے سلام

☆ ماں کے قدموں تلے جنت ہے۔

☆ جو ماں کو ستاتا ہے وہ کبھی چین نہیں پاتا۔

☆ ماں کی دعا ہر پل ہم پر سایہ کیے رکھتی ہے۔

☆ ماں تو وہ ہستی ہے جو ہر دل میں بستی ہے۔

☆ دنیا کے سب رشتے دوبارہ مل سکتے ہیں، صرف ماں دوبارہ نہیں ملتی۔

☆ ماں کی چاہت سات سمندروں سے بھی زیادہ گہری ہے۔

☆ ماں کا غصہ دراصل پیار کا انمول حصہ ہوتا ہے۔

☆ ماں کا دامن ہنستا بستا ساون ہوتا ہے۔

چھوٹی مگر گہری باتیں

☆ دل کے البم میں دل لگی کے لیے تصویریں نہ لگائیں بلکہ ایسی تصویروں کا انتخاب کریں جو دل کو بھی لگیں۔

☆ دل کی سلیٹ پر لکھنے سے قبل یہ سوچ لیں کہ یہ نقش مٹانے سے نہیں مٹتے۔

☆ زندگی ایک ایسا کھیل ہے جس میں آپ جیت نہیں سکتے، برابر نہیں ہوسکتے اور یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ ہم نہیں کھیلتے۔

☆ زندگی ایک ایسی گاڑی ہے کہ جب آپ اچھی طرح چلانا سیکھ جاتے ہیں تو آپ کو رہا کردیا جاتا ہے۔

☆ ہم بھی کیسی قوم ہیں کہ جو کرنسی نوٹوں پر ''حصول رزقِ حلال عین عبادت ہے'' جیسی عبارت لکھ کر سمجھتے ہیں کہ حرام رک جائے گا۔

☆ اینٹ سے اینٹ بجانا آسان لیکن اینٹ پر اینٹ رکھنا بے حد مشکل ہے۔

یادیں

☆ ان لمحوں کی یادیں ہمیشہ دل میں بس جاتی ہیں جو یاد آنے پر مسکراہٹ لے آتی ہیں تو کبھی اداسی پھیل جاتی ہے۔

☆ یادوں کا رشتہ ہی ایسا ہوتا ہے جو غموں سے بھی جڑا ہوتا ہے اور خوشی سے بھی۔

(مرسلہ: محمد انور ندیم۔ اسلام نگر، حویلی لکھا، اوکاڑہ)

pklibrary.com

احسان اللہ کو کوٹ غازی کلاں کیوں بھیجا ہے؟''

ابھی تک مجھے اتنی فرصت نہیں ملی تھی کہ میں چمن شاہ کو اپنے پروگرام کی اس تبدیلی کے بارے میں بتاتا۔ کوارٹر سے نکلنے کے بعد تو میں کانا جما کے ساتھ ''مصروف'' ہو گیا تھا۔

''تھانے کی عقبی جانب میرا کوارٹر ہے اور میں نے پوری رات جاگنے کا فیصلہ کر لیا ہے اس لیے اس طرف کسی اور کی ڈیوٹی کی ضرورت نہیں تھی۔'' میں نے حوالدار کے سوال کے جواب میں بتایا۔ ''اور احسان اللہ کو کوٹ غازی کلاں بھیجنے کا دوسرا سبب یہ ہے کہ ہم نے کانا جما کو اس گاؤں کے نزدیکی جنگل سے گرفتار کیا ہے اور اس لٹے پٹے پردیسی جوڑے کا میزبان بابا حیاتا وہاں کا پرانا رہنے والا ہے۔ میں اس مزارع کو تھانے بلا کر تھوڑی تفتیش کرنا چاہتا ہوں اور ان دونوں مہمانوں کو ان کے مزارع کے سپرد کرنا بھی ضروری ہے۔ اس وقت باہر کی جو صورتِ حال ہے اس میں داؤد اور چھیماں کا اکیلے کوٹ غازی کلاں کی طرف جانا ٹھیک نہیں۔ وہ اپنا سب کچھ لٹا چکے ہیں۔ اب کی بار اگر ڈاکوؤں نے انہیں راستے میں کہیں گھیر لیا تو وہ انہیں کیا دیں گے؟ ان دونوں کو خالی پا کر ڈاکو انہیں جانی نقصان بھی پہنچا سکتے ہیں۔''

''یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں ملک صاحب!'' وہ تشویش بھرے لہجے میں بولا۔ ''لیکن میں سمجھ نہیں پا رہا کہ آپ بابا حیاتا سے کس قسم کی پوچھ تاچھ کرنا چاہتے ہیں؟''

''مجھے شک ہے کہ کانا جما کے ساتھیوں میں سے بعض نے کوٹ غازی کلاں میں پناہ لی ہوگی۔'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''بابا حیاتا کئی پشتوں سے وہاں کا وسنیک ہے۔ وہ ڈاکوؤں کے اس گروہ کے بارے میں یقیناً گہری معلومات رکھتا ہوگا اور جہاں تک آدھی رات کو اس مزارع کو تھانے بلا کر تفتیش کرنے کا سوال ہے تو.....'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''اس بارے میں مجھے خود بھی کچھ معلوم نہیں ہے چمن شاہ! بس، میں جیسے ہی عشا کی نماز سے فارغ ہوا، میرے ذہن میں بابا حیاتا سے ملاقات کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ یہاں تھانے میں جو حالات چل رہے ہیں، ان کو دیکھتے ہوئے میں اس وقت تک بیرونی سرگرمیوں کا حصہ نہیں بن سکتا جب تک میں اس کانے سؤر، ڈاکوؤں کے سردار کو حوالۂ عدالت نہیں کر دیتا۔''

''کانا جما ایک بھاری ذمے داری کے طور پر آپ کے پیشہ ورانہ فرائض کا حصہ بنا ہوا ہے۔'' حوالدار نے معتدل انداز میں کہا۔ ''میں آپ کی مجبوری کو سمجھ سکتا ہوں ملک صاحب!''

''مجھے قوی امید ہے کہ بابا حیاتا کے اندر سے کچھ ایسا ضرور نکلے گا جو کانا جما کے معاملے میں ہمارے لیے سودمند ثابت ہوگا۔'' میں نے پُرخیال انداز کہا۔ ''میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ مجھے جب بھی نماز کے دوران میں یا نماز کے بعد اچانک کوئی خیال آیا تو وہ کبھی رائگاں نہیں گیا۔ ایسی سوچ کا کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہوتا ہے۔ آسان الفاظ میں یوں سمجھ لو کہ قدرت ایسے اشاروں سے میری مدد کر رہی ہوتی ہے اور قبل از وقت ایسے معاملات کی وضاحت کرنا ممکن نہیں ہوتا۔''

حوالدار نے اثبات میں گردن ہلا کر میری بات کو سمجھ لینے کی تصدیق کی پھر چونکے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ملک صاحب! یہ آواز کیسی ہے؟''

میں نے چمن شاہ کے استفسار پر دھیان دیا تو مجھے برآمدے کی جانب سے ایسی آوازیں سنائی دیں جیسے کوئی بلی یا کتا کسی شے کو کھسوڑ رہا ہو۔ میں نے حوالدار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ نے غلط نہیں سنا شاہ جی! یہ آواز برآمدے کی طرف سے آ رہی ہے۔''

اس وقت آدھی رات کا عمل تھا اور تھانے کی چار دیواری کے اندر میرے اور حوالدار کے سوا اور کوئی موجود نہیں تھا اور ہم دونوں، میرے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ہمارا دیگر اسٹاف یعنی چار کانسٹیبل نصیر احمد، احمد علی، خادم حسین اور احسان اللہ آج کی رات تھانے کے باہر ''آن اسپیشل ڈیوٹی'' تھے۔

''میں جا کر دیکھتا ہوں ملک صاحب!'' حوالدار اٹھ کر کھڑا ہوتے ہوئے بولا۔ ''کہیں کوئی آوارہ کتا یا بلی کسی کھانے وغیرہ کی تلاش میں اندر نہ گھس آئے ہوں۔''

میں نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

چمن شاہ میرے کمرے سے نکل گیا اور دس منٹ سے بھی پہلے واپس آ گیا اور دوبارہ میرے سامنے بیٹھنے کے بعد ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔

''ہمارے دونوں مہمان ابھی تک جاگ رہے ہیں ملک صاحب! وہ چارپائیوں پر بیٹھے اپنے اگلے کیس کو کھول کر اس میں کچھ تلاش کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں نے ان کے قریب جا کر داؤد سے پوچھا۔

''کیا تم لوگوں کو نیند نہیں آ رہی؟''

داؤد نے اٹیچی کیس کو بند کرتے ہوئے کہا۔ ”جناب! ہم چند گھنٹے پہلے جن حالات سے گزرے ہیں، اس میں انسان کی بھوک، پیاس، نیند، سکون..... سب کچھ اڑ جاتا ہے۔ ہم نے زہر مار کر کے تھوڑا کھانا تو کھالیا ہے مگر باوجود کوشش کے بھی نیند نہیں آرہی۔“ اس نے اٹیچی کیس کو اپنی بیوی کی جانب بڑھانے کے بعد بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”ہم سونے کے لیے جیسے ہی آنکھیں بند کرتے ہیں، وہ دونوں گھڑسوار ڈاکو سامنے آکھڑے ہوتے ہیں۔ وہ اپنی سرخ انگارہ آنکھوں سے ہمیں گھورتے ہوئے اپنی بندوقیں ہم پر تان کر غضب ناک لہجے میں کہتے ہیں۔ ”سب کچھ نکال دو۔“ اس کے ساتھ ہی ہم ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیتے ہیں۔ بس، پچھلے پانچ چھ گھنٹے سے ہم اسی اذیت ناک کیفیت سے گزر رہے ہیں جناب عالی!“

”اور تھوڑی دیر پہلے تک تو آپ لوگوں کی ”تفتیش“ نے بھی ہمیں سونے کا موقع نہیں دیا۔“ چھیماں نے اٹیچی کیس کو واپس چارپائی کے نیچے رکھتے ہوئے برہمی بھرے لہجے میں کہا۔ ”کوئی بھلا کسی انسان پر اتنا زیادہ تشدد بھی کرتا ہے۔ تھانیدار صاحب نے ہمیں بتایا تھا کہ کانا جما کی زبان کھلوانے کے لیے اس پر سختی کی جارہی ہے۔ اگر اس سختی سے اس کی جان چلی جاتی تو؟“

”ہم کانا جما کو موت کے گھاٹ اتارنے کے لیے یہ تفتیش نہیں کررہے بی بی!“ میں نے واشگاف الفاظ میں نیم عرف چھیماں سے کہا۔ ”اس کے اندر سے جو معلومات ”خارج“ ہوں گی، وہ ہمیں اس گروہ کے دوسرے آدمیوں تک پہنچنے میں مدد دیں گی اور یہ مت بھولو کہ کانا جما کے انہی ”آدمیوں“ میں راجو اور ماکھا بھی شامل ہیں۔ جب تک یہ دونوں ڈاکو ہمارے ہتھے نہیں چڑھیں گے، تمہارے طلائی زیورات اور داؤد کی نگڑی رقم کی بازیابی ممکن نہیں ہوسکے گی۔ میری بات سمجھ میں آرہی ہے نا؟“

”جی!“ چھیماں تھوک نگلتے ہوئے بولی۔

داؤد نے کہا۔ ”ٹھیک ہے حوالدار صاحب! آپ اپنا کام جاری رکھیں۔ ہمیں تو بس یہ رات یہاں گزارنا ہے۔ کل صبح ہم تھانے سے روانہ ہوجائیں گے۔“ لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک افسردہ سانس خارج کی پھر بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”ہمارا جو مال و اسباب چلا گیا، اس کا ہمیں دکھ تو بہت ہے لیکن شکر سو ہے رب کا کہ ہماری جان بچ گئی۔ سیانے کہہ گئے ہیں کہ..... جان ہے تو جہان ہے۔“

”سیانے غلط نہیں کہتے داؤد!“ میں نے اس سے کہا۔ ”اب تم لوگ آرام سے سوجاؤ اور ہمیں بھی اپنا کام کرنے دو۔“

حوالدار نے اپنی بات ختم کرنے کے بعد میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ملک صاحب! میں انہیں سونے کی تاکید تو کرآیا ہوں مگر مجھے نہیں لگتا کہ وہ لوگ آج کی رات ایک پل کے لیے بھی سوسکیں گے۔“

”آپ کو ایسا کیوں لگتا ہے شاہ جی؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”اس کے دو اسباب ہیں ملک صاحب!“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”جواب دینے سے پہلے مجھے آپ سے ایک درخواست کرنا ہے۔“

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ”ایسی کون سی درخواست ہے شاہ جی؟“

چند لمحات تک تذبذب کی کیفیت میں مبتلا رہنے کے بعد وہ گویا ہوا۔ ”آپ میرا حد سے زیادہ احترام کرتے ہیں جبکہ عملے کے دوسرے افراد کے ساتھ آپ کا رویہ جدا ہے۔ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ آپ خدانخواستہ ان کے ساتھ بدتمیزی سے پیش آتے ہیں۔ آپ اپنے نیچے کام کرنے والے تمام افراد کے ساتھ نرمی اور اخلاق کا برتاؤ کرتے ہیں مگر میرے ساتھ آپ کا سلوک ان سے مختلف ہے جس سے بعض اوقات مجھے شرمندگی سی محسوس ہونے لگتی ہے۔“

”شاہ جی! میں نے آپ کی الجھن کی تہ تک رسائی حاصل کرلی ہے۔“ میں نے چمن شاہ کے چہرے پر نگاہ جما کر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”ایک انسان پر ہر دوسرے انسان کا احترام واجب ہے اور میں اس نکتے کو ہمیشہ ذہن میں رکھتا ہوں۔ جرائم پیشہ اور ٹیڑھے لوگوں کو ڈیل کرتے ہوئے بعض اوقات جارحیت اور بداخلاقی ضروری ہوجاتی ہے۔ باقی عام حالات میں، میں کسی سے بھی ملتے وقت اس کی عزتِ نفس کا بہت خیال رکھتا ہوں۔ جہاں تک آپ کا معاملہ ہے شاہ جی.....!“ لمحاتی توقف کرکے میں نے حوالدار کی آنکھوں میں دیکھا پھر ان الفاظ میں اپنی بات مکمل کردی۔

”آپ سید زادے ہیں۔ آپ کا نسب نامہ کہیں نہ کہیں، پیچھے جاکر اہلِ بیت سے جڑتا ہے۔ میں سادات کا بہت احترام کرتا ہوں شاہ جی! بس، اتنی سی بات ہے۔“

”یہ اتنی سی بات نہیں ہے ملک صاحب!“ وہ عقیدت بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”آپ نے بڑے

اہم نکتے کو پکڑ رکھا ہے۔ میں اس سے زیادہ مزید اور کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

"تو پھر ان دو اسباب کے بارے میں مجھے کون بتائے گا جس کا تھوڑی دیر پہلے آپ نے ذکر کیا تھا؟" میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ "آپ نے تو مزید کچھ کہنے سے صاف انکار کر دیا ہے۔"

"میرا یہ مطلب نہیں تھا ملک صاحب!" وہ اضطراری لہجے میں بولا۔

"تو پھر بتائیں۔" میں نے کہا۔ "ان میاں بیوی کے رات بھر نہ سو سکنے کے دو اسباب کون سے ہیں؟"

"نمبر ایک، ان کے ساتھ آج شام میں جو سانحہ پیش آیا ہے، وہ داؤد اور چھیماں کے اعصاب کو توڑنے اور ان کے حواس کو جھنجوڑنے کے لیے کافی ہے۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "نمبر دو، ایک گھنٹے کی مدت گزر جانے کے بعد بھی اگر کانا جما نے زبان نہ کھولی تو ہم اس کا جو حشر کرنے جا رہے ہیں، وہ اسے بے دریغ چیخنے پر مجبور کر دے گا اور اس مردود کی اذیت ناک چیخیں تھانے کی چھت اور در و دیوار کو ہلا کر رکھ دیں گی اور کانا جما جس درد بھرے انداز میں چیخے اور چلائے گا، وہ "ساں" انہیں کیا خاک سونے دے گا۔"

"آپ کی بات تو سولہ آنے صحیح ہے شاہ جی!" میں نے اتفاق آمیز لہجے میں کہا۔ "کل کا سورج طلوع ہونے سے پہلے کانا جما کی زبان کا قفل کھلنا ضروری ہے تاکہ میں کل ہی اس کیس کا چالان تیار کر کے اس شیطان کو عدالت میں پیش کر دوں۔ میں نے تو پہلے یہی سوچا تھا کہ کانا جما کو چھ فروری کی صبح حوالۂ عدالت کروں گا مگر شام سے اب تک تھانے کے گرد و نواح میں جو شر انگیز بدلاؤ دیکھنے کو مل رہا ہے، وہ اس بات کا متقاضی ہے کہ یک چشم ڈاکوؤں کے سردار کو زیادہ عرصے تک کسٹڈی میں نہ رکھا جائے ورنہ کوئی بھی سنجیدہ پیچیدگی پیدا ہو سکتی ہے۔"

"ملک صاحب! اللہ کا شکر کہ گولی کانا جما کی ٹانگ کو گھائل کرتے ہوئے آگے نکل گئی تھی۔" حوالدار نے معتدل انداز میں کہا۔ "اگر یہی گولی اس کی ران کے گوشت کے اندر دھنس جاتی تو مجبوراً ہمیں گرفتاری کے بعد اسے اسپتال میں داخل کرانا پڑتا تاکہ آپریشن کر کے گولی کو اس کے بدن سے باہر نکالا جا سکے۔ یہ تو ہم نے خود ہی اس کے زخم کی مرہم پٹی کر کے کام چلا لیا ہے بصورتِ دیگر اس کا اسپتال جانا لازمی تھا اور اس صورت میں تھانے کی یہ نسبت اس پر ہماری گرفت قدرے کمزور ہوتی۔"

"آپ کا یہ واقعاتی تجزیہ بالکل درست ہے شاہ جی!" میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "لیکن اب بھی صورتِ حال کچھ زیادہ تسلی بخش نہیں ہے۔ اگرچہ وہ منحوس شخص اس وقت حوالات کے اندر بند ہے لیکن میں تھانے کی بیرونی فضا میں ایک عجیب سی بے کیفی اور بے نام سی ہلچل محسوس کر رہا ہوں۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ کچھ ہونے والا ہے۔ کیا ہونے والا ہے.....؟ اس کا مجھے کچھ بھی اندازہ نہیں ہے۔"

"کچھ نہیں ہوگا ملک صاحب!" چمن شاہ نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ "اللہ خیر کرے گا۔ ہم پوری طرح مستعد اور تیار ہیں۔ اگر کچھ ایسا ویسا ہوا بھی تو ہم بہ آسانی اس ناگہانی افتاد سے نمٹ لیں گے۔"

"بالکل۔" میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

☆☆☆

میں نے جمال دین عرف کانا جما کو ایک گھنٹے کی مہلت دی تھی تاکہ وہ زبان کھولنے یا بند رکھنے کے حوالے سے اچھی طرح سوچ کر کوئی مناسب سا فیصلہ کر لے۔ یہ تو طے تھا کہ اگر اس نے مجھ سے تعاون نہ کیا تو میں وعدے کے مطابق اس کی ٹانگ کے زخم میں چلی پاؤڈر (پسی ہوئی مرچیں) بھرنے میں کسی پس و پیش سے کام نہیں لینے والا تھا۔ کانا جما جیسے ناپاک معاشرتی ناسوروں کی جراحی کا مجھے بڑا وسیع "تجربہ" تھا اور اس سلسلے میں، میں خاصا بے رحم اور سفاک بھی ثابت ہوا تھا۔

ایک بجنے میں دس منٹ باقی تھے کہ حوالدار دوبارہ میرے کمرے میں آ گیا۔ میں رات کے ابتدائی حصے ہی سے ٹک کر اپنی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ حوالدار تھوڑی دیر پہلے تھانے کے اندرونی اور بیرونی حصے میں ایک راؤنڈ لگانے گیا تھا۔ وہ میرے سامنے کرسی پر بیٹھ چکا تو میں نے استفسار کیا۔

"شاہ جی! باہر کی کیا خبریں ہیں؟"

"تھانے کے باہر تو مکمل سکون اور سناٹا ہے۔" اس نے بتایا۔ "البتہ شام والی خنکی نے باقاعدہ ٹھنڈک کی شکل اختیار کر لی ہے۔"

"فروری کا پورا مہینا تو ایسے ہی چلے گا شاہ جی۔ کہیں جا کر مارچ کے وسط میں موسم کھلے گا اور "سرما" دیکھتے ہی دیکھتے "بہار" میں بدل جائے گا۔" میں نے ایک طویل جماہی لینے کے بعد کہا اور پوچھا۔

"ہمارے مہمانوں کا کیا حال ہے؟"

"دونوں چپ چاپ اپنی چارپائیوں پر لیٹے ہوئے ہیں۔" حوالدار نے جواب دیا۔ "وہ واقعی سو چکے ہیں یا ایسے ہی آنکھیں بند کیے نیند کی آمد کا انتظار کر رہے ہیں، اس بارے میں، میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اب کی بار میں نے ان سے بات کرنے کی کوشش نہیں کی۔"

"یہ آپ نے بہت اچھا کیا شاہ جی!" میں نے معتدل انداز میں کہا۔ "وہ آنکھیں میچ کر بھی لیٹے رہے تو انہیں نیند آنے کے امکانات بڑھ جائیں گے۔" بات کے اختتام پر میں نے ایک مرتبہ پھر جماہی لی۔

"انہیں نیند آئے گی یا نہیں مگر میں دیکھ رہا ہوں، آپ اس وقت ایک بھرپور نیند کی اشد ضرورت محسوس کر رہے ہیں۔" حوالدار نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ "کوئی کانسٹیبل تو یہاں موجود نہیں، میں خود ہی گرما گرم چائے بنا کر لاتا ہوں۔ اس سے نیند اور سردی دونوں بھاگ جائیں گے۔ اس کے بعد ہم اپنے خاص الخاص مشن میں مصروف ہو جائیں گے۔"

بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔ "کون سا مشن؟"

"میں کانا جما کی گھائل ٹانگ میں پسی ہوئی مرچیں بھرنے والے پروگرام کی بات کر رہا ہوں ملک صاحب! آپ نے اسے سوچنے کے لیے ایک گھنٹے کی مہلت دی تھی۔ یہ وقت پورا ہونے میں چند منٹ باقی ہیں۔"

"تو آپ کو یقین ہے کہ وہ خبیث زبان نہیں کھولے گا؟" میں نے سوالیہ نظر سے حوالدار کو دیکھا۔

"اس کا امکان تو بہرحال ہے نا۔"

"ہاں، ایسا ممکن ہے۔" میں نے تائیدی انداز میں کہا۔ "اور ایسا کر کے وہ اپنی تکلیف کو بہت زیادہ بڑھاوا دے گا۔"

"میں چائے کا بندوبست کرنے جا رہا ہوں۔ اگر داؤد اور چھیماں مجھے بیدار حالت میں ملے تو انہیں بھی چائے کی دعوت دے دوں گا۔ آخر کو وہ دونوں میاں بیوی ہمارے مہمان ہیں۔ بھلے ایک رات ہی کے کیوں نہ سہی۔"

"شاہ جی! آپ کی بات سے میرے ذہن میں ایک آئیڈیا آیا ہے۔" میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔

وہ ترنت مستفسر ہوا۔ "کیسا آئیڈیا ملک صاحب؟"

"اگر ہمارے مہمان واقعی جاگ رہے ہوں اور انہیں چائے کی طلب بھی محسوس ہو رہی ہو تو یہ نیک کام چھیماں سے بھی لیا جا سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "میرا مطلب ہے، چائے بنانے کا کام۔"

"گڈ آئیڈیا!" اس نے توصیفی نظر سے مجھے دیکھا۔ "یہ کام تو واقعتاً کسی خاتون ہی کو زیادہ زیب دیتا ہے۔ خیر، میں انہیں چیک کرتا ہوں۔"

"اگر وہ سو چکے ہوں تو پھر انہیں جگانے کی غلطی نہیں کرنا شاہ جی!" میں نے تاکیدی انداز میں کہا۔

"سمجھ گیا ملک صاحب!" وہ مضبوط لہجے میں بولا اور جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور
ملک بھر میں گھر بیٹھے حاصل کریں
جاسوسی، ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت
ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِسالانہ بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ
پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 3000 روپے
بیرونِ ممالک کے لیے زرِسالانہ 30,000 روپے
بیرونِ ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین
یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں
رابطہ:
مرزا ثمر عباس: 0334-5498977
0301-2454188
سرکولیشن منیجر محمد شہزاد خان: 0333-2256789
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی
مین کورنگی روڈ۔ کراچی

pklibrary.com

قبل اس کے کہ حوالدار چمن شاہ میرے کمرے سے باہر قدم رکھتا، کانسٹیبل خادم حسین بوکھلاہٹ بھرے انداز میں کمرے میں داخل ہوا۔ اس کی آنکھوں میں وحشت اور چہرے پر ہوائیاں سی اڑ رہی تھیں۔ اس نے مجھے سیلوٹ کیا اور حد درجہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

''ملک صاحب! لاش.....''

''کس کی لاش؟'' میں نے چونکے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''کون سی لاش خادم حسین؟''

''جناب! آپ نے میری ڈیوٹی تھانے کے بائیں جانب والے حصے میں لگائی تھی۔'' وہ سراسیمہ لہجے میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''میں پوری طرح چوکنا ہو کر وہاں پہرا دے رہا تھا کہ میں نے تھوڑے فاصلے پر کسی کو لیٹے ہوئے دیکھا۔ آپ جانتے ہیں ہمارے تھانے کی چاروں طرف دور دور تک کھیتوں کا سلسلہ پھیلا ہوا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے ہی مکئی کی فصل اتری ہے اور اب وہ کھیت خالی پڑے ہیں۔ مجھے اس بات پر حیرت ہوئی کہ آدھی رات کو اس کھیت میں کون سویا ہوا ہے اور وہ بھی سردیوں کے موسم میں۔ میں وہاں کافی دیر سے ڈیوٹی دے رہا تھا اور اس سے پہلے میرا اس طرف دھیان نہیں گیا تھا لیکن جب میں نے دیکھ لیا تو پھر یہ پتا لگانا ضروری ہو گیا کہ آخر وہ بندہ ہے کون اور سردی کی ٹھنڈی ٹھار رات میں وہ یوں کھلے آسمان کے نیچے کیوں سو رہا ہے؟'' وہ ایک ہی سانس میں بولتا چلا گیا تھا لہٰذا توقف لازم ٹھہرا تھا۔ اس نے دو تین گہری سانسیں لیں پھر اپنے بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے بتانے لگا۔

''ملک صاحب! رائفل میرے پاس تھی اس لیے مجھے ذرا سا بھی ڈر نہیں لگا پھر آپ نے یہ اجازت بھی دے رکھی تھی کہ اگر کوئی مشکوک بندہ تھانے کے آس پاس نظر آئے تو اسے قابو کرنے کے لیے ضرورت پڑنے پر گولی بھی چلائی جا سکتی ہے۔ ان لمحات میں وہ سویا ہوا بندہ مجھے مشکوک ہی لگا تھا اسی لیے میں رائفل سونتے بڑی بہادری سے اس کے نزدیک پہنچ گیا اور تحکمانہ لہجے میں پوچھا۔ ''کون ہو تم اور اتنی رات گئے یہاں کیا کر رہے ہو؟'' یہ سوال کرتے ہوئے میں نے اسے مسلسل اپنی رائفل کے نشانے پر رکھا ہوا تھا تاکہ اگر وہ کوئی چالاکی یا ہوشیاری دکھانے کی کوشش کرے تو میں اس کے بدن کے کسی محفوظ حصے پر فائر کر سکوں لیکن جب میرے کئی بار پکارنے پر بھی اس بندے کے وجود میں کوئی حرکت پیدا نہیں ہوئی تو میں نے اسے ہلا جلا کر دیکھا۔ تبھی یہ انکشاف ہوا کہ وہ تو مر چکا ہے۔''

خادم حسین اپنی بات مکمل کرنے کے بعد ڈری سہمی نظر سے مجھے تکنے لگا تو میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''کیا تم نے اس مردہ شخص کا چہرہ دیکھا ہے؟''

''جی ملک صاحب!'' وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے خوفزدہ لہجے میں بولا۔ ''دیکھا ہے۔''

''کیا تم اسے پہچانتے ہو؟''

''نہیں جناب!''

میں نے حوالدار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''شاہ جی! آپ خادم حسین کے ساتھ جا کر ذرا اس لاش کا ابتدائی جائزہ لیں تاکہ بنیادی معلومات سامنے آ سکیں۔ وقوعہ کی باقاعدہ کارروائی سورج اگنے کے بعد روشنی میں کی جائے گی۔ آپ یہاں کے لوگوں کو مجھ سے زیادہ جانتے اور پہچانتے ہیں اسی لیے میں آپ کو بھیج رہا ہوں۔ عین ممکن ہے کہ آپ اس بندے کی شناخت کر لیں جس کے بعد ہمارا کام آسان ہو جائے گا..... اور ہاں، لالٹین بھی ساتھ لے جائیں۔''

''او کے ملک صاحب! میں وقوعہ کی جانب روانہ ہو رہا ہوں۔'' چمن شاہ نے پُرعزم لہجے میں کہا۔ ''اور چائے کے لیے معذرت چاہوں گا۔''

''اب چائے کی ضرورت نہیں رہی شاہ جی!'' میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔ ''خادم حسین کی اطلاع نے تو میری نیند اڑا دی ہے۔''

چمن شاہ نے معنی خیز انداز میں مجھے دیکھا پھر خادم حسین کے ہمراہ میرے کمرے سے نکل گیا۔ میں ان کے ساتھ تھانے کے گیٹ تک آیا۔ جب وہ میری نظر سے اوجھل ہو کر تاریکی کا حصہ بن گئے تو بھی میں انہی کی سمت دیکھتا رہا کیونکہ خادم حسین کے ہاتھ میں موجود لالٹین مجھے تا دیر نظر آتی رہی تھی۔

حوالدار چمن شاہ ایک تجربہ کار اور قابلِ بھروسا پولیس اہلکار تھا۔ اسے پولیس ڈیپارٹمنٹ میں خدمات انجام دیتے ہوئے ایک طویل عرصہ ہو گیا تھا۔ مجھے یہ بتانے میں کوئی عار محسوس نہیں ہو رہی کہ ان چار ماہ میں، میں نے چمن شاہ سے کام کی کئی ایک باتیں سیکھی تھیں۔

میں واپس اپنے کمرے میں جانے کے لیے برآمدے سے گزرا تو لامحالہ میری نگاہ اس مہمان جوڑے کی طرف اٹھ گئی جو وقت کی ستم ظریفی کا شکار ہو کر میرے پاس آئے تھے اور مجبوراً انہیں رات گزارنے کے لیے تھانے کا مہمان بننا پڑا تھا۔ ایک فوری خیال کے تحت میرے قدم

برآمدے کے اس دور افتادہ کونے کی سمت بڑھ گئے جہاں چمن شاہ نے ان کے سونے کا بندوبست کر رکھا تھا۔ میں ان کی چارپائیوں کے نزدیک پہنچا تو مجھے داؤد کے بدن میں حرکت سی دکھائی دی۔ وہ چارپائی پر لیٹا ہوا ضرور تھا مگر ابھی تک جاگ رہا تھا مگر اس کی بیوی کیم عرف چھیماں بے سدھ پڑی تھی۔

میں داؤد کی چارپائی کے انتہائی قریب پہنچا تو میری موجودگی کو محسوس کر کے وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں نے نرم لہجے میں استفسار کیا۔

''لگتا ہے تمہاری سونے کی کوشش بیکار جا رہی ہے۔ بتاؤ، میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟''

''آپ کو بالکل ٹھیک لگ رہا ہے تھانیدار صاحب!'' وہ بیزاری سے بولا۔ ''آپ میرے لیے بھلا کیا کر سکیں گے۔ آپ کو تو خود بھی نیند نہیں آ رہی۔''

''ہماری ڈیوٹی آٹھ یا بارہ گھنٹے کی نہیں ہوتی داؤد!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اور ہمیں ہفتہ وار چھٹی بھی نہیں ملتی۔ بس یوں سمجھ لو کہ جب تک تھانے میں ہیں، ڈیوٹی پر ہیں۔''

''مگر ایسی بھی کیا ڈیوٹی کہ انسان رات میں بھی نہ سو سکے۔'' وہ اکتائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''میں یہی دیکھ رہا ہوں کہ آس پاس کا سارا ماحول نیند کی چادر اوڑھے سکون سے سو رہا ہے مگر آپ کا تھانہ مسلسل جاگ رہا ہے۔ آپ کے عملے کا آنا جانا لگا ہوا ہے۔ ہم تو اپنی پریشانی کو لے کر نہیں سو رہے۔ کم از کم آپ لوگ تو آرام سے نیند پوری کریں۔ ایسا تھانہ تو میں نے کہیں دیکھا اور نہ ہی سنا۔''

''دیکھو اور سنو گے بھی نہیں داؤد!'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''کیونکہ میں تھانیدار ہوں ذرا دکھری ٹائپ کا اور یہ تو طے ہے کہ جیسا تھانیدار، ویسا ہی اس کا تھانہ۔ باقی جہاں تک میرے عملے کی بات ہے تو.....'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔ میرے بیان میں مبالغہ آرائی بھی شامل تھی۔

''وہ سب میرے ہی اشاروں پر حرکت میں ہیں۔ میں نے رات کے ابتدائی حصے میں ہی اپنے ہوشیار بندوں کو ان دو ڈاکوؤں کی تلاش میں روانہ کر دیا تھا جنہوں نے آج شام تم میاں بیوی کو بندوقیں دکھا کر لوٹا تھا۔ مجھے امید ہے کہ وہ لوگ صبح تک کوئی اچھی خبر لے کر آئیں گے اور اس کے بعد ہی میں آپ میاں بیوی سے کیا ہوا وعدہ پورا کر سکوں گا۔''

داؤد نے مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ میں نے ان لوگوں سے کونسا وعدہ کر رکھا ہے۔ وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔

''آپ نے تو کئی گھنٹے پہلے اپنے عملے کے ان بندوں کو دو ڈاکوؤں کی تلاش میں بھیجا تھا مگر اس کے بعد بھی آپ لوگوں میں سے کوئی آ رہا ہے اور کوئی جا رہا ہے..... اور بھی حوالات کی جانب سے کانا جما کی اذیت ناک چیخیں سنائی دینے لگتی ہیں۔ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آخر اس تھانے میں ہو کیا رہا ہے؟''

اگرچہ ہم دونوں دھیمے لہجے میں بات کر رہے تھے لیکن شاید چھیماں کچی نیند میں تھی چنانچہ وہ بھی اٹھ کر بیٹھ گئی اور خواب آلود نظر سے ہمیں تکنے لگی۔

''ہو یہ رہا ہے.....'' میں نے داؤد کے سوال کے جواب میں بتایا۔ ''کچھ دیر پہلے چودھری رب نواز کے بھوسے کے گودام میں آگ لگ گئی تھی لہٰذا میرے عملے کو فوراً حرکت میں آنا پڑا اور ابھی ابھی یہ اطلاع ملی ہے کہ تھانے کی بائیں جانب تھوڑے فاصلے پر کسی آدمی کی لاش پڑی ہوئی ہے۔ میں نے حوالدار کو ایک کانسٹیبل کے ہمراہ ادھر ہی بھیجا ہے۔ تم لوگوں کے لیے یہ سب عجیب ہو سکتا ہے مگر ہم لوگ اس کے عادی ہیں۔ تھانے میں یہ چلتا رہتا ہے۔ دن ہو یا رات، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

''تو اس وقت آپ تھانے میں اکیلے ہیں؟'' داؤد کی بیوی نے مجھ سے پوچھا۔ لاش والی بات پر انہوں نے ذرا توجہ نہیں دی تھی۔

''ہاں، بالکل!'' میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا اور چھیماں سے پوچھا۔ ''کوئی خاص بات؟''

''نہیں، نہیں..... کوئی خاص بات نہیں جناب!'' وہ جلدی سے بولی۔ ''میں نے آپ سے یہ سوال اس لیے کیا ہے کہ کافی دیر سے خطرناک ڈاکو کانا جما کے چیخنے چلانے کی آواز نہیں آ رہی۔ آپ کا حوالدار خاصا گرم مزاج کا ہے۔ اس نے ڈاکوؤں کے سردار کی زبان کھلوانے کے لیے اس پر بڑا تشدد کیا ہے مگر آپ اس سے بہت مختلف ہیں۔ آپ کی طبیعت میں نرمی پائی جاتی ہے۔ شاید اسی لیے اب وہ ڈاکو سکون میں ہے۔ کیا اس نے آپ کی مطلوبہ معلومات فراہم کر دی ہیں؟''

چھیماں کی باتوں میں مجھے کہیں بھی کوئی ربط ضبط نظر نہیں آیا۔ عین ممکن ہے بقول چمن شاہ، یہ اس کی منتشر الخیالی کا نتیجہ ہو۔ پریشانی کے عالم میں انسان اپنی گفتگو کا فوکس کھو بیٹھتا ہے۔ بہرحال میں نے اس کے آخری سوال کا جواب دینا ضروری نہ جانا اور ایک فوری خیال کے تحت پوچھا۔

''چھیماں! تم نے شام میں کانا جما کو دیکھنے کی

خواہش کا اظہار کیا تھا۔ کیا اب بھی تم ایسا چاہتی ہو؟''

''جی ہاں۔'' وہ خوش ہوتے ہوئے بولی۔ ''رات جب میں نے آپ کے حوالدار سے یہی بات کی تو اس نے مجھے ٹالنے والے انداز میں کہا تھا کہ میں چپ چاپ سو جاؤں۔ کانا جما سے میرا ملنا اتنا بھی ضروری نہیں ہے۔ یہ ملاقات کل صبح بھی ہو سکتی ہے حالانکہ مجھے کسی ڈاکو سے ملاقات کرنے کا شوق نہیں ہے تھانیدار صاحب! میں تو بس ایک نظر دیکھنا چاہتی ہوں کہ یہ ڈاکو لوگ کیسے ہوتے ہیں۔''

بات کے اختتام پر اس نے ایک ہاتھ اپنی پیشانی پر مارا۔

عورتوں کے بارے میں مردوں کا عمومی خیال یہی ہے کہ یہ مخلوق بہت زیادہ باتونی ہوتی ہے۔ میں اس ''عمومی خیال'' کی تردید یا تصدیق کو ایک طرف رکھتے ہوئے صرف اتنا کہوں گا کہ اگر داؤد ''چپ شاہ'' تھا تو اس کے مقابلے میں چھیماں کو باتونی کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

''میں تمہاری یہ خواہش ابھی پوری کر سکتا ہوں چھیماں!'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''میں تمہیں اپنے ساتھ حوالات لے جا کر کانا جما کی ایک جھلک دکھانے کو تیار ہوں لیکن اس کے بدلے میں تمہیں میرا ایک چھوٹا سا کام کرنا ہوگا۔ بولو منظور ہے؟''

چھیماں نے شک زدہ نظروں سے مجھے گھورا۔ وہ میری بات کا کوئی غلط مطلب لے بیٹھی تھی اور اس میں اس بے چاری کا کوئی قصور بھی نہیں تھا۔ آدھی رات کے وقت اگر ایک پولیس والا کسی نامحرم عورت سے کہے کہ اسے اس سے کوئی ضروری کام ہے تو لامحالہ مذکورہ عورت کا دھیان اس پولیس والے کی بدنیتی ہی کی طرف جائے گا۔

''آپ کو اس وقت میری بیوی سے کیا کام ہے تھانیدار صاحب؟'' داؤد نے قدرے سخت اور محتاط لہجے میں مجھ سے دریافت کیا۔

''ایسی کوئی بات نہیں جیسا تم لوگ سوچ رہے ہو۔'' میں نے ان دونوں کے چہروں کے تاثرات کا باریک بینی سے جائزہ لینے کے بعد ٹھہرے ہوئے اور سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''دراصل آپ لوگوں کو نیند نہیں آ رہی اور میرے تھانے میں آج رات کچھ زیادہ ہی مصروفیت ہے جس کی وجہ سے مجھے جاگنا پڑ رہا ہے اور اتفاق سے اس وقت میرا زیادہ تر اسٹاف تھانے سے باہر اپنی ڈیوٹی کر رہا ہے۔ اس صورتِ حال میں اگر چھیماں ہم سب کے لیے چائے بنا دے گی تو سردی اور نیند کا مقابلہ کرنے میں کافی آسانی ہو جائے گی۔ میں نے نیند بھگانے والی بات اپنے لیے کی ہے۔ آپ لوگوں کو تو ویسے ہی نیند نہیں آ رہی۔''

''اوہ، تو یہ بات ہے۔'' داؤد ایک گہری اور پُرسکون سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''میں تو کچھ اور ہی سمجھ بیٹھا تھا۔''

''ایسا ویسا کچھ بھی سمجھنے میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے داؤد!'' میں نے رسان بھرے لہجے میں کہا۔ ''تم آج شام میں ایک بدترین حادثے کا شکار ہو چکے ہو۔ اس قسم کے پریشان کن حالات میں انسان کا ذرا سہما ہوا ذہن کچھ بھی سوچ سکتا ہے اور یہ ''کچھ بھی'' زیادہ تر منفی ہی ہوتا ہے۔''

''تھانیدار صاحب!'' چھیماں نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''اگر میں سب کے لیے چائے بنا دوں تو آپ مجھے کانا جما کے پاس لے چلیں گے؟''

''پکا وعدہ!'' میں نے ایک ایک لفظ پر دباؤ ڈالتے ہوئے جواب دیا۔ ''میں پہلے تمہیں ڈاکوؤں کے سردار کی جھلک دکھاؤں گا اس کے بعد تم چائے بنانا۔''

وہ کسی ننھے بچے کے مانند خوش ہو گئی۔

میں چھیماں کو اپنے ساتھ لے کر حوالات کی طرف گیا اور اسے کانا جما کے سامنے کھڑا کر دیا۔ کانا جما اس وقت حوالات کے فرش پر سکڑا سمٹا، آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا۔ میں اگر چاہتا تو اس بدبخت کے لیے گرم بستر کا انتظام کروا سکتا تھا لیکن جب وہ مجھ سے تعاون کرنے پر آمادہ نہیں تھا تو میں اس کی آسانی اور آرام کے بارے میں کیوں سوچتا؟ وہ کوئی عام شریف اور سیدھا سادہ انسان نہیں تھا جو میں اخلاقی تقاضوں کے دباؤ میں آ کر اپنے رویے میں نرمی بھر دیتا۔ وہ ایک بدنام زمانہ ڈاکو، لٹیرا، قاتل اور جانے کیا کیا تھا۔ اس کے معاملے میں نرمی کا برتاؤ کرنا انصاف کے ساتھ ناانصافی ہوتی۔

ہمارے قدموں کی آہٹ سن کر کانا جما نے آنکھیں کھول دیں۔ گویا وہ سو نہیں رہا تھا۔ ویسے اس وقت وہ جس نوعیت کی صورتِ حال سے دوچار تھا، اس میں نیند کی آمد ناممکنات کی حد تک مشکل تھی۔ آج کی رات ہم سب جاگ رہے تھے۔ یہ الگ بات کہ اس رت جگے کے لیے ہر کسی کے پاس اپنی ایک وجہ تھی جو دوسرے کی وجہ سے کافی مختلف تھی۔ بہرحال ان تمام وجوہات کے ڈانڈے کسی نہ کسی طرح اس یک چشم ڈاکو جمال دین کی ذات کے ساتھ جڑے ہوئے تھے۔

کانا جما نے ایک بھرپور نگاہ چھیماں پر ڈالی تو اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس کی آنکھوں میں حیرت کے بجائے خوشی کے تاثرات تھے اور اس خوشی کا تعلق شناسائی سے زیادہ ہونا کی سے تھا۔ میں جان چکا تھا کہ وہ عورت کے

حصول کی خاطر رال ٹپکانے کا کوئی موقع ضائع نہیں کرتا۔ عورت اس بداعمال شخص کی سب سے بڑی کمزوری تھی اور چھیماں صرف عورت ہی نہیں بلکہ ایک گوری چٹی اور حسین و جمیل خاتون تھی۔

''تم نے ایک بدنام زمانہ ڈاکو کا دیدار کرلیا ہے چھیماں!'' میں نے داؤد کی بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے سپاٹ آواز میں کہا۔ ''اب تم وعدے کے مطابق میرے تھانے کے عملے اور اپنے لیے چائے بناؤ گی۔''

''تھانیدار صاحب!'' کانا جما نے لجاجت بھرے لہجے میں کہا۔ ''ایک پیالی چائے میرے لیے بھی بنوا دیں سرکار! اس رات کی ٹھنڈک اور آپ کے حوالدار کی مار نے میرے بدن کا جوڑ جوڑ..... اب میں آپ کو کیا بتاؤں کہ میری کیا حالت ہے۔''

''اپنی اس حالت کے تم خود ہی ذمے دار ہو۔'' میں نے درشت لہجے میں کہا۔ ''اور اس حالت سے باہر نکلنا بھی تمہارے ہی ہاتھ میں ہے۔ اگر تم میرے تمام سوالات کے ٹھیک ٹھیک جوابات دے دو تو میں تمہارے معاملے میں کسی حد تک نرمی برتنے کو تیار ہوں۔''

''میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ آپ کو کیسے یقین دلاؤں۔'' وہ بے بسی سے بولا۔ ''میں اپنے گروہ کے کسی آدمی کے موجودہ ٹھکانے کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے دوٹوک اور سفاک لہجے میں کہا۔ ''پھر تمہارے لیے چھیماں نہیں، حوالدار چمن شاہ چائے بنائے گا اور وہ بھی مرچوں والی۔''

کانا جما کینہ توز انداز میں مجھے گھور کر رہ گیا۔ میں چھیماں کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ میں دراصل چھیماں کو وہ جگہ دکھانا چاہتا تھا جہاں چائے بنانے کا تمام سامان رکھا ہوا تھا لیکن قبل اس کے کہ میں مطلوبہ مقام تک رسائی حاصل کرتا، کانسٹیبل احسان اللہ، بابا حیاتا کو لے کر تھانے پہنچ گیا۔ ان دونوں نے گرم چادروں کی بکلیں مار رکھی تھیں جس کی وجہ سے ان کے چہرے پوری طرح دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

''چھیماں! تم تھوڑی دیر کے لیے برآمدے میں اپنے خاوند کے پاس جا کر بیٹھو۔ حوالدار چمن شاہ بھی واپس آنے والا ہے۔ پھر تم سب کے لیے ایک ساتھ چائے بنانا۔''

''جی ٹھیک ہے۔'' وہ فرمانبرداری سے بولی اور برآمدے کی جانب بڑھ گئی۔

میں بابا حیاتا کو لے کر اپنے کمرے میں آگیا۔ کانسٹیبل احسان اللہ کو میں نے باہر ہی رکنے کو کہہ دیا تھا۔

حیات محمد عرف بابا حیاتا کی عمر ساٹھ سے متجاوز تھی۔ وہ دبلے پتلے بدن کا مالک ایک عام سا کاشتکار تھا تاہم اس وقت اس کے چہرے پر عام سے تاثرات نہیں تھے۔ وہ اپنے آدھی رات کو تھانے بلائے جانے پر خاصا خفا اور مکدر دکھائی دیتا تھا۔ میں نے اس کی مشکل کو آسان کرنے کی غرض سے نرم لہجے میں کہا۔

''بابا حیاتا! میں اس تکلیف کے لیے تم سے معذرت چاہتا ہوں لیکن ایک مجبوری کی خاطر تمہیں اس وقت تھانے بلایا ہے۔''

''ایسی کیا مجبوری آپڑی ہے تھانیدار صاحب؟'' میرے معذرتی الفاظ نے اس کی کلفت کو زائل کر دیا تھا اسی لیے اس نے معتدل انداز میں استفسار کیا تھا۔ ''آپ کے کانسٹیبل نے مجھے بتایا ہے کہ آپ کانا جما کے بندوں کے ٹھکانے وغیرہ کے بارے میں مجھ سے پوچھ تاچھ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ مجھے اس بات کا علم ہو چکا ہے کہ آپ نے اس خطرناک ڈاکو کو گرفتار کرلیا ہے لیکن یقین جانیں کہ میں اس کے ساتھیوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ میں تو ایک سیدھا سادہ اور امن پسند کاشتکار ہوں جناب والا۔''

''اگر تم کانا جما اور اس کے گروہ کے دیگر افراد کے بارے میں کسی قسم کی معلومات نہیں رکھتے تو اس میں کوئی قباحت نہیں ہے لیکن بات یہاں پر ختم نہیں ہو جاتی بابا حیاتا!'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر ٹھوس انداز میں کہا۔ ''اس گروہ کے دو ڈاکوؤں راجو اور ماکھا نے آج شام تمہارے دو مہمانوں کو بھی لوٹا ہے اور.....!''

''میرے دو مہمان؟'' میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی وہ بول اٹھا۔ ''آپ کن لوگوں کا ذکر کر رہے ہیں تھانیدار صاحب؟'' اس نے الجھن زدہ لہجے میں سوال کیا۔

بابا حیاتا کے اس سنسنی خیز استفسار نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ''میں داؤد اور اس کی بیوی چھیماں کی بات کر رہا ہوں۔ داؤد گوجرانوالہ کے محلہ باغبان پورہ میں برتن بنانے کا ایک کارخانہ چلاتا ہے اور اس کی دس ایکڑ زرعی اراضی تمہاری مزارعت میں ہے۔ وہ ہر سال ایک رات کے لیے تمہارے پاس آتا ہے اور اگلی صبح واپس چلا جاتا ہے۔ کل شام بھی وہ اپنی بیوی چھیماں کے ساتھ ادھر جلال پور بھٹیاں آیا تھا مگر اس وقت تک کوٹ غازی کلاں جانے والا آخری تانگا نکل چکا تھا۔ اسی لیے وہ دونوں تمہارے پاس نہ پہنچ سکے اور پھر

راجو وما کھانے انہیں لوٹ لیا۔ میں نے ازراہِ ہمدردی رات گزارنے کے لیے انہیں تھانے میں جگہ دے دی ہے۔ ابھی تم نے جس عورت کو میرے ساتھ دیکھا، وہ داؤد کی بیوی چھیماں ہے۔ داؤد باہر برآمدے میں ایک چارپائی پر لیٹا یا بیٹھا ہوا ہے۔''

''ہاں، میں نے ایک بندے کو برآمدے میں اور ایک خوبصورت عورت کو آپ کے ساتھ دیکھا ہے مگر میں ان میاں بیوی کو بالکل نہیں جانتا تھانیدار صاحب!'' وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔

بابا حیاتا کے جواب نے مجھے سرتاپا ہلا کر رکھ دیا۔ اس کا تو سیدھا سادہ یہی مطلب نکلتا تھا کہ داؤد اور چھیماں نے مجھ سے صریحاً غلط بیانی کی تھی اور یا پھر میرے سامنے بیٹھا ہوا وہ کانسٹیبل دروغ گوئی کا سہارا لے رہا تھا۔ جب کوئی انسان دانستہ جھوٹ بولتا ہے تو اس کے پیچھے اس کا کوئی خاص مقصد پوشیدہ ہوتا ہے۔ ان دونوں پارٹیوں میں کون سچا اور کون جھوٹا تھا، اس کا فیصلہ بہت ضروری ہو گیا تھا۔ میں نے باہر موجود کانسٹیبل کو آواز دی۔

''احسان اللہ!''

ان لمحات میں میرا ذہن طوفانی رفتار سے مختلف زاویوں پر طبع آزمائی کر رہا تھا۔ کسی بھی نازک معاملے میں سچ اور جھوٹ کے بیچ ایک بہت ہی باریک سی نادیدہ لائن موجود ہوتی ہے۔ اس لائن کے پار دیکھنے والا ہی سچ تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو پاتا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے سردست میرے دماغ میں یہی آیا تھا کہ دونوں پارٹیوں کو آمنے سامنے بٹھا کر بات کرنا چاہیے تاکہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے۔

''یس سر!'' میری پکار پر کانسٹیبل احسان اللہ نے میرے سامنے حاضر ہونے کے بعد مؤدب لہجے میں کہا۔

''تم ان دونوں میاں بیوی کو اپنے ساتھ لے کر یہاں آجاؤ۔ ان سے کہنا میں نے ایک ضروری کام سے بلایا ہے۔''

''او کے ملک صاحب!'' وہ مستعدی سے بولا۔

جب وہ میرے کمرے سے نکلنے لگا تو میں نے ایک فوری خیال کے تحت ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔ ''جب تم انہیں یہاں پہنچا دو تو واپس جا کر ان کے اٹیچی کیس کو چارپائی کے نیچے سے نکال کر ریکارڈ روم کی الماری کے اندر چھپا دینا۔''

''سمجھ گیا ملک صاحب!'' کانسٹیبل نے کہا۔ ''آپ کے حکم کی تعمیل کی جائے گی۔''

موجودہ صورتِ حال میں میرا دماغ چھوٹی اور بظاہر معمولی نظر آنے والی چیزوں پر زیادہ فوکس کر رہا تھا۔ بابا حیاتا کے بیان نے میری سوچ کی بساط کو الٹ کر رکھ دیا تھا۔ اگر وہ بوڑھا کاشتکار کوئی ڈراما نہیں کر رہا تھا تو پھر ان میاں بیوی کی طرف سے مجھے ریڈ الرٹ ہونا تھا اور میں کچھ ایسا ہی کر بھی رہا تھا۔

''بابا حیاتا! تم دوبارہ گرم چادر کی بکل مار لو تاکہ داؤد اور چھیماں تمہارے چہرے کو دیکھ نہ سکیں۔'' میں نے تاکیدی انداز میں کہا۔ ''اور جب تک میں نہ کہوں، تم نے اپنے چہرے سے چادر کو ہٹانا نہیں ہے۔ میری بات تمہاری سمجھ میں آ رہی ہے نا؟''

''میں سمجھ گیا جناب!'' وہ فرمانبرداری سے بولا۔

بات کے اختتام پر اس نے گرم چادر کی اس طرح بکل ماری کہ اس کی ناک اور ہونٹ ہی کھلے ہوئے تھے یا پھر کسی حد تک آنکھیں۔ باقی کا تمام چہرہ اس بکل کی محفوظ ''پناہ'' میں چلا گیا تھا۔

آئندہ دو منٹ میں کانسٹیبل، داؤد اور چھیماں کو میرے کمرے میں پہنچا کر واپس چلا گیا تاکہ اٹیچی کیس کے حوالے سے وہ میرے حکم کی تعمیل اور اپنے کام کی تکمیل کر سکے۔

''تھانیدار صاحب! آپ نے ہمیں کسی ضروری کام سے بلایا ہے۔'' داؤد نے کہا۔ ''کہیں آپ ہم میاں بیوی دونوں سے چائے بنوانے کا ارادہ تو نہیں رکھتے؟''

''چائے کا معاملہ بعد میں دیکھیں گے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''فی الحال تو میں نے آپ لوگوں کو ایک خطرناک ڈاکو کی شناخت کے لیے یہاں بلایا ہے۔ ہو سکتا ہے یہ انہی دو ڈاکوؤں میں سے کوئی ایک ہو جنہوں نے شام سے تھوڑی دیر پہلے آپ دونوں کو خطرناک ہتھیاروں کے نشانے پر رکھ کر لوٹ لیا تھا۔''

''آپ کس ڈاکو کی بات کر رہے ہیں؟'' داؤد نے سرسراتی ہوئی آواز میں استفسار کیا پھر تیز نظر سے بکل پوش بابا حیاتا کی طرف دیکھا۔

''تمہاری نظر کا نشانہ خطا نہیں گیا داؤد!'' میں نے بدستور اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے ٹھوس انداز میں کہا۔ ''میں اسی ڈاکو کی بات کر رہا ہوں۔''

''اس بندے نے تو اپنا چہرہ چھپا رکھا ہے۔'' داؤد نے الجھن زدہ لہجے میں کہا۔ ''میں اس کی شناخت کیسے کروں؟ مانا کہ میرا حافظہ بہت قوی ہے مگر میں کسی دبیز گرم

چادر کے پیچھے تو نہیں دیکھ سکتا تھانیدار صاحب!''

''میں تمہاری مشکل کو آسان کر دیتا ہوں۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا پھر بابا حیاتا کی طرف دیکھتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔ ''چاچا! ذرا اپنا چہرہ کھول کر ان لوگوں کو دکھاؤ۔''

میں نے دانستہ بابا حیاتا کا نام نہیں لیا تھا اور اس کی جگہ ''چاچا'' کا لفظ استعمال کیا تھا تاکہ اگر ان میاں بیوی نے میرے ساتھ کوئی چھل فریب کیا تھا تو میں ان کی بدبختی کی تہ میں اتر کر ان کی اصلیت تک رسائی حاصل کر سکوں۔

بابا حیاتا نے میرے حکم پر اپنے چہرے کو ان دونوں پر نمایاں کر دیا۔ انہوں نے بابا حیاتا کو دیکھا پھر معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو تکنے لگے۔ داؤد نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''تھانیدار صاحب! یہ بندہ تو دبلا پتلا اور عمر رسیدہ ہے جبکہ وہ دونوں ڈاکو ادھیڑ عمر اور ہٹے کٹے تھے۔ آپ نے غلط بندے کو پکڑ لیا ہے۔ ہمیں لوٹنے والوں میں یہ بزرگ شامل نہیں تھا۔''

''تم اس بارے میں کیا کہتی ہو؟'' میں نے سوالیہ نظر سے چھیماں کو دیکھا۔

''داؤد بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے جناب!'' وہ داؤد کی بات کی تصدیق کرتے ہوئے بولی۔

''مطلب یہ کہ.....'' میں نے یکے بعد دیگرے داؤد اور چھیماں کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔ ''یہ بندہ راجو ہے اور نہ ہی ماکھا..... ہیں نا؟''

وہ یک زبان بولے۔ ''جی، آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔''

''تو پھر یہ شخص کون ہے؟'' میں نے قدرے سخت لہجے میں استفسار کیا۔ ''کیا تم اسے جانتے ہو؟''

''ہم تو ان چاچا جی کو نہیں جانتے تھانیدار صاحب!'' چھیماں بیزاری سے بولی۔ ''آپ ہی بتائیں، یہ بابا کون ہے اور آپ نے ڈاکوؤں کے شبے میں اسے کہاں سے گرفتار کیا ہے؟''

اس دوران میں کانسٹیبل احسان اللہ اپنا ''کام'' نمٹا کر واپس آ چکا تھا اور میرے کمرے کے دروازے کے باہر ہی چاق و چوبند کھڑا تھا۔

''میں نے اس بزرگ کو کہیں سے گرفتار نہیں کیا۔'' میں نے داؤد اور چھیماں کو حقائق سے روشناس کرانے کی غرض سے واشگاف الفاظ میں کہا۔ ''گرفتار شدگان ملزموں اور مجرموں کو میں اپنے کمرے میں کرسی پر نہیں بٹھاتا بلکہ کانا جما کی طرح حوالات میں بند کرتا ہوں۔ میں نے اسے کوٹ غازی کلاں سے خاص طور پر آدھی رات کو اس لیے بلایا ہے کہ تمہاری اصلیت کو منظر عام پر لا سکوں اور..... یہ محض ''بابا'' نہیں بلکہ حیات محمد عرف بابا حیاتا ہے۔''

میرے الفاظ آسمانی بجلی کے مانند ان دونوں پر گرے۔ ان کے چہرے پہلے متغیر ہوئے پھر سیاہی مائل ہو گئے۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ میں انہیں یوں بے نقاب کر دوں گا اور..... میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا تھا۔ بابا حیاتا کو تھانے بلانے کا خیال تو خود بخود قدرت نے میرے دماغ میں ڈالا تھا۔ میرا تو اس طرف مطلق دھیان نہیں گیا تھا۔ عشا کی نماز کے بعد اللہ کی جانب سے مجھے یہ راہنمائی حاصل ہوئی تھی۔ اس کے بعد ہی میں نے کانسٹیبل احسان اللہ کو موضع کوٹ غازی کلاں کی طرف دوڑایا تھا۔

یہ تمام تر خیالات سیکنڈ کے دسویں حصے میں میرے دماغ سے گزر گئے۔ اس دوران میں، میں نے ان دونوں کو اپنی کڑی نگاہ میں رکھا ہوا تھا۔ وہ ''نہ پائے رفتن، نہ جائے ماندن'' ایسی صورتِ حال سے دوچار تھے۔ قبل اس کے کہ وہ مکار کسی لنگڑی وضاحت کا سہارا لیتے، میں نے گرج دار آواز میں کہا۔

''کون ہو تم لوگ؟''

''تھانیدار صاحب! کیا یہ وہی ''میاں بیوی'' ہیں جنہوں نے آپ کو بتایا تھا کہ میں ان کا مزارع ہوں؟'' بابا حیاتا نے مجھ سے پوچھا۔

''میاں بیوی کا رشتہ تو بہت محترم اور پاکیزہ ہوتا ہے بابا!'' میں نے ان دونوں کو نفرت انگیز نظر سے گھورتے ہوئے زہر خند لہجے میں کہا۔ ''یہ کمینے اس رشتے کے قابل نہیں ہیں۔'' پھر میں دوبارہ داؤد اور چھیماں کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''تم کیا منہ میں گھنگنیاں ڈالے بیٹھے ہو، میرے سوال کا جواب کیوں نہیں دے رہے ہو؟ مجھے بتاؤ، تم آخر ہو کون اور میرے ساتھ یہ ڈرامار چانے کا تمہارا مقصد کیا ہے؟''

میں ان کی زبان سے کسی بھی لولے لنگڑے جواب کی توقع کر رہا تھا۔ جواب تو انہوں نے دیا مگر منہ کے بجائے ''پاؤں'' سے۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھے اور آن واحد میں انہوں نے دروازے کی جانب دوڑ لگا دی۔

میرے کمرے کے دروازے پر کانسٹیبل مستعد کھڑا تھا۔ میں نے بہ آوازِ بلند کہا۔ ''احسان اللہ! انہیں روکو۔ یہ بھاگنے نہ پائیں۔''

اس کے ساتھ ہی میں نے اپنا سروس ریوالور نکال لیا اور بجلی ایسی سرعت سے ان کے تعاقب میں لپکا۔
احسان اللہ مستعد تو تھا مگر داؤد جیسا چیتا چالباز نہیں۔ داؤد نے بڑی مہارت سے اسے زور کا دھکا دیا اور برآمدے کی سمت دوڑتا چلا گیا۔ چھیماں بھی اس کے ہمراہ تھی۔
وہ دونوں اپنی چارپائیوں کے پاس پہنچے اور اس کے نیچے اپنا اٹیچی کیس تلاش کرنے لگے۔ اس تلاش میں انہیں سخت مایوسی ہوئی کیونکہ میں نے ان کے بکسے (اٹیچی کیس) کو وہاں سے اٹھوا کر کہیں اور پہنچوا دیا تھا۔ ایک بات اچھی طرح میری سمجھ میں آگئی کہ وہ اٹیچی کیس ان دونوں کے لیے بہت زیادہ اہمیت کا حامل تھا۔
''تم جس چیز کو ڈھونڈ رہے ہو، وہ میرے پاس محفوظ رکھی ہے۔'' میں نے انہیں ریوالور کے نشانے پر رکھتے ہوئے کرخت لہجے میں کہا۔ ''تمہارا کھیل ختم ہو چکا۔ شرافت سے گرفتاری دے دو۔ تم دونوں داؤد اور چھیماں تو ہرگز نہیں ہو سکتے۔ تم جو کوئی بھی ہو، میں اگلے ایک گھنٹے میں تمہاری اصلیت جان لوں گا۔''
وہ میرے اندازے سے کچھ زیادہ ہی ضدی نکلے۔ گرفتاری دینے کے بجائے انہوں نے فرار ہونے کی کوشش کی۔ مجھے مجبوراً ان کی ٹانگوں پر فائرنگ کرنا پڑی۔ میرا نشانہ خطا نہیں گیا۔ وہ برآمدے سے نکل ہی رہے تھے کہ میری چلائی ہوئی گولیوں نے انہیں چیختے ہوئے اوندھے منہ زمین پر گرا دیا۔
اسی وقت حوالدار چمن شاہ، کانسٹیبل خادم حسین کے ساتھ واپس آگیا۔ حوالدار کی کہانی سننے کا وقت تھا اور نہ ہی موقع۔ میں نے چمن شاہ اور دیگر کانسٹیبلو کی مدد سے دونوں زخمی بھگوڑوں کو گرفتار کر کے حوالات میں پہنچا دیا۔ ان کے برابر میں دوسرے کمرے میں خطرناک ڈاکو کانا جما بند تھا۔

☆☆☆

داؤد اور چھیماں کے نام سے جن فرضی میاں بیوی نے مجھے اپنی دکھ بھری کہانی سنا کر تھانے میں رات گزارنے کی سہولت حاصل کر لی تھی، وہ درحقیقت کانا جما ہی کے گروہ سے تعلق رکھتے تھے اور اس ڈرامے کے توسط سے وہ اپنے سردار کو حوالات سے فرار کرنے کی نیت سے تھانے میں رکے تھے۔ ان کے بکسے کی تلاشی خاصی سنسنی خیز اور سودمند ثابت ہوئی۔ اس اٹیچی کیس کے اندر تین ریوالور، چار خنجر اور آتش زنی کا تمام سامان پیٹرول اور ماچس وغیرہ سب موجود تھا۔ وہ اس سنہری موقع کی تلاش میں تھے جب تھانے کا عملہ سو جائے اور انہیں کوئی بھرپور کارروائی کرنے کے لیے راستہ صاف ملے۔ ان کی بدقسمتی کہ اس رات میرے تھانے کے عملے نے گویا خود پر نیند حرام کر لی تھی۔
ان نقلی میاں بیوی نے مزارع بابا حیاتا کا نام تو سن رکھا تھا لیکن اس کی صورت سے واقف نہیں تھے۔ شاید اسی لیے قدرت نے میرے ذہن میں یہ سوچ ڈالی تھی کہ موضع کوٹ غازی کلاں سے بابا حیاتا کو تھانے بلانا چاہیے۔
کانا جما کے گروہ کے لوگوں نے اپنے گرو کو میرے تھانے کی حوالات سے فرار کرانے کا جو ناپاک منصوبہ بنایا تھا، وہ رب کے فضل سے کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ آئندہ ایک ہفتے میں، میں نے اس گروہ کے باقی ماندہ افراد کو بھی گرفتار کر لیا تھا جن میں راجو اور ماکھا بھی شامل تھے۔ ان تمام دستور شکن عناصر کو میں نے قرار واقعی سزا دلوانے کے لیے پورا زور لگا دیا تھا اور مجھے اس کام میں صد فیصد کامیابی بھی حاصل ہوئی تھی لیکن اس معاملے کے نمٹ جانے کے بعد بھی کئی دن تک چمن شاہ اداس رہا۔
''کیا بات ہے شاہ جی؟'' ایک روز میں نے اس سے پوچھ ہی لیا۔ ''لگتا ہے آپ کو کانا جما اور اس کے بندوں کے عبرتناک انجام سے خوشی نہیں ہوئی؟''
''ایسی بات نہیں ہے ملک صاحب!'' وہ بجھے ہوئے لہجے میں بولا۔
میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ ''پھر کیسی بات ہے؟''
''ان مردود ڈاکوؤں کے انجام سے تو میں بہت خوش ہوں ملک صاحب!'' وہ ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''لیکن میرا آئیڈیا بیچ میں ہی رہ گیا۔''
''آپ پسی ہوئی مرچوں والے آئیڈیا کی بات کر رہے ہیں شاہ جی؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔
اس نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔
''شاہ جی! دل چھوٹا کرنے کی ضرورت نہیں۔'' میں نے تشفی بھرے لہجے میں کہا۔ ''یہ دنیا ''عبرت سرائے دہر'' ہے۔ یہاں پر ایک سے بڑھ کر ایک دستور شکن پیدا ہوتا رہے گا۔ ان شاء اللہ بہت جلد آپ کے آئیڈیے کو آزمانے کا موقع بھی نکل آئے گا۔''
جواب میں چمن شاہ کے ہونٹوں پر توانا اور معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ میں سمجھ گیا کہ اس کا موڈ بحال ہو چکا ہے۔

(تحریر: حسام بٹ)

pklibrary.com

پُراسرار مردہ

شاہد لطیف

علم کوئی بھی ہو... نفع بخش یا نقصان کا سبب بننے کے لیے... اس کے استعمال کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں... وہ جو انتہائی خطرناک رستے پر چل نکلا تھا۔ انسانی زندگی سے کھیلنا اس کے لیے اب بائیں ہاتھ کا کھیل بن گیا تھا مگر اسے خبر ہی نہیں ہو پائی کہ کب یہ کھیل نہ صرف بائیں ہاتھ سے دائیں ہاتھ میں منتقل ہوا بلکہ اس نے انجام کے ساتھ ساتھ اپنا راستہ بھی بدل ڈالا۔

ایک مردے کی پراسرار سرگرمیوں کا خوفناک احوال

آکسفورڈ کی پرانی عمارت کے ایک مخصوص حصے کے ایک کونے میں ایک بہت قدیم کنگرہ ہے۔ کھلے دروازے پر پھیلی بھاری محراب، گئے زمانوں کے سرد و گرم کا وزن اٹھائے تھک کر نیچے کی جانب جھک گئی ہے۔ دروازے سے ایک پتھر کا بنا زینہ اوپر کی جانب گھومتا ہوا جاتا ہے۔ یہ اوپر کی دو منزلوں کو جانے کا راستہ تھا جو تیسری منزل پر ختم ہوتا ہے۔ صدیوں سے علم کے متلاشی طلبا ان پتھر کی سیڑھیوں پر دن میں نہ جانے کتنی مرتبہ چڑھتے اترتے رہتے ہیں کہ یہ جا بجا چلنے

سے گھس چکی تھیں۔

یہ مئی 1884ء کی بات ہے۔ تین نوجوانوں کو رہائش الاٹ ہوئی جو اسی مذکورہ عمارت کی علیحدہ منزلوں پر واقع تھی۔ ہر اپارٹمنٹ بیٹھنے کے کمرے اور سونے کے کمرے پر مشتمل تھا جبکہ گراؤنڈ فلور پر دو کمرے تھے۔ ایک کوئلے کا گودام اور دوسرا ملازم کے لیے۔ یہاں ان تین نوجوان طلبا کا مشترکہ ملازم ٹام رہتا تھا۔

عمارت کے دائیں اور بائیں کلاس روم اور مختلف دفاتر کی قطار تھی۔ اس پرانے کنکرہ میں رہنے والے ایک خاص خلوت کا لطف اٹھاتے تھے۔ اب یہاں یہ تین خوش قسمت رہنے آئے۔ اوپر اسمتھ، اس کے نیچے ایڈورڈ اور سب سے نیچے ولیم۔

موسم بہار کی اس روشن رات دس بج رہے تھے۔ اسمتھ کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اسی طرح کی دوسری کرسی پر آتش دان کے قریب اس کے اسکول کا دوست جیف بیٹھا اس سے گپ شپ کر رہا تھا۔ چونکہ شام تک دونوں دریا پر تھے لہٰذا ہلکے گرم کپڑے زیب تن کیے ہوئے تھے۔ یہ دونوں مضبوط اعصاب اور کاٹھی کے مالک تھے۔ جیف ایک اچھا کشتی ران تھا لیکن اسمتھ تو اس سے بھی بہتر کشتی رانی کرتا تھا مگر امتحانات نے ان کی تقریباً تمام ہی سرگرمیوں کو متاثر کر رکھا تھا۔ ان کی بھی عجب ہی کہانی تھی۔ ایک طرف تو میز پر طب کی کتابیں اور انسانی ہڈیوں کے مصنوعی نمونے بکھرے پڑے تھے تو دوسری جانب مینٹل پیس پر اسکیٹس اور باکسنگ گلوز بھی دونوں کے مزاج کی عکاسی کر رہے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کو بہت اچھی طرح جانتے تھے۔

''تمہارا سے کافی تو پی لو۔'' خاموشی کو توڑتے ہوئے اسمتھ کے منہ سے یہ پہلا جملہ نکلا۔

''نہیں یار! میں تو صرف انسانی کھوپڑی کے ماڈل کے لیے آیا تھا۔ تم پی لو۔'' جیف نے کہا۔

''نہیں، میں نے کچھ دیر قبل چائے پی تھی۔''

اس پر جیف نے سر کو اثبات میں جنبش دی اور پھر دونوں پہلے کی طرح خاموشی کی دنیا میں واپس چلے گئے۔

''ویسے اسمتھ.....!'' جیف نے پوچھا۔ ''کیا تم نے یہاں رہنے والے اپنے ساتھیوں سے کوئی واقفیت بھی پیدا کی؟''

''آتے جاتے بس مسکرا کر سر ہلا دیتے ہیں اور اس سے زیادہ کچھ نہیں۔'' اسمتھ نے جواب دیا۔

''اچھا۔ البتہ میں ان دونوں کے بارے میں تھوڑا بہت جانتا ہوں۔ فی الحال اتنا سن لو کہ ولیم عجیب سا شخص ہے۔ اس کے ساتھ مسائل ہیں۔'' جیف نے کہا۔

''وہ جو دبلا پتلا سا ہے؟'' اسمتھ نے پوچھا۔

''ہاں وہی۔''

''وہ تو شریف آدمی ہے۔ مجھے نہیں لگتا کہ اس میں کوئی عیب ہے۔'' اسمتھ نے کہا۔

''پھر تو تم ایڈورڈ کو جانے بغیر اسے نہیں سمجھ سکتے۔''

''تمہارا مطلب وہ موٹا؟''

''ہاں، وہی تو ایڈورڈ ہے۔''

''کیا وہ شراب نوشی کرتا ہے..... جوا کھیلتا ہے؟'' اسمتھ نے براہِ راست جیف سے نظریں چار کرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ''یار! تم تو لوگوں کی پیٹھ پیچھے برائیاں اور عیب جوئی نہیں کرتے تھے۔ یہ تمہیں آج کیا ہو گیا؟''

''اوہ۔ ظاہر ہے ابھی تم اس سے واقف نہیں ورنہ یہ بات نہیں کرتے۔ اس سے متعلق تو سحر اور جادو کرنے کرانے کی قابلِ ملامت باتیں ہر جگہ کی جاتی ہیں۔ پھر میرا دل بھی گواہی دیتا ہے کہ یہ پراسرار شیطانی معاملات میں خاصا آگے جا چکا ہے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی طے ہے کہ وہ اناڑی یا بے وقوف نہیں..... پھر اس کے بارے میں یہ بھی سننے میں آتا ہے کہ وہ اپنے ہائی اسکول اور کالج کے تعلیمی میدان میں بہترین طلبا میں شمار ہوتا رہا ہے۔''

''طب یا فنون کا میدان؟'' اسمتھ نے سوال کیا۔

''مشرقی زبانیں۔ وہ ان سے خاصا واقف ہے۔ مجھے ایڈورڈ بتا رہا تھا کہ اس کے سامنے ولیم عرب لڑکوں سے یوں گپیں مار رہا تھا جیسے وہ ان ہی میں پیدا ہوا اور پلا بڑھا ہو۔ اس نے قبطیوں سے قبطی، یہودیوں سے عبرانی اور بدوؤں سے عربی زبان میں بات کی۔''

''اچھا یہ بتاؤ کہ تم یہ کیوں کہتے ہو کہ ایڈورڈ کو جانے بغیر ولیم کو نہیں جان سکتے؟'' اسمتھ نے سوال کیا۔

''وہ اس لیے اسمتھ کہ ایڈورڈ کی بہن ولیم کی منگیتر ہے۔ وہ بہت پیاری اور ذہین بچی ہے۔ میں تو ایڈورڈ کے پورے خاندان کو بھی جانتا ہوں۔''

''یار! تم نے تو ایک دم ہی تاش کے پتے دکھا دیے۔ لگتا ہے کسی خاص وجہ سے اس کے خلاف تمہارے اندر بغض بھرا ہوا ہے۔ کیا ولیم میں اس کے علاوہ بھی کوئی عیب ہیں؟'' اسمتھ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''دیکھو اسمتھ! میں تو اس کی بہن کو تب سے جانتا ہوں جب وہ گڑیوں کے ساتھ کھیلتی تھی۔ میں قطعاً نہیں چاہوں گا کہ وہ ایک حیوانی مزاج شخص کے ساتھ زندگی گزارے۔

ارے ہاں، خوب یاد آیا۔ کیا تمہیں اس کا نارٹن کے ساتھ جھگڑا یاد ہے؟''

''نہیں۔ تم ہمیشہ بھول جاتے ہو کہ میں یہاں نیا ہوں۔'' اسمتھ نے جواب دیا۔

''تو پھر سنو۔ یہ پچھلی سردیوں کی بات ہے۔ ہلکی بارش میں دریا کنارے راستے پر کئی ایک لوگ آجا رہے تھے۔ تم جانتے ہی ہو بارش میں کھیتوں اور اس میں جانے کے راستے کیچڑ سے بھر جاتے ہیں۔ خیر، وہیں اس ولیم کا ایک بوڑھی خاتون سے آمنا سامنا ہوگیا۔ اس بدبخت کی حرکت دیکھو کہ اپنی دادی کی عمر کی اس خاتون کو کیچڑ میں دھکا دے دیا۔ وہیں نارٹن نے ولیم کی یہ قبیح حرکت دیکھی اور پھر دونوں میں بحث و تکرار ہوئی جس نے ہاتھا پائی کی صورت اختیار کرلی جسے پھر دیگر راہگیروں نے ختم کرایا۔ اب بھی جب ان دونوں کا آمنا سامنا ہوتا ہے تو ولیم کے چہرے کے تاثرات دیکھنے کے قابل ہوتے ہیں۔''

''یار تم نے عجیب بات سنا دی۔''

''اوہ۔ اب میں چلتا ہوں۔ گیارہ بجنے والے ہیں۔'' جیف یہ کہتا ہوا وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا اور جاتے جاتے کھوپڑی بھی لے گیا۔

جیف کے جانے کے بعد اسمتھ بھی پڑھائی میں مشغول ہوگیا۔ اگرچہ وہ آکسفورڈ میں نیا ضرور تھا لیکن طب کی دنیا میں نیا نہیں تھا۔ وہ گلاسگو اور برلن میں چار سال کام کر چکا تھا۔ بس اس ہونے والے امتحان کے بعد اس کو ڈاکٹریٹ جانا تھا۔ اس میں آگے بڑھنے کی خداداد صلاحیت موجود تھی۔ اسمتھ نے گلاسگو اور برلن میں یونہی نام نہیں کمایا تھا۔ اب وہ یہاں آکسفورڈ میں بھی یہی سب کچھ کرنے پر کمر کس چکا تھا۔

وہ تقریباً ایک گھنٹے پڑھتا رہا جب اچانک ایک تیز اور باریک آواز سنائی دی جیسے کوئی شخص لمبی لمبی سسکاریاں بھر رہا ہو۔ اسمتھ کتاب رکھ کر ہمہ تن گوش ہوگیا۔ اس کے دونوں جانب اور اوپر تو کوئی تھا ہی نہیں۔ ہو نہ ہو یہ آواز یقینی طور پر نیچے کی جانب سے آرہی تھی۔ جی ہاں، وہی پڑوسی جس کے بارے میں ابھی تھوڑی دیر پہلے اس کا دوست جیف ناگوار باتیں کر کے گیا تھا۔ اسمتھ تو اسے محض ڈھیلا ڈھالا، خاموش طبع اور پڑھاکو لڑکے کے طور پر ہی جانتا تھا۔ عجیب بات یہ تھی کہ ان دونوں میں خاموشی کا ایک رشتہ قائم ہوگیا تھا۔ ولیم ایک اچھا لڑکا تھا۔ بس تھوڑا سا اکھڑ اور فنونِ لطیفہ، تخیلات اور ہمدردی کے جذبات سے کوسوں دور۔

اس عجیب و غریب آواز کے بعد مزید کوئی آواز نہیں آئی۔ اسمتھ اپنی کتاب کی جانب متوجہ ہوا ہی چاہتا تھا کہ خاموشی میں ایک کرخت سی چیخ ابھری اور کسی نے بھرائی ہوئی آواز میں رونا شروع کردیا۔ اسمتھ کسی اسپرنگ کے مانند اپنی نشست سے اٹھا اور اس کے ہاتھ سے کتاب گر پڑی۔ وہ مضبوط اعصاب کا مالک تھا لیکن اس خوفناک چیخ میں یقیناً کچھ ایسا تھا کہ اس کا کلیجا منہ کو آگیا۔ کچھ لمحات تو وہ تذبذب کی حالت میں کھڑا رہا پھر جب حواس قدرے قابو میں آئے تو معاملے کی کھوج لگانے کو قدم اٹھایا ہی تھا کہ نیچے سے اوپر اس کے اپارٹمنٹ کی جانب دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی اور اس کا پڑوسی ایڈورڈ ہانپتا کانپتا اس کے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کا رنگ خوف کے مارے لٹھے کی طرح سفید ہو رہا تھا۔

''جلدی نیچے آؤ۔ ولیم ٹھیک نہیں۔'' ایڈورڈ نے بمشکل کہا۔

اسمتھ تیزی کے ساتھ اس کے پیچھے زینے پر نیچے کی جانب بھاگا۔ اپارٹمنٹ میں پہلا کمرا مطالعے کا تھا۔ یہاں داخل ہوتے ہی اسمتھ تو ششدر رہ گیا۔ یہ تو مطالعے کے کمرے کے بجائے ایک عجائب گھر کا نقشہ پیش کر رہا تھا۔ کمرے کے در و دیوار قدیم مصر اور مشرق کی آثارِ قدیمہ کی عجیب و غریب اشیا سے بھرے ہوئے تھے۔ کمرے کے وسط میں ایک چوکور میز پر کاغذات، بوتلیں اور کھجور کے سوکھے ہوئے پتے رکھے ہوئے تھے۔ ان سب چیزوں کو ایک مصری ممی کے پتھر کے بنے ہوئے مزین تابوت کی جگہ بنانے کے لیے ایک جگہ پر ڈھیر کردیا گیا تھا۔ اُف..... سیاہ اور مرجھائی ہوئی سی ممی خود اپنے کیس سے آدھی باہر تھی۔ اس کے سوکھے ہوئے ہڈی نما بازو میز پر ٹکے ہوئے تھے۔ تابوت کے سرکی جانب کاغذ کا ایک رول موجود تھا۔ اس کی زرد رنگت صدیوں پرانا ہونے کی غمازی کر رہی تھی۔ اس کے عین سامنے کرسی پر کمرے کا مکین ولیم عجیب حالت میں بیٹھا تھا۔ اس کا سر پیچھے کی جانب جھکا ہوا تھا۔ اس کی کھلی آنکھیں خوفزدہ انداز میں سامنے کی دیوار پر ٹنگے مگرمچھ کے ممائے ہوئے سر کو گھور رہی تھیں۔ اس کے ہونٹ نیلے ہو چکے تھے لیکن بظاہر وہ سانس لے رہا تھا۔

''پاخدایا! یہ تو مر رہا ہے۔'' ایڈورڈ نے پریشان ہو کر کہا۔

''نہیں، یہ صرف خوفزدہ حالت میں بے ہوش ہے۔'' مستقبل کے ڈاکٹر اسمتھ نے اطمینان سے بولنا شروع کیا۔ ''یہاں آؤ اور میری مدد کرو۔ اس کے پیر پکڑو، میں اس کے بازو پکڑتا ہوں۔ اسے صوفے پر لے چلو۔''

اسمتھ نے اس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے اور کچھ اس کے ہونٹوں سے لگایا۔

''اب بتاؤ، مسئلہ کیا تھا؟'' اسمتھ نے سوال کیا۔

''مجھے اس بارے میں کچھ علم نہیں۔ میں نے تو چیخیں سنیں اور دوڑتا ہوا اس کے اپارٹمنٹ میں آیا۔ سامنے یہ سین تھا۔ اب تمہارا یہاں آنا بہت اچھا ہوا۔'' ایڈورڈ نے جواب دیا۔

اسمتھ نے بے ہوش ولیم کے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ''اس کا سینہ تو دھونکنی کی طرح چل رہا ہے۔ یہ خوف کا شکار ہے۔ اس کے منہ پر پانی کے اور چھینٹے مارو۔''

اس کی سرمئی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں جن میں پھیلی ہوئی پتلیاں واضح طور پر ایک ہی سمت میں دیکھتے ہوئے گویا خوف سے پتھرا چکی تھیں۔

''میری سمجھ سے باہر ہے کہ آخر کس چیز نے اس کو اس قدر حواس باختہ کر دیا؟'' اسمتھ نے سوال کیا۔

''اس ممی نے۔'' ایڈورڈ نے میز پر پتھر کے مزین تابوت اور ممی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

''وہ کیسے؟''

''مجھے معلوم نہیں۔ میں تو اتنا جانتا ہوں کہ یہ اس کے ساتھ پہلی مرتبہ نہیں ہوا ہے۔ گزشتہ سردیوں میں بھی تقریباً ایسا ہی ایک سین ہوا تھا۔ یہی ممی تھی اور کم و بیش یہی منظر۔'' ایڈورڈ نے کہا۔

''آخر وہ اس ممی سے کیا چاہتا ہے؟'' سر کھجاتے ہوئے اسمتھ نے پوچھا۔

''تمہیں کیا معلوم کہ وہ سنکی ہے۔ قدیم مصر کے اسرار اس کا مشغلہ ہے۔ کاش وہ اب بھی ان خرافات سے باز آجائے۔ ارے وہ دیکھو۔ یہ تو ہوش میں آرہا ہے۔''

اس کا جسم بتدریج پُرسکون ہونے لگا۔ اس نے اپنی پلکیں جھپکائیں۔ دو چار لمبے لمبے سانس لے کر اپنے سر کو ایک جھٹکا دے کر اپنے سامنے کھڑے دونوں افراد کو پہچاننے کی کوشش کرنے لگا۔ جیسے ہی اس کی نظر ممی پر پڑی ویسے ہی وہ صوفے سے اچھل پڑا۔ تابوت کے قریب رکھا ہوا صدیوں پرانا کاغذ کا رول اٹھایا اور میز کی دراز کھول کر اسے رکھ کر قفل لگا دیا۔ یہ سب کچھ اس قدر تیزی سے کیا کہ قفل کی چابی بھی صوفے پر گر گئی۔

''تم دونوں یوں میرے کمرے میں کیوں آئے ہو..... کیا مقصد ہے؟'' الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے والی بات کرتے ہوئے ولیم نے اسمتھ اور ایڈورڈ کو مخاطب کیا۔

''تم اس بُری طرح سے چیخ و پکار کر رہے تھے کہ گویا آسمان سر پر اٹھا رکھا ہو۔'' ایڈورڈ نے جواب دیا۔ ''اگر اوپر والے اپارٹمنٹ سے ہمارا پڑوسی، یہ ہونے والا ڈاکٹر اسمتھ نہ آتا تو نہ جانے تمہارا اب تک کیا حشر ہو چکا ہوتا۔ میں تو اس سلسلے میں کچھ بھی نہیں کر سکتا۔''

''اوہ، اسمتھ یہ تم ہو۔'' ولیم نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ''بھئی میں تمہارا مشکور ہوں۔ میں بھی کیسا احمق ہوں۔ اوہ خدایا۔'' اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا اور پاگلوں کی طرح قہقہے لگانے لگا۔

''ارے چھوڑو یہ سب۔ میری طرف دیکھو۔'' اسمتھ نے اس کے کاندھے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے اعصاب اس وقت قابو میں نہیں۔ تمہیں ممیوں کے ساتھ کھیل کود چھوڑنا ہوں گے ورنہ تم ہوش و حواس سے جاتے رہو گے۔ ایک آدھ ایسا اعصابی جھٹکا اور لگا تو جان سے جاؤ گے یا پاگل خانے۔''

''چھوڑو، تمہیں بھلا کیا پتا۔ اسے دیکھنے کے بعد بھی میں اس وقت جتنا پُرسکون ہوں اگر تم نے اسے دیکھا ہوتا تو نہ جانے تمہارا کیا حال ہوتا۔'' ولیم کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

''کیا دیکھا ہوتا..... تمہارا دماغ تو ٹھکانے پر ہے..... تم کس کے دیکھے جانے کی بات کر رہے ہو؟'' اسمتھ نے کہا۔

''اوہ۔ کچھ نہیں۔ میں پوچھ رہا تھا کہ کیا تم بھی ممی کے پاس خاموشی سے رات کو بیٹھ سکتے ہو؟ بے شک تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ شاید میں کام کی زیادتی کی وجہ سے اعصابی تناؤ کا شکار ہوں لیکن اب میں بالکل ٹھیک محسوس کر رہا ہوں۔ براہِ کرم ابھی مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ۔ چند منٹ اور..... تب تک میں اور بہتر ہو جاؤں گا۔''

''تمہارے اس کمرے کی کھڑکی نہ جانے کب سے بند ہے۔ تازہ ہوا نہ آئے تو اچھے خاصے آدمی کے اعصاب جواب دے جاتے ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے اسمتھ نے بند کھڑکی کھولی اور رات کی ہوا کا جھونکا اندر آیا۔

''یہ درختوں کی خوشبو ہے۔'' ولیم نے کہا پھر اس نے میز پر سے مجور کے سوکھے ہوئے پتوں میں سے ایک کو اٹھایا اور چراغ کی چمنی پر خم دار کر کے جھکا دیا۔ یکدم موٹے پردے کے مانند کثیف دھواں کمرے میں جمع ہو گیا۔ ساتھ ہی ایک تیز اور ناگوار بو پھیل گئی۔

''یہ مقدس پودا ہے جو پادری کا پودا بھی کہلاتا ہے۔'' بات کو جاری رکھتے ہوئے ولیم کہنے لگا۔ ''اسمتھ! کیا تم قدیم مصری یا مشرق کی زبانوں سے واقفیت رکھتے ہو؟''

اسمتھ نے میز کی جانب قدم بڑھایا اور ایک پیشہ ور ڈاکٹر کی نظر سے سیاہ ممی کو دیکھا۔ ممی کے خدوخال اگرچہ اپنی اصل رنگت کھو چکے تھے۔ دو چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں گہرائی جھلک رہی تھی۔ داغدار جلد ہڈیوں پر مضبوطی سے منڈھی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ اس کے موٹے سیاہ الجھے ہوئے بال اس کے کانوں پر گرے ہوئے تھے۔ چوہے کے باریک دانتوں کی طرح ممی کے دو دانت نیچے کے مرجھائے اور سکڑے ہوئے ہونٹ کے سامنے واضح تھے۔ ممی جھکی ہوئی حالت میں تھی۔ مڑے ہوئے جوڑ اور سارس کے جیسی گردن اور سوکھی ہوئی کمزور پسلیاں جس پر کاغذی غلاف کی طرح منڈھی ہوئی کھال واضح دکھائی دے رہی تھی۔ ممی کے جسم پر لوبان کی طرح کی خوشبودار گوند لگائی گئی تھی۔ اس گوند کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ممی کے تابوت میں بھی جا بجا بکھرے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ مجموعی طور پر اس ممی سے توانائی کی لہریں پھوٹ رہی تھیں جس سے اسمتھ بے چین ہو گیا۔

''میں اس کا نام تو نہیں جانتا۔'' ولیم نے ممی کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ''تم دونوں نے دیکھا کہ اس پتھر کے مزین تابوت پر صاحبِ تابوت کے نام کی کھدی ہوئی عبارت کسی اناڑی نے اوزار مار مار کر تباہ کر دی ہے۔ اب تو یہ محض ''لاٹ نمبر 249'' ہے اور اب تابوت پر بھی یہی نام لکھا ہوا ہے۔''

''لاٹ نمبر 249!'' ایڈورڈ اور اسمتھ دونوں بیک وقت بولے۔

''ہاں۔ نیلامی میں یہی اس کا نمبر تھا جہاں سے میں اسے لایا تھا۔''

''کبھی یہ بھی اپنے دور میں ایک اچھا بھلا انسان رہا ہوگا۔'' اسمتھ نے کہا۔

''ممیائی گئی حالت میں بھی اس کا قد چھ فٹ سات انچ ہے۔ اپنی جیتی جاگتی زندگی میں تو یہ واقعی ایک دیو سے کم نہیں ہوگا۔ یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ فراعین مصر کے زمانے میں عام لوگ مضبوط اور تنومند نہیں ہوتے تھے۔ دیکھو اور اس کی ہڈیوں کو بھی محسوس کرو۔ اپنے وقت میں تو اس سے پنگا لینا بھی آسان نہیں ہوتا ہوگا۔'' ولیم نے کہا۔

''شاید ان ہاتھوں نے بھی اہرام کے پتھر ڈھونے میں مدد کی تھی۔'' ایڈورڈ نے طنزاً ممی کے گندے اور ٹیڑھے ناخنوں کو دیکھتے ہوئے نفرت انگیز انداز میں کہا۔

''کوئی ڈر نہیں۔ یہ اس زمانے کا کوئی عام چرواہا نہیں بلکہ یقیناً کوئی اہم شخصیت ہوگا۔ میرے حساب سے فراعین مصر کے زمانے میں اس پائے کے ممیائے جانے کے عمل کے 730 پاؤنڈ بنتے ہیں۔''

''فرعونوں کے زمانے میں اتنی زیادہ رقم؟'' ایڈورڈ نے حیرت سے پوچھا۔

''یہی نہیں میرے دوست! یہ صاحب تابوت ہرگز بھی عام آدمی نہیں۔ یہی سادہ سی بات ہے، کسی بھی زمانے میں عام آدمی کی اوقات عام آدمی کی ہی رہی ہے۔ خیر اسے چھوڑو۔ اسمتھ! تم اس ممی کے تابوت پر پیروں کی جانب کھدے ہوئے نشانوں کے بارے میں کیا کہتے ہو؟'' ولیم نے سوال کیا۔

''میں نے تم سے کہا تو ہے کہ مجھے مصری یا کوئی بھی مشرقی زبان نہیں آتی۔''

خیالات کے اظہار کے دوران اسمتھ اور ایڈورڈ جانے کے لیے اٹھ گئے۔

روٹین کے کام کے دوران بتدریج اسمتھ کو علم ہوا کہ ولیم غیر معمولی یادداشت والا ٹھیک ٹھاک پڑھا کو ہے۔ ملنے جلنے میں اس کا انداز نہایت خوشنما، ملنسار تھا۔ جلد ہی پھر ایک ایسا بھی وقت آیا کہ اس کی شخصیت کے منفی پہلو پیچھے کہیں رہ گئے اور اس کی صحبت ناخوشگوار نہیں لگتی تھی۔ پھر یوں بھی ہوا کہ ولیم اس کے ہاں آنے جانے لگا اور اسمتھ بھی جب پڑھائی میں زیادہ تھک جاتا تو جواباً ولیم کے پاس چلا جاتا۔

بے شک ولیم بلا کا ذہین تھا لیکن کبھی کبھار اپنی گفتگو اور حرکات وسکنات کی وجہ سے میڈیکل کے طالب علم اسمتھ کو اس کے جنونی پن کا علم ہو گیا۔ ایسے ہی ایک موقع پر ولیم نے جذبات کی رو میں کہہ دیا۔ ''دیکھو، یہ کتنی حیرت انگیز بات ہے کہ انسان نیک اور بد طاقتوں کو بلا سکتا ہے..... ایک خدمت گار اور دوسرا سراسر اپنا انتقام۔''

اس طرح اشاروں کنایوں میں کی گئی گفتگو کے دوران دھیمے مزاج کا اسمتھ صرف خاموشی سے اپنی نظریں اٹھا کر سر ہلاتا۔ ولیم میں عجیب بات یہ تھی کہ وہ اکثر دوسروں کی موجودگی میں بھی خود سے باتیں کرتا تھا۔ راتوں کے آخری پہر کی خاموشی میں جب ولیم کے پاس کسی ملاقاتی کے آنے کا کوئی امکان نہیں ہو سکتا، ایسے میں اسمتھ کو ہلکی آواز میں ولیم کی سرگوشیوں میں ڈوبی خود کلامی سنائی دیتی۔ اس احمقانہ خود کلامی سے اسمتھ کو پڑھائی پر توجہ مرکوز رکھنا مشکل ہو جاتا۔ اس مسئلے پر اس نے ولیم سے ایک سے زائد مرتبہ بات بھی کی تھی۔ ہر دفعہ اس نے ناگواری کا اظہار کیا اور سرے سے اس الزام ہی کو مسترد کر دیا۔

بات اسمتھ تک رہتی تو بھی غنیمت تھی لیکن ولیم کی اس خود کلامی سے ان کے مشترکہ ملازم کی نیند بھی اجیرن ہو گئی اور

اس نے اسمتھ سے اس بات کی شکایت کردی۔

''ذرا مہربانی فرمائیں ڈاکٹر صاحب! کیا آپ کو لگتا ہے کہ ولیم کی طبیعت ٹھیک ہے؟''

''ہاں، ٹھیک ہے۔ کیوں، اسے کیا ہوا؟''

''مجھے لگتا ہے اس کے دماغ میں کچھ خرابی ہوگئی ہے۔''

''اچھا، تم یہ کیونکر کہتے ہو؟''

''میں زیادہ تو نہیں جانتا لیکن محسوس کررہا ہوں کہ کچھ دنوں سے اس کی عادتیں بدل گئی ہیں۔ خودکلامی کا بھی کچھ سلیقہ ہوتا ہے۔ لوگ اپنی محرومیوں پر باتیں کرتے ہیں لیکن یہ تو بہت خوفناک باتیں کرتا ہے۔ حیرت ہے کہ اس کی خودکلامی سے آپ پریشان نہیں ہوتے۔ سمجھ نہیں آتی کہ میں اس مسئلے کا کیا کروں۔''

''ٹام! میں تمہارے مسئلے کا کیا حل بتاؤں؟''

''دیکھو، میں تم تینوں کا خیال رکھتا ہوں، اس طرح گویا میں تمہارے ماں باپ کی جگہ ہوں۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ جب ولیم اپنے اپارٹمنٹ میں موجود نہیں ہوتا تب وہ کون ہے جو کبھی کبھار اس کے کمرے میں چلتا پھرتا ہے؟ جبکہ وہ تو دروازہ باہر سے بند کرکے جاتا ہے پھر میں بھی تو نہیں ہوتا ہوں، تو میری موجودگی میں کوئی بھلا کیونکر آسکتا ہے؟''

''یہ کیا بے معنی بات کررہے ہو؟'' ٹام کی طرف دیکھتے ہوئے اسمتھ نے حیرت سے پوچھا مگر ٹام کچھ کہے بنا چلا گیا۔

کچھ ہی دنوں بعد ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے اس کے ذہن پر ناخوشگوار اثر چھوڑا۔ ایسے میں اسے بے ساختہ ملازم ٹام کی یہ بات یاد آئی۔ ہوا یوں کہ ایک رات اس کے مطالعے کے کمرے میں ولیم بیٹھا بالائی مصر میں واقع ''بنی حسن'' کے مقابر کے بارے میں ایک دلچسپ واقعہ سنا رہا تھا کہ اچانک اسمتھ جس کی قوتِ سماعت بہت تیز تھی، نے ولیم کے اپارٹمنٹ کا دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی ایک واضح آواز سنی جسے سن کر وہ بے ساختہ بولا۔

''تمہارے اپارٹمنٹ کے اندر یا باہر کوئی ابھی ابھی گیا ہے۔''

ولیم نشست سے اٹھ کر ایک لمحے کو بے بس کھڑا رہا۔ اس کے چہرے پر خوف اور بے یقینی کے تاثرات تھے۔

''میں نے اسے یقینی طور پر قفل لگایا ہے۔ میں نے اسے بند کردیا ہے۔'' اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ ''کوئی بھی اسے کھول نہیں سکتا۔''

''ارے، میں تو اب بھی کسی کے زینے پر اوپر آتی ہوئی چاپ سن رہا ہوں۔'' اسمتھ نے کہا۔

ولیم تیزی سے دروازے سے باہر نکلا اور بھاگتا ہوا زینے پر نیچے کی جانب اپنے اپارٹمنٹ کی طرف بھاگا۔ تقریباً آدھے راستے پر اسمتھ کو یوں لگا جیسے ولیم رک کر کسی سے سرگوشی میں بات کررہا ہو۔ پھر کچھ دیر بعد ولیم کے اپارٹمنٹ کے دروازے کے بند ہونے کی آواز آئی۔ اب پھر کسی کے زینے پر اوپر آنے کی چاپ سنائی دی اور اسمتھ کے کمرے کا دروازہ کھول کر ولیم ماتھے پر پسینے کے قطرے سجائے آن کھڑا ہوا۔

''سب ٹھیک ہے۔'' اس نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''اس احمق کتے نے دروازہ کھول لیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں دروازے کو بند کرنا کیوں بھول گیا۔''

''ارے، کیا تم نے کوئی کتا بھی پال لیا؟'' اسمتھ نے اپنے دوست کے پریشان چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے سوال کیا۔

''اسے رکھے کوئی زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ یہ میں نے خوامخواہ کی پریشانی مول لے لی۔''

''میں تو خود کتوں میں دلچسپی رکھتا ہوں۔'' اسمتھ نے بدستور ولیم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔ ''آؤ میرے ساتھ۔ میں بھی تو دیکھوں تمہارا کتا کون سا ہے؟''

''ہاں، کیوں نہیں لیکن اس وقت نہیں کیونکہ میں نے کسی سے ملنے جانا ہے اور مجھے پہلے ہی دیر ہوچکی ہے۔ معافی چاہتا ہوں۔ اب میں چلتا ہوں۔''

بقول ولیم کے اس کو پہلے ہی دیر ہوچکی تھی پھر بھی اسمتھ نے ولیم کے اپارٹمنٹ کے دروازے کے کھلنے اور پھر بند ہونے اور اندر سے لاک ہونے کی واضح آواز سنی۔

ولیم نے اس سے سفید جھوٹ بولا تھا، وہ بھی اس بھونڈے طریقے سے۔ صاف لگتا تھا کہ وہ کوئی بات چھپانے کو بے تاب ہے۔ اسمتھ کو اچھی طرح علم تھا کہ اس کے پاس کوئی کتا نہیں ہے۔ اسے یاد آیا کہ ٹام نے کہا تھا کہ ولیم کی عدم موجودگی میں کبھی کبھی کبھار اس کے اپارٹمنٹ میں کسی کے چلنے پھرنے کی آواز آتی ہے۔ کیا یہ کوئی عورت ہوسکتی ہے؟ اسمتھ نے اس خیال کو جھٹک دیا کیونکہ کوئی بھی طالب علم ایسا کام کیوں کرے گا جس کی پاداش میں اتنے نامور تعلیمی ادارے سے بے عزتی اور بے دخلی کا سامنا کرنا پڑتا۔ اس کے ساتھ ہی اسمتھ نے مصمم ارادہ کرلیا کہ اب وہ ولیم سے قربتوں کو ختم کردے گا۔

☆☆☆

ابھی اسمتھ نے اپنے ذہن کو پڑھائی کے لیے تیار

کیا ہی تھا کہ آندھی طوفان کی طرح اس کا دوست ہستی مطالعے کے کمرے میں وارد ہوا۔ یہ اسمتھ کے ساتھ کشتی رانی کرتا تھا۔

''تم بھی ایک ہی ہو۔ یہاں آکسفورڈ میں زلزلہ بھی آجائے تو تم یونہی کتابوں میں ہی غرق رہو گے۔ بہرحال میں تمہیں قطعاً بور نہیں کروں گا۔ بس مجھے گھڑی دو گھڑی میں جانا بھی ہے۔''

''پھر کیا نئی تازی ہے؟'' کتاب رکھتے ہوئے اسمتھ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''ہاں، خوب یاد آیا۔ فٹ بال کے ہمارے اچھے کھلاڑی نارٹن کے بارے میں تمہیں پتا چلا؟''

''کیوں، اسے کیا ہوا؟'' اسمتھ نے سوال کیا۔

''اس پر حملہ ہوا ہے۔''

''کیا کہا..... حملہ ہو گیا؟''

''وہ جیسے ہی ہائی اسٹریٹ سے باہر نکل کر مڑا اور ابھی سو گز ہی چلا ہو گا کہ اس پر اچانک ہی حملہ ہو گیا۔''

''حملہ ہو گیا..... مگر کیوں اور کس نے کیا؟'' اسمتھ نے پوچھا۔

''بھئی یہی تو چیستان ہے۔ اس سے بھی زیادہ الجھی ہوئی بات سنو۔ نارٹن قسم کھا کر کہتا ہے کہ حملہ آور انسان نہیں تھا پھر اس کے گلے پر خراشوں سے بھی اس کی بات سچ ثابت ہوتی ہے۔''

''تو پھر کیا اب ہم اس کو بھوتوں کی کارروائی سمجھنے لگیں؟'' اسمتھ نے جواب دیا۔

''نہیں، میں ایسا نہیں سمجھتا۔ لگتا ہے حال ہی میں سرکس والوں کا کوئی بڑا بندر فرار ہو گیا ہے۔ یہ وحشی ہمارے علاقے میں پھر رہا ہے۔ مقامی انتظامیہ کو اس کے خلاف فوری قدم اٹھانا چاہیے۔ تم جانتے ہی ہو کہ روزانہ رات کو نارٹن ایک مخصوص وقت پر اسی راستے سے گزرتا ہے۔ راستے میں باغ کے پاس ایک جھکا ہوا جنگلی درخت بھی ہے۔ نارٹن کا خیال ہے کہ کوئی چیز اچانک اسی درخت سے اس پر گری۔ وہ کہتا ہے کہ مہلت دیے بغیر دو ہاتھوں سے اس کا گلا دبایا جانے لگا۔ وہ ہاتھ پتلی فولادی تاروں کی طرح مضبوط تھے۔ وہ ان دو حیوانی بازوؤں کے سوا اور کچھ نہ دیکھ سکا کیونکہ اس کی گردن فولادی شکنجے میں مسلسل کستی چلی جا رہی تھی۔ کرم ہوا کہ اس کی پکار کے جواب میں باغ کے لوگ فوراً اس کی جانب دوڑے آئے۔ انہیں آتا دیکھ کر وہ حملہ آور یا جو بھی وہ چیز تھی، بلی کی سی پھرتی سے بھاگ کر دیوار کی جانب کود گئی۔ اس پوری کارروائی کے دوران وہ اسے صاف طور پر نہیں دیکھ سکا۔ اس واقعے نے نارٹن کو جھنجوڑ کر رکھ دیا ہے۔''

اس پورے قصے کو اسمتھ نے بغیر بات کاٹے بہت انہماک سے خاموشی سے سنا۔

''ویسے اسمتھ! تمہارا وہ نیچے والا پڑوسی تو یہ کہانی سن کر بہت خوش ہو گا۔ سب ہی جانتے ہیں کہ اسے نارٹن سے نفرت تھی۔ جیسا کہ میں اسے جانتا ہوں وہ اپنے مزاج اور ذات کے خلاف کسی کی چھوٹی سے چھوٹی بات بھی نہیں بھولتا۔''

☆☆☆

دوست کے جانے کے بعد اسمتھ کرسی پر کچھ دیر یونہی ٹیک لگائے بیٹھا رہا پھر اپنی کتابوں کی جانب متوجہ ہو گیا لیکن لاکھ کوشش کے بعد بھی صفحات پر توجہ مرکوز کرنا مشکل ہو گیا۔ اس کا دھیان بار بار نیچے ولیم کے اپارٹمنٹ اور وہاں کے اسرار کی جانب چلا جاتا۔ پھر وہ نارٹن کے لیے ولیم کی رنجش اور اس پر ہونے والے حملے سے متعلق سوچتا رہا۔

''میری پڑھائی کا بیڑہ غرق کر کے رکھ دیا۔'' اسمتھ نے بڑبڑاتے ہوئے کتاب بند کر کے ایک طرف رکھ دی۔ ''اس ولیم نے تو رات کی پڑھائی کا موڈ ہی ختم کر دیا۔''

دس دن تک وہ اپنی پڑھائی میں ایسا مصروف ہوا کہ دن دیکھا نہ رات۔ اس طرح نیچے والے دونوں پڑوسیوں سے بھی کوئی ملاقات نہیں ہوئی۔ ولیم جن اوقات میں اس کے پاس آتا تھا، اسمتھ ان ہی اوقات میں کشتی رانی یا کھیلنے باہر چلا جاتا۔ اس نے ایک آدھ مرتبہ اپنے اپارٹمنٹ کے دروازے پر دستک بھی سنی لیکن ارادتاً جواب نہیں دیا۔ تاہم ایک دوپہر جب وہ زینے سے نیچے جا رہا تھا تو ولیم کے اپارٹمنٹ سے چند قدم اور پر ہی اس نے دیکھا کہ ولیم کا دروازہ دھڑ سے کھلا اور ایڈورڈ غصے کی حالت میں تیزی سے باہر نکلا۔ اس کے پیچھے فوراً ولیم بھی شدید غصے کے عالم میں باہر آیا۔

''میں تمہارا دماغ درست کر دوں گا۔''

''کر لو جو کرنا ہے۔ میں نے جو کہا تھا اس کا خیال رکھنا۔ اب دوبارہ ایسا ہوا تو میں بھی تمہیں دیکھ لوں گا۔'' ایڈورڈ نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

''تم نے ویسے وعدہ بھی کیا ہے۔'' ولیم نے کہا۔

''ہاں، میں اپنے وعدے کا پاس رکھوں گا۔ ایوا میری بہن ہے۔ تم جیسے کمینے شخص کی بیوی بننے کا مطلب اپنے ہاتھوں اپنی قبر کھودنا ہے لیکن تم بھی کان کھول کے سن لو۔ وہ وہی کرے گی جو میں چاہوں گا۔ اب میں تمہیں دیکھنا بھی پسند نہیں کروں گا۔'' ایڈورڈ یہ کہتے ہوئے زینے سے اتر گیا۔

اسمتھ کو نہ چاہتے ہوئے بھی یہ گفتگو سننا پڑی۔ وہ اس

جھگڑے میں پڑنا نہیں چاہتا تھا۔ ان دونوں کے درمیان ایک واضح سنگین اختلاف تھا۔ ایڈورڈ اپنی بہن کے ساتھ ولیم کی منگنی ختم کرنے والا تھا۔ اسمتھ کو بھی بخوبی اندازہ تھا کہ اب یہ کہانی ختم ہونا چاہتی ہے۔ ایسے شخص کے ساتھ اس بے چاری کا زندگی گزارنا ایک ڈراؤنا خواب ہی ہوتا۔ اسمتھ سوچتے ہوئے زینہ اتر گیا کہ ولیم سے کیا گیا وہ کون سا وعدہ ہوسکتا ہے جس کے بارے میں دونوں غصے کے عالم میں بات کررہے تھے۔

☆☆☆

وہ اتوار کا دن تھا۔ طلبا جوق در جوق کشتی رانی کے مقابلے دیکھنے دریا کی جانب جارہے تھے۔ مئی کے مہینے کا سورج چمک رہا تھا۔ راستے کے دونوں جانب جنگلی درخت سایہ کیے ہوئے تھے۔ چونکہ اسمتھ خود بھی کشتی رانی کرتا تھا لہٰذا مناسب جگہ منتخب کرکے بیٹھ گیا۔ وہ ابھی بیٹھا ہی تھا کہ کسی نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ اس نے دیکھا کہ وہ ایڈورڈ ہے۔

''میں نے تمہیں وہاں ولیم کے اپارٹمنٹ کے پاس دیکھا تھا۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔ ''میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ آؤ، سامنے چائے پیتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔ تھوڑی دیر تمہارے ساتھ چلتا ہوں لیکن تم جانتے ہی ہو میرا کشتی رانی کا دوست ہسٹی بھی مقابلے میں ہے اور میں اسی کے لیے یہاں آیا ہوں۔''

''بھئی وہ میرا بھی دوست ہے۔ آؤ، زیادہ وقت نہیں لوں گا۔'' دونوں چائے خانے میں ایک طرف بیٹھ گئے۔ کشتی رانی کے مقابلوں کی وجہ سے اکّا دُکّا لوگ ہی یہاں موجود تھے۔

''دیکھو اسمتھ! اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو اپنا اپارٹمنٹ چھوڑ کر فوراً کہیں اور منتقل ہوجاتا۔''

''اچھا۔'' اسمتھ نے چائے کا کپ ہاتھ میں لیے ایڈورڈ کو بغور دیکھا۔

''یہ ہے تو عجیب بات لیکن میں کیے گئے وعدے کے مطابق اس کی وجوہات نہیں بتا سکتا لیکن یہ کہہ سکتا ہوں کہ ولیم سے جلد از جلد دور ہوجاؤ۔''

''میں یہاں محفوظ نہیں..... کیا یہ مطلب ہے تمہارا؟''

''مجھے کہنا تو نہیں چاہیے مگر میرا مشورہ مانو اور یہاں سے کہیں اور منتقل ہوجاؤ۔ تم نے زینے پر ہماری بحث سنی ہوگی۔''

''ہاں۔''

''میں کہہ رہا ہوں اسمتھ کہ وہ شخص خوفناک ہے۔ یہی لفظ اس پر درست آتا ہے۔ جس رات وہ بے ہوش ہوا تھا، تمہیں یاد ہے نا جب تم نیچے آئے تھے۔ مجھے اسی وقت شک ہوگیا تھا پھر آج اس نے ایسی ایسی چیزیں بتائیں کہ میرے ہوش اڑ گئے۔ وہ مجھے بھی اپنے ساتھ شامل کرنا چاہتا ہے۔ تم جانتے ہی ہو یہ شیطانی کام کرتا ہے اور میرا تعلق ایک پادری گھرانے سے ہے۔ خداوند کا شکر ہے کہ بروقت مجھے ان خرافات کا پتا لگ گیا ورنہ تو اس کی ہمارے خاندان میں شادی ہونے والی تھی۔''

''ایڈورڈ! ٹھیک ہے، لیکن جو تم نے وہاں دیکھا اور کہا وہ بہت کم ہے۔ بات تو اس سے بھی آگے کی ہے۔'' اسمتھ نے عجیب جواب دیا۔

''میں تمہیں پھر تنبیہہ کرتا ہوں۔''

''انتباہ کی کوئی ٹھوس وجہ ہو تو کوئی وعدہ تمہیں نہ بتانے پر پابند نہیں کرسکتا۔ اگر میں کسی دہشت گرد کو دہشت گردی کرتے دیکھتا ہوں تو اس کو روکنے کے لیے میری راہ میں کوئی عہد یا کیا گیا وعدہ نہیں آئے گا۔''

''آہ..... لیکن میں اسے روک نہیں سکتا اور تمہیں خبردار کرنے کے سوا کچھ نہیں کرسکتا۔''

''بھئی خبردار کس چیز سے کررہے ہو؟ کیا ولیم سے؟ یہ بچکانہ بات ہے۔ میں اس سے یا کسی سے بھی آخر کیوں ڈروں؟''

''کہا تو ہے کہ میں وجہ نہیں بتا سکتا، محض التماس ہی کرسکتا ہوں کہ اپنا ٹھکانا کہیں اور کرلو۔ تم اس جگہ بہت خطرے میں ہو۔ میں یہ بھی نہیں کہتا کہ ولیم تمہیں کوئی نقصان پہنچائے گا لیکن یہ ہوبھی سکتا ہے کیونکہ وہ آج کل بھتے سے اکھڑا ہوا ہے۔''

''شاید میں اس سلسلے میں اس کے علاوہ بھی جانتا ہوں۔'' اسمتھ نے نرم آواز میں کہا۔ ''کیا تم جانتے ہو کہ ولیم کے کمرے میں اس کے علاوہ بھی کوئی رہتا ہے؟''

یہ سنتے ہی ایڈورڈ اپنی نشست سے یکدم اچھل کر اٹھ کھڑا ہوا۔

''بیٹھو، بیٹھو۔ ایسی بھی کیا جذباتیت۔''

''کوئی عورت ہے؟''

''میرے ہونٹ بند ہیں۔ میں کوئی لب کشائی نہیں کرسکتا لیکن اس کا تو کوئی امکان نہیں کہ میں کسی خوف سے اس اپارٹمنٹ سے چلا جاؤں جو میرے لیے ہر لحاظ سے مناسب ہے۔ میں اتنا بھی گیا گزرا نہیں کہ اپنا اسباب و اثاثہ اٹھائے نقل مکانی کرجاؤں.....'' یہ کہتے ہوئے اسمتھ وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا۔

☆☆☆

pklibrary.com

کافی عرصے سے یہ اسمتھ کا معمول تھا کہ ہفتے میں دو دن منگل اور جمعے کو وہ فارلنگ فورڈ میں واقع ڈاکٹر پیٹرسن کے گھر پیدل جاتا۔ یہ آکسفورڈ سے میل ڈیڑھ میل کے فاصلے پر تھا۔ ڈاکٹر پیٹرسن، اسمتھ کے بڑے بھائی فرانسس کا دوست تھا۔ ان کے ہاں ایک بہترین لائبریری بھی تھی۔ یہاں گپ شپ کے علاوہ علم طب کی تازہ ترین پیشرفت اور جدید سرجری پر بھی بات ہوتی۔

کشتی رانی کے مقابلے والے روز ایڈورڈ سے گفتگو کے بعد رات سوا آٹھ بجے اسمتھ حسب معمول ڈاکٹر پیٹرسن کے ہاں جانے کے لیے نشست سے اٹھنے ہی لگا تو اس کی نظر ایک کتاب پر پڑی جو ولیم نے پڑھنے کے لیے دی تھی۔ اس کے ضمیر نے ابھی تک وہ واپس نہ کرنے پر ملامت کی۔ ولیم خواہ کتنا ہی نفرت انگیز کیوں نہ ہو، اس کے ساتھ بدتہذیبی کا کوئی جواز نہیں لہٰذا اس نے مذکورہ کتاب اٹھائی اور پڑوسی کے اپارٹمنٹ کے دروازے پر دستک دی۔ کوئی جواب نہیں آیا البتہ دستک دینے سے دروازہ جو شاید پہلے ہی صرف بھڑا ہوا تھا، تھوڑا سا کھل گیا۔ یہ سوچ کر اسمتھ خوش ہوگیا کہ ولیم کی فضولیات سننے سے جان چھوٹی اور وہ اندر داخل ہوا۔ سامنے میز پر کتاب رکھی اور قریب پڑے کاغذ پر اپنا نام اور شکریہ کی سطور لکھ کر کتاب پر رکھ دیا۔

کمرے کا لیمپ مدھم کر دیا گیا تھا لیکن اسمتھ کو کمرے میں رکھی ہوئی اشیا صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا اس نے پہلے دیکھا تھا۔ وہی دیوار پر کھردرے کپڑے اور جانوروں کے سروں والے دیوتا، مگرمچھ کا سر، میز پر دھرے بے ترتیب کاغذات اور سوکھے پتے۔ ممی کا تابوت دیوار کے سہارے سیدھا کھڑا تھا مگر صاحب تابوت یعنی خود وہ ممی غائب تھی۔ اس نے کمرے کے چاروں جانب غور سے دیکھا مگر کمرے کے دوسرے مکین کا کوئی نشان نہیں ملا۔ اب اسے احساس ہوا کہ اس نے شاید ولیم کے ساتھ ناانصافی کی ہے۔ اگر وہ قصوروار ہوتا تو اپنا راز چھپاتا نہ کہ یوں دروازہ کھول کر چلا جاتا۔

اسمتھ بل کھاتے زینے پر نیچے کی جانب اترنے لگا۔ یہاں گھپ اندھیرا تھا۔ ایسا شاذونادر ہی ہوتا کہ زینے پر روشنی نہ ہو۔ وہ احتیاط سے ایک ایک قدم رکھ رہا تھا۔ اچانک اسے یوں لگا جیسے کوئی وجود تیزی سے گزرا ہو۔ ایک خفیف سی آواز اور ہوا کا جھونکا اس کی کہنی کو چھوتا ہوا گزرا۔ اس نے کچھ دیر مزید رک کر سننے کی کوشش کی مگر پھر ویسی سرسراہٹ سنائی نہیں دی۔

''ٹام! کیا یہ تم ہو؟'' اس نے بلند آواز سے کہا۔

کوئی جواب نہیں آیا۔ ضرور تیز ہوا کا جھونکا ہوگا کیونکہ چھوٹے برج میں جا بجا سوراخ اور شگاف تھے۔ اس کے باوجود وہ قسم کھا سکتا تھا کہ اس نے اپنی جانب بڑھتے ہوئے قدموں کی چاپ سنی تھی۔ ابھی اسمتھ عمارت سے ملحق چھوٹے سے باغ میں سے باہر جانے کو مڑا ہی تھا کہ سامنے سے اس کا دوست ہسٹی دوڑتا ہوا آیا۔

''اسمتھ! کیا یہ تم ہو؟''

''ہاں، کیا ہوگیا ہسٹی؟ کیا پریشانی ہے؟'' اسمتھ نے سوال کیا۔

''خدا کے واسطے فوراً آؤ۔ ایڈورڈ ڈوب گیا۔ مقامی ڈاکٹر دستیاب نہیں۔ اب تمہیں ہی سب کام کرنا ہیں۔ آؤ، ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔''

''کیا تمہارے پاس برانڈی ہے؟''

''نہیں۔''

''ٹھہرو میں لاتا ہوں۔ میرے پاس بوتل میں ہے۔''

اسمتھ تقریباً تین سیڑھیاں ایک وقت میں پھلانگتا ہوا اپنے اپارٹمنٹ میں آیا۔ جب وہ بوتل لیے ولیم کے اپارٹمنٹ کے دروازے کے سامنے سے گزرا تو اس کی نظر اچانک جس شے پر پڑی اس سے وہ تقریباً منجمد ہی ہوگیا۔ وہ دروازہ جو اس نے خود اپنے ہاتھوں سے بند کیا تھا، وہ اب کھلا ہوا تھا۔ اس کے عین سامنے لیمپ کی روشنی میں ممی کا تابوت دیوار کے سہارے کھڑا تھا۔ ابھی چند منٹ قبل وہ خالی تھا۔ اسمتھ اس بات کی قسم کھا سکتا تھا..... اور اب..... اب اس میں وہ اکڑی ہوئی غیر متحرک اور بے جان سیاہ ممی دروازے کی جانب رخ کیے موجود تھی۔ اسمتھ کو ایسے لگا کہ جیسے اس میں اب کبھی زندگی کی رمق موجود ہے۔ اسمتھ انگشت بدنداں رہ گیا۔ نہ جانے کتنی گھڑیاں بیت گئیں جب ہسٹی کی پکار سے یہ سحر ٹوٹا اور اسمتھ بگٹٹ نیچے بھاگا۔

''جلدی کرو اسمتھ! یہ زندگی اور موت کا معاملہ ہے۔'' ہسٹی جوش سے بولا۔ ''تیز دوڑو۔ ایک میل سے کم کا فاصلہ ہے۔ ہمیں یہ پانچ منٹ میں طے کر لینا چاہیے۔''

ایک انسانی زندگی بچانے کے لیے وہ دونوں جتنا تیز ممکن تھا، دوڑے اور دریا کے کنارے کانیج میں پہنچ گئے۔ ایڈورڈ پانی کے پودے کے مانند صوفے پر دراز تھا۔ اس کے سیاہ بالوں میں دریا کے کناروں کی سبز کائی جا بجا لگی ہوئی تھی۔ ہونٹ سوج کر نیلے ہوگئے تھے۔ گھٹنوں کے بل اس کا ساتھی ہرنگٹن بیٹھا اس کے پیروں کی مالش کر رہا تھا۔

''میرے خیال میں ہمارا ساتھی زندہ ہے۔'' اسمتھ نے کہا۔ ''اپنی گھڑی کا شیشہ اس کے ہونٹوں کے اوپر رکھو۔ دیکھو یہ ہلکا سا دھندلا ہوا ہے۔ ہسٹی! تم اس کا ایک بازو پکڑو اور جو میں کروں ویسا ہی تم بھی کرنا۔ یہ ٹھیک ہو جائے گا۔''

دس منٹ تک وہ خاموشی سے کام کرتے رہے۔ بے ہوش ایڈورڈ کے سینے کو زور سے دباتے اور چھوڑتے۔ کچھ دیر میں اس کا جسم کپکپایا اور ہونٹ بھی کپکپائے پھر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ ہسٹی، ہرنگٹن اور اسمتھ تینوں کے چہرے خوشی سے کھل اٹھے۔

''اب اٹھ جاؤ۔ تم نے تو ہماری جان ہی نکال دی تھی۔ لو تھوڑی سی برانڈی پی لو۔'' اسمتھ نے یہ کہتے ہوئے بوتل سے کچھ برانڈی ایڈورڈ کے ہونٹوں سے لگائی۔

''یہ ابھی پورے حواسوں میں نہیں۔'' ہرنگٹن نے کہا۔

''ارے بتاؤ تو سہی یہ دریا میں ڈوبا کیسے؟ ایڈورڈ تو انعام یافتہ تیراک ہے۔'' اسمتھ نے تشویش ظاہر کی۔

''ہم دونوں دریا کنارے بیٹھے پڑھ رہے تھے کہ ایڈورڈ تازہ دم ہونے کے لیے ٹہلنے لگا۔ میرا دھیان کتاب پر تھا۔ مجھے علم نہیں کہ اصل میں ہوا کیا۔ بس پانی میں زوردار چھپاکے اور ایڈورڈ کی چیخ و پکار سنائی دی۔ میں اس سمت دوڑا اور اسے ڈھونڈ کر باہر نکالا۔ اسی اثنا میں ہسٹی بھی آ گیا۔ میرے دماغ میں جو پہلا خیال آیا وہ تمہارا تھا لہٰذا پھر ہسٹی کو تمہاری طرف دوڑا دیا۔ تم لوگوں کے بغیر میں کیا کر سکتا تھا۔ شکر ہے اب یہ بہتر حالت میں ہے۔''

ایڈورڈ اپنے بازوؤں کے سہارے اٹھ کر بیٹھ گیا اور اپنے آپ کو دیکھنے لگا۔

''ہاں، میں پانی میں تھا۔ یہ مجھے یاد ہے۔'' اس کی آنکھوں میں خوف کی واضح جھلک آئی اور اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا۔

''تم گر کیسے گئے تھے؟ پھر گر بھی گئے تو کون سی بڑی بات ہو گئی۔ تم تو خود ایک بہترین تیراک ہو؟''

''میں نہیں گرا تھا۔''

''تو پھر کیا ہوا تھا؟''

''مجھے دریا میں پھینکا گیا تھا۔ میں تو کنارے کنارے ٹہل رہا تھا کہ اچانک پیچھے سے کسی نے مجھے ہلکے پھلکے روئی کے گالے کی طرح سے اٹھا کر پانی میں پھینک دیا۔ اتنی زبردست قوت کے ساتھ کہ میں تو ادھ موا ہو گیا۔ نہ میں نے کچھ سنا نہ ہی کچھ دیکھا لیکن ایک بات بتا دوں اسمتھ کہ مجھے علم ہے کہ وہ کیا تھا۔''

''میں بھی جانتا ہوں۔'' اسمتھ نے سرگوشی کی۔

''تو تمہیں علم ہو ہی گیا۔ تمہیں میرا مشورہ یاد ہے نا؟'' ایڈورڈ نے اسمتھ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں تمہارے مشورے پر عمل کرنے کا بھی سوچ رہا ہوں۔''

''مجھے معلوم نہیں کہ تم لوگ کس شیطان کی بات کر رہے ہو۔'' ہسٹی نے کہا۔ ''مگر پہلے ایڈورڈ کو تو آرام سے لٹا دو۔ یہ بحث بعد میں ہوتی رہے گی کہ کس نے اور کیوں دھکا دیا۔ اب ہم چلتے ہیں۔''

راستے میں کیا گفتگو ہوئی، وہ اسمتھ کو یاد نہیں کیونکہ اس کا ذہن تو شام کے واقعات میں الجھا ہوا تھا۔ ولیم کے کمرے سے ممی کا غائب ہونا، اندھیرے زینے پر اس کو چھوتے ہوئے کسی وجود کا تیزی سے اوپر جانا، ممی کا پراسرار اور ناقابل تشریح طریقے سے اپنے نابوت میں واپس پایا جانا..... پھر ایڈورڈ پر دوسرا ناگہانی حملہ جس سے ولیم کھلے عام عداوت رکھتا ہے۔ پھر خود ولیم کا ممی سے خوفزدہ ہو کر بے ہوش ہو جانا۔ اسمتھ کے ذہن میں جو شبہ مبہم خیال کی صورت میں تھا، اب یقین میں تبدیل ہوتا نظر آتا تھا۔ اس کے پاس ایسے دلائل تھے جن کا اب جھٹلانا ممکن نہیں تھا۔ ایک ایسا خطرناک انسانی تجربہ کیا جا رہا تھا جس کا سوچ کر ہی سردی میں بھی اسمتھ کو پسینا آ گیا۔ اب کوئی شک و شبہ نہیں رہ گیا کہ ولیم کے روپ میں قاتل گھوم رہا ہے اور یہ کہ اس نے ایسا ہتھیار استعمال کیا جس کو جرائم کی تاریخ میں کسی انسان نے کبھی بھی استعمال نہیں کیا۔

☆☆☆

راستے میں ہسٹی نے اسمتھ سے کوئی بات کی لیکن جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ اس کا دوست کہیں اور ہی کھویا ہوا ہے۔ جلد ہی وہ مصافحہ کر کے اپنے کمرے کی جانب چلا گیا اور اسمتھ اپنی اپارٹمنٹ بلڈنگ کی طرف بڑھ گیا۔ اب اس نے جلد از جلد اپنا اپارٹمنٹ چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا۔ جب زینے پر ہر آہٹ اور ولیم کے کمرے سے پراسرار سرگوشیوں پر اس کی توجہ مرکوز ہو تو کیا خاک پڑھائی ہو گی۔ جب اس نے چھوٹا سا باغ عبور کیا تو ولیم کے مطالعے کے کمرے کی کھڑکی سے روشنی نظر آ رہی تھی۔ جب اسمتھ اس کے دروازے کے قریب سے گزرنے لگا تو دروازہ کھلا اور ولیم نے باہر جھانکا۔ اس کے چہرے سے یوں لگا جیسے کسی بہت بڑی مکڑی نے ابھی ایک زہریلا جالا بُنا ہو۔

''کیا حال ہے..... کیا اندر نہیں آؤ گے؟''

''نہیں۔'' اسمتھ زور سے پکارا۔

''نہیں..... تم ہمیشہ کی طرح آج بھی مصروف ہو؟ میں

تم سے ایڈورڈ کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا۔ اس سے متعلق افسوسناک افواہیں گردش میں ہیں۔''

اس کے خدوخال سنگین تھے لیکن بولتے ہوئے اس کی آنکھوں میں طنزآمیز ہنسی کی چمک بہت واضح تھی۔ محض اسی بات پر اسمتھ، ولیم کو گھونسا جڑ سکتا تھا۔

''تمہیں تو یہ سن کر بہت افسوس ہوگا کہ ایڈورڈ ہر طرح کے خطرے سے باہر ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''تمہاری جہنمی چالیں اب کی مرتبہ کچھ کام نہ آسکیں۔ ڈھکی چھپی گفتگو کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ میں الف سے ے تک سب جان گیا ہوں۔''

ولیم غصے میں بپھرے اسمتھ سے ایک قدم پیچھے ہٹ گیا اور کسی ممکنہ حملے سے بچنے کے لیے دروازہ آدھا بند کردیا۔

''تم پاگل تو نہیں؟'' اس نے کہا۔ ''تمہارا مطلب کیا ہے؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ میرا اس حادثے سے کوئی تعلق ہے؟''

''ہاں، بالکل ہے۔'' اسمتھ نے گرج کر کہا۔ ''تم اور تمہارے پیچھے تابوت میں رکھا ہڈیوں کا ڈھانچا اس میں ملوث ہیں۔ تم سمجھتے ہو قدیم مصر نے تم جیسے سوختہ لوگوں کو مختار کل بنا دیا ہے۔ مت بھولو کہ ہر دور میں جلاد بھی ہوتے ہیں۔ اب تم بھی کان کھول کر سن لو ولیم! اگر تمہارے آکسفورڈ میں ہوتے ہوئے کوئی شخص بھی غیر معمولی موت سے ہمکنار ہوا تو میں تمہیں چھوڑوں گا نہیں۔ پھر اگر تم پھانسی پر جھول گئے تو مجھے الزام نہ دینا، سمجھے۔ یہ برطانیہ ہے۔ یہاں تمہارے قدیم مصری ٹونے اور چالیں نہیں چلیں گی۔''

''کیا بہکی بہکی باتیں کررہے ہو۔ پاگل تو نہیں ہوگئے؟'' ولیم نے اسمتھ کی طرف منہ کرکے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ میں نے جو کہا وہ یاد رکھنا۔''

اسمتھ غصے میں بھرا اپنے اپارٹمنٹ میں آیا۔ اندر سے دروازہ لاک کیا۔ کیسی پڑھائی؟ کون سی کتاب؟ آدھی رات تک وہ ان عجیب وغریب واقعات پر سوچ بچار کرتا رہا۔

اگلی صبح پڑوسی ولیم کی طرف سے کچھ نہیں سنا لیکن ہرگٹن کی جانب سے پیغام آیا کہ ایڈورڈ اب ٹھیک ہے۔ اسمتھ سارا دن مصروف رہا البتہ شام کو اس نے پروفیسر پیٹرسن سے ملنے کا فیصلہ کیا جہاں اس نے گزشتہ رات جانا تھا۔

ولیم کے اپارٹمنٹ کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس نے دیکھا کہ وہ بند تھا لیکن جب وہ برج سے کچھ فاصلے پر تھا تو اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ لیمپ کی روشنی میں پڑوسی کا سر کھڑکی سے جھانکتے ہوئے نظر آیا۔ وہ کھڑکی کے شیشے سے اپنا منہ لگائے باہر اسی کی جانب دیکھ رہا تھا۔ ایسے شخص کے تمام رابطوں سے دور رہنا خواہ تھوڑی دیر کے لیے بھی ہو، اسمتھ کے لیے نعمت تھی۔ بہار کی آمد آمد تھی۔ اسمتھ نے تازہ ہوا کے گہرے گہرے سانس لیے۔ کچھ ہی دیر میں وہ آبادی کو پیچھے چھوڑ چکا تھا۔ اب وہ اکیلا اس سڑک پر جارہا تھا جو پروفیسر کے گھر جاتی تھی۔ حال ہی میں پیش آئے واقعات کی روشنی میں وہ محتاط ہوکر تیز رفتاری سے آگے پیچھے دیکھتے ہوئے ایونیو گیٹ پر پہنچ گیا۔ یہاں سے ایک سیدھی سڑک کچھ فاصلے پر واقع فارلنگ فورڈ کو جاتی تھی۔ درختوں کے پتوں کے بیچ میں سے پروفیسر کے مکان کی کھڑکیوں سے روشنی آتی بڑی پیاری لگ رہی تھی۔ وہاں پہنچ کر حفظ ماتقدم کے طور پر دائیں بائیں اور پیچھے مڑ کر سڑک کو دیکھا جہاں سے وہ آیا تھا۔ اندھیرے میں واضح طور پر کوئی تیزی کے ساتھ اس کی سمت آرہا تھا۔ چونکہ روشنی ناکافی تھی لہٰذا خدوخال واضح نہیں تھے، بس دور سے حرکت کرتا ہیولا ہی دکھائی دیتا تھا۔ تاریک پس منظر میں آنے والا قدرے جھک کے چل رہا تھا۔ وہ جس رفتار سے آرہا تھا لگتا تھا کہ منٹوں میں اس کے سر پر ہوگا۔ وہی ہوا۔ آنے والا تقریباً نزدیک آچکا تھا۔ اندھیرے میں اسے ایک کھردری اور لاغر گردن اور دو خوفناک آنکھوں کی جھلک نظر آئی۔ ایک دہشت ناک چیخ مارتے ہوئے وہ مڑا اور پروفیسر کے مکان کی سمت سر پر پاؤں رکھ کر بگٹٹ بھاگا۔ وہ کشتی رانی اور دوڑ کے مقابلوں میں انعامات لیتا رہا تھا لیکن جس قدر تیز وہ اس وقت بھاگ رہا تھا، ویسا وہ کبھی نہیں بھاگا۔

وہ بھاری آہنی دروازہ بند کرکے مکان کی جانب بھاگا تھا لیکن تعاقب میں آنے والے کے دروازہ کھولنے کی آواز آئی۔ دیوانہ وار بھاگتے ہوئے اسے اپنے پیچھے ایک عجیب سی ہلکی آواز سنائی دی۔ بھاگتے ہوئے اس نے جیسے ہی پیچھے مڑ کر دیکھا تو چند گز کے فاصلے پر سیاہ جسم والی کوئی شے کھڑکھڑاہٹ کے ساتھ لمبے پتلے بازو بڑھائے اس پر حملہ آور تھی..... وہ تو قسمت اچھی تھی کہ پروفیسر کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ گولی کی طرح اندر داخل ہوا اور فوراً سے پیشتر دروازہ بند کرکے اندر سے کنڈی لگادی۔ اس کے بعد تو اسے کوئی اور بات سوچنے تک کی ہمت نہ رہی اور سامنے رکھی کرسی پر بیٹھا نہیں بلکہ گر گیا۔

''یاخدایا، اسمتھ! کیا معاملہ ہے؟'' پروفیسر نے مطالعے کے کمرے سے باہر آتے ہوئے پریشانی کے عالم میں پوچھا۔

''مجھے کچھ برانڈی دیجیے۔''

پیٹرسن فوراً ایک گلاس اور برانڈی کی بوتل لے آیا جو

اسمتھ نے وقفے وقفے سے پی کر گلاس خالی کر دیا۔

''خیریت تو ہے؟ تم تو لٹھے کی طرح سفید ہو رہے ہو۔'' پروفیسر نے سوال کیا۔

اسمتھ نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے گلاس میز پر رکھا۔

''اب میں ٹھیک ہوں اور آرام سے بات کر سکتا ہوں۔ میں نے ایسی بے بسی کا پہلے کبھی سامنا نہیں کیا مگر آپ کی اجازت سے میں آج رات یہیں سونا چاہتا ہوں۔ رات کی تاریکی میں اس سڑک پر میں قطعاً نہیں جاؤں گا۔''

''ہاں ہاں، کیوں نہیں۔ میں ابھی تمہارے سونے کا انتظام کرواتا ہوں۔'' پروفیسر نے اسمتھ کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''خیریت تو ہے نا؟''

''ذرا آپ میرے ساتھ اس کھڑکی تک آئیں جہاں سے باہر سڑک کا منظر دکھتا ہے۔ میں چاہتا ہوں آپ بھی وہ دیکھیں جو میں نے دیکھا۔''

دونوں اوپر کے ہال کی کھڑکی پر جا کھڑے ہوئے جہاں سے وہ مکان میں آنے جانے والے راستے کو دیکھ سکتے تھے۔ ہر طرف سکوت طاری تھا۔ درخت چاند کی چاندنی میں نہا رہے تھے اور دور دور تک کوئی ذی روح دکھائی نہیں دیتا تھا۔

''ٹھیک ہے اسمتھ!'' پروفیسر پیٹرسن نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں جانتا ہوں کہ تم ایک پرہیزگار شخص ہو۔ آخر تمہیں کس چیز نے اس قدر خوفزدہ کر دیا ہے؟''

''میں ابھی بتاتا ہوں مگر وہ آخر کہاں گیا ہوگا؟ اپنے گیٹ سے آگے سڑک کا وہ موڑ دیکھیے۔''

''ہاں، مجھے ایک ہیولا محسوس ہو رہا ہے۔ دبلا پتلا اور لمبا...... آخر معاملہ کیا ہے؟''

''میں شیطانی گرفت سے بال بال بچا ہوں۔ آیئے مطالعے کے کمرے میں چلتے ہیں۔ میں وہاں اطمینان سے تمام ماجرا بتاؤں گا۔''

اسمتھ نے ترتیب کے ساتھ ولیم کے ممی کے سامنے بے ہوش ہونے سے 'ابھی گھنٹا بھر پہلے کے خوفناک تجربے تک کے چھوٹے بڑے تمام واقعات بیان کیے۔ بات کو سمیٹتے ہوئے اسمتھ نے کہا۔ ''پروفیسر صاحب! یہ قدیم جادو کا تانا بانا بظاہر خوفناک اور ناقابلِ یقین لگتا ہے لیکن یہ سچ ہے۔''

پروفیسر ڈاکٹر پیٹرسن کچھ دیر خاموشی سے بیٹھے رہے۔ ان کے چہرے پر تذبذب کے تاثرات نمایاں تھے۔

''میں نے ایسی بات اپنی زندگی میں کبھی نہیں سنی۔'' انہوں نے کہا۔ ''تم نے حقائق تو بتلا دیے اب ذرا نتائج کا خلاصہ بھی بتا دو۔''

''آپ اپنے نتائج مجھے بتائیں پروفیسر صاحب!''

''لیکن مجھے تمہارا قیاس سننا ہے کیونکہ یہ بپتا تم پر گزری ہے۔''

''ولیم نے مصری اور مشرقی علوم پر تحقیق کرتے ہوئے کچھ قدیم جادوئی راز پا لیے جس کے ذریعے ایک ممی...... یا ممکنہ طور پر صرف اس ممی کو عارضی طور پر زندہ کیا جا سکتا ہے۔ وہ اس رات یہی مکروہ تجربہ کر رہا تھا جب بے ہوش ہو گیا تھا۔ اگرچہ اس کی توقع تھی لیکن بلاشبہ ممی کو پہلی مرتبہ حرکت کرتا دیکھنے نے اس کے اعصاب کو ہلا کر رکھ دیا۔ مجھے یاد ہے کہ ہوش میں آنے کے بعد اس کی زبان سے جو الفاظ سب سے پہلے ادا ہوئے وہ یہ تھے کہ ''میں کتنا احمق ہوں'' پھر وہ اس قابل ہو گیا کہ ڈرے اور بے ہوش ہوئے بغیر ممی کے معاملات آگے بڑھائے۔ کسی طریقے سے ممی میں توانائی ڈالی جاتی ہے اور وہ حسبِ منشا چل پھر سکتی ہے ورنہ تو وہ محض ایک حنوط شدہ بے جان تھی جو ٹیبل پر یا اپنے تابوت میں پڑی رہتی تھی۔ مجھے لگتا ہے کہ ولیم کے پاس کوئی خاص عمل ہے جس سے وہ ممی کو اپنے تابع کرتا ہے پھر وہ اسے بطور ماتحت استعمال کر سکتا ہے۔ ناقابلِ یقین بات یہ کہ ممی میں ذہانت اور طاقت دونوں ہیں۔ کسی مقصد کے تحت ولیم نے ایڈورڈ کو بھی اس ممی والی بات میں اعتماد میں لیا مگر ایڈورڈ نے صحیح العقیدہ شخص کی طرح اسے کہہ دیا کہ اس مکروہ کام میں اس کا کوئی لینا دینا نہیں۔ اسی لیے ان میں بحث و تکرار ہوئی اور ایڈورڈ نے کہہ دیا کہ وہ اپنی بہن کو اس کا حقیقی روپ بتا دے گا۔ ولیم نے اسے روکنا چاہا اور کسی حد تک اس میں کامیاب بھی ہوا جب اس عفریت کو ایڈورڈ کے پیچھے بھیج کر دریا میں ڈبو دیا۔ اس سے پہلے ولیم نے اپنے شیطانی عمل کو ممی کے ذریعے نارٹن پر بھی آزمایا تھا۔ وہ نارٹن جس سے اسے نفرت تھی...... ممی کو اپنے تابع کر کے اس کے یہ دونوں مکروہ وار سیدھے سیدھے اقدامِ قتل تھے۔ گو کہ ولیم کامیاب نہ ہو سکا لیکن ان کو ٹھکانے لگانے کا پورا پورا انتظام تھا پھر جب میں اس کے مقابل آیا تو اس نے مجھے اپنے لیے خطرہ سمجھا کہ کہیں میں دوسروں کے سامنے اس کا پول نہ کھول دوں۔ یوں اس نے مجھے راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کر لیا۔ چونکہ وہ میری عادات کو جانتا تھا کہ میں کب کب، کہاں کہاں جاتا ہوں۔ اس کے منصوبے میں کوئی خامی نہیں تھی، نہ ہی اپنی جان بچانے میں میری کوئی ذہانت تھی بلکہ یہ تو ''جسے خدا رکھے اسے کون چکھے'' والی مثال ہے ورنہ میں آپ کی دہلیز پر زندہ نہیں ملتا۔ آپ جانتے ہیں کہ میں مضبوط اعصاب کا مالک ہوں۔ جیسا موت کا خوف مجھے آج ہوا ویسا تو میں سوچ

pklibrary.com

بھی نہیں سکتا تھا۔ آج علم ہوا کہ موت کا خوف کس شے کا نام ہے۔"

"دیکھو لڑکے! تم اس معاملے کو ضرورت سے زیادہ سنجیدگی سے لے رہے ہو۔" پروفیسر نے کہنا شروع کیا۔ "یہ تمہارا آخری سال ہے پھر تم ڈاکٹر بن جاؤ گے۔ اعصاب قابو میں رکھو ورنہ تمہارا ہی نقصان ہوگا۔ خواہ دن ہو یا رات آکسفورڈ کی سڑکوں میں نظروں میں آئے بغیر ایسی خوفناک شے کا کھلے عام پھرنا کیونکر ممکن ہوسکتا ہے؟"

"جناب یہ شے دیکھی گئی ہے۔ یہاں فرار ہونے والے ایک بڑے بندر کے خاص و عام میں چرچے ہیں۔ اس ممی کو بندر قیاس کیا جارہا ہے۔ اس کو لوگوں نے دیکھا بھی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ یہ تو واقعات کا ایک حیرت انگیز سلسلہ ہے۔ میرے پیارے دوست! اس کے باوجود تمہارے ہر واقعے کے پیچھے اس کی قدرتی وجوہات تلاش کی جاسکتی ہیں۔"

"میرے اس آج کے واقعے کی بھی؟" اسمتھ نے سوال کیا۔

"یقینی طور پر۔ جب تم میری طرف آنے کے لیے اپنے اپارٹمنٹ سے باہر نکلے تو تمہارے اعصاب بے قابو تھے۔ ایسے میں کوئی کمزور، لاغر، بے گھر نشئی تمہارے پیچھے چوری کی غرض سے آرہا تھا۔ تمہیں بھاگتا دیکھ کر اسے تمہارا پیچھا کرنے کا حوصلہ پیدا ہوگیا۔ باقی کا کام تمہارے خوف اور تخیل نے کر ڈالا۔"

"نہیں پروفیسر صاحب! ایسا قطعاً نہیں۔"

"ایک اور بات..... جب تم نے تابوت کو ممی سے خالی پایا اور اس کے چند لمحے بعد اس میں ممی کو موجود پایا تب لیمپ کا رخ آدھا نیچے تھا پھر تم نے تابوت کو سرسری دیکھا۔ بغور دیکھنے کی کوئی خاص وجہ بھی نہیں تھی۔ عین ممکن ہے کہ یہ ممی پہلے بھی وہیں ہو اور ایک نظر میں تمہیں نظر نہیں آئی ہو۔"

"نہیں، ایسا ممکن نہیں۔" اسمتھ نے جواب دیا۔

"اور پھر ایڈورڈ دریا میں ڈبویا گیا اور نارٹن کا گلا گھونٹا گیا۔ ولیم کے خلاف یقیناً یہ ایک خوفناک الزام ہے۔ اگر تم پولیس مجسٹریٹ کے روبرو یہ بیان دو گے تو وہ تمہارا مذاق اڑائیں گے۔"

"جناب محترم! یہ بات میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ میرے اس الزام کی صداقت کے دلائل میں جب ممی اور پراسرار طریقے سے اس میں محدود وقت کے لیے توانائی واپس لانے کی بات ہوگی تاکہ اس کو اپنے تابع کرکے لوگوں کو قتل کرایا جائے تو کون اس بات پر یقین کرے گا؟ کوئی بھی نہیں۔"

"تو لڑکے پھر یہ معاملہ کہاں اور کیسے حل ہوگا؟" پروفیسر پیٹرسن نے پوچھا۔

"وہ ایسے کہ اب میں یہ معاملہ خود اپنے ہاتھ میں لوں گا۔"

"ہائیں..... کیا کہا، معاملہ اپنے ہاتھ میں لو گے؟"

"میں محسوس کرتا ہوں کہ ایک عوامی ذمے داری مجھ پر عائد ہوتی ہے اور اس کے علاوہ مجھے اپنی حفاظت کے لیے بھی تو کچھ کرنا ہے۔ میں اپنے آپ کو یوں اتنی آسانی سے اس درندے کے ہاتھوں شکار ہونے نہیں دوں گا۔ میں نے تمام پہلوؤں پر کافی سوچ بچار کی ہے کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ سب سے پہلے تو میں آپ کا کاغذ قلم استعمال کروں گا۔ مجھے گھنٹا بھر دے دیجیے۔"

"ہاں ہاں، کیوں نہیں۔ یہ سب سائڈ ٹیبل پر رکھا ہے۔"

اسمتھ کو لکھنے میں کم و بیش سوا گھنٹا لگا اور اس نے کئی ایک صفحات لکھ دیے۔ اس لکھت پڑھت کو قریب رکھی کرسی پر بیٹھے پروفیسر ڈاکٹر پیٹرسن صبر اور تجسس کے ساتھ دیکھ رہے تھے۔

آخر کار اسمتھ اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اطمینان کے ساتھ لکھے ہوئے کاغذات کو ترتیب سے جمع کیا اور آخری صفحہ پروفیسر صاحب کی سائڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔

"برائے مہربانی اس پر بطور گواہ دستخط فرما دیجیے۔" اسمتھ نے کہا۔

"گواہ..... کس بات کا؟"

"میرے دستخط اور تاریخ کے بارے میں۔ اس میں تاریخ سب سے اہم ہے پروفیسر صاحب! اس لیے کہ میری زندگی اسی سے جڑی ہوئی ہے۔"

"دیکھو لڑکے! کیسی باتیں کررہے ہو؟ بہتر ہے کچھ دیر آرام کرلو۔"

"میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ جس وقت آپ اس پر دستخط کریں گے، میں سو جاؤں گا۔"

"لیکن یہ ہے کیا؟"

"یہ سب ان باتوں کا بیان ہے جو میں آج رات آپ کو بتاتا رہا ہوں۔ یہی آپ کی گواہی ہے کہ آپ نے میری تمام باتیں سنی ہیں۔"

"یقیناً۔" پیٹرسن نے اسمتھ کے نام پر دستخط کرتے ہوئے کہا۔ "لو میں نے اپنے دستخط کردیے۔ مگر یہ سب آخر کیوں کیا جارہا ہے؟"

"آپ مہربانی کرکے اسے اپنے پاس رکھیں گے اور اگر مجھے گرفتار کرلیا جائے تو اسے پیش کریں گے۔"

"گرفتار..... کس لیے گرفتار کیا جائے گا؟"

"قتل کے جرم میں..... اور یہ ہو بھی سکتا ہے..... میں ہر صورتِ حال کے لیے تیار رہنا چاہتا ہوں۔ اب میرے لیے صرف ایک ہی راستہ باقی رہ گیا ہے اور میں اس پر عمل کرنے کے لیے پُرعزم ہوں۔"

"قتل کے ناخن لو۔ جلد بازی سے کام نہ لو۔"

"مجھے قوی امید ہے کہ آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں پڑے گی لیکن یہ جان کر میرے دل کو سکون ملے گا کہ آپ کے پاس ایک دستاویزی ثبوت ہے کہ میرے کسی بھی قدم کے پیچھے اصل محرکات کیا تھے اور اب میں آپ کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے آرام سے سونے جا رہا ہوں کیونکہ صبح میں نے جو کام کرنے ہیں ان کے لیے میرا ہشاش بشاش ہونا انتہائی ضروری ہے۔"

اس نے اپنی پڑھائی کو ایک دن کے لیے چھوڑ دیا تھا لیکن اس کا ارادہ تھا کہ یہ دن بھی ضائع نہیں جائے گا۔ اس نے اپنے منصوبے کے بارے میں پروفیسر ڈاکٹر پیٹرسن سے ایک لفظ بھی نہیں کہا لیکن صبح نو بجے تک وہ آکسفورڈ کے راستے میں تھا۔

ہائی اسٹریٹ میں وہ مشہورِ زمانہ گن شاپ "کلف فورڈ" کے پاس رکا اور "سینٹرل فائر" کارتوسوں سمیت ایک بھاری ریوالور خریدا۔ ان میں سے چھ کو ریوالور کے چیمبر میں ڈالا اور ہتھیار کا آدھا گھوڑا چڑھا کر کوٹ کی جیب میں رکھ لیا پھر وہ ہسٹی کی طرف گیا جہاں وہ ایک کافی شاپ پر کھڑا کافی پی رہا تھا۔

"آؤ آؤ..... کیا حال ہے؟ کافی پی لو۔"

"نہیں شکریہ۔ ہسٹی! میں چاہتا ہوں کہ ذرا میرے ساتھ چلو اور میں تم سے جو کہوں وہ کرو۔"

"ہاں ہاں، کیوں نہیں۔" ہسٹی نے حسبِ عادت خوشدلی سے جواب دیا۔

"اور ہاں، اپنے ساتھ ایک موٹی تازی چھڑی بھی لاؤ۔"

"یہ کام بھی ہو جائے گا۔ مزید کچھ؟" ہسٹی نے ہنستے ہوئے کہا۔

"تمہارے پاس پوسٹ مارٹم کرنے والے چھری، چاقوؤں کا ڈبا ہے۔ اس میں سے سب سے لمبا چاقو مجھے لا کر دو۔"

"لگتا ہے جنگ کی تیاری پر ہو۔ کچھ اور؟"

"نہیں، بس اس سے کام چل جائے گا۔" اسمتھ نے لمبا چاقو کوٹ کی اندرونی جیب میں طریقے سے رکھا۔ "ہسٹی! ہم دونوں بزدل نہیں۔ میں یہ کام اکیلے بھی کر سکتا ہوں لیکن احتیاطاً تمہیں لے جا رہا ہوں۔ تم باہر ہی کھڑے رہنا۔ مجھے ولیم سے تھوڑی بات کرنا ہے۔ اگر وہ اکیلا ہوتا تو تمہاری ضرورت پیش نہ آتی۔ مجھے قوی امید ہے کہ جب میں اس کے اپارٹمنٹ میں جاؤں گا تو تمام امور نمٹ جائیں گے لیکن اگر تمہیں میری چیخ و پکار سنائی دے تو فوراً دوڑتے ہوئے کمرے میں آنا اور اپنی چھڑی سے ولیم کی دھنائی کر دینا۔ سمجھ گئے نا؟"

"ٹھیک ہے۔ تمہاری چیخ و پکار سنتے ہی میں چھڑی لے کر ولیم کے کمرے میں آ جاؤں گا۔" ہسٹی نے کہا۔

"پھر اگر میری چیخ و پکار سنائی نہ دے تو خواہ مجھے آنے میں دیر بھی ہو جائے، تم ولیم کے کمرے میں نہیں آنا جب تک میں خود تمہارے پاس نہ آ جاؤں۔"

☆☆☆

اسمتھ نے ولیم کے اپارٹمنٹ کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ ولیم اپنی میز کے پیچھے بیٹھا لکھنے میں مصروف تھا۔ کمرے میں اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے سامان میں اب کی مرتبہ بھی سب سے ممتاز نظر آنے والی چیز می کا تابوت ہی تھا۔ اس کا نیلامی نمبر "لاٹ نمبر 249" اب بھی اس کے سامنے والے حصے پر چسپاں تھا۔ اس کے اندر اس کا گھناؤنا، اکڑا ہوا، ہیبت ناک ممی موجود تھا۔ اسمتھ نے جان بوجھ کر اپنے اردگرد دیکھا پھر دروازہ بند کر کے لاک لگا دیا۔ دروازے کے اندر والے تالے کی چابی بھی قبضے میں لے لی پھر آتش دان کے پاس رکھی ماچس سے آگ روشن کر دی۔ ولیم اپنے چہرے پر غصہ سجائے پھولے ہوئے منہ کے ساتھ اسمتھ کو گھورے جا رہا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ اب تم بیٹھ بھی چکو۔" ولیم بولا۔

اسمتھ اطمینان سے چل کر ولیم کے مقابل بیٹھ گیا۔ اپنی گھڑی اتار کر میز پر رکھی۔ ریوالور نکال کر اس کا گھوڑا کلک کر کے پورا چڑھایا اور اپنی گود میں رکھ لیا پھر اس نے پوسٹ مارٹم میں استعمال ہونے والا لمبا چاقو کوٹ کی اندرونی جیب سے نکال کر ولیم کے سامنے نیچے پھینک دیا۔

"چلو، اب کام پر لگ جاؤ۔ اور اس ممی کو کاٹ دو۔" اسمتھ نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

"اچھا؟" ولیم حکم کے جواب میں حقارت سے بولا۔

"ہاں، تم نے ٹھیک سنا۔ کہا جاتا ہے کہ تم اتنے چالاک ہو کہ قانون تمہاری گرد کو نہیں پہنچ سکتا لیکن میرے پاس ایک ایسا قانون ہے جو معاملات کو منٹوں میں سیدھا کر دے گا۔ میں تمہیں تنبیہ کرتا ہوں کہ اگر تم نے یہ کام پانچ منٹ کے اندر نہیں کیا تو میں گولی سے تمہارا بھیجا اڑا دوں گا۔"

"کیا تم مجھے قتل کرو گے؟" ولیم آدھا اٹھ چکا تھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"ہاں۔"

"وہ کس لیے؟"

"تمہاری اذیتوں کو روکنے کے لیے۔ ایک منٹ ہو گیا ہے۔"

"آخر میں نے کیا، کیا ہے؟"

"یہ میں بھی جانتا ہوں اور تم بھی جانتے ہو۔"

"یہ تو کھلی دھونس اور غنڈا گردی ہے۔" ولیم نے کہا۔

"دو منٹ ہو گئے۔"

"مگر تمہیں وجہ بتانی چاہیے۔ تم تو پاگل ہو..... ایک خطرناک پاگل آدمی..... میں اپنی ہی چیز اپنے ہاتھوں کیوں تباہ کر دوں؟ یہ تو قیمتی ممی ہے۔"

"تمہیں اسے کاٹنا پھر جلانا بھی ہوگا۔"

"میں ایسا کچھ نہیں کروں گا۔"

"چار منٹ گزر گئے۔"

اسمتھ نے گود میں رکھا ریوالور ہاتھ میں اٹھا لیا اور ولیم کے چہرے کو غضب ناک انداز سے دیکھا۔ جیسے ہی گھڑی کے پانچ منٹ پورے ہوئے اس نے اپنا ہاتھ اٹھایا اور انگلی کو ریوالور کے گھوڑے پر رکھ دیا۔

"اوہ..... یہ مجھ سے دور کرو۔ جیسے کہو گے ویسا ہی کروں گا۔" ولیم چیخا۔ اس نے عجلت میں چاقو پکڑا اور بادلِ ناخواستہ ممی پر وار کر کے ٹکڑے کرنے لگا۔ کبھی خوفزدہ ہو کر اپنے پیچھے بھی دیکھ لیتا جہاں اسمتھ غصے میں بھری دو آنکھوں کے ساتھ تیار حالت میں خوفناک ہتھیار لیے کھڑا تھا۔ چاقو کے ہر ایک وار سے پیلے رنگ کی دبیز چادر کی صورت دھول اڑتی۔ مسالے اور خوشبو کی چھوٹی ڈلیاں فرش پر گرنے لگیں پھر ایک ضرب سے ایک بڑا شگاف بنا اور ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ ایسا ہوتے ہی ممی بے ڈھنگے اعضا کے ڈھیر میں بکھر گئی۔

"اس ڈھیر کو آگ میں ڈالو۔" آتش دان کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اسمتھ نے کہا۔

آگ پکڑنے والے خشک پتوں کی طرح ممی کے ملبے سے آگ بھڑکنے لگی۔ وہ کمرا چند لمحات میں کسی بھٹی کی طرح دہکنے لگا اور وہاں موجود دونوں افراد کے چہرے پسینے سے تر ہو گئے۔ آتش دان کی آگ سے کثیف دھواں اٹھ رہا تھا۔ بالوں کے جھلسنے اور تارپین کی تیکھٹ کی تیز ناگوار بُو نے کمرے کی فضا کو بھر دیا۔ پندرہ منٹ میں لاٹ نمبر 249 کی اب چند جلی ہوئی، ٹوٹی پھوٹی اور خستہ ہڈیاں ہی باقی بچیں۔

"کیا تم مطمئن ہو گئے؟" ولیم نے خوف اور نفرت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ اذیت دینے والے کی طرف دیکھا۔

"نہیں۔ مجھے تمہارے سب سامان کو صاف کرنا ہوگا۔ یہاں شیطانی چالوں والا کوئی سامان باقی نہیں رہنا چاہیے۔"

"اب کیا رہ گیا ہے؟ کیا مجھے بھی آگ میں جھونکو گے؟" کھجور کے سوکھے پتوں کو آتش دان میں ڈالتے ہوئے ولیم نے غصے سے کہا۔

"وہ فراعین مصر کے زمانے والا پیلے کاغذ کا رول جو میرے خیال میں اس میز کی دراز میں ہے۔"

"نہیں نہیں.....!" ولیم چلّایا۔ "اسے مت جلاؤ۔ تم نہیں جانتے کہ تم کیا کر رہے ہو۔ یہ تو اپنی نوعیت کا یکتا اور بے مثل ہے۔ اس میں ایسی حکمت ہے جو کہیں اور نہیں ملتی۔"

"کسی حیل وحجت کی ضرورت نہیں۔ جیسا کہا ہے ویسا کرو۔"

"دیکھو اسمتھ! تم یقیناً اس کی اہمیت سے ناواقف ہو ورنہ یہ احمقانہ ضد نہیں کرتے۔ چلو میں بھی تمہیں اس قدیم علم میں شریک کر لیتا ہوں۔ میں تمہیں وہ سب سکھا دوں گا جو اس میں ہے۔ اچھا ٹھہرو، مجھے آگ میں ڈالنے سے قبل اسے نقل ہی کر لینے دو۔" ولیم نے بے بسی سے کہا۔

اسمتھ نے آگے بڑھ کر دراز کھولا۔ کاغذ کا پیلا رول نکال کر پھرتی کے ساتھ آگ میں جھونک دیا۔ ولیم نے چیخ ماری اور دوڑ کر اسے آگ میں سے نکالنے کو بھاگا لیکن اسمتھ پہلے ہی اس اقدام کے لیے تیار تھا لہٰذا پھرتی کے ساتھ اس پر قابو پا لیا۔ بے بسی کے عالم میں ولیم چپ چاپ قدیم مصری کاغذ کے رول کو راکھ بنتے دیکھتا رہا۔

"اچھا بھئی ولیم!" اس نے کہا۔ "تم نے بہت اچھے طریقے سے میری مدد کی لیکن یاد رکھنا، اگر اب تم اپنی پرانی چالوں پر واپس آئے تو....." اسمتھ نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا پھر خود پر قابو پا کر کہنے لگا۔ "اچھا، اب میں چلتا ہوں۔ گڈ مارننگ! مجھے اپنی پڑھائی پر واپس جانا ہے۔"

اسمتھ کی یہ داستان ان واقعات کے بارے میں تھی جو اولڈ کالج آکسفورڈ میں 1884ء کے موسم بہار میں پیش آئے۔ ایسا کوئی نہیں جس نے اسمتھ کے بیان کی تردید کی ہو۔ اس کے فوراً بعد ولیم نے یونیورسٹی چھوڑ دی۔ آخری مرتبہ وہ سوڈان میں دیکھا گیا۔

انسان کی عقل چھوٹی ہے اور فطرت کے طریقے عجیب۔ جو لوگ تاریک چیزوں کے متلاشی ہوتے ہیں ان کی کامیابی ہی ان کی ناکامی بن جاتی ہے۔

⌘⌘⌘

محفلِ شعر و سخن

❁ ناہید یوسف.....اسلام آباد

کیوں ہجر کے شکوے کرتا ہے کیوں عشق کے رونے روتا ہے
جب پیار کیا تو صبر بھی کر اس میں یہی تو کچھ ہوتا ہے

❁ مہتاب احمد.....حیدرآباد

عشق کو فریاد لازم تھی سو وہ بھی ہو چکی
اب ذرا دل تھام کر فریاد کی تاثیر دیکھ
تو نے دیکھا سطوتِ رفتارِ دریا کا عروج
موجِ مضطر کس طرح بنتی ہے اب زنجیر دیکھ

❁ زین الاسلام.....ڈیرہ غازی خان

خلق کھڑی ہے راہ میں پتھر لیے ہوئے
نکلو نہ گھر سے کانچ کا پیکر لیے ہوئے

❁ رؤف علی.....خانیوال

اے یادِ دوست آج تو جی بھر کے دل دکھا
شاید یہ رات ہجر کی آئے نہ پھر کبھی

❁ محمد سعید.....گوجرانوالہ

تجھ کو تنہا کر گیا ہے منفرد رہنے کا شوق
اب اکیلے بیٹھ کر یادوں کے منظر دیکھنا

❁ خاور مشتاق.....اٹک

تُو بدلتا ہے تو بے ساختہ میری آنکھیں
اپنے ہاتھوں کی لکیروں سے الجھ جاتی ہیں

❁ ملک ثاقب.....خانیوال

ابلیس تیری ایک خدا سے نہ نبھ سکی
مجھ کو تو دیکھ کتنے خداؤں کی زد میں ہوں

❁ امتیاز علی.....لاہور

کسی کو روشنی دے کر اندھیرے میں جو ڈوبا تھا
فلک کی وسعتوں میں وہ ستارہ جگمگاتا ہے

❁ رب نواز بھٹی.....سرگودھا

واعظ نہ ڈرا ہم کو گناہ کے عذاب سے
کیا لذتِ توبہ کا مزہ تک نہیں چکھا؟

❁ سلمیٰ شہزادی.....کوٹ غلام محمد

تیرا برق بن کے آنا مجھے راکھ کر نہ ڈالے
تیری اس ادا کے قابل میرا آشیاں نہیں ہے

❁ عائشہ فاروقی.....ملتان

دشمنوں کی طرح اس سے لڑتے رہے
اپنی چاہت بھی کتنی نرالی رہی

❁ مہر نواز.....پشاور

مرا عیش غم، مرا شہد سم، مری بود ہم نفسِ عدم
ترا دل حرم، گرِ و عجم، ترا دیں خریدۂ کافری
دمِ زندگی رمِ زندگی، غمِ زندگی ستمِ زندگی
غمِ رم نہ کر، سمِ غم نہ کھا کہ یہی ہے شانِ قلندری

❁ زاہد حسین.....سوات

شاید کہ چاند بھول پڑے راستہ کبھی
رکھتے ہیں اس امید پر کچھ لوگ گھر کھلے

❁ کاشف مجید.....ساہیوال

جب وہ دباتے ہیں ہونٹوں میں گلابی آنچل
کتنے مُرکیف نظاروں کو سزا ملتی ہے

pklibrary.com

❁ کرن صدیقی.....کراچی

یعنی کوئی کمی نہیں مجھ میں
یعنی مجھ میں کمی اسی کی ہے
کیا مرے خواب بھی نہیں میرے
کیا مری نیند بھی اسی کی ہے

❁ ڈاکٹر نصیر احمد.....راولپنڈی

میرے بازوؤں میں تھکی تھکی ابھی مجو خواب ہے چاندنی
نہ اٹھے ستاروں کی پالکی ابھی آہٹوں کا گزر نہ ہو

❁ جمیل قمر.....گوجر خان

اے خدا بال و پر عطا کردے
میں بھی رکھتا ہوں حسرتِ پرواز

❁ اشفاق خان.....آزاد کشمیر

ترے بچھڑنے سے پہلے ہی رو لیا تھا تجھے
کہ اعتبار مجھے تیری دوستی کا نہ تھا

❁ آصف راہی.....ہزارہ

ہر اہلِ ہوس جیب میں بھر لایا ہے پتھر
ہمسائے کی بیری پر ابھی بور پڑا ہے

❁ رانا شاہد.....شیخوپورہ

دشت میں خاک اڑانے کے بعد
اب ارادہ ہے کدھر جانے کا
تیری آنکھوں کی طرف لے آیا
شوق دریا میں اتر جانے کا

❁ مرید کاظم.....میانوالی

شام آتی ہے تو اس گھر کی طرف
عادتاً اپنے قدم جاتے ہیں
ہاتھ اٹھتا نہیں دستک کے لیے
پاؤں دہلیز پہ جم جاتے ہیں

❁ ندا خان.....کوئٹہ

کوئی تو ہوگا جو ہم سوختہ سامانوں کو
گلے لگائے گا اور پیار سے بٹھائے گا

❁ امجد محمود.....پنڈ دادن

غم کی جاگیر وراثت میں ملی ہے مجھ کو
اپنی جاگیر میں رہتا ہوں نوابوں کی طرح

❁ فیض شاہ.....کراچی

کچھ بھی نہ رہا یاد ہمیں تجھ سے بچھڑ کے
مدت ہوئی خود اپنا پتا ڈھونڈ رہے ہیں

❁ کائنات حیدر.....کوئٹہ

دستِ تقدیر میں دیکھے نہیں پتھر تم نے
کانچ کا جسم لیے پھرتے ہو بازاروں میں

❁ نور بلوچ.....بلوچستان

مت پوچھ کہ ہم ضبط کی کس راہ سے گزرے
یہ دیکھ کسی کچھ پر کوئی الزام نہ آیا

❁ انیلا شکور.....سکھر

بے وفا کہا مجھ کو آپ نے بجا لیکن
اس طرح نہیں کہتے ہر کسی کے بارے میں

❁ سحر خان.....مری

کہاں کے عشق و محبت کہاں کے ہجر و وصال
یہاں تو لوگ ترستے ہیں زندگی کے لیے

❁ انعم کمال.....حیدرآباد

کوئی نظر کبھی اٹھے اس پہ دل دھڑک جائے
میں اس سے پیار کروں اپنی آبرو کی طرح

❁ خالد حسن.....پنڈی بھٹیاں

وہ جب بھی آئے گا تو اس کی رفاقت کے لیے
موسم گل میرے آنگن میں ٹھہر جائے گا

❁ تنویر رضا.....اوباڑو

دنیا کی بے رخی تو نہیں ہے کوئی جواز
اس شدتِ خلوص کو کم کس لیے کریں

❁ احسان اللہ.....بہاولنگر

پرانے عہد کو جب زندہ کرنے کا خیال آئے
مجھے بس اتنا لکھ دینا محبت مر نہیں سکتی

❁ عابد علی.....بہاولپور

اک نقشِ پا کی طرح سہی اس زمین پر
اپنی بھی ایک راہ بناتے رہیں گے ہم

❁ سعد شاہد.....کراچی

ہم لوگ اسیر اپنی ہی مٹی کے ہیں ورنہ
کس رات ہمیں چاند بلانے نہیں آئے

❁ صہیب شاہد.....کراچی

خدا کے سامنے کس منہ سے جائیں گے خدا جانے
محبت کا کوئی دعوا نہیں ہے جن کے دامن پر

❁ عظیم احمد.....جھنگ سٹی

کبھی لوٹ آئیں تو پوچھنا نہیں، دیکھنا انہیں غور سے
جنہیں راستے میں خبر ہوئی کہ یہ راستہ کوئی اور ہے

❁ ہما خان.....چکوال

یہ عشق سمایا ہے دل میں یہ ریت پہ لکھا نام نہیں
ہمیں موت جدا کر سکتی ہے انسان کے بس کی بات نہیں

❁ روبینہ راشد.....کوٹ ادو

آندھی ایسی تھی کہ رکھنے ہی پڑے آنکھوں پہ ہاتھ
ورنہ غافل تو نہ تھا آخری قندیل سے میں

pklibrary.com

❁ ڈاکٹر شوکت......شیخوپورہ

اپنے عیبوں پہ نظر جس کی نہیں ہوتی ہے
اس کو آئینہ دکھاتے ہیں زمانے والے

❁ ملک اظہر......لاہور

اب احتیاط کی دیوار کیا اٹھاتے ہو
جو چور دل میں چھپا تھا وہ کام کر بھی گیا

❁ ساجد علی......حافظ آباد

دشتِ ہجراں میں نہ سایہ نہ صدا تیرے بعد
کتنے تنہا ہیں تیرے آبلہ پا تیرے بعد

❁ محمد فراز......شورکوٹ

تُونے جو زخم دیے مجھ کو بہت راس آئے
کاٹ کر زخم کو ہر بار سیا کرتا ہوں

❁ نبیلہ اظہر......کراچی

کبھی چاند چہروں کی بھیڑ سے میں نکل کے آیا تو یہ کھلا
وہ جو اصل تھا اسے کھو دیا جسے پالیا کوئی اور ہے

❁ حرا اطہر......کراچی

کون ہوتا ہے بُرے وقت کی حالت کا شریک
مرتے دم آنکھوں کو دیکھا ہے کہ پھر جاتی ہیں

❁ شاہینہ مہتاب......چنیوٹ

دل حسرتوں سے بھر کے نہ پھٹ جائے تبسم
چند حسرتیں نکال یا دل ہی نکال دے

❁ فاعقہ ساجد......حیدرآباد

میں اپنی اس روش کو آج تک سمجھا نہیں حسرت
کہ رہنا پتھروں میں اور گھر میں آئینہ رکھا

❁ ممتاز حسین......لیہ

نہ پہنچی چاند تک لیکن چکوری کھوگئی خود بھی
بڑی نادان تھی اس کا یہی انجام ہونا تھا

❁ فرزانہ ریاض......فیصل آباد

مقتل میں چلی آئی ہے اس واسطے غربت
قاتل کی جو تلوار ہے ہیروں سے جڑی ہے

❁ محمد انور ندیم......حویلی لکھا، اوکاڑہ

یوں غلط تو نہیں چہروں کا تاثر بھی مگر
لوگ ویسے بھی نہیں جیسے نظر آتے ہیں

❁ جاوید عباس......ملتان

خوشی کے ساتھ دنیا میں ہزاروں غم بھی ہوتے ہیں
جہاں بجتی ہے شہنائی وہاں ماتم بھی ہوتے ہیں

❁ محمد بخش......خانیوال

میں وقت سے بیکار نہ رکھوں تو یہی وقت
ماضی کے کسی طاق میں رکھ جائے مجھے

❁ عائشہ مظفر......کراچی

زخمی ہوئے جو ہونٹ تو محسوس یہ ہوا
چوما تھا میں نے پھول کو دیوانگی کے ساتھ

❁ مظہر خان......خانپور

اس نے چوما میری آنکھوں کو سحر دم اور پھر
رکھ گیا میرے سرہانے میرے خوابوں کے گلاب

❁ ضیا آفریدی......پشاور

موتی ہیں ان کی تہ میں کہ پتھر کے خبر
دل تو سمندروں سے بھی گہرے ہیں دوستو!

❁ راجا ناصر......چکوال

ایک ایسی بھی گھڑی عشق میں آئی تھی کہ ہم
خاک کو ہاتھ لگاتے تو ستارہ کرتے

❁ عبدالغفور خان......مظفر آباد

ہو خوشی بھی ان کو حاصل یہ ضروری تو نہیں
غم چھپانے کے لیے بھی مسکرا لیتے ہیں لوگ

❁ ملک یونس......سرگودھا

چور مامور ہوئے شہر کی دربانی پر
رونا آتا ہے اس اندازِ نگہبانی پر

❁ شازیہ حسین......ڈھرانجا

ہم نے مانا کہ کل وہ آئیں گے
عقل حیراں ہے آج کیا کیجیے

❁ اسلم خان......کراچی

میں خود زمیں ہوں مگر ظرف آسمان کا ہے
کہ ٹوٹ کر بھی میرا حوصلہ چٹان کا ہے

❁ لبنیٰ جاوید......کراچی

ہم دُہری اذیت کے گرفتار مسافر
پاؤں بھی ہیں شل شوقِ سفر بھی نہیں جاتا

کوپن برائے شمارہ فروری 2024

محفلِ شعر و سخن

نام: ....

پتا: ....

pklibrary.com

حسب معمول اسکول سے نکلنے کے بعد فرزین اور مدحت اپنے پسندیدہ ریسٹورنٹ ''چائے ہوجائے'' میں داخل ہوئیں۔ دونوں کو اس ریسٹورنٹ کے چائے اور برگر اس لیے پسند تھے کہ یہاں بیٹھ کر چائے کی چسکیوں کے دوران جب دونوں برگر پر ہاتھ صاف کرتیں تو اپنے نجی معاملات کے علاوہ حالاتِ حاضرہ پر بھی گفتگو کرتیں۔ اسی دوران وہ تکان بھی اتر جاتی جو صبح سے دوپہر تک سر پر سوار ہوتی۔ دونوں یہاں آکر ریلیکس ہوجاتیں، کچھ سنتیں، کچھ سناتیں اور پھر اپنا اپنا راستہ ناپتیں۔ چونکہ دونوں کا تعلق متوسط طبقے سے تھا اس لیے ایک دوسرے کو زیر بار نہیں کرتیں بلکہ اپنا بل اپنی ہی جیب سے ادا کرتیں اور پھر گھر جاکر دوپہر کا کھانا گول کرجاتیں کیونکہ دونوں کے بدن فربہی مائل تھے۔ پانی بھی گھی بن کر لگتا اسی لیے کھانے پینے میں کاٹ کسر اور احتیاط برتتیں۔

اس وقت اِدھر اُدھر کی گپ شپ کے بعد موضوعِ گفتگو اچانک شادی بیاہ کی طرف مڑ گیا۔ فرزین نے دانتوں سے برگر کاٹتے ہوئے پلکیں جھپکائیں اور اپنی یادداشت پر زور ڈالتے ہوئے استفسارانہ نظروں سے

بعض لوگوں کی زندگی میں ایسے نشیب و فراز آتے ہیں کہ یقین کرنا مشکل ہوجاتا ہے... ان تینوں کے ساتھ بھی قسمت نے کچھ ایسا ہی کھیل کھیلا کہ اس مثلث کا ہر کردار پُراسرار بھید بن کر رہ گیا... اندھا اعتبار ہمیشہ پیروں پر کلہاڑی مارتا ہے... وہ بھی اپاہج ہوگئی مگر زندگی کی بازی پھر بھی جیت گئی۔

خوابوں کی کرچیوں سے زخمی ایک عاشق جوڑے کی دلدوز کتھا

آصفہ ضیاء احمد

ہمراز

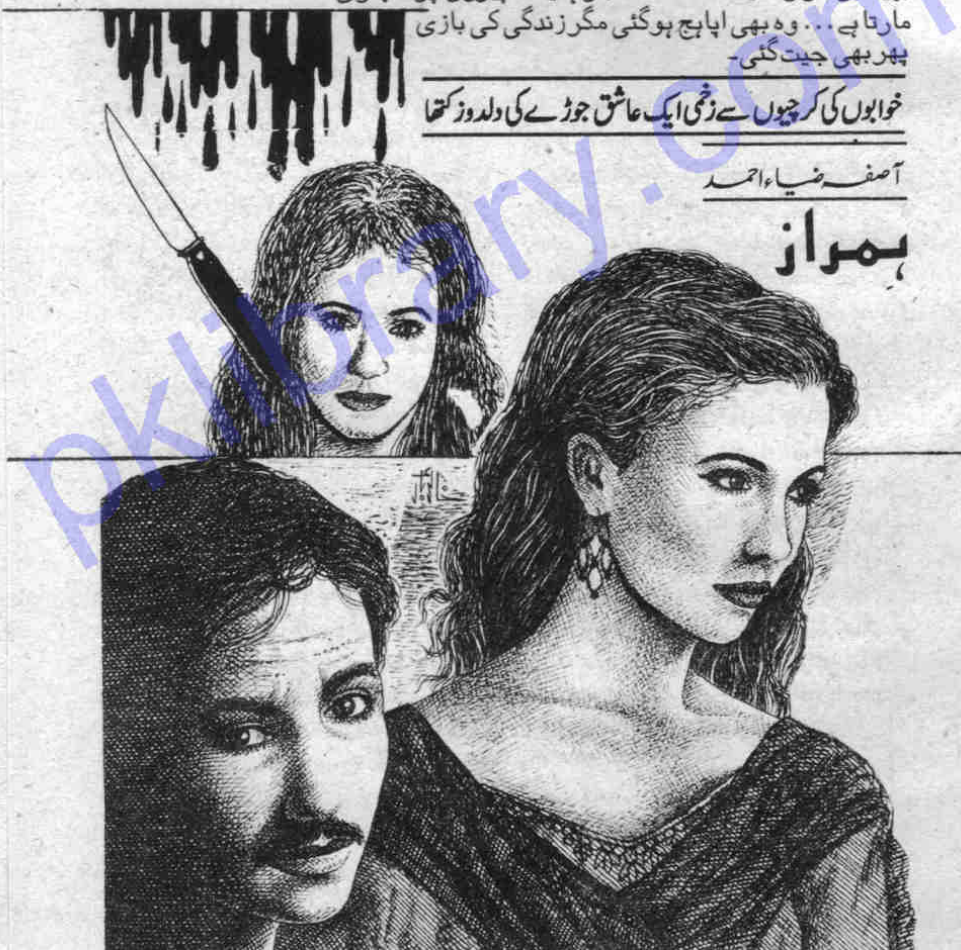

pklibrary.com

مدحت کو دیکھا اور پوچھا۔ ”ارے تم نے بتایا نہیں کہ خیر سے تمہارے رشتے کے سلسلے میں مہمان آنے والے تھے۔ آئے بھی یا بس افواہ ہی تھی۔“

مدحت گرما گرم چائے سپ کر رہی تھی۔ اس تذکرے پر اس نے یوں منہ بنایا جیسے کپ میں چائے نہیں بلکہ کریلے کا عرق ہے جسے وہ بہ مشکل حلق سے اتار رہی ہے۔ فرزین کے سوال کا اس نے فوراً جواب نہیں دیا۔ دونوں کے درمیان مکمل سناٹا چھا گیا۔ لمحاتی توقف کے بعد مدحت نے بیزار کن لہجے میں جواباً کہا۔ ”ہر اس گھر میں جہاں جوان لڑکیاں ہوتی ہیں، اس قسم کے ناٹک باز لوگوں کی آمد و رفت تو لگی ہی رہتی ہے۔ آتے ہیں، کھاتے پیتے ہیں اور پھر پلٹ کر بھی نہیں دیکھتے۔“ یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی اتر آئی۔ فرزین نے فوراً موضوعِ سخن بدل دیا ورنہ شاید مدحت رو ہی پڑتی۔

چائے ختم کرنے کے بعد جیسے ہی دونوں ریسٹورنٹ سے نکلیں تو مدحت نے بس اسٹاپ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اوہ، فرزین! مجھے تو اب اجازت دو۔ وہ دیکھو میری بس آ رہی ہے۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے دوڑ کر بس پکڑی اور ایک خالی سیٹ پر ٹک گئی۔ اس کا موڈ ابھی تک ٹھیک نہیں ہوا تھا۔ ایک عجیب سی اداسی اور یاسیت اس پر چھائی ہوئی تھی۔ کچھ اسی طرح کا حال فرزین کا بھی تھا۔ اسے اچھی طرح علم تھا کہ مدحت کو دیکھنے کے بعد آنے والی خواتین محض اس کے پکے سانولے رنگ کو دیکھ کر اسے ریجیکٹ کر دیتی ہیں حالانکہ اس کے نین نقش انتہائی تیکھے اور حسین تھے۔ سیاہ اور گھنیرے بال جب شانوں پر بکھرتے تو یوں لگتا جیسے شام اتر آئی ہے۔ مدحت کو دکھی کر کے اسے پچھتاوا ہو رہا تھا کہ کاش وہ یہ ذکر ہی نہیں چھیڑتی۔

☆☆☆

فرزین جوں ہی گھر میں داخل ہوئی، اسے اپنی ماں عفیفہ بیگم کی آواز سنائی دی۔ وہ اپنے شوہر سے مخاطب تھیں۔ ”آج تو میں اس سے فائنل جواب مانگ کر ہی دم لوں گی۔ ارے آخر حد ہوتی ہے ہٹ دھرمی کی۔ ٹانگ برابر کی لڑکی اور ہمیں لارے لپے دے رہی ہے۔ ارے میرا بھتیجا کوئی برا تھا۔ شریفانہ عادات و اطوار کا مالک، صورت شکل کا اتنا اچھا، اپنا بزنس۔ میرے بھائی بھاوج کتنے ارمانوں سے رشتہ مانگ رہے تھے لیکن اس لڑکی کی نہ، ہاں میں نہیں بدلی۔ ارے جو لڑکی بھائی جان کی بہو بن کر آئی ہے، راج کر رہی ہے، راج..... اور ایک ہماری بے وقوف بیٹی ہے جو اسکول میں جوتیاں چٹخا رہی ہے۔“

فرزین فوراً ٹھٹک کر دروازے کی آڑ میں کھڑی ہو گئی اور اپنی تمام تر سماعت ماں باپ کے درمیان ہونے والی گفتگو پر مرکوز کر دی۔ اب اسے اپنے باپ اکرام الدین کی آواز سنائی دی۔ ”میری بہن کا بیٹا اپنے خاندان کا سب سے زیادہ قابل اور تعلیم یافتہ لڑکا تھا۔ قطر میں لاکھوں کما رہا ہے۔ صاحبزادی نے وہ رشتہ بھی ٹھکرا دیا۔ اب پتا نہیں کہاں کا شہزادہ آئے گا اسے بیاہنے۔ میں تو کہتا ہوں اب اسے چھوڑو اور اپنے دوسرے بچوں کی فکر کرو۔ ہمیں بیٹیاں بھی بیاہنا ہیں اور بہو بھی لانا ہے۔“

عفیفہ بیگم نے جتی لہجے میں کہا۔ ”کہہ تو رہی ہوں آج آخری بار اسے سمجھانے کی کوشش کرتی ہوں پھر آگے اپنے کیے دھرے کی وہ خود ذمے دار ہے۔“ دونوں کی بات چیت کے درمیان جیسے ہی وقفہ آیا، فرزین خاموشی سے وہاں سے کھسک گئی۔

رات کے کھانے کے بعد عفیفہ بیگم نے جوں ہی فرزین کے کمرے میں قدم رکھا، فرزین نے فوراً آنکھیں موند لیں اور سوتی بن گئی۔ عفیفہ بیگم نے انتہائی پیار دلار کے ساتھ بیٹی کی پیشانی چومی اور اپنی انگلیوں سے اس کے بالوں میں کنگھا کرنے لگیں۔ فرزین نے کسمساتے ہوئے آنکھیں کھولیں اور اٹھلاتے ہوئے مصنوعی خفگی سے بولی۔ ”او مائی ڈیئر مما! اتنی گہری اور میٹھی نیند سو رہی تھی اور ایک سہانا سپنا دیکھ رہی تھی لیکن آپ نے جگا کر سب ڈسٹرب کر دیا۔“

عفیفہ بیگم نے اس کے گال پر پیار سے چپت لگاتے ہوئے کہا۔ ”جھوٹی کہیں کی۔ اچھی خاصی جاگ رہی تھی اور مجھے بے وقوف بنا رہی ہے۔ اماں باوا کے گھر بہت سو لیا۔ اب پیا کے گھر میں خواب خرگوش کے مزے لوٹنا تاکہ ہم بھی سکون کی سانس لے سکیں۔ آج تمہارے ابو کے ایک دوست اپنے بیٹے کے لیے تمہارا رشتہ.....“

فرزین نے ماں کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ”مما! میں نے دوپہر میں ہی آپ کی اور ابو کی ساری گفتگو سن لی ہے اور میرا جواب آج بھی وہی ہے جو پہلے تھا۔ میں شادی اس وقت کروں گی جب مجھے اپنی پسند کا جیون ساتھی ملے گا ورنہ میں کنواری ہی بھلی۔“

عفیفہ بیگم بری طرح بھنا گئیں اور دانت کچکچا کر بولیں۔ ”ہم دونوں میاں بیوی شاید اس دنیا سے رخصت ہو جائیں گے تب ہی تمہیں اپنی پسند اور معیار کا لڑکا ملے گا۔ یا اگر نہیں ملا تو اسی دہلیز پر بیٹھی بیٹھی بوڑھی ہو جانا۔“

فرزین نہ دبی، نہ جھجکی بلکہ پوری ڈھٹائی کے ساتھ دبنگ آواز میں بولی۔ ”مجھے یقین ہے ایک دن مجھے اپنی ٹکر کا لڑکا ضرور ملے گا۔ بس اسی روز میں آپ کو خوشخبری.....“

اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے عفیفہ بیگم کمرے سے نکل چکی تھیں۔ بیٹی کو بے حیا، بے غیرت اور نہ جانے کون کون سے القابات سے نوازتی ہوئی شوہر کے قریب جا بیٹھیں۔ اب وہ شوہر سے مخاطب تھیں۔ ”آپ درست کہتے ہیں۔ اس سر پھری کو چھوڑ کر ہمیں اپنے دوسرے بچوں کی فکر کرنی چاہیے۔“

اکرام الدین ٹی وی پر نیوز دیکھ رہے تھے لیکن بیوی کے تیور دیکھ کر انہوں نے فوراً ٹی وی آف کیا اور وضاحت طلب نظروں سے بیوی کی جانب دیکھنے لگے۔ عفیفہ بیگم نے واضح الفاظ میں بیٹی کا فیصلہ شوہر کے گوش گزار کر دیا۔ اکرام الدین کا چہرہ غصے کی شدت سے سرخ ہو گیا لیکن آدمی وضع دار تھے۔ ضبط و تحمل سے کام لیتے ہوئے فقط اتنا کہا۔ ”نازنین کی مرضی معلوم کر کے یہ رشتہ ہم لوگ اس کے لیے قبول کر لیں گے کیونکہ لوگ بہت اچھے ہیں۔ لڑکا بھی انتہائی شریف، تعلیم یافتہ اور برسرروزگار ہے۔“

عفیفہ بیگم اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولیں۔ ”میں کل ہی نازنین سے بات کرتی ہوں۔ اگر وہ راضی ہو گئی تو بس چٹ منگنی، پٹ بیاہ کر کے سبکدوش ہو جائیں گے۔“

اس وقت بھی فرزین نے پردے کی اوٹ سے ماں باپ کے درمیان ہونے والی ساری گفتگو سن کر ایک طویل سکون کی سانس خارج کی اور خود کلامی کے انداز میں بولی۔ ”شکر ہے، بلا ٹلی۔“ یہ کہتے ہوئے وہ اپنے کمرے کی طرف پلٹی اور قد آدم آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اپنا گورا چٹا رنگ دیکھ کر گردن احساسِ تفاخر سے تن گئی۔ اپنے آپ سے آہستہ سے کہا۔ ”میری پسند ایک نہ ایک دن مجھ سے ضرور ٹکرائے گی اور پھر..... اور پھر.....“ پھر خود ہی شرما گئی۔ شرم اور حیا کے باعث گال اور گلابی اور نین شرابی ہو گئے تھے۔ بیڈ پر لیٹتے ہی آنکھیں بوجھل ہونے لگیں اور پھر وہ اپنے تصوراتی راج کمار کے ساتھ خوابوں کے دیس میں دور جا نکلی۔

☆☆☆

مدحت گھر پہنچی تو کمرے سے آنے والی آوازوں نے اس کے قدم بھی روک لیے۔ اس کے بڑے بھائی سرمد اور بھابی رونق جہاں کے درمیان ہونے والی بحث و تکرار زور و شور سے جاری تھی۔ اپنا نام سن کر وہ دیوار سے چپک گئی اور بھائی بھاوج کے درمیان جو گولہ باری ہو رہی تھی، اس پر کان لگا دیے۔ سرمد کہہ رہا تھا۔ ”تم جس روز سے بیاہ کر اس گھر میں آئی ہو، کبھی میں نے یا میری بہن نے تمہیں کسی بات پر روکا ٹوکا ہے؟ ہمیشہ اس گھر میں تمہارا حکم چلا۔ تم نے من مانی کی لیکن ہم دونوں نے کبھی کسی بات کے لیے منع نہیں کیا۔ لیکن جو رشتہ تم مدحت کے لیے بتا رہی ہو، وہ نہ مجھے پسند ہے اور نہ ہی مدحت اس رشتے کے لیے راضی ہو گی۔“

رونق جہاں اشتعال انگیز لہجے میں دہاڑی۔ ”ارے حقیقت کی عینک لگا کر ذرا غور سے اپنی بہن کو دیکھیے تو سہی۔ اچھا خاصا کالا رنگ ہے۔ لاکھ خدوخال کھڑے ہیں لیکن رنگ نہیں تو کچھ نہیں۔ گھر تو لوگ بہت آئے لیکن کسی نے بھی قابلِ توجہ نہیں سمجھا۔ اگر جوانی کی دھوپ ڈھل گئی نا تو دونوں بہن بھائی سر کو ہاتھ لگا کر روؤ گے۔ اس لیے کہہ رہی ہوں کہ.....“

سرمد نے بیوی کی بات کاٹتے ہوئے انتہائی تلخ لہجے میں کہا۔ ”بس آگے میں ایک لفظ بھی نہ سنوں۔ تم اپنی زبان کو تالا لگاؤ۔ مدحت کے اسکول سے آنے کا وقت ہو گیا ہے۔ اس کے سامنے کسی قسم کا کوئی ذکر نہیں کرنا۔ میری اکلوتی بہن ہے۔ میری والدہ مرتے وقت اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے کر گئی ہیں۔ اس کی شادی میری ذمے داری ہے۔ رب نے اس کا جوڑا تارا ہو گا۔ وقت آنے پر ان شاء اللہ سب کچھ ہو جائے گا۔“

رونق جہاں نے پھر زہر اگلا۔ ”ابھی تک تو کچھ نہیں ہوا تو آگے کیا ہو گا۔ ہم بھی دیکھیں گے کہ کون آتا ہے سہرا باندھ کر۔“

مدحت کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے پگھلا ہوا سیسہ اس کے کانوں میں ڈال دیا۔ لڑکھڑاتے قدموں سے چلتی ہوئی اپنے کمرے تک پہنچی اور بیڈ پر جا گری۔ احساسِ کمتری، محرومی اور گھٹن نے آکٹوپس کی طرح اسے اپنے شکنجے میں لے لیا تھا۔ اس کی اپنی بھابی نے اس کے متعلق جو گل افشانیاں کی تھیں، وہ سوئیاں بن کر اس کے دل و دماغ میں چبھ رہی تھیں۔ جب ذرا طوفان تھما تو اٹھ کر آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اندرونی کرب کی لکیریں اب بھی نمایاں تھیں۔ خود کلامی کے انداز میں بولی۔ ”میرے خالق نے مجھے اتنا برا بھی نہیں بنایا۔ ایک ذرا سا رنگ ہی تو مدھم ہے ورنہ کس بات کی کمی ہے مجھ میں؟“ پھر سر جھٹک کر بولی۔ ”کوئی پسند کرے نہ کرے، میرا بھائی تو مجھے چاہتا ہے۔ نہیں ہو گی شادی، نہ سہی۔ عزت کے ساتھ اپنے بھائی کے گھر میں ساری زندگی گزار دوں گی۔ گورنمنٹ اسکول

میں جاب ہے اور کیا چاہیے۔ اپنی روزی خود کما رہی ہوں۔ کسی کا دیا تھوڑی کھا رہی ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا بھی حکم ہے کوئی تم پر ظلم کرے، تم بھی سینہ سپر ہو کر مقابلہ کرو۔ میں بھی اب اینٹ کا جواب پتھر سے دوں گی۔ جو کچھ ہے میرے والدین اور بھائی کا ہے۔ ان کے میکے والوں نے تو چار چیتھڑوں میں رخصت کر دیا تھا۔'' دل کی اندرونی کیفیت درست ہوئی تو اضطراب بھی کم ہوا اور چہرے سے تفکرات کے بادل بھی چھٹ گئے۔ دل و دماغ کو طمانیت نصیب ہوئی تو مثبت موڑ پر سوچیں بھی مڑ گئیں۔ ''بھیا کو میری بہت فکر ہے۔ بس اللہ میرے بھائی کی مدد کرے۔ کوئی من چاہا شریک زندگی مل گیا تو پھر..... تو پھر.....'' سوچتے سوچتے وہ شرما گئی۔ چہرے پر حیا کی لالی بکھری تو فوراً بالوں سے ہیئر پن نکال کر تکیے پر سر رکھ کر لیٹ گئی۔ اب خوابوں خیالوں کی ایک دنیا تھی اور وہ تھی۔

☆☆☆

دوسرے دن دونوں پھر اسی ریسٹورنٹ میں ہاتھ پاؤں کی لڑائی اور گفت و شنید میں مصروف تھیں۔ فرزین گزرے ہوئے کل کی ساری داستان نہایت تفصیل سے وضاحتی انداز میں بیان کر رہی تھی۔ دورانِ گفتگو ماں اور باپ کی آواز کی نقل اتار کر ان کے دہرائے ہوئے ڈائیلاگ ان ہی کے انداز میں بول رہی تھی۔

مدحت کو اس کی یہ گستاخی ایک آنکھ نہیں بھائی۔ اس نے سخت لہجے میں اسے تنبیہ کی۔ ''فرزین بہت بری بات۔ انکل اور آنٹی اپنی جگہ بالکل صحیح ہیں۔ یہی وقت ہے جو تمہیں مناسب اور من پسند بر مل سکتا ہے۔ اگر چند سال تم پر سے اور گزر گئے نا تو پھر ان گنت مسائل کھڑے ہو جائیں گے۔ بہر حال یہ تمہارا اپنا مسئلہ ہے لیکن کم از کم والدین کا احترام کرنا سیکھو۔''

فرزین نے اس کے پند و نصائح پر برا سا منہ بنایا اور ترش لہجے میں بولی۔ ''غالب نے تم جیسوں کے لیے ہی کہا ہے..... یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح..... وقت بے وقت اپنی نصیحتوں کا پٹارا کھول کر بیٹھ جاتی ہو۔ چلو خیر میرے گھر کا قصہ تمام ہوا۔ تم اپنی سناؤ۔ تم بتا رہی تھیں کہ کل تمہارے بھیا اور بھابی میں کافی تو تو، میں میں ہوئی۔ آخر کس بات پر ہوئی؟ کچھ ہمیں بھی تو پتا چلے۔''

مدحت نے فوراً بات اڑا دی اور بناوٹی ہنسی ہنستے ہوئے جواباً کہا۔ ''ارے کوئی خاص بات نہیں۔ وہی مہنگائی کا رونا، بجلی اور گیس کے بل، گھر کا کرایہ.....''

فرزین نے اکتاہٹ بھرے لہجے میں اس کی بات کاٹی اور بولی۔ ''اوہ، میں سمجھی کوئی چٹخارے دار موضوع ہوگا۔ ان موضوعات پر تو روزانہ ہی ہمارے گھر میں دانتا کل کل ہوتی ہے۔ اس میں کیا دھرا ہے۔''

مدحت نے دانستہ ساری بات گول کر دی۔ دراصل اس کے دل میں پہلی بار فرزین کے لیے بال آیا۔ ابھی تک وہ ہر معاملے میں فرزین پر بھروسا کر کے ہر اچھی بری بات فرزین کو بتا دیتی تھی لیکن آج بجلی کی طرح یہ خیال اس کے ذہن میں کوندا کہ جو لڑکی اپنے والدین کا مذاق اڑا سکتی ہے، وہ کچھ بھی کر سکتی ہے۔ ایسا نہ ہو وہ جن مسائل سے نبرد آزما ہے، فرزین بھری محفل میں انہیں طشت از بام کر دے۔ اس واقعے کے بعد مدحت نے اپنی زبان پر کافی حد تک قابو پا لیا۔ اِدھر اُدھر کے تمام موضوعات پر باتیں کرتی لیکن اپنے گھر میں پکنے والی کھچڑی کی خوشبو بھی فرزین کی ناک تک نہ پہنچنے دیتی۔ لیکن یہ احتیاط وہ چند دنوں ہی کر پائی کیونکہ اچانک اس کی زندگی میں اشعر کی انٹری ہوئی۔

اشعر سعودی عرب سے آیا تھا۔ رونق جہاں کا سگا بھائی تھا۔ طویل القامت، خوبرو اور اعلیٰ تعلیم یافتہ۔ ریاض میں کسی فیکٹری میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھا۔ باہر سے ٹھیک ٹھاک کما کر لایا تھا۔ رونق جہاں کے میکے میں اور رونق جہاں کے چہرے پر ایسی رونق اتر آئی تھی کہ دیکھ کر نظر لگ رہی تھی۔ اشعر گاہے بگاہے بہن بہنوئی سے بھی ملنے چلا آتا تو مدحت سے بھی آمنا سامنا ہو جاتا۔ پہلے پہل تو شرم حجاب مانع رہی لیکن رفتہ رفتہ دونوں کھلتے چلے گئے۔ اشعر نہ صرف خوش لباس، خوش خوراک بلکہ خوش کلام بھی تھا۔ اب اسکول میں مدحت کا دل چاہتا جلدی سے چھٹی کی بیل بجے اور وہ اڑ کر گھر پہنچ جائے۔ اشعر سے باتیں کرتے ہوئے اسے مزہ آنے لگا تھا۔ اس کا دل چاہتا اشعر بولتا رہے اور وہ سنتی رہے۔ بہانے بہانے سے وہ اشعر کے گرد منڈلاتی رہتی۔ اسے کھانے میں کیا پسند ہے اور کیا ناپسند ہے، اس نے اچھی طرح ازبر کر لیا تھا۔ اسکول سے آتے ہی وہ کچن سنبھال لیتی اور پھر اشعر کی پسندیدہ ڈش میز پر پوری شان و شوکت سے جلوہ نما ہوتی اور جب اشعر اس کے پکائے ہوئے کھانوں کی تعریف کر رہا ہوتا تو اس کا دل مارے خوشی کے جھوم اٹھتا۔ اس کی اس نمایاں تبدیلی کو فرزین نے بھی محسوس کیا اور اس سے سب کچھ اگلوا لیا اور اشعر کے بارے میں بتاتے ہوئے مدحت پر ایک نشہ، ایک سرور چھایا ہوا تھا۔ دل گھنگروؤں کی تال پر رقص کر رہا تھا۔

فرزین نے اسے گلے لگاتے ہوئے نہایت خلوص سے مبارک باد دی اور اس کے کان میں گنگنائی۔ ''بڑا زبردست ہاتھ مارا ہے۔ ویسے مجھ ناچیز کا مشورہ ہے کہ کبھی کہیں پر اسے کریدنے کی تو کوشش کرو۔'' فرزین نے شرارتی اور شوخ لہجے میں مدحت کو چھیڑا۔

مدحت نے گھبرا کر سہمی ہوئی آواز میں کہا۔ ''نہ بابا نہ۔ بھابی تو مجھے زندہ دفن کردیں گی۔ انہیں اگر بھنک بھی لگ گئی تو میرا جینا حرام ہوجائے گا۔''

فرزین نے اسے تعجب خیز نگاہوں سے دیکھا اور بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے بولی۔ ''تو پھر یہ سارا ڈراما کس لیے؟ ارے بھئی اس سے کہو کہ وہ شادی کا پیغام تمہارے بھائی کے کانوں تک پہنچائے تب ہی تو یہ بیل منڈھے چڑھے گی نا۔''

مدحت نے اثبات میں اپنے سر کو یوں جنبش دی جیسے کہہ رہی ہو کہ میں تم سے متفق ہوں۔ فرزین، اشعر سے بات کرنے کے نت نئے گُر اور ترکیبیں اسے بتاتی رہی اور مدحت سر ہلا ہلا کر اس کی ہر بات کی تائید کرتی رہی۔ آج جب وہ گھر لوٹی تو اس کا دماغ اسی مسئلے میں الجھا ہوا تھا کیونکہ اشعر کی جانب سے کوئی پیشرفت نہیں ہوئی تھی۔ رونق جہاں سے اس کا کانٹے کا رشتہ تھا۔ اس رات اپنے بستر پر بھی وہ اضطراری انداز میں کروٹیں بدلتی رہی۔ چین، سکون اور نیند پتا نہیں کہاں اڑن چھو ہوگئے تھے پھر اچانک بجلی نے بھی آنکھ مچولی کا کھیل شروع کردیا۔ وہ گھبرا کر اپنے کمرے سے صحن میں نکل آئی لیکن بھائی بھاوج کے کمرے کے قریب آکر وہ ٹھٹک گئی۔ اسے اپنے بھائی کی لجاجت آمیز آواز سنائی دی۔ وہ بیوی سے مخاطب تھا۔

''رونق! میری ایک دلی آرزو ہے۔ ویسے تو ہر آرزو، ہر خواہش رب کی رضا سے پوری ہوتی ہے لیکن اگر تم چاہو تو میری ایک دلی تمنا پوری ہوسکتی ہے۔''

جواب میں رونق جہاں کی تحیر خیز آواز سنائی دی۔ ''ایسی کون سی تمنا ہے آپ کی جس میں میری مدد درکار ہے؟''

سرمد ہچکچے لہجے میں ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ''دراصل..... درحقیقت میں چاہتا ہوں..... میں چاہتا ہوں.....'' اتنا کہہ کر سرمد یکدم خاموش ہوگیا۔ ایسا لگ رہا تھا اظہارِ خیال کے لیے اسے الفاظ نہیں مل رہے ہیں۔

رونق جہاں نے جھنجلا کر کہا۔ ''ارے بھئی اب کہہ بھی دو، کیا بات ہے؟ مجھے نیند آرہی ہے۔''

اس بار سرمد نے بغیر کسی تمہید کے ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ ڈالا۔ ''رونق! مجھے لگتا ہے اشعر اور مدحت ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں تو کیوں نہ ہم اپنے گھر کے سارے لوگوں کو اس رشتے کے لیے تیار کرلو اور پھر کوئی مبارک ساعت دیکھ کر ہم اس فریضے سے سبکدوش ہوجائیں۔''

رونق شوہر کی بات سن کر یوں اچھلی جیسے کئی ہزار وولٹ کا بجلی کا شاک لگا ہو۔ اس نے طنزیہ انداز میں ایک لمبی ہنکاری بھری اور خار چباتے ہوئے بولی۔ ''تو یہ بات ہے۔ تب ہی تو مہارانی مدحت بھی آج کل اسکول سے وقت سے پہلے ہی آنے لگی ہیں۔ ٹی وی اور نیٹ پر طرح طرح کے پکوانوں کی تراکیب دیکھ کر اشعر کی ایسی مہمان نوازی کرتی ہیں کہ حاتم طائی بھی شرما جائے۔ ہمم..... م..... م تو میں اب سمجھی۔ میں تو سمجھ رہی تھی کہ دال میں کچھ کالا ہے مگر یہاں تو ساری دال ہی کالی ہے۔ یقیناً یہ آپ کی بہن نے ہی آپ کو پٹی پڑھائی ہوگی اور میرے بھائی کے لیے بھی دام بچھایا ہوگا تب ہی تو وہ فون پر بات کرتا ہے تو پہلے مدحت صاحبہ کی خیریت دریافت کرتا ہے بعد میں اسے بہن یاد آتی ہے۔ مدحت صاحبہ اگر کڑوے کریلے بھی پکا کر سامنے رکھ دیتی ہیں تو انگلیاں چاٹ چاٹ کر کھاتا ہے۔ بہت زبردست پلاننگ ہے سرمد صاحب آپ کی اور آپ کی بہن کی۔ میں تو مان گئی آپ لوگوں کو۔ استادوں کے استاد ہیں آپ دونوں بھائی بہن۔''

سرمد گڑگڑانے والے انداز میں کہہ رہا تھا۔ ''خدارا رونق! میری بہن کو کچھ نہ کہو۔ اس کے فرشتوں کو بھی اس بات کی خبر نہیں۔ یہ تو اپنا سمجھ کر میں نے تم سے کہہ دیا۔ اگر تمہاری مرضی نہیں ہے تو میں کوئی تمہاری گردن پر چھری تھوڑی رکھ رہا ہوں۔''

رونق شوہر کی بات کو سنی ان سنی کرتے ہوئے بے تکان بولے جارہی تھی۔ ''ارے کہاں میرا ہیرے جیسا بھائی اور کہاں معمولی شکل وصورت والی آپ کی بہن۔''

اس بار سرمد ..... انتہائی اشتعال آمیز لہجے میں بولا۔ ''کبھی تم نے اپنے آپ کو آئینے میں دیکھا ہے۔ بس نام ہی تمہارا رونق ہے ورنہ تم تو سراپا بدرونق ہو۔''

اب تو رونق کو پتنگے لگ گئے اور سرمد کو وہاں سے بھاگنے میں ہی عافیت نظر آئی اور بھائی کے نکلنے سے پہلے مدحت وہاں سے نو دو گیارہ ہوگئی۔ مدحت کی باقی رات کروٹیں بدلتے بدلتے گزر گئی۔ بالآخر اس نے فیصلہ کیا کہ اسے ساری بات فرزین کو بتا کر اس سے مشورہ کرنا چاہیے کہ بھابی نام کے اس لوہے کو کس طرح موم کیا جاسکتا ہے۔ یہ

بات تو وہ بھانپ چکی تھی کہ اشعر اسے پسند کرتا ہے۔ یہی چیز اس کے لیے باعث سکون تھی۔ ایک دل خوش کن احساس لہو بن کر اس کے رگ و پے میں دوڑتا رہا تھا۔ اس مسئلے پر سوچتے ہوئے وہ غفلت کی نیند سوگئی۔

دوسری صبح وہ جاگی تو گھر کا ماحول بوجھل بوجھل سا محسوس ہوا۔ کمرے سے باہر نکلی تو باورچی خانے میں مکمل سناٹا چھایا ہوا تھا۔ وہ گر بہ قدمی سے بھائی بھاوج کے کمرے کی طرف بڑھی اور دروازے پر دستک دی۔ اندر سے سرمد کے کھنکھارنے کی آواز آئی اور ساتھ ہی وہ اپنے مخصوص انداز میں بولا۔ ”اندر آجاؤ مدحت!“

مدحت فوراً پردہ ہٹا کر کمرے میں داخل ہوئی اور متلاشی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ”بھابی باتھ روم میں ہیں؟“

سرمد کرخت لہجے میں بولا۔ ”نہیں، نہ باتھ روم میں ہے اور نہ گھر کے کسی اور کونے میں بلکہ سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی اپنی اماں کے گھر سدھار گئی ہیں۔ میں بھی دیکھتا ہوں کب تک کوئی اسے مہمان رکھتا ہے۔“

مدحت چند لمحے بھائی کو دیکھتی رہی پھر بھائی کے پاس بیٹھتے ہوئے ملائم لہجے میں بولی۔ ”بھائی جان! آج اتوار ہے۔ میں آپ کے اور بھابی کے لیے شاہانہ بریک فاسٹ تیار کرتی ہوں۔ آپ بس فٹافٹ انہیں گھر لے آئیے۔“

سرمد نے سخت اور انکاری لہجے میں جواب دیا۔ ”نہیں، ہرگز نہیں۔ نہ میں جاؤں گا اور نہ تمہیں جانے دوں گا۔ خود گئی ہے، خود آئے گی۔“

مدحت نے حتی الامکان بھائی کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن سرمد پتھر کی طرح اپنے موقف پر اڑا رہا۔

☆☆☆

رونق کے اچانک اور بے وقت پہنچنے پر ماں باپ، بہن بھائی اسے حیران پریشان نظروں سے دیکھ رہے تھے لیکن کسی نے اس سے کوئی سوال نہیں کیا جبکہ وہ منتظر تھی کہ ماں اسے گلے لگائے، چومے چمکارے لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہوا بلکہ سب ناشتے کی میز پر بیٹھ کر کھانے پینے میں مصروف ہوگئے۔ بالآخر اشعر نے نرم اور پُرسکون آواز میں بہن کو مخاطب کیا۔ ”آپی! آئیے، آج اتوار ہے نا۔ اماں نے زبردست قسم کا ناشتا بنایا ہے۔“

اب رونق پھٹ پڑی۔ اشعر سے مخاطب ہو کر غضب ناک آواز میں بولی۔ ”مجھے کیا ناشتے کی دعوت دے رہے ہو۔ تم تو سعودی عرب میں ہی صحیح تھے۔ یہاں آکر تو تم نے میرا کھانا، پینا، جینا سب دوبھر کر دیا ہے۔ کیا نظر آگیا ہے تمہیں اس دو ٹکے کی لڑکی میں کہ اس پر عاشق ہو گئے؟ اب اس کا بھائی میری جان کھا رہا ہے کہ کسی طرح تمہاری اور اس کی شادی ہو جائے۔“

اشعر سمیت گھر کے تمام افراد ہکا بکا ہو کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے رونق کو تک رہے تھے اور رونق ہچکیوں اور سسکیوں کے درمیان پچھلی رات میں ہونے والی نوٹنکی کی منظر کشی کر رہی تھی۔ سب ناشتا چھوڑ کر اس کی داستان سن رہے تھے۔ ماں نے اسے دلاسا تسلی دیتے ہوئے انتہائی نرم لہجے میں کہا۔ ”رونق، میری بچی! سرمد نے اگر یہ بات تمہارے سامنے رکھی ہے تو اس نے کوئی معیوب کام تو نہیں کیا۔ وہ ایک جوان بہن کا بھائی ہے۔ بہن کی شادی اس کی ذمے داری ہے اور اگر وہ اپنی بہن کی شادی تمہارے بھائی سے کرنا چاہتا ہے تو اس میں اتنا مشتعل ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ دونوں بہن بھائی انتہائی مہذب، سمجھ دار اور سلجھے ہوئے مزاج کے ہیں۔ میرے خیال میں تو اس رشتے میں کوئی برائی نہیں۔ وہ لڑکی ہمارے گھر کے لیے بہت اچھی بہو ثابت ہو سکتی ہے۔“

رونق کی چھوٹی بہن نے ماں کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ”ہاں امی! مجھے بھی مدحت بہت پسند ہے۔“

ماں بیٹے کی باتوں پر رونق مکمل جوالا مکھی بن گئی جس کے شعلے آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔ وہ غراتے ہوئے بولی۔ ”میرے میاں اور نند میں ایسی کیا خوبی نظر آگئی جو اتنے قصیدے پڑھے جا رہے ہیں۔“

اس بار رونق کے والد بول پڑے۔ ”ارے بھئی تم جیسی ناقص العقل، بدمزاج، پھوہڑ کو نبھانا کوئی آسان کام ہے؟ وہ تو ان دونوں بہن بھائی کا ہی دل گردہ ہے جو تمہیں برداشت کر رہے ہیں۔ اس سے بڑی خوبی بھلا کیا ہو سکتی ہے۔ میری مانو تو کوئی مناسب تاریخ طے کر کے......“

رونق اس بات پر یوں اچھلی جیسے بچھو نے ڈنک مارا ہو۔ تلملاتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اپنا بھاری بھر کم پرس اٹھایا اور کمرے سے نکل گئی۔ اشعر نے پیچھے دوڑ لگائی اور ایک جھٹکے سے اس کا بازو پکڑ کر کھینچا اور تمسخرانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”آپی! آپ نے بھی حد کر دی۔ بات نہ بات کا سر پیر۔ میں نے کون سا مدحت سے نکاح کر لیا ہے۔“

رونق نے ہیجان زدہ آواز میں جواب دیا۔ ”نہیں کیا تو کر لو گے کیونکہ سارے ووٹ تمہارے ہی حق میں پڑ رہے ہیں۔“

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
ایک ادارہ، چار ماہانہ مطبوعات
دنیا بھر میں
خدمات
اور مصنوعات
کی موثر تشہیر کے لیے
جاسوسی ڈائجسٹ سسپنس ڈائجسٹ ماہنامہ پاکیزہ ماہنامہ سرگزشت
عالمی ادب سے شاہکار کہانیوں، افسانوں اور معلومات کے خزانوں کا انتخاب
جنھیں دنیا بھر کے لاکھوں قارئین ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں
JASOOSI
PUBLI
جہاں جہاں اردو پڑھی اور سمجھی جاتی ہے، وہاں یہ رسائل باقاعدگی سے پہنچتے ہیں
63-C فیز ٹو ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ کراچی
فون نمبر: 35804200، 35802552 (92-21) فیکس: 35802551 (92-21) ای میل: group@hotmail.com

اشعر نے ایک بلند آہنگ قہقہہ لگایا اور کھلکھلاتے ہوئے بولا۔ ''آپی...آپی! گہرے سانولے رنگ کے علاوہ آپ کی نند میں کئی خوبیاں ہیں کہ..... جس گھر میں جائے گی، روشنی ہی روشنی بکھیر دے گی۔''

رونق نے اپنی متورم گول گول آنکھیں مٹکاتے ہوئے استفسار کیا۔ ''ہائے ایسا کون سا الیکٹرانک پلانٹ فٹ ہے اس کے جسم میں؟''

اشعر نے بہن کے کان میں سرگوشی کی۔ ''گورنمنٹ سرونٹ ہے۔ جب تک کرسی ہے، ماہانہ تنخواہ پکے پھل کی طرح اپنے ہی گھر میں ٹپکے گی اور ریٹائرمنٹ کے بعد بھی لاکھوں کی گریجویٹی فنڈ اور پھر ساری زندگی پنشن کا آسرا بھی رہے گا۔ میں کوئی خسارے کا سودا تھوڑا۔۔۔ ہی کر رہا ہوں۔ ارے آپی! آپ دیکھنا آم کے آم اور گٹھلیوں کے دام۔''

بھائی کی بات پر رونق کے غصے کا پارہ اور چڑھ گیا۔ ایک لمبی ''ہوں'' کے بعد اس کی گھن گرج کا پھر سے آغاز ہوگیا۔ ''دیر سے ہی سہی، میرے دماغ میں اب ساری بات آگئی ہے۔ اماں، ابا اور روشن کو بغیر پیسوں کی نوکرانی مل جائے گی اور تمہاری تو لاٹری ہی کھل جائے گی۔ تم تو ہو ہی ایک نمبر کے نکھٹو، نکمے۔ تمہیں تو یہ مجھو ذریعۂ معاش مل جائے گا لیکن ابھی سرمد کے سامنے تمہاری قلعی کھول دوں نا تو فوراً اس رشتے سے پھر جائے گا۔ ابھی تو بچو تم نے کہہ رکھا ہے کہ بزنس مینجمنٹ میں ڈگری لے رکھی ہے اور لاکھوں ریال میں تمہیں تنخواہ ملتی ہے اور تمہاری رہائش وہاں کے بڑے سے ہوٹل میں ہے جس کے تمام اخراجات تمہاری کمپنی پے کرتی ہے۔ ابھی حقیقت بتادوں تو یہ سرمد اور اس کی بہن تمہیں اپنی دہلیز پر کھڑا بھی نہیں رہنے دیں گے۔'' چند لمحے کے لیے وہ سانس لینے رکی اور پھر سلسلہ جوڑتے ہوئے بولی۔ ''سرمد اور مدحت بھی اتنے سیدھے نہیں ہیں۔ دونوں بھائی بہن نے کوئی کچی گولیاں نہیں کھیل رکھی ہیں۔ جیسے ہی انہیں علم ہوگا کہ تم اس فائیو اسٹار ہوٹل کے رہائشی نہیں بلکہ وہاں ہر کمرے میں جاکر بیڈز کی چادریں بدلتے ہو تو دونوں تمہیں اپنے جوتے کی نوک پر رکھیں گے اور جب پتا چلے گا نا کہ تمہارے پاس کوئی ڈگری ہے، نہ کوئی ڈپلوما بلکہ میٹرک کا سرٹیفکیٹ بھی نہیں ہے تو وہ تمہارے منہ پر تھوکیں گے بھی نہیں اور تمہاری ایک اضافی خوبی پر سے بھی پردہ ہٹادوں گی کہ خیر سے تمہارے پاس اقامہ بھی نہیں ہے اس لیے ہر دو چار ماہ میں سعودی پولیس سلاخوں کے اندر تمہاری مہمان نوازی کرتی ہے۔ یہ سب سن کر تو سرمد ضرور بہن کا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں دے کر فخر محسوس کرے گا۔''

اتنی کھری کھری سننے کے بعد اشعر کا اپنے پیروں پر کھڑا رہنا محال ہوگیا۔ وہ قریب رکھے صوفے پر دھم سے بیٹھ گیا۔ چہرے کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہوگیا لیکن تھا رونق کا ہی بھائی۔ لمحاتی توقف کے بعد اینٹ کا جواب پتھر سے دیا۔ رونق کے چہرے پر جو فاتحانہ شفق پھوٹی پڑ رہی تھی، وہ آن واحد میں غائب ہوگئی۔

اب باری اشعر کی تھی۔ وہ زخم خوردہ سانپ کی طرح پھنکارتا ہوا بولا۔ ''بہت ہوگیا۔ عزت کے ساتھ اپنے شوہر کے گھر کی چار دیواری میں رہ لو آپا.... محترمہ.....! ابھی سارا کچا چٹھا کھول کر سرمد بھائی کے سامنے رکھ دوں نا تو زندگی بھر سر کو ہاتھ لگا کر روؤ گی۔ اماں ابا نے اپنی عزت و ناموس بچانے کے لیے کس طرح داؤ پیچ آزمائے ہیں اور کس طرح سرمد بھائی کو گھیرا ہے۔ مجھے سب پتا ہے۔ آپ کی شادی میں، میں ننھا نادان نہیں تھا۔ اچھے برے کی تمیز تھی مجھے۔ اگر ذرا بھی سرمد بھائی کی فیملی کو تمہارے کرتوتوں کا علم ہوجاتا نا تو ایمان سے برات واپس چلی جاتی۔ مجھے لگتا ہے آپ نے خود بھی کوئی چلہ کاٹا تھا جب ہی تو اتنا اچھا سسرال ہاتھ لگ گیا۔''

جوں ہی اشعر نے بہن کو آئینہ دکھایا، اس کی بولتی بند ہوگئی۔ خوفزدہ نظروں سے بھائی کو دیکھتے ہوئے اپنی پیشانی کا پسینا پونچھا اور خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولی۔ ''بات سنو! اپنے ہونٹوں کو ہمیشہ کے لیے مقفل لگا کر چابی مجھے دے دو۔ یہی کام میں بھی کر رہی ہوں۔ اس معاہدے کی پاسداری ہم دونوں پر لازم ہے۔ اگر دونوں میں سے ایک بھی اپنے عہد سے مکرتا ہے تو دوسرا ابھی اس چابی کو کسی گٹر میں پھینک سکتا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ تنتناتی ہوئی گھر سے نکل گئی۔ اشعر ناپسندیدہ نظروں سے بہن کو جاتا ہوا دیکھتا رہا۔ اس بار اس نے جھوٹوں بھی رکنے کے لیے نہیں کہا۔

رونق ماں کے گھر سے نکل تو گئی تھی لیکن اب اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ جائے تو کہاں جائے۔ متلاشی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا تو دور دور تک کوئی ٹیکسی نظر نہیں آئی ہاں البتہ دور کھڑا ایک رکشا نظر آیا۔

جب رونق اپنے گھر میں داخل ہوئی تو سرمد اور مدحت نے اسے حیرانی سے دیکھا لیکن دونوں نے اپنی زبانیں بند رکھیں۔ مدحت نے نہایت خوش دلی سے بھاوج کو ویلکم کیا اور پھر کہا۔ ''بھابی! آپ ہاتھ منہ دھو کر اپنا حلیہ درست کرلیں۔ میں آپ کے لیے ناشتا تیار کرتی ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ کچن

کی جانب مڑ گئی۔ سرمد نے اپنی بائیک اٹھائی اور بغیر کچھ کہے گھر سے نکل گیا۔ رونق نے آئینے میں اپنے آپ کو دیکھا تو اسے مدحت کا مشورہ بالکل صحیح لگا۔ وہ فوراً باتھ روم میں گھس گئی۔ وہاں سے نکلی تو گرما گرم ناشتا اور چائے اس کے منتظر تھے۔ بغیر کسی شرمندگی کے وہ ناشتے پر ٹوٹ پڑی۔

☆☆☆

فرزین نے برگر کا بڑا سا پیس مدحت کے منہ میں ٹھونستے ہوئے کہا۔ ''بس، بہت رولیا۔ اب تھوڑا بہت کچھ کھاؤ اور پھر مجھے بتاؤ کہ اس بار تمہاری بھابی نے کون سا نیا گل کھلایا ہے؟''

چائے ختم کرنے کے بعد فرزین نے استفسارانہ نظروں سے مدحت کی جانب دیکھا تو اس نے گلوگیر آواز میں نہایت آہستگی سے کہا۔ ''فرزین! بھابی گرنہیں دیتی، نہ دے لیکن گر جیسی بات تو کرلے۔ میرے رنگ روپ سے انہیں خدا واسطے کا بیر ہے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ انگارے چبانے لگتی ہیں۔''

فرزین نے ہاتھ جھٹکتے ہوئے کراری آواز میں کہا۔ ''ارے خاک ڈال اپنی بھابی پر اور یہ بتا بھابی کے بھائی نے کچھ اس موضوع پر اظہارِ خیال فرمایا یا دونوں طرف ابھی تک خاموشی کا راج ہے؟''

مدحت نے ایک سرد آہ بھری اور کرسی سے اٹھتے ہوئے بولی۔ ''فرزین! بھابی یہ شادی کبھی بھی نہیں ہونے دیں گی۔ اس لیے سب کچھ بھول جانا ہی بہتر ہے۔''

فرزین نے اس کا ہاتھ کھینچ کر اسے دوبارہ اس کی نشست پر بٹھایا اور سنسناتے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''بے وقوف لڑکی! اتنی جلدی ہار نہیں مانتے۔ جب تم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہو تو مل کر احتجاج کرو اور اس معاملے کو آگے بڑھاؤ۔ تم اور اشعر ڈٹ گئے نا تو سب کو ہتھیار ڈالنے پڑیں گے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے قریب کھڑے بیرے کو دو کپ چائے کا مزید آرڈر دے دیا۔

اچانک چائے پیتے ہوئے فرزین اپنی نشست سے اچھل پڑی۔ مدحت نے گھبرا کر پوچھا۔ ''یہ اچانک تمہیں کیا ہوگیا؟''

فرزین نے چائے کے کپ کو چومتے ہوئے اپنی آنکھیں مٹکائیں اور بولی۔ ''واہ، کیا کیف ہے۔ کیا سرور ہے۔ ارے دماغ میں ایسا جھماکا ہوا ہے کہ اب تو تیری شادی اشعر سے ہونی ہی ہونی ہے اور تیری بھابی تجھے اور اشعر کو دیکھ کر ہاتھ ملتی رہ جائے گی۔''

مدحت نے پُراشتیاق لہجے میں فوراً سوال کیا۔ ''اللہ فرزین! جلدی سے بتاؤ۔ ایسی کون سی ترکیب تمہارے دماغ میں آئی ہے؟''

مدحت ٹکٹکی باندھے فرزین کو دیکھے جارہی تھی۔ زبان سے کچھ نہیں کہا لیکن انتہائی غور وخوض کے ساتھ اس کا ہر ہر لفظ سن رہی تھی۔ فرزین نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''ہاں تو تمہاری بھابی سے کوئی اولاد نہیں ہے لہٰذا اپنے بھائی کی جیب میں ایک خوبصورت حسینہ کی تصویر رکھ دو جو تمہاری بھابی کے ہاتھ لگ جائے گی۔ جھگڑا ہوگا اور اس وقت بھائی صاف کہہ دیں کہ رونق صاحبہ سے تو کوئی اولاد نہیں ہے لہٰذا میں دوسری شادی کرنے جارہا ہوں۔ تیری بھابی پر تو آسمانی بجلی یوں کڑکڑاتی ہوئی گرے گی کہ جل کر بھسم ہوجائے گی۔ اب محترمہ ہمارے ہیرو اشعر صاحب کی انٹری ہوتی ہے۔ وہ سرمد بھائی کے پاس بھاگے بھاگے آئیں گے۔ اپنی روتی بلبلاتی بہن کو پہلے تو گلے لگائیں گے پھر اسے تسلی تشفی دے کر کہیں گے۔ 'میری بہنا! ابھی تیرا بھائی زندہ ہے۔ وہ تیرا گھر نہیں بگڑنے دے گا۔' اور پھر ایک جھوٹا تلے پائے گا کہ سرمد بھائی کبھی کسی اور لڑکی کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھیں گے اور مدحت بنتِ سلطان کی شادی خانہ آبادی اشعر خان سے طے کی جاتی ہے۔'' یہ کہہ کر فرزین نے فاتحانہ نظروں سے مدحت کی جانب دیکھا۔

مدحت نے مایوس نظروں سے فرزین کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''فرزین! زبانی کلامی تو تمہارا یہ پلان اپنی جگہ مکمل اور لاجواب ہے لیکن بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے گا؟ بھائی جان سے کون بات کرے گا؟ اشعر کو کون راضی کرے گا اور پھر یہ ڈراما کس طرح شوٹ ہوگا؟''

فرزین نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے نپے تلے انداز میں کہا۔ ''گھنٹی میں باندھوں گی۔ تم بس اپنے بھائی جان اور اشعر سے میری ایک ملاقات کروادو۔ دونوں کو ایسے پینترے اور داؤ پیچ سکھاؤں گی کہ ہمارا یہ ڈرامائی صرف ہٹ ہوگا بلکہ انتہائی کامیابی کے ساتھ آگے بھی رواں دواں رہے گا۔''

مدحت نے ہنستے ہوئے اسے اٹھایا اور بولی۔ ''مجھے رات بھر کی مہلت دو۔ میں سوچ کر جواب دوں گی کہ کیا کرنا چاہیے۔''

فرزین نے اپنی نشست سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''چلو ٹھیک ہے۔ اچھی طرح سوچ لو۔ بس یہی ایک چانس ہے تمہارے پاس۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا پرس سنبھالا اور دونوں اپنے اپنے گھر روانہ ہوگئیں۔

مدحت گھر پہنچی تو گھر کی ملازمہ نے بتایا کہ صاحب جی ابھی دفتر سے نہیں لوٹے ہیں اور بیگم صاحبہ بھی شاپنگ کے لیے گئی ہیں۔ مدحت نے جواب میں ''ہوں ہاں'' کی اور کہا۔ ''بوا! آج میں کچھ نہیں کھاؤں گی۔''

مدحت نے شاور لیا اور اپنے سیاہ لمبے بالوں کو تولیے سے خشک کرنے لگی۔ اپنی پشت پر اچانک اسے کسی کی آہٹ محسوس ہوئی۔ وہ فوراً پلٹی۔ اس کے بالکل قریب اشعر کھڑا تھا۔ نہایت توجہ اور انہماک کے ساتھ دزدیدہ نگاہوں سے اسے تک رہا تھا۔ یکا یک اس کے پلٹنے پر بری طرح بوکھلا گیا اور گھبرا کر بولا۔ ''وہ..... وہ..... میں آپ کے حسین بالوں میں الجھ گیا تھا۔ سچ کہتا ہوں، اتنے لانبے، گھنے اور سیاہ بال میں نے اور کسی کے نہیں دیکھے۔''

مدحت کو فوراً دوپٹے کی غیر موجودگی کا احساس ہوا اور اس نے تولیے کو اپنے سینے پر پھیلاتے ہوئے سوال کیا۔ ''آپ کب آئے، مجھے پتا ہی نہیں چلا؟''

اشعر نے شوخ نظروں سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''کاش! ابھی اور پتا نہیں چلتا بلکہ زندگی بھر پتا نہیں چلتا اور میں آپ کو یوں ہی دیکھتا رہتا۔''

مدحت نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا اور التجا آمیز لہجے میں بولی۔ ''خدارا آپ جلدی سے چلے جائیں۔ اگر بھائی جان اور بھابی آ گئے اور انہیں کوئی سن گن مل گئی تو ہنگامہ کھڑا ہو جائے گا۔''

اشعر نے عقابی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اچھا تو آج بہن صاحبہ بھی نہیں ہیں اور بہنوئی صاحب بھی غائب ہیں۔ یعنی گھر میں ہم صرف دو نفوس ہیں۔''

مدحت نے استہزائیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''جی نہیں، جناب! دو نفوس نہیں بلکہ تین ہیں۔ خیر سے ہماری ماسی کچن میں سبزی کاٹ رہی ہے۔''

''اوہ'' کہتے ہوئے اشعر ذرا پرے کھسک گیا۔ اس کے ہونٹوں پر کھسیانی سی ہنسی تھی۔ اگلے ہی لمحے گھر سے باہر رکشا رکنے کی آواز آئی۔ اشعر نے گھبرا کر کہا۔ ''شاید آپی آ گئیں۔ انہیں کس طرح راضی کیا جائے، یہی پوچھنے کے لیے میں آیا تھا۔ باقی تو میرے گھر کے تمام افراد اس رشتے کے لیے راضی ہیں۔''

مدحت نے لرزتی آواز میں جواب دیا۔ ''آپ اس سلسلے میں میری دوست فرزین سے مل لیجیے گا۔ وہ اس مسئلے کا حل بتا کر آپ سے مکمل طور پر تعاون کرے گی۔ بس آپ عقبی دروازے سے رفو چکر ہو جائیے۔''

اشعر نے چلتے چلتے افراتفری میں ایک کام کا سوال کر ڈالا۔ ''آپ کی دوست ملے گی کہاں اور کب؟''

مدحت نے دل کی دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے گھبراہٹ کے عالم میں کہا۔ ''ایک چھوٹا سا ریسٹورنٹ ہے ''چائے ہو جائے''۔ ہمارے اسکول سے قریب ہی ہے۔ آپ ٹھیک چار بجے اتوار کے دن وہاں پہنچ جائیے گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' کہتے ہوئے اشعر نے وہاں سے دوڑ لگا دی اور لمحوں میں یہ جا وہ جا۔ جب رونق شاپنگ بیگز سے لدی پھندی گھر میں داخل ہوئی تو میدان صاف ہو چکا تھا۔ مدحت نے ایک سکون کا سانس خارج کیا اور آگے بڑھ کر رونق کا بوجھ ہلکا کرنے لگی۔

☆☆☆

اتوار کی رات مدحت نے پہلی فرصت میں فرزین کو کال کی اور دھڑکتے دل سے پوچھا۔ ''فرزین! تمہاری اشعر سے ملاقات ہوئی؟ اور تم نے اپنے پلان سے اسے آگاہ کیا؟ اسے تم نے بتا دیا کہ اسے اب بھائی جان سے بات کرنا ہے اور پھر بھائی جان کو اپنا کردار کس طرح ادا کرنا ہے، اچھی طرح سمجھا دیا نا؟''

فرزین نے جواباً کہا۔ ''مدحت! میں تم سے بعد میں بات کرتی ہوں۔ دراصل اس وقت میری چھوٹی بہن کے رشتے کے سلسلے میں کچھ مہمان آئے ہوئے ہیں۔''

مدحت نے سرعت کے ساتھ دوسرا سوال داغ دیا۔ ''خیر، باقی باتیں تو بعد میں ہوں گی لیکن یہ تو بتاؤ تمہیں اشعر کیسا لگا؟ میری پسند، پسند آئی؟''

''تمہاری پسند، اف میرے خدا! دل چاہا دل نکال کر اس کے قدموں میں رکھ دوں۔ بخدا مدحت! جب اشعر کو دیکھا تو دل نے کہا۔ کاش پہلے اس شخص سے ملی ہوتی۔''

''کیا کہہ رہی ہو؟'' مدحت چیخی۔ اس سے پہلے کہ مدحت کچھ اور کہتی، کال کاٹ دی گئی۔ مدحت کے دل میں کسی نے برچھی اتار دی۔ اپنے ہاتھ سے اپنے پیر پر کلہاڑی مارنے والا محاورہ اسے آج سمجھ میں آیا تھا۔ دوسرے دن اسکول میں بھی دونوں ایک دوسرے سے کافی دور دور رہیں۔ ریسٹورنٹ کا وہ گوشہ بھی اب اجاڑ ہو گیا تھا جہاں دونوں برگر اور چائے کے مزے لیتیں اور ہنستی بولتی تھیں۔ اسکول میں اسٹاف اور اسٹوڈنٹس کے درمیان بھی کھیوں والی جھنجھناہٹ جاری تھی کہ اتنی گہری دوستی میں ایسی کیا دراڑ آ گئی جو ایک دوسرے کا پرچھاواں بھی نہیں برداشت کر رہی ہیں۔ دونوں نے بہت خوبصورتی کے ساتھ سب کو

pklibrary.com

ٹال دیا۔ گاہے بگاہے اکثر مقامات پر مدحت نے فرزین اور اشعر کو ساتھ ساتھ گھومتے پھرتے بھی دیکھا بلکہ ایک بار شہر کے بڑے سے شاپنگ مال میں مدحت ان دونوں سے ٹکرا گئی۔ اسے دیکھ کر دونوں اس طرح گھبرائے جیسے کسی عفریت کو دیکھ لیا ہو۔ مدحت کے ہونٹوں پر ایک گہری طنز بھری مسکراہٹ تھی۔ پھر وہ خود ہی دونوں کے راستے سے ہٹ گئی۔ راستہ ملتے ہی دونوں وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ اپنی نمناک آنکھوں کو صاف کرتی ہوئی وہ مال سے نکل گئی حالانکہ اسے ابھی مزید شاپنگ کرنا تھی۔ گھر آکر وہ اپنے کمرے میں بند ہوگئی۔ ملازمہ کمرے کا دروازہ بجاتے بجاتے تھک گئی تو وہ گھبرا کر سرمد کے پاس گئی اور بولی۔

''صاحب جی! بیگم صاحبہ تو پڑوس میں گئی ہیں۔ ہم نے آپ کا اور مدحت بی بی کا کھانا لگا دیا ہے۔''

سرمد کسی کتاب کے مطالعے میں غرق تھا۔ اس نے نظریں اٹھائے بغیر کہا۔ ''اچھا میں آتا ہوں۔'' سرمد کے پکارنے پر مدحت نے فوراً دروازہ کھول دیا۔ مدحت کی صورت دیکھ کر سرمد نے گھبرا کر کہا۔ ''یہ تم نے کیا حالت بنا رکھی ہے، کیا ہوا ہے تمہیں؟''

بھائی کی اس محبت و شفقت پر مدحت کا دل بھر آیا اور وہ بھائی سے لپٹ کر رو پڑی۔ سرمد نے اپنے ہونٹ بہن کی پیشانی پر رکھ دیے پھر گھبرا کر بولا۔ ''اوہو، تمہیں تو بخار ہو رہا ہے۔ چلو پہلے ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں پھر کھانا کھائیں گے۔'' آج بہن کے آنسوؤں نے اسے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔ جوان بہن کی تنہائی کے احساس نے اسے حد درجہ ملول کر دیا تھا۔ وہ کافی رات تک جاگتا رہا اور اس مسئلے پر سوچتا رہا۔ دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔ کاش رونق مان جاتی تو اشعر کی اور مدحت کی جوڑی کیسی لاجواب ہوتی۔ یہ خیال آتے ہی اس کے ذہن میں ایک نئی سوچ کلبلائی کہ اچانک اشعر نے یہاں آنا کیوں کم کر دیا اور مدحت بھی بولائی بولائی سی سارے گھر میں چکراتی پھرتی ہے جیسے اس کی کوئی قیمتی چیز گم ہوگئی ہو۔ ضرور کہیں کوئی گڑبڑ ہے۔ آج اس نے مصمم ارادہ کرلیا تھا کہ بہت جلد وہ کوئی مناسب رشتہ دیکھ کر بہن کو رخصت کر دے گا ورنہ وہ تو یوں ہی گھل گھل کر مر جائے گی۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد اس نے سکون کی سانس لی۔

☆☆☆

اکرام الدین اور عفیفہ بیگم بے انتہا خوش تھے کہ کسی طور پر بیٹی شادی کے لیے مان تو گئی۔ اشعر اور اس کے خاندان سے ملنے کے بعد تو وہ اور بھی مطمئن اور خوش تھے کیونکہ اشعر اور اس کی فیملی ہر لحاظ سے فرزین کے لیے انہیں مناسب اور بہتر لگی حالانکہ اس سے بہتر رشتے بھی اس کے لیے تھے لیکن فرزین دراصل اشعر کی مردانہ وجاہت پر مر مٹی تھی۔ شادی کی تیاریاں دونوں جانب پورے زور و شور سے جاری تھیں۔ رونق آج کل بجائے شوہر کے گھر رہنے کے، میکے میں رہنے کو ترجیح دے رہی تھی۔ سرمد بھی مصلحتاً خاموش رہا کیونکہ اس نے نہایت سنجیدگی سے اس بات پر کافی غور و خوض کیا کہ مدحت کے لیے جو بھی رشتہ آتا ہے، رونق کوئی نہ کوئی ان میں میخ نکال دیتی ہے۔ اسی لیے اس مرتبہ جب اس کے ایک عزیز ترین دوست کے بھائی کا رشتہ مدحت کے لیے آیا تو سرمد نے کانوں کان بیوی کو خبر نہیں ہونے دی۔ مدحت کی مرضی معلوم کر کے فوری رشتہ طے کر دیا۔ اس کے بعد اس نے ایک دن بہن کو اپنے پاس بٹھا کر اپنا شفقت بھرا ہاتھ اس کے سر پر پھیرا اور نہایت متانت سے بولا۔ ''مدحت! میں صرف تمہارا بڑا بھائی ہی نہیں بلکہ ابا اور اماں کے انتقال کے بعد ان کا کردار بھی میں نے ادا کیا ہے۔ مجھ سے اگر کہیں کوئی کوتاہی ہوئی ہو تو.....'' اتنا کہہ کر اس کی آواز بھرا گئی۔ مدحت کی آنکھوں سے بھی ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

سرمد نے ان آنسوؤں کو اپنی ہتھیلیوں پر سمیٹ لیا اور لمحاتی توقف کے بعد اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے بولا۔ ''مدحت! زمانے کی اونچ نیچ اور سرد و گرم کو میں اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ جو رب نے تمہارے لیے بہتر نہیں سمجھا، تمہیں نہیں دیا اور جو بہتر سمجھا وہ دے رہا ہے۔ اس کی قدر کرنا۔ اپنی خواہشات اور تمناؤں کو پس پشت ڈال کر کاتبِ تقدیر کی رضا کو مقدم سمجھنا۔ فہیم کا انتخاب میں نے یوں ہی نہیں کیا۔ وہ تمہارا بہت اچھا شوہر ثابت ہوگا۔ تم اپنے سارے دکھ بھول جاؤ گی۔ وقتی طور پر تو اگر مالکِ حقیقی ہماری کسی خواہش کو رد کرتا ہے تو ہم غم سے نڈھال ہو جاتے ہیں لیکن آنے والا وقت ہمیں اچھی طرح سمجھاتا ہے کہ قدرت نے ہمیں کتنے بڑے طوفان سے محفوظ رکھا۔''

مدحت نے بھائی کی نصیحتوں کو عارضی طور پر سن لیا لیکن وہ دل ہی دل میں پکا ارادہ کر چکی تھی کہ وہ فرزین اور اشعر سے ایسا انتقام لے گی کہ دونوں کے لیے یہ زمین تنگ کر دے گی۔ زخم خوردہ ناگن کی طرح وہ اپنا پھن پٹخ رہی تھی۔ بہت طویل سوچوں کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ دونوں کی موت ہی اس کے دل کو سکون اور ٹھنڈک بخش سکتی ہے۔ فیصلہ کن انداز میں اس نے اپنی آنکھیں جھپکائیں اور خود کلامیہ انداز میں بولی۔

''اس کے لیے مجھے ابھی سے تیاری کرنا ہوگی۔''

☆☆☆

اشعر اور فرزین یہ سمجھ رہے تھے کہ مدحت ہرگز ہرگز ان کی شادی کی تقریب میں شرکت نہیں کرے گی۔ دیگر تقریبات میں تو اس نے اپنی خرابی طبیعت کا بہانہ بنالیا لیکن نکاح والے دن وہ اپنی تمام سج دھج کے ساتھ شریک ہوئی۔

اشعر اور فرزین کی شادی میں مدحت جس قیامت خیز اور کربناک صورتِ حال سے گزر رہی تھی، وہی جانتی تھی لیکن اپنے آپ کو خوش و خرم ظاہر کرنے کے لیے وہ اتنی بہترین اداکاری کر رہی تھی کہ کوئی بھی یہ نہیں جان سکا کہ اس کے دل میں کیا لاوا پک رہا ہے۔ بظاہر ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی لیکن من ہی من میں وہ ایک خونی منصوبے کی پلاننگ کر چکی تھی۔

اس کا دل چاہا کہ دلہن بنی فرزین کے کان میں کہہ دے کہ ایک ڈرامے کا اسکرپٹ تم نے لکھا تھا لیکن وہ شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہوگیا لیکن جو ڈراما میری پروڈکشن میں کھیلا جائے گا، اس کا انجام دیکھ کر ایک زمانہ معترف ہو جائے گا۔

محفل میں ہر طرف زرق برق لباسوں کی بہار تھی۔ نکاح ہو چکا تھا۔ دونوں خاندان آنے والے مہمانوں سے مبارک بادیاں وصول کر رہے تھے۔ اسی اثناء میں فرزین کے والد گھبرائے ہوئے حواس باختہ خواتین والے حصے میں داخل ہوئے اور فرزین کی والدہ کو پکارا۔ ''ارے بھئی عفیفہ! ذرا میری بات سنو۔''

عفیفہ بیگم مہمانوں میں گھری ہوئی ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھیں۔ شوہر کی آواز پر اپنی قیمتی ساڑی سنبھالتی ہوئی آئیں۔ اکرام الدین بیوی کو ہال کے ایک گوشے میں لے گئے جہاں لوگ نسبتاً کم تھے اور پھر انتہائی خفیہ انداز میں ایک دھماکا خیز خبر بیوی کے گوش گزار کی۔ ''اری نیک بخت! میں نے باہر مردوں میں تو بڑی عجیب بات سنی ہے۔''

عفیفہ بیگم نے اپنے سینے پر دوہتڑ مارتے ہوئے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ ''ہائے، ایسا کیا سن لیا جو تمہارے چہرے کا رنگ ہی بدل گیا ہے؟''

اکرام الدین نے اپنی جیب سے رومال نکالا اور پسینے سے تر اپنی پیشانی پونچھی اور بولے۔ ''یہ لڑکا باہر کے ہوٹلوں میں معمولی کام کر کے اپنے خاندان کی کفالت کر رہا ہے۔ تمہاری بیٹی کے معیار پر یہ کسی طرح پورا نہیں اترے گا۔ نکاح ہو چکا ہے ورنہ ہم کچھ ہاتھ پیر مارتے۔ معاملہ ختم کر کے کمبخت کے لیے کوئی دوسرا بر تلاش کرتے۔''

عفیفہ بیگم کا چہرہ بھی لٹک گیا۔ تھوڑی دیر پہلے کی مسرت اور چہچہاہٹ ہوا ہوگئی۔ آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب اتر آیا۔ سسک کر بولی۔ ''کتنا سمجھایا بدنصیب کو مگر اپنی ضد پر اڑی رہی۔ بس اس کا نصیب اسی لڑکے کے ساتھ بندھا تھا۔ قسمت کا لکھا کون مٹا سکتا ہے۔ اس کے ہاتھ ٹوٹے اور اسی کے گلے میں پڑے۔ بس اب حالات کا تقاضا یہ ہے کہ خاموشی سے رخصت کر کے سارے معاملے پر خاک ڈالو۔ جیسا کیا ہے ویسا ہی بھگتے گی۔''

والدین کے درمیان ہونے والے مذاکرات اڑتے ہوئے فرزین کی بہن نورین کے کانوں تک پہنچ گئے اور اس نے یہ سنسنی خیز انکشاف جب فرزین تک پہنچایا تو چند لمحوں کے لیے تو وہ بالکل گنگ ہوگئی۔ پھر کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن آواز ہی نہیں نکل پائی۔ شدتِ غم سے چکرا کر وہیں ڈھیر ہوگئی۔ جب ہوش میں آئی تو پتا چلا کہ پیا کے گھر میں قدم رنجہ فرما چکی ہیں پھر زہریلی ناگن کی طرح پھنکاری اور آہستہ سے بولی۔ ''اشعر! تو نے مجھے اتنا بڑا فریب دیا ہے۔ میں تجھے اور تیرے خاندان کو جینے نہیں دوں گی۔'' غصے کی تمتماہٹ سے دلہناپے کا حسن مزید بڑھ گیا تھا۔ آنکھوں میں خون اتر آیا تھا لیکن سبھوں کی زبان پر ایک ہی جملہ تھا۔ ''دلہن بہت حسین لگ رہی ہے۔'' لیکن فرزین کو اس وقت یہ تعریفوں کے ڈونگرے یوں لگ رہے تھے جیسے آگ کے شعلے بھڑک رہے ہوں۔ جب حجلۂ عروسی میں اسے لا کر بٹھایا گیا تو اچانک اس کی نظر ٹیبل پر رکھی ہوئی پھلوں کی ٹرے پر پڑی جس میں سائڈ میں بنی جھلمل کرتی چھری بھی رکھی تھی۔

فرزین نے گھونگھٹ کی اوٹ سے معنی خیز نگاہوں سے چھری کی جانب دیکھا اور پھر اپنی عقابی نظریں کمرے میں دوڑائیں۔ جب اسے کلی طور پر اطمینان ہوگیا تو اس نے فوراً اچک کر چھری اپنے ہاتھ میں لے لی اور اپنے جھلملاتے دوپٹے میں چھپالی۔ یہ فرزین کی خام خیالی تھی کہ کمرے میں اس کے علاوہ کوئی نہیں ہے۔ کمرے میں اس کی آمد سے پہلے مدحت آچکی تھی۔ چونکہ وہ دلہن کے کمرے کا وزٹ رونق اور روشن کے ساتھ کر چکی تھی اور اس خفیہ جگہ کا بھی انتخاب کر چکی تھی جہاں آج رات اپنے دونوں دشمنوں کو خون میں نہلانا تھا۔ قیمتی اور دبیز پردوں کے درمیان چھری بنا کردہ فرزین کی ایک ایک موومنٹ کو ٹریس کر رہی تھی۔ اس کی حیرانی کی انتہا نہیں رہی جب فرزین نے اپنے دوپٹے میں چھری چھپالی۔ اس کی چھٹی حس نے اسے خبردار کر دیا کہ کمرے میں کوئی خطرناک کھیل شروع ہونے والا ہے۔ وہ پُرخیال انداز میں اپنی جگہ کھڑی کھڑی پہلو بدل رہی تھی۔

اپنے اس پستول پر بھی اس کی گرفت مضبوط تھی جو وہ اپنے پرس میں چھپا کر لائی تھی۔ اسی اثناء میں اشعر ہنستا مسکراتا کمرے میں داخل ہوا۔ مہکتی ہوئی پھولوں کی سیج پر عروسی لباس پہنے اس کی محبوبہ، بیوی کے روپ میں اس کی منتظر تھی۔

خراماں خراماں وہ بیڈ کی طرف بڑھا۔ اس کا ہر ہر قدم کیف و سرور میں ڈوبا ہوا تھا۔ بیڈ پر بیٹھنے کے بعد اس نے جیسے ہی فرزین کا گھونگھٹ اٹھانا چاہا، فرزین غرائی۔

''خبردار، مجھے چھوا تو۔ دھوکے باز، فریبی، دغاباز! تو نے مجھے سبز باغ دکھا کر مجھ سے شادی کی۔ چند دن پہلے ایک صنعت کار گھرانے کا رشتہ محض تیری وجہ سے ٹھکرایا۔ نکاح کے بعد مجھے اس بات کا علم ہوا کہ تو نے میرے ساتھ کتنا بڑا گیم کھیلا ہے اور تیری اوقات کیا ہے۔ تو نے میری زندگی کی ہر خوشی چھین لی لیکن میں بھی تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ تیری موت کی لکیر میرے ہی ہاتھ میں ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے چھری والا ہاتھ بلند کیا۔ اشعر ہکا بکا حیران کن نظروں سے اسے دیکھے جا رہا تھا۔ ذہنی طور پر اس خطرناک صورت حال کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔ وہ صحیح طور پر... سنبھلنے بھی نہیں پایا تھا کہ چھری فرزین عین اس کے دل کے قریب لے کر گئی۔

اشعر پینترا بدل کر معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔

''اس جھوٹ کے لیے میں شرمندہ ہوں مگر فرزین حقیقت یہ ہے کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ اس لیے زندگی بھر محنت مزدوری کروں گا لیکن تمہیں کانٹا بھی نہیں چبھنے دوں گا۔ میں تمہارے آرام و آسائش کا پورا پورا خیال رکھوں گا۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے فرزین کی آنکھوں میں جھانکا تو وہاں دیوانگی کی لہریں موجزن تھیں۔ چھری برقی روشنی میں پوری آب و تاب سے چمک رہی تھی۔

اشعر انتہائی ہوشیاری سے پیچھے کی جانب کھسکنے لگا۔ اس کے دونوں ہاتھ عقب میں پھیلے ہوئے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ بیڈ سے کھڑا ہو گیا۔ خونخوار نظروں سے دیکھتی ہوئی فرزین بھی کھڑی ہو گئی اور سفاک لہجے میں بولی۔ ''اشعر! مرنے کے لیے تیار ہو جا۔'' اشعر نے اندھوں کے مانند پلکیں جھپکائیں اور پھر اچانک اس کے ہاتھ ٹیبل پر رکھے ہوئے پانی سے بھرے ہوئے جگ سے ٹکرائے۔ اس نے فوراً جگ کا پانی فرزین پر اچھال دیا اور یہی وہ لمحہ تھا جب اشعر نے مکمل طور پر اس پر قابو پا لیا لیکن فرزین نے چھری پر اپنی گرفت اور مضبوط کر دی اور اپنی پوری طاقت کے ساتھ چھری کا پھل اشعر کے سینے میں اتار دیا جبکہ مرتے مرتے اشعر نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ شیشے کا بھاری جگ فرزین کے ماتھے پر دے مارا۔ اس نے ایک چیخ ماری اور حلق سے بے معنی آوازیں نکالیں۔ آخری ہچکی لی اور قالین پر گر گئی۔ دلہن اور دلہا کا سرخ سرخ گرم تازہ لہو قیمتی قالین کو تر کر رہا تھا۔ مدحت سنگی بت بنی سارا منظر پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ جیسے ہی دونوں نے دائمی اجل کو لبیک کہا، مدحت ہوش میں آ گئی۔ اب اسے عقل آئی کہ وہ کس نازک دوراہے پر کھڑی ہے۔ کمرے میں لہو میں نہائی ہوئی دو لاشیں اور وہ اکیلی تن تنہا۔ اف خدایا، یہ میں کہاں آ گئی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے پھانسی کا پھندا لہرا رہا تھا۔

اشعر اور فرزین کی آخری چیخیں اتنی دلدوز اور سمع خراش تھیں کہ باہر بھگدڑ مچ گئی۔ مدحت پسینے میں تربتر اب بھی پردے کے پیچھے ہی کھڑی تھی۔ سارا بدن تھر تھرا رہا تھا۔ دل و دماغ میں بھونچال آیا ہوا تھا۔ اسی وقت گھر کے افراد اور مہمانوں کا زبردست ریلا کمرے میں داخل ہوا۔ مدحت نے صبر و ہمت سے کام لیتے ہوئے اپنی حاضر دماغی سے اس خطرناک سچویشن پر نہایت آسانی سے قابو پا لیا۔ چونکہ کمرے کا دروازہ اشعر نے بند نہیں کیا تھا دروازہ صرف بھڑا ہوا تھا اس لیے جیسے ہی ایک جم غفیر کمرے میں داخل ہوا، مدحت آہستگی سے پردے کی اوٹ سے نکل کر خواتین کے ہجوم میں گھل مل گئی۔ کسی کو بھی اس بات کا علم نہیں ہو سکا کہ وہ کمرے میں پہلے سے موجود تھی اور ان دونوں کے قتل کی واحد چشم دید گواہ ہے۔

کمرے سے باہر نکل کر اس نے کافی دیر سے روکی ہوئی سانس خارج کی اور دیوار سے سر ٹکا لیا۔ سارا گھر ماتم کدہ بنا ہوا تھا۔ ماں باپ اور بہنوں کی چیخوں نے آسمان ہلا دیا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے جہاں ہنسی، قہقہے اور شہنائیوں کی گونج تھی اب وہاں آنسو، آہیں اور نالے تھے۔ پولیس نے سارے گھر کو اپنے گھیرے میں لے لیا تھا۔ اس وقت مدحت کو اپنے بھائی کے الفاظ یاد آ رہے تھے کہ مالک کی رضا میں ہی ہماری فلاح اور بہتری ہے۔

اسی وقت رونق آ کر مدحت سے لپٹ گئی اور آہ و زاری کرتے ہوئے بولی۔ ''مدحت! اشعر تم سے بھی تو بہت باتیں کرتا تھا۔ تم بتا سکتی ہو ان دونوں کو کس نے قتل کیا اور کیوں؟ یہ کیا راز ہے؟''

مدحت آہستہ سے بڑبڑائی۔ ''بھابی! انہیں قدرت نے قتل کیا ہے اور ان دونوں کی ہمراز صرف اور صرف میں ہوں۔''

⌘⌘⌘

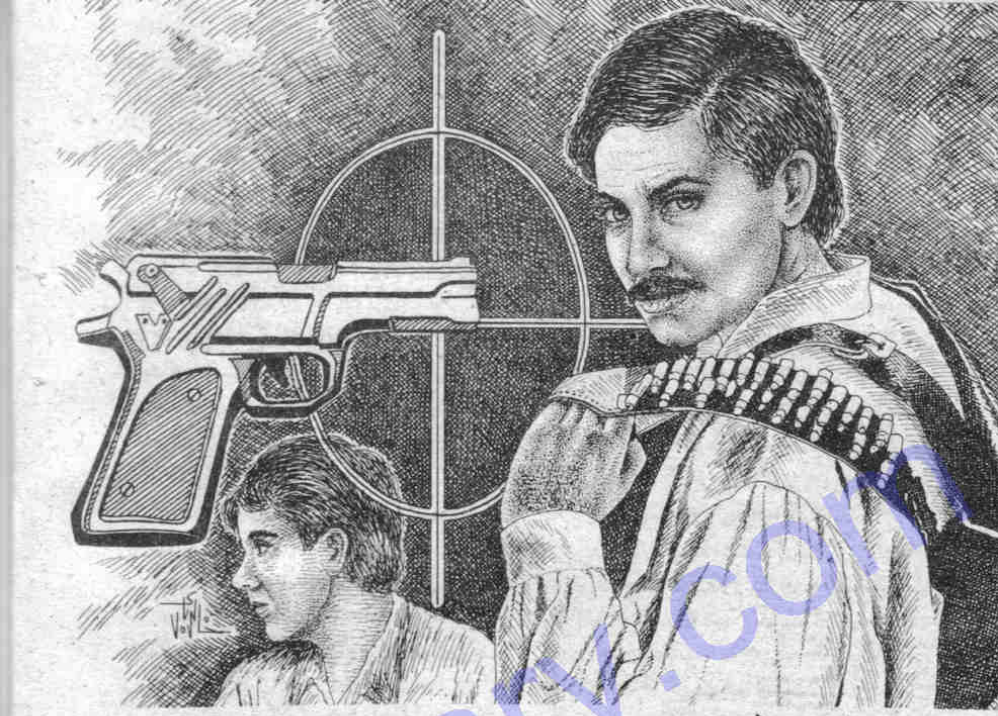

جنگ باز

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

قسط :23

مقدر کا عروج ہو یا نصیب کا زوال... جانے کن خاموش لمحوں میں زندگی میں شامل ہوجاتے ہیں... لیکن کچھ لوگ تقدیر سے زیادہ تدبیر پر بھروسا کرتے ہیں... وہ جو حالات کی زنجیر میں قید بوسیدہ درودیوار تک محدود تھا تمام تر معصومیت کے ساتھ شب و روز کی ہنگامہ خیزیوں میں مصروف تھا کہ اچانک حرص و طمع اور لالچ کے مارے... چہروں پر شرفا کا نقاب ڈالے عبرت و مکر کے تمام حربے آزمانے اس کے راستے میں چلے آئے... وہ جو رنگین شاموں... سنگین ہنگاموں اور تحیر انگیز چالوں سے ناآشنا تھا... ایسا بازی گر بن گیا کہ تمام پردہ داروں کی ڈوریاں الجھ کر رہ گئیں... اس کے ذہن میں قید ناآسودہ خواہشوں کا بھنور اسے کسی کل چین سے بیٹھنے نہیں دیتا تھا۔ تقدیر کے سہارے چلنے والا... کچھ اس انداز سے تدبیروں سے اپنی کایا پلٹتا چلا گیا کہ چال بازوں کی تمام چالیں لڑکھڑا گئیں۔

معاشرتی ناسوروں اور درندوں کی خوں ریز سازشوں اور زخم زخم ہونے والے ایک جنگ باز کی دلدوز داستان

pklibrary.com

pklibrary.com

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

روشنیوں کا شہر کراچی..... اس نے جانے کتنے لوگوں کو اپنے دامن میں ماں کی طرح سمیٹ رکھا ہے، ان گنت داستانوں کی امین اس مہربان گود کے کسی کونے میں سہراب خان یعنی میں بھی رہتا ہوں جو ایک غریب محلے میں محبت کرنے والی ماں اور ایک سخت گیر طبیعت کے حامل باپ کا ایسا ناخلف بیٹا بھی تھا جو ہر وقت باپ کی بے جا مار پیٹ کا نشانہ بنتا رہتا۔ میری ایک بہن بھی تھی راحیلہ، مگر نہیں، بعد میں مجھ پر انکشاف ہوا کہ وہ میری بہن نہیں تھی، خالہ زاد تھی۔ بچپن میں اس کے ماں باپ ایک ناگہانی حادثے میں مر چکے تھے اور ماں نے اسے میرے ساتھ ہی پال پوس کر جوان کیا تھا۔ یہ راز صرف میری ماں اور راحیلہ کو پتا تھا۔ میں تو راحیلہ کو بچپن سے ہی اپنی بہن سمجھا کرتا تھا مگر وہ بچپن سے ہی مجھے ایک بھائی کی نہیں بلکہ کسی اور ہی ''نگاہ'' سے دیکھا کرتی۔ ماں میری شادی اس سے کروانا چاہتی تھی لیکن یہ حقیقت آشکار ہونے کے باوجود بھی میرے اس جذبے میں کوئی فرق نہ آیا۔ میں اب بھی اسے ایک ''بہن'' کے ہی روپ میں دیکھتا تھا۔ راحیلہ نے میرے اس برتاؤ پر برا منایا مگر میں اسے بری طرح جھڑک دیتا۔ میرا باپ، ماں کو مارا پیٹا کرتا تھا۔ ایک دن ماں کو اس نے گہرا زخم دیا تو میں برداشت نہ کر پایا اور باپ کے سامنے سینہ تانے کھڑا ہو گیا۔ باپ کا یہ دیکھ کر بلڈ پریشر بڑھ گیا اور اس کی دماغ کی رگ پھٹ گئی۔ وہ جہان سے کوچ کر گیا تو گھر میں سکون ہوا۔ پتا چلا کہ اصل منحوست غربت کی نہیں بلکہ ایک غصہ ور شخص کی روز روز کی دانتا کل کل کی تھی۔ غربت اور باپ کی سخت گیر طبیعت نے مجھے ایک حد تک جرائم کی طرف لڑھکا ضرور دیا تھا مگر چونکہ شاید میری رگوں میں ''نسلی'' خون دوڑ رہا تھا اسی لیے میں جلد ہی سنبھل گیا مگر اس ''سنبھلنے'' کی مجھے بڑی قیمت چکانا پڑی۔ میں اور میرا باپ ایک فیکٹری میں معمولی ورکر تھے۔ گلی کے محلے میں ہی تین ہم عمر لڑکے میرے یار کہلائے۔ ایک کا نام سلیم، دوسرے کا راجو اور تیسرا ماجد تھا۔ ماجد کی جوان بہن فوزیہ میری پہلی اور آخری محبت ٹھہری۔ ہم چاروں جرائم پیشہ گروہ کے آلۂ کار بن گئے۔ اقبال نامی ادھیڑ عمر شخص ہمارا ''باس'' کہلایا۔ اس کا نائب سجاد بیگ تھا۔ اسی گروہ نے ہم چار یاروں (سلیم، راجو، ماجد اور مجھے) ایک روز آنکھوں پر پٹی باندھ کر کسی نامعلوم مقام پر پہنچایا جہاں ہمیں لڑائی بھڑائی کی خصوصی ٹریننگ دی گئی۔ میں جسامت کے لحاظ سے چھریرا، لمبا اور مضبوط کاٹھی کا تھا۔ سلیم مناسب قد و قامت کا جبکہ راجو اور ماجد قدرے گٹھی ہوئی جسامت کے مالک تھے۔ گروہ نے ہمارے ناموں کے ساتھ عجیب و غریب قسم کے ''لاحقے'' نتھی کر ڈالے۔ میں سہراب لبو کہلایا۔ سلیم کے ساتھ ''چھالیا'' نتھی ہو گیا۔ راجو ''بوری'' ہو گیا جبکہ ماجد ''ماچا''۔ گروہ دیگر جرائم کے ساتھ بھتا خوری بھی کرتا تھا۔ ہمارے فیکٹری مالک سیٹھ سکندر سے بھتا لینے کے لیے ''باس'' اقبال نے ہمیں استعمال کیا۔ میری غیرت جاگی۔ میں نے سلیم وغیرہ کو سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ میرے ہی دشمن ہو گئے، تاہم میں نے سیٹھ سکندر کے ساتھ نمک حلال کیا اور اسے سب باتیں بتا دیں کہ بھتا نہ دینے کی صورت میں اس کی فیکٹری کو بم سے اڑا دینے کی دھمکی دی گئی ہے۔ میں نے بروقت بم کی اطلاع دے کر جہاں سیکڑوں غریب ورکروں کی جان بچائی، وہیں سیٹھ سکندر کو بھی بھاری مالی اور جانی نقصان سے بچا لیا۔ گروہ سمیت میرے تینوں یار میری جان کے دشمن ہو گئے۔ سیٹھ سکندر کی جواں سال خوب صورت بیٹی سدرہ میری ''نمک حلالی'' سے متاثر ہوئی۔ سیٹھ سکندر تو تھا ہی میرا معترف۔ عقدہ کھلا کہ سدرہ کا ماموں یعنی سیٹھ سکندر کا سالا، سجاد بیگ ہی جرائم پیشہ گروہ کے باس اقبال کا نائب ہے۔ بعد میں اس راز سے بھی پردہ ہٹا کہ وہ سدرہ کی ماں کا سوتیلا بھائی تھا۔ وہ بھائیوں والی محبت جتا کر سوتیلی بہن کا سب کچھ ہتھیانا چاہتا تھا اور اپنے گروہ کو بھی مالی فائدہ پہنچانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ میں نے اس کی پلاننگ آشکار کر دی۔ وقت تیزی سے بدلا۔ ماں مر گئی۔ ماجد عرف ماچے کے قتل کا الزام مجھ پر لگا۔ فوزیہ مجھ سے متنفر ہوئی تھی کیونکہ بعد میں راحیلہ نے اسے حقیقت بتا ڈالی تھی۔ میں لاک اپ ہوا۔ اسی دوران کوئی ''پھوٹا خان'' نامی اجنبی میری مدد کو آیا۔ اندازہ ہوا کہ یہ گروہ کا کوئی مخالف تھا۔ اس کی مدد سے میں نے کسی طرح قانون سے رہائی پائی۔ باس اقبال، سلیم چھالیا اور راجو بوری میرے خون کی بو سونگھتے پھر رہے تھے۔ میں راحیلہ اور فوزیہ کو لے کر کراچی سے سیالکوٹ ہجرت کرنے لگا۔ وہاں سدرہ کا کوئی مکان خالی پڑا تھا۔ ادھر سدرہ کو اپنے نام نہاد ماموں سجاد بیگ سے بھی جان کا خطرہ تھا۔ سیٹھ سکندر کے دو وفادار محمود قریشی اور مشتاق بھی تھے۔ ٹرین کراچی سے پنجاب کے لیے روانہ ہوئی اور صادق آباد میں فوزیہ اور راحیلہ سے بچھڑ کر میں باثر ''چودھری جی برادران'' کے نرغے میں چلا گیا۔ وہاں بھولے سے میری عجیب حال میں ملاقات ہوئی۔ اس کی منگ سے چودھری شالاجی نے زبردستی شادی کر لی تھی۔ اس کا نام نادو تھا۔ ہم تینوں فرار اختیار کر گئے۔ راستے میں پولیس اور چودھری جی برادران کے حواریوں سے مقابلے میں بھولا مارا گیا۔ نادو میری ذمے داری بن گئی۔ وہ ایک عجیب لڑکی تھی۔ اسے درحقیقت کسی اور سے محبت تھی۔ اس کا نام بختیار تھا۔ بختیار راجن پور میں رہتا تھا۔ فوزیہ اور راحیلہ کو بھی میں نے کسی طرح تلاش کر لیا۔ سیالکوٹ میں ایک ماں بیٹی سے میری شناسائی ہوئی۔ وہ محلے دار تھیں۔ لڑکی نگہت اور ماں شگفتہ خاتون۔ نگہت کسی وسیم نامی لڑکے سے محبت کرتی تھی۔ دونوں فائٹنگ کلب کے ممبر بھی تھے۔ عقدہ کھلا کہ شگفتہ، باس اقبال کی منکوحہ تھی اور نگہت بیٹی مگر شوہر کی مجرمانہ زندگی سے تنگ آ کر شگفتہ اپنی بیٹی نگہت کے ساتھ کراچی سے سیالکوٹ اپنے ماں باپ والے گھر میں آن بسی تھی۔ اس کی الگ کہانی تھی۔ فائٹنگ کلب کا ایک ماسٹر عرف استاد جو جی میرا دوست بن گیا۔ نگہت اب بھی باپ (اقبال) سے ملاقات

کرتی تھی۔ سیالکوٹ میں اقبال چوک پر اس کے باپ یعنی باس کا بنگلا تھا۔ وہاں دو چوکیدار اور ملازم ارشد وغیرہ تھے۔ ایک خفیہ گروہ ''کالی لہر'' سے میرا ٹکراؤ ہوگیا۔ یہ جادوٹونے کرنے والا گروہ تھا۔ عدیل جو کہ جگنو نامی شخص کا بھائی تھا ان کے ہاتھوں مارا گیا۔ جگنو ایک بڑی سیاسی شخصیت کا آلۂ کار تھا۔ وہ میرا دشمن اور بعد میں دوست بن گیا۔ کالی لہر کے رانگا بابا اور میڈم پنکی سے میری دشمنی عروج پر تھی اور ان کے میرے خلاف جادوٹونے بھی۔ میرا دشمن باس اقبال بھی ان کی جادوئی ہانڈیوں کی زد میں آ کر اسپتال پہنچ گیا۔ اس کی بیٹی نگہت میری دشمن بن گئی جبکہ اس کی ماں شگفتہ خاتون مجھے بھائی سمجھتی تھی۔ اب میری بیک وقت جنگ بازی...... باس اقبال کے نائب سجاد بیگ، چودھری جی برادران اور کالی لہر والوں کے ساتھ جاری تھی۔ میں راحیلہ کا پیچھا کرتے ہوئے رانگا بابا کے ٹھکانے پر پہنچ گیا اور وہ اسے اٹھا کر فارم ہاؤس لے آیا۔ رانگا نے منتر پڑھنا شروع کر دیے اور اچانک وہاں ہانڈیوں کی بارش ہونے لگی۔ مجھے سر پر کچھ مار کر بے ہوش کر دیا گیا اور جب ہوش آیا تو وہ لوگ باور کرانے لگے کہ میں مر چکا ہوں اور میری روح ان کے قبضے میں ہے۔ عجیب عجیب شعبدہ بازیاں دکھائی گئیں، پھر مجھے حالتِ بے ہوشی میں قبر میں دفنا دیا گیا۔ وہاں بجو نے حملہ کیا اور تب ہی غیبی مدد ہوئی اور ایک ماں بیٹی نے مجھے قبر سے نکالا۔ میری حالت دگرگوں تھی۔ پھر میری محسن میرا علاج کرنے لگی۔ ان ماں بیٹی کو گاؤں والوں نے دربدر کر دیا تھا۔ وہاں کے چودھری کا بیٹا صمد یار چنبیلی کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ وہ وہاں آ کر ہم لوگوں کو ہراساں کرنے لگا۔ اماں میرے علاج کی غرض سے خاص بوٹی لینے سرحد پار نکل گئی۔ صمد یار اور اس کے گماشتوں نے ہم پر حملہ کر دیا تاہم میں نے اسے اپنی باتوں میں الجھا کر کسی طرح اپنی اور چنبیلی کی جان بچائی۔ اماں خاص بوٹی لے آئی تھی اور اس نے دوا کا سفوف اور تیل تیار کر لیا تھا۔ دوا نے مجھ پر جادوئی اثر دکھایا اور میرے اندر طاقت کا خزانہ بھر گیا۔ جنگل میں عورت کی چیخ پر میں وہاں پہنچا تو دیکھا ایک تیندوا عورت کو دبوچے ہوئے تھا۔ میں نے درندے کو ٹھکانے لگا دیا۔ زخمی عورت صمد یار کی ماں شمیلہ خانم تھی۔ صمد یار کے گماشتوں نے اماں کی مڑھی کو آگ لگا دی۔ میں انہیں تھانے لے گیا تاہم انہوں نے مجھے ہی لاک اپ کر دیا۔ میں تھانے سے بھاگ نکلا۔ مجھے شمیلہ خانم نے ایک ڈاکٹر کے کلینک پر ٹھہرا دیا۔ ڈاکٹر نے کہا کہ وہ ہمیں یہاں سے نکال کر شہر پہنچا دے گا تاہم میں مطمئن نہ تھا۔ میں نے ڈاکٹر کے پاس ایک پراسرار آدمی کو دیکھا۔ جب تھوڑا تحقیق کی تو پتا چلا ڈاکٹر ہمیں پھنسانا چاہتا ہے۔ میں نے ڈاکٹر کو گرفت میں لیا مگر وہ نکل گیا اور ہمیں مجبور کیا کہ جیسا وہ کہے، ہم کریں۔ تاہم دھینگا مشتی میں ڈاکٹر جان سے چلا گیا اور میں اماں اور چنبیلی کے ساتھ وہاں سے نکل کھڑا ہوا۔ میں استاد جوجی کے ٹھکانے پر آ گیا۔ وہاں سے ہم کالی لہر والوں کے ایک ٹھکانے پر پہنچے تو وہاں نزاکت اور راڑاں کی لاشیں ملیں۔ میں نے انتقام لینے کی ٹھان لی۔ وہاں سے میں ایک قصائی صورت بدمعاش کو اپنے ٹھکانے پر لے آیا۔ اس پر تشدد کر کے ہم معلومات لے رہے تھے کہ وہاں ہانڈیوں کی بارش ہوگئی۔ ہم نے دشمنوں کو مار بھگایا اور قبضے میں موجود بدمعاش سے کالی حویلی کا پتا معلوم کر لیا۔ ہم کالی حویلی پہنچ گئے۔ وہاں میرا رانگا سے ٹاکرا ہوا۔ رانگا نے استاد جوجی کو شدید زخمی کر دیا۔ میں نے رانگا کی ایک ٹانگ کاٹ ڈالی تاہم رانگا بچ نکلنے میں کامیاب ہوگیا۔ میں دشمن کے ایک اور ٹھکانے پر پہنچا تاہم انہوں نے مجھے قابو کر لیا۔ میں زخمی بھی ہوگیا۔ اچانک وہاں سلیم نے حملہ کر دیا۔ مجھے وہاں سے نکال لیا گیا۔ سلیم اور چودھری برادران نے مجھ سے مفاہمت کر لی تاہم اس کے پیچھے ان کا کوئی خاص مقصد تھا۔ راحیلہ بھی انہی لوگوں کے پاس تھی۔ سلیم اور میں نے راجا تیمور کو چھاپنے کی کوشش کی تاہم ہمیں ناکامی ہوئی۔ وہاں سے واپسی پر ایک جگہ ایمبولینس اور پولیس نظر آئی۔ وہ کسی لاش کو اٹھا رہے تھے۔ جگنو کو مار دیا گیا تھا۔ میں نے انتقام کی ٹھان لی۔ میں نے تیمور کو چھاپنے کا ارادہ کیا اور اس کی فیکٹری پہنچ گیا۔ وہ لوگ کوئی ''شے'' لے کر کہیں جا رہے تھے۔ میں نے ان کا تعاقب شروع کر دیا۔ ایک مقام پر میری گاڑی کا ٹائر پنکچر ہوگیا۔ میں نے پیدل ہی ان کا تعاقب شروع کر دیا۔ اچانک دوڑتے ہوئے میں گڑھے میں گرا۔ سر پر چوٹ لگنے سے میں بے ہوش ہوگیا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

نہ جانے کتنی دیر بعد میں ہوش و خرد کی دنیا میں واپس لوٹا تھا۔ رات ہو چکی تھی۔ ماحول پر ہر سو سناٹے اور گھور تاریکی کا راج مسلط تھا۔

میں نے سر کے زخم کو سہلایا، دو ایک بار جھٹکے دیے، اعصاب اور ہوش و حواس کو سنبھالا دینے کی کوشش کی۔ اس کے بعد گڑھے سے باہر نکل آیا۔ کارگو باکس ٹرک اور کار کا دور دور تک نام و نشان نظر نہیں آیا۔ لانبے لانبے درختوں کی چھتنار سی شاخوں سے اوپر کھلا تاریک آسمان تاروں سمیت کچھ روشن روشن سا دکھائی دیا۔ چاند دور کہیں جھکا ہوا تھا مگر اس کی چاندنی چہار سو پھیلی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ مجھے بے حد افسوس ہوا کہ میں نے جوش میں تیزی سے دوڑتے ہوئے اس گڑھے کا خیال نہ رکھا اور دونوں گاڑیاں میری پہنچ سے دور نکل گئیں۔

جنگل ویران تھا۔ آسمان پر ٹکے تاروں اور دور کہیں جھکے چاند کی کچھ کرنیں چھن چھن کر نیچے پڑتی رہیں۔ دور قریب میں کسی چھوٹے موٹے جانور کے بولنے کی آواز

pklibrary.com

ابھرتی اور پھر سناٹا طاری ہوجاتا۔ میں نے تیزی سے سوچا۔ گاڑیاں نکل گئیں ہاتھ سے، اب کیوں نہ واپس جا کر اپنی کار کا وہیل بدل کر دونوں گاڑیوں کے ٹائروں کے نشانات سے ہی استفادہ کرتے ہوئے تعاقب میں نکلا جائے۔

یہ سوچ کر میں ابھی واپس دوڑنے کے لیے پلٹا ہی تھا کہ دفعتاً غیر ارادی طور پر میری نظروں نے مدھم سی روشنی دیکھی۔ وہ سرخ روشنی تھی اور اسی راستے سے ذرا ہٹ کر تھی جہاں مذکورہ گاڑیوں کا رخ تھا۔ اس روشنی کو دیکھ کر میں چونک پڑا پھر ایک پل ضائع کیے بغیر وہاں پہنچا تو مجھے حیرت کا ایک شدید جھٹکا لگا۔ یہاں درختوں کی بہتات نسبتاً کم ہونے کے سبب چاندنی پوری پڑ رہی تھی۔

میں نے دیکھا کہ کارگو باکس ٹرک ایک جانب کو الٹا پڑا ہے۔ وہ سرخ بتی اسی کی بیک لائٹس تھیں جو ہنوز روشن تھیں۔ بادی النظر میں مجھے یہی لگا کہ شاید اس ٹرک کو اچانک کوئی حادثہ پیش آ گیا ہو اور وہ الٹ گیا تھا مگر کیسے؟ یہ سب اچانک کیسے ہوگیا؟ میں بھی تو ان کے تعاقب میں تھا۔ ہوسکتا ہے میں پہلے اندھے گڑھے میں جا گرا تھا اور انہیں بعد میں یہ حادثہ پیش آیا ہو۔

بہرحال جو کچھ بھی تھا، عجیب اور خوشگوار تھا۔ میں دھڑکتے دل سے آگے بڑھا اور غور سے گردوپیش کا جائزہ لیا۔ کار نہیں تھی، صرف ٹرک ایک سائڈ پر الٹا پڑا تھا۔ ٹرک کا کارگو باکس بھی کھلا پڑا تھا۔ ٹرک سے وہ کینوس میں ڈھکی ہوئی پراسرار شے بھی نیچے آن پڑی تھی۔ اب کینوس ہٹ چکا تھا۔ وہ خالی ڈبا تھا، فولاد کا بنا ہوا۔ اس کا ڈھکن کھلا پڑا تھا۔ یقیناً اندر کوئی شے ایسی تھی جسے کوئی بہ آسانی نکال کر لے گیا تھا۔

میں نے قیاس کیا کہ ٹرک کو حادثہ پیش آنے کے سبب یہ لوگ اس پراسرار شے کو آہنی ڈبے سے نکال کر کار کی چھت پر لاد کر نکل گئے ہوں گے۔ آہنی باکس سے نکالنے کے بعد اس شے کا جم چھوٹا ہو۔ تاہم یہ سب ہوا کیا تھا؟ میرا ذہن چکرانے لگا۔ کار غائب تھی جس میں راجا تیمور اور بگا سوار تھے۔ میں جلتے بجھتے ذہن کے ساتھ ٹرک کے ڈرائیونگ کیبن کی طرف بڑھا ہی تھا کہ ٹھٹک کر رک گیا۔

مجھے اپنے دائیں جانب جنگلی زمین پر دو آڑے ترچھے وجود پڑے نظر آئے۔ قریب پہنچا تو میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ وہ دونوں وجود لاشوں میں تبدیل ہو چکے تھے۔ ایک لاش تو ٹرک ڈرائیور کی تھی جبکہ دوسری لاش..... راجا تیمور کی تھی۔

☆☆☆

میں واقعی کئی ساعتوں کے لیے چکرا کر رہ گیا۔ یہ سب کیا گھن چکر تھا؟ اب حالات بتا رہے تھے کہ معاملہ میری سوچ سے بھی زیادہ خطرناک تھا۔ یعنی اس بات کا صاف مطلب تھا کہ میرے علاوہ اور کوئی بھی ہمارے تعاقب میں تھا مگر کون.....؟ اور پھر کار.....؟

کیونکہ راجا تیمور تو اپنی کار میں سوار تھا جس میں اس کا قریبی ساتھی بٹنوں جیسی آنکھوں والا ٹھگنا ''بگا'' بھی سوار تھا، ہٹا کٹا ڈرائیور بھی..... وہ دونوں کہاں چلے گئے؟

اگر میرے علاوہ اور کوئی بھی ان کے تعاقب میں تھا تو پھر مجھے کیوں نہیں پتا چل سکا؟ یہ کوئی ضروری بات نہ تھی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ سلیم اور گل تعاقب میں ہوں کیونکہ سلیم بھی کالی لہر بالخصوص سجاد بیگ کی دشمنی میں میرے ہی خطوط پر ان کے پیچھے لگا ہوا تھا مگر یہ کچھ ہضم نہیں ہو رہا تھا۔ تب ہی اچانک میرے تیزی سے سوچتے ہوئے ذہن میں جھماکا ہوا۔

''غداری..... یا پھر کوئی دھوکا.....؟''

کہیں بگا نے ڈرائیور سے مل کر اپنے ہی ساتھی راجا تیمور کو کسی بات پر دھوکا دے کر ہلاک تو نہیں کر ڈالا تھا؟ اور وہ پراسرار سی شے لے اڑے کیونکہ ٹرک خالی تھا اور جس آہنی ڈبے میں وہ پراسرار شے بند یا محفوظ رکھی گئی تھی، وہ بھی غائب تھی..... لیکن دوسرے ہی لمحے مجھے اپنا یہ خیال بچکانہ محسوس ہوا۔ بگا ان کا ساتھی تھا۔ بھلا اسے غداری کرنے یا دھوکا دہی کی کیا ضرورت تھی۔

تو پھر ان کے ساتھ ایسا کیا پراسرار واقعہ یا حادثہ رونما ہوا تھا؟ میرا ذہن چکرا گیا۔ ٹرک بھی خالی تھا اور الٹا پڑا تھا۔ اگر حادثہ تھا تو پھر اس میں لدی وہ پراسرار شے کدھر غائب کر دی گئی تھی۔

بہرکیف، میں نے ذہن سے سارے خیالات جھٹکے اور عملی قدم بڑھاتے ہوئے سب سے پہلے گھوم پھر کر ٹرک کا اچھی طرح سے جائزہ لیا تو ایک بڑا پتھر مجھے اس کے اگلے ٹائر سے کچھ فاصلے پر پڑا نظر آیا۔ ٹرک کا اگلا ٹائر شاید اسی پتھر پر آ کر لگا ہوگا جس کے نتیجے میں ٹرک الٹ پڑا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ پھر راجا تیمور اور ٹرک ڈرائیور کو کس نے اس طرح ہلاک کیا اور اس کی کار کون لے گیا؟ دونوں لاشوں کا جائزہ لینے کے بعد ایک اور سنسنی خیز انکشاف ہوا۔ ان دونوں کو گولی مار کر ہلاک کیا گیا تھا۔ ڈرائیور کی پیشانی پر گولی کا نشان تھا اور راجا تیمور کے سینے پر عین دل کے مقام پر گولی داغی گئی تھی۔

عقدہ کھل گیا۔ اب دو باتیں ہی سمجھ آ رہی تھیں۔ پہلی

pklibrary.com

تو یہ کہ بگا نے کار کے ڈرائیور کے ساتھ مل کر راجا تیمور سے کوئی غداری یا دھوکا کیا تھا کیونکہ وہ دونوں راجا تیمور کی کار سمیت غائب تھے لیکن معاملہ اس پراسرار شے کا تھا جو کارگو باکس ٹرک میں لدی ہوئی تھی۔

یہ بھی ہوسکتا تھا کہ وہ کسی طرح اس شے کو کار کی چھت پر بہ آسانی لاد کر کہیں لے گئے ہوں اور آہنی بکسا چھوڑ گئے تھے یا پھر میرے علاوہ کوئی اور بھی ان لوگوں کے تعاقب میں تھا اور موقع تاک کر انہیں اڑا لے گیا مگر ٹرک کیوں الٹا پڑا تھا؟ اس سے تو یہی لگتا تھا کہ انہیں اچانک کوئی حادثہ پیش آ گیا تھا۔ کیا خبر اسی حادثے سے کسی نے موقع پر پہنچ کر فائدہ اٹھالیا ہو۔ خود بگا نے ہی ہاتھ دکھا دیا ہو۔

اچانک مجھے یوں لگا جیسے میرے گرد و پیش کی جھاڑیوں اور موٹے تنوں والے درختوں کے عقب میں کوئی چھپا ہو جو میری ایک ایک حرکات وسکنات پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ اس ہولناک جنگل ویرانے میں اپنے علاوہ کسی اور کی بھی موجودگی کا احساس کر کے میرے اندر یکلخت سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ میں یکدم محتاط ہو گیا۔ میں آنکھیں سکیڑ کر بڑے غور سے تاریک اور جنگلی ویرانے میں گھورنے لگا پھر کچھ سوچ کر پلٹا۔

اچانک مجھے احساس ہوا کہ کوئی میرے عقب میں آن کھڑا ہوا ہے۔ میں بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ پلٹا تو ایک خوفناک سے چہرے کی جھلک دکھائی دی۔ وہ مجھ پر کسی موٹے ڈنڈے سے حملہ آور ہونے کی کوشش میں تھا۔ اس نے اپنے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے ڈنڈے سے مجھ پر وار کیا۔ عین ممکن تھا کہ اس وار سے میرے سر کا قلع قمع ہی ہو جاتا مگر پھر بھی بچتے بچاتے وہ ڈنڈا میرے کندھے پر پڑ ہی گیا۔

میں اس ''پھسلتے'' وار کو سہہ گیا اور بڑی پھرتی کے ساتھ اس خوفناک صورت آدمی سے ڈنڈا جھپٹ کر اس کے چہرے پر مکا جڑ دیا۔ وہ چیخ مارتا ہوا الٹ کر گر پڑا۔ ڈنڈا اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ وہ کسی گرے ہوئے درخت کی موٹی شاخ تھی۔ اس آدمی کی خوفناک شکل کی تعریف یہی تھی کہ وہ خون آلود ہو رہا تھا اور زخمی بھی کیونکہ اس کے کپڑے جگہ جگہ سے مسخ اور پھٹے ہوئے تھے، یوں جیسے اس نے کسی کے ساتھ دوبدو لڑائی کی ہو۔ میں اسے دیکھتے ہی پہچان گیا اور بری طرح چونک پڑا۔ میرا اول الذکر خدشہ غلط ثابت ہوا تھا کیونکہ وہ شخص اور کوئی نہیں بٹنوں والی آنکھوں کا مالک بگا تھا۔

میں فوراً اس کے سینے پر سوار ہو گیا۔ وہ ہانپنے لگا۔ میں نے اس کے خون آلود چہرے پر دو تین زوردار تھپڑ رسید کر دیے اور خونخوار غراہٹ سے بولا۔ ''یہ سب کیا چکر ہے؟ بتاؤ مجھے۔''

میرے اس سوال پر اس کے چہرے پر حیرت کے کچھ آثار میں نے محسوس کیے۔ وہ اٹکتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''تت...... تو کیا وہ تمہارے ساتھی نہیں تھے؟''

''کون؟''

''وہ...... وہ دو نقاب پوش تھے کوئی......''

اس کی بات پر میری پیشانی شکن آلود ہو گئی۔ یوں میرا آخری الذکر خدشہ درست ثابت ہوا تھا۔

میں نے ایک گہری سانس لے کر اسے کھڑا کیا۔ اس کی حالت بڑی ناگفتہ بہ سی ہو رہی تھی۔ پہلے میں نے اس کی حالت سدھاری۔ وہ مجھے بہت کچھ بتا سکتا تھا۔

''بٹنوں جیسی آنکھوں والے بے وقوف آدمی! اگر وہ میرے ساتھی ہوتے تو پھر میں یہاں کیا کر رہا ہوتا۔ ان کے ساتھ ہی فرار ہو چکا ہوتا مگر محض ان دو آدمیوں نے یہ سب کیسے کرلیا؟''

بگا نے میرے ''ریمارکس'' پر برا سا منہ بنایا اور پھر بولا۔ ''وہ دونوں یقیناً کوئی خطرناک لوگ ہوں گے۔ کب سے ہمارے تعاقب میں تھے اور موقع نکال کر ہم پر حملے کے درپے بھی مگر شاید قسمت نے خود ہی انہیں یہ موقع دے دیا۔ ٹرک الٹ گیا۔ تیمور صاحب نے کار روک لی، ہم نیچے اترے اور ان دونوں نے ہم پر قیامت توڑ ڈالی۔ میں بڑی مشکلوں سے جان بچا کر اندھیرے میں گم ہو گیا۔ وہ دونوں مسلح تھے۔ آن کی آن میں انہوں نے راجا تیمور اور ٹرک ڈرائیور کو گولی کا نشانہ بنا کر موقع پر ہی ہلاک کر دیا اور...... اور کار لے کر فرار ہو گئے۔''

''اور ٹرک پر لدی ہوئی وہ شے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ...... وہ...... بھی لے اڑے۔''

''کس طرح؟''

''ڈبے سے نکال کر، کار کی چھت پر لاد کر۔''

''وہ شے آخر تھی کیا؟'' بالآخر میں نے پوچھا۔ بگا ہیر پھیر سے کام لینے لگا۔ میں نے اسے گریبان سے پکڑ کر ایک جھٹکا دیا۔

''مجھ سے کچھ چھپانے یا دھوکا دینے کی ذرا بھی کوشش کی تو تم بھی زندہ نہیں بچو گے۔ مجھے تفصیل سے بتاؤ، تم کہاں جا رہے تھے اور رانا لنگڑا، میڈم پچھی، فوزیہ سمیت یہ سب لوگ کدھر ایک دم روپوش ہو گئے تھے؟''

وہ ہانپنے لگا اور بے ہوش ہونے کی ایکٹنگ کرنے لگا تو میں نے اپنے دانت بھینچ کر اسے گریبان سے پکڑا پھر کھڑا

pklibrary.com

کیا اور زور سے ایک درخت کے تنے پر دے مارا۔ اس کے حلق سے بڑی دلدوز چیخ خارج ہوئی اور وہ مردہ چھپکلی کی طرح جنگلی گھاس والی زمین پر گر پڑا۔ وہ بے حس و حرکت ہو چکا تھا۔ یکا یک مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ جوشِ غیظ تلے میں اسے ہلاک کرنے کی غلطی نہ کر بیٹھوں، یہ سوچ کر میں فوراً اسے سنبھالا دینے کو لپکا۔

اس کے سینے کی دھڑکن چیک کی۔ شکر تھا وہ زندہ تھا۔ میں نے طمانیت کی سانس لی۔ بگا مجھے بہت کچھ بتا سکتا تھا۔ اب اسے ہوش میں لانے کے لیے پانی کی ضرورت تھی۔ میں نے کھڑے ہو کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ تاریک جنگل میں ہر طرف تنے ہوئے پردۂ ظلمات کے پار میں کسی حد تک دیکھ پا رہا تھا۔ تب ہی مجھے چاندی سی پٹی دکھائی دیتی محسوس ہوئی۔ کہیں قریب میں کوئی ندی بہہ رہی تھی۔

میں نے بے ہوش بگا کو اٹھایا اور کندھے پر لاد کر اسی سمت دوڑ پڑا۔ ذرا دیر میں وہاں پہنچ کر کنارے پر میں نے اسے ڈالا اور جھک کر ہاتھوں کی اوک بنا کر اس کے چہرے پر پانی پھینکا۔ وہ کھانستا ہوا بیدار ہو گیا۔

میں نے اسی طرح اسے چند گھونٹ پانی بھی پلایا، خود بھی پیا۔ اس کی حالت کافی سنبھل گئی۔ وہ پھر لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ جیسا کہ اس کے بارے میں مذکور ہو چکا ہے کہ وہ ایک تھرد لا اور ڈرپوک سا آدمی تھا۔ میں نے اس پر واضح کر دیا تھا کہ فوزیہ میری کیا لگتی تھی اور میں اس کی برآمدگی کے لیے ہر حد تک گزر سکتا تھا اور ہر رکاوٹ کو نہس نہس کرنے کا عزم بھی کر چکا تھا۔ اگر اس نے زبان نہیں کھولی تو اسے عبرت کا نشان بنا دوں گا۔

''میں تمہیں سب سچ بتا دوں گا لیکن.....'' بالآخر اس نے کہا۔

''لیکن ویکن کچھ نہیں سننا چاہتا میں۔'' اس کی مکاری پر میں نے خوفناک غراہٹ سے کہا۔ ''مجھے سب سے پہلے رانگا تنگرا وغیرہ کے ٹھکانے کے بارے میں بتاؤ۔ وہ فوزیہ کو لے کر اچانک کدھر غائب ہو گئے ہیں؟''

''ہاں ہاں، بتا رہا ہوں، ذرا سانس تو لینے دو۔'' وہ بولا۔ میں دانت پیس کر چند لمحوں کے لیے خاموشی سے اسے گھورتا رہا۔ اس نے کہنا شروع کیا۔

''ان لوگوں کو تمہاری وجہ سے ہی سب کچھ چھوڑ کر بھاگنا پڑا تھا۔ حتیٰ کہ وہ اس مجسمے کو بھی نہیں لے جا پائے تھے اور اس کی ذمے داری ہمارے سپرد کر دی گئی۔ وہ اب سرحد پار جا چکے ہیں۔ ہمیں ان لوگوں نے یہی حکم دیا تھا کہ ہم لوگ جلد از جلد مجسمہ لے کر پہلی گھاٹ نامی سرحد پار قصبے میں پہنچیں۔ راجا تیمور کو انہوں نے یہ مجسمہ وہیں پہنچانے کی ذمے داری سونپی تھی۔''

''مجسمہ..... کیسا مجسمہ؟'' میں نے اپنی بھویں سکیڑیں۔

''وہ مجسمہ بومبورگا کا ہے جو ان لوگوں کے لیے بہت اہمیت کا حامل تھا..... بلکہ ان سب لوگوں کے لیے مقدس اور روحانیت کا حامل۔ اسے ایک دیوتا کی حیثیت حاصل ہے۔ بس یہاں تک ہی میں نے سنا ہے کہ اسے پیرس یا مصر کے میوزیم سے چوری کیا گیا تھا۔''

بومبورگا کے نام سے میں چونکا تھا۔ یہ نام میں پہلے بھی سن چکا تھا۔ قیدی شکرا کے منہ سے، نیز پرویز نے کسی شروپا قبیلے کے بارے میں بھی مجھے بتایا تھا۔ اگرچہ مجھے اس بے سروپا قصے کہانیوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی لیکن چونکہ یہ کالی لہر والوں کے لیے بے حد اہمیت کا حامل تھا اسی لیے میں کچھ دلچسپی لیتے ہوئے بولا۔

''کیا اس مجسمے کے پیچھے اور بھی کوئی گروپ پڑا ہوا تھا؟''

''پہلے تو ایسی کوئی بات نہیں تھی لیکن اب اس حادثے کے بعد تو یہی نظر آتا ہے۔'' بگا جواب میں بولا۔ ''مگر یہ حقیقت ہی ہے کہ بومبورگا کا مجسمہ ان لوگوں کے لیے انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ اگر وہ تمہارے ہاتھ لگ جائے تو سمجھو ان کی جان تمہارے قبضے میں آ گئی۔''

میں نے غور کرنے کے انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ سوچا، کہیں یہ اپنی گلوخلاصی کی خاطر مجھے اصل راہ سے ہٹا کر کسی دوسری راہ پر تو نہیں لگانا چاہتا لیکن پھر سوچا اگر ایسی بات ہوتی تو وہ مجھے کیوں اتنی اہم بات اور کالی لہر والوں کی کمزوری سے آگاہ کرتا؟

بومبورگا کا مجسمہ میرے لیے کتنا سودمند ثابت ہو سکتا تھا یہ بعد کی بات تھی لہٰذا میں نے مقصد کی بات پر آتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''پہلی گھاٹ کس طرف ہے اور کیا وہ لوگ بھی وہیں موجود ہیں؟'' میں نے سوال کیا۔

''میران پور سے ہی سرحد پار اس قصبے کا راستہ جاتا ہے جو دریائے توی کے ایک معاون دریا بیاسی کے کنارے واقع ہے اور یہ مچھیروں کی بستی کہلاتی ہے۔''

''مجسمے کی کیا حقیقت ہے اور ان لوگوں کا آگے کیا مقصد تھا؟'' میں نے پوچھا۔ بگا نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔

''میں ان کا ایک زرخرید غلام اور میزبان قسم کا ساتھی ہوں۔ مجھ سے زیادہ ان کے اور ان کے مقاصد کے بارے

میں راجا تیمور کو ہی علم تھا۔''

میں نے اسے پھر خونیں نظروں سے گھورا۔ وہ خفیف سا ہوا۔ اسی لہجے میں بولا۔

''اگر تم ان لوگوں کی فضول کہانی میں وقت گنوانا چاہتے ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ میں ساری رات اور صبح تک ان کے بارے میں الٹی سیدھی کہانیاں سناتا رہوں گا جو تمہارے کسی کام کی نہ ہوگی، تو پھر کروں شروع؟''

میں ہونٹ بھینچ کر اسے گھورتا رہا۔ وہ کمبخت بیک وقت مجھے ڈرپوک اور چالاک بھی محسوس ہوا۔ تاہم اس کی بات غلط بھی نہ تھی۔

مجھے کسی مجسمے سے کیا لینا دینا اور مزید یہ کہ جو دو نقاب پوش اسے لے بھاگے تھے، ان سے بھی میری بھلا کیا دشمنی تھی۔ مجھے بگا کالی لہر والوں کے ٹھکانے سے آگاہ کر رہا تھا، میرے لیے یہی بہت تھا۔

میں نے کہا۔ ''وہاں تک جانے کے لیے تم میری کیا مدد کر سکتے ہو؟ میرا مطلب ہے پہلی گھاٹ تک۔''

''کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ میں تو ان کا ایک ادنیٰ ملازم تھا، میں بھلا اور کیا جانوں؟'' بگا نے جواب میں مسمسی سی صورت بنا کر کہا۔

میں نے بھانپتی ہوئی نظروں سے بگا کے چہرے کی طرف دیکھا اور بے پروائی سے بولا۔ ''چلو ٹھیک ہے، میں تو کسی نہ کسی طرح وہاں تک پہنچ ہی جاؤں گا، جگہوں کے نام بھی مجھے معلوم ہو چکے۔ اب تمہارے ساتھ میں ایک ہی رعایت برت سکتا ہوں کہ تمہیں آسان موت سے ہمکنار کر کے یہاں سے آگے روانہ ہو جاؤں۔ بولو، کیسی موت قبول کرو گے؟ گلا دبا کر یا پھر کسی بھاری پتھر سے باندھ کر تمہیں اس ندی کے سپرد کر دوں؟''

میری بات پر اس کے چہرے پر دہشت پھیل گئی۔ اسی لہجے میں ہکلاتے ہوئے بولا۔

''لل..... لیکن میرا کیا قصور؟ مم..... میں نے تو تمہاری مدد کی اور سب بتا ڈالا۔''

''تم بھی ان کے ساتھی ہو جنہوں نے میری منگیتر فوزیہ کو یرغمال بنایا اور میرے بہت سے جگری دوستوں کو بیدردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ جلدی بتاؤ، گلا دباؤں یا پھر پانی.....''

ابھی میری بات مکمل بھی نہیں ہوئی تھی کہ وہ اٹھ کر بھاگا مگر میں نے اسے جا دبوچا اور اس کی گردن پر دونوں ہاتھ جما دیے۔ خوف سے بگا کا رنگ پیلا پڑ گیا۔

''مم..... میں تمہیں وہاں تک لے جا سکتا ہوں۔ مم..... مجھے راستہ آتا ہے۔''

وہ لائن پر آ گیا۔ میری باریک مونچھوں تلے مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ میں نے اس کی گردن چھوڑ دی۔

''لل..... لیکن ہم کس طرح وہاں تک پہنچیں گے؟''

''پیدل۔''

''اگر کسی قریبی بستی سے کشتی کا بندوبست ہو جائے تو ہمارا کام آسان ہو سکتا ہے۔'' وہ بولا، ساتھ ہی اپنی گردن مسلنے لگا۔ گہرے گہرے سانس بھی لیے۔

میں نے اس پر نفسیاتی وار کیا تھا جو کارگر ثابت ہوا۔ ایسا ہو نہیں سکتا تھا کہ کالی لہر کی قیادت نے انہیں اپنے ٹھکانے تک پہنچنے کا کہا ہو اور انہیں نقشہ یا جگہ کا علم نہ ہوتا۔ اب بھی وہ بہت کچھ جانتا تھا۔ وقتاً فوقتاً میں وہ اگلوا سکتا تھا مگر ابھی اتنا ہی میری ضرورت تھی اور کافی بھی۔ کشتی والی بات میں نے ذہن میں رکھی اور اس سے کہا کہ گاڑیوں والے راستے پر ہی پیدل چلتے رہو۔

''یہ جنگل آگے جا کر بہت خطرناک ہو جاتا ہے۔ بہتر ہوگا کہ صبح پو پھٹے ہی نکلا جائے۔'' اس نے مشورہ دیا۔ مجھے صاد کرنا پڑا۔ اب مسئلہ نیند کا تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے۔ الٹے ہوئے ٹرک کے ٹول بکس سے مجھے بہت کچھ مل گیا۔ کھانے پینے کا سامان بھی۔ اس کی مشکیں کس کر رسی کا ایک سرا درخت کے تنے سے باندھ دیا۔

''میں بھلا اس طرح کیسے سو پاؤں گا؟'' وہ بے چارگی سے بولا۔

''نیند تو سولی پر بھی آ جاتی ہے۔'' میں نے بے پروا انداز میں کہا پھر اس سے ذرا فاصلے پر سو گیا۔

میں کھٹکے کی نیند سونے والا شخص تھا تاہم رات خیریت سے گزر گئی۔ وہ بھی ٹیڑھا میڑھا سا تنے سے ٹیک لگائے سوتا رہا۔ میں نے اس کی مشکیں کھولیں اور پھر ندی سے ہاتھ منہ دھو کر پانی پیا اور روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

یہ ہماری پیادہ مہم تھی۔ میران پور گاؤں کوئی زیادہ آبادی والا گاؤں نہ تھا۔ اس سے آگے جموں کی سرحد تھی۔ بگا نے مجھ سے کہا کہ اس کے مغرب سے دریائے توی کا ایک معاون دریا بیاسی بہتا ہے۔ اگر ہمیں مچھیروں کی کشتی مل جائے تو بہ آسانی سرحد پار کی جا سکتی ہے۔

اس کی یہ تجویز پھنسانے والی بھی ہو سکتی تھی۔ یعنی وہ انڈین بارڈر سیکیورٹی فورسز کو میرے بارے میں جھوٹ سچ

بتا کر اپنی گلوخلاصی کروا سکتا تھا لہٰذا میں نے اسے تہدید کر ڈالی کہ اگر اس نے ایسی کوئی کمینی حرکت کرنے کی کوشش کی تو میں اسے بھی پھنسوا دوں گا۔

اس نے کہا۔ ”مجھے صرف اپنی زندگی سے پیار ہے۔ باقی بھاڑ میں جائیں۔“

”کیا مطلب؟“ میں نے اسے گھورا۔

”مم..... میرا مطلب ہے کہ مجھے اس بات سے کوئی غرض نہیں کہ میں کالی لہر والوں کا اب غلام یا زرخرید رہا ہوں۔ راجا تیمور کے مرنے کے بعد میری کوئی حیثیت نہیں رہی۔ میں سب پر..... میرا مطلب ہے ان کالی لہر والوں پر لعنت بھیج کر اپنے اصل شہر بہاول نگر کوچ کر جانا چاہتا ہوں، ہمیشہ کے لیے۔“

”ہمم۔“ میرے منہ سے برآمد ہوا۔

القصہ..... میران پور کے اس مطلوبہ گوشے میں آ کر سب سے پہلے ہم نے مچھیروں کی کشتی میں خفیہ پناہ لینے کا منصوبہ بنایا۔ اسی دوران بگا میرے دونوں پاؤں پکڑ کر اور اپنی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو بہاتے ہوئے بولا۔

”اب مجھے یہاں سے واپس جانے دو۔ میں بال بچے دار آدمی ہوں۔ میں نے تمہاری راہنمائی کر دی ہے کہ کس طرح تم وہاں تک پہنچ جاؤ گے اور تمہیں بھی میری اس ترکیب میں کوئی عیب محسوس نہیں ہوا۔“

میں نے سوچتی نظروں سے اس کے مسمسی چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ واقعی مایوس تھا اور اپنے گھر جانے کے لیے بے تاب بھی۔

”لیکن تم نے راجا تیمور کے ساتھ ایسا مجرمانہ گٹھ جوڑ کیا ہی کیوں تھا؟“ میں نے اسے تھوڑا سا ستایا۔

”راجا تیمور لالچی آدمی تھا۔ میں تو اس کا پی اے تھا۔ نہ جانے کب، کیسے اور کیوں اس نے مزید دولت مند بننے کے لالچ میں ان کے ساتھ خفیہ گٹھ جوڑ کر لیا تھا اور مجھے بھی ساتھ شامل ہونا پڑا۔“ اس نے بیزاری سے بتایا۔

”کوئی چالاکی تو نہیں کر رہے ہو تم؟“ میں نے گھورا۔

”ہرگز نہیں۔“ وہ جلدی سے امید بھرے انداز میں اپنی گردن دائیں بائیں ہلاتے ہوئے بولا۔ ”میں عام سا آدمی ہوں۔ اگر ایسا کچھ ہوا تو تم بہاول نگر آ کر میری گردن ناپ لینا۔“

وہ مجھے کچھ معصوم سا محسوس ہوا۔ میں نے اسے جانے کی اجازت دے دی۔ فرطِ جذبات تلے اس نے آگے بڑھ کر میرے ہاتھوں کو چوم لیا۔

”دفع ہو جاؤ اب، کہیں میرا ارادہ نہ بدل جائے۔“ میں نے اپنے ہاتھ پیچھے کر کے اسے گھرک دیا۔ وہ جلدی سے پلٹ کر غائب ہو گیا۔ رخصت ہوتے وقت میں نے اسے یہ دھمکی بھی دے دی تھی کہ اگر اس نے پھر کبھی کالی لہر والوں سے تعلق رکھا یا ان سے خفیہ رابطہ کرنے کی کوشش کی تو اس کا میں بڑا بھیانک انجام کروں گا۔

ویسے مجھے وہ بے ضرر ہی لگا تھا۔ میرا آج تک ٹاپ پروفائل کرمنل مجرموں سے واسطہ پڑتا رہا تھا۔ ان میں ایسے ”گھسیارے“ بھی ہوتے تھے جو کسی مجبوری کی وجہ سے جرم کی ناؤ کے ساتھ بہے چلے جاتے تھے مگر موقع ملتے ہی اس سے تائب ہونے میں بھی دیر نہیں لگاتے تھے۔

مجھے بہرحال اس کی بات پر یقین ہو چلا تھا کہ وہ میرا ساتھ دینے پر اور جلد سے جلد اپنی آزادی اور اپنے بال بچوں کی طرف لوٹ جانے کا ارادہ کیے ہوئے تھا۔ راجا تیمور کے مرنے کے بعد وہ مایوس ہو چکا تھا کیونکہ کالی لہر والوں سے اس کا کوئی براہِ راست تعلق نہیں تھا اسی لیے وہ ان تک مجھے پہنچا کر واپس لوٹ جانا چاہتا تھا۔

بہرکیف، بگا نے مجھے سرحد پار کرنے کی جو آسان تجویز سجھائی تھی اس پر میں واقعی اس کی نیک نیتی اور تجویز پر اش اش کر اٹھا تھا۔ اب میں اسی پر عمل پیرا ہونے والا تھا۔ شرط یہی تھی کہ ابھی میں خود کو میران پور میں ظاہر نہ کروں اور بغیر تاخیر کیے اپنی مہم کا آغاز کر ڈالوں لیکن کالی لہر والوں کی اس دکھتی رگ یعنی بومبورگا کا مجسمہ مجھے بار بار کھٹک رہا تھا۔ میں جتنا اس لغو موضوع کو غیر اہم سمجھ رہا تھا، اتنا ہی میرے دل و دماغ کے عمیق گوشوں میں اس کی اہمیت بار بار باور کراتی تھی کہ اس راز سے پردہ اٹھانے اور مجسمے کی برآمدگی میرے لیے فائدہ مند ثابت ہو سکتی ہے۔ کم از کم بگا کی باتوں سے تو مجھے یہی اندازہ ہوا تھا کہ بومبورگا کا مجسمہ کالی لہر والوں کے لیے ایسا ہی تھا جیسے کسی جن کی جان اس ”طوطے“ میں ہو۔

بگا گرتا پڑتا مجھ سے رخصت ہو چکا تھا۔ میں نے ابھی نہر کنارے والی مچھیروں کی بستی کا رخ نہیں کیا تھا۔

اب وہ دو نقاب پوش کون تھے جنہوں نے مجسمہ ہتھیانے کے لیے ہمارا (ان کا) خفیہ تعاقب کیا تھا کہ مجھے بھی ان کی خبر نہ ہو سکی تھی۔ ممکن تھا وہ پہلے سے ہی یہاں ان کے انتظار میں گھات لگائے بیٹھے تھے۔

اب آ جا کر سلیم اور گگل کا ہی خیال ذہن میں آتا تھا لیکن جلد ہی میں نے اس خدشے کو ذہن سے جھٹک دیا

کیونکہ سلیم وغیرہ کی کالی لہر والوں اور ان کے خفیہ عزائم اور پراسرار رمزوں تک ابھی اتنی رسائی نہیں ہوئی تھی جتنی کہ میری تھی۔ تو پھر وہ دو نقاب پوش کون تھے؟ یقیناً وہ کالی لہر والوں کا کوئی مخالف گروپ ہی ہوسکتا تھا مگر صرف دو انسان؟

اب میں الجھ سا گیا تھا۔ پیلی گھاٹ پر جانے کی کوشش کرتا یا پھر پہلے اس مجسمے اور ان دو نامعلوم افراد کا کھوج لگاتا۔ بوبورگا کا مجسمہ مجھے بار بار کھٹک رہا تھا۔ اگر وہ میرے قبضے میں آجاتا تو شاید رانگا لنگڑا سمیت میڈم بھی اور ان کا پورا گروہ میرے آگے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہوجاتا اور اس طرح فوزیہ کو ان کے قبضے سے چھڑانا بھی نسبتاً آسان ہوجاتا۔

میں فوری فیصلہ کرنے کا قائل تھا اسی لیے سب سے پہلے میں نے انہی دو نامعلوم نقاب پوشوں کا کھوج لگانے کا ارادہ کرلیا لیکن صرف اسی حد تک کہ اگر جلد کھوج ملا تو ٹھیک ورنہ پیلی گھاٹ جانے کی کوشش کروں گا۔

سب سے پہلے میں نے زمین کا جائزہ لینا شروع کیا۔ میری غیر معمولی عقابی نظروں نے کار کے ٹائروں کے نشانات فوراً تاڑ لیے۔ میرا خیال تھا انہوں نے ضرور واپسی شہر کا رخ کیا ہوگا لیکن میرا خیال غلط نکلا، ساتھ ہی حیرت بھی ہوئی کہ ان کار رخ بجائے واپسی کے، آگے جنگل کی اندرونی شمال مشرقی سمت تھا جبکہ مجھے مغربی سمت جانا تھا جدھر بقول بگا کے ان مچھیروں کی بستی تھی جن کی مدد سے میں سرحد پار پیلی گھاٹ تک جاسکتا تھا۔

بہرکیف، میں نے کار کے ٹائروں کی راہنمائی میں اول الذکر سمت کی طرف لمبے لمبے ڈگ بھرنا شروع کر دیے۔ دن خوب نکل آیا تھا۔ خوشگوار دھوپ کی روشنی چھتنار درختوں سے چھن کر نیچے پڑ رہی تھی۔ جنگل بھانت بھانت کے چرند پرند کی خوش الحانی سے گونج رہا تھا۔ ایک مقام پر میں نے دوڑنا شروع کردیا۔ آگے گھاس اور ٹیلے ٹبوں کا میدان سا آگیا۔ میں ان کے درمیان سے گزرتا ہوا ایک بل کھاتی نہر کے کنارے آگیا۔

یہاں ذرا رک کر میں نے جھک کر ٹائروں کے نشان جانچے۔ وہ نہر والی سمت پر کنارے کنارے آگے تک چلے گئے تھے۔ اس طرف مجھے جنگلی گھاس اور درختوں کا سلسلہ دکھائی دیا۔ ایک اور بات کا انکشاف ہوا کہ کار یہاں ذرا دیر کو رکی تھی۔ شاید یہ لوگ یہاں کچھ دیر ٹھہرنا چاہتے ہوں لیکن کچھ سوچ کر آگے نکل گئے تھے۔

میں اب پہلے سے زیادہ محتاط ہوکر آگے بڑھنے لگا کیونکہ لگتا ایسا ہی تھا کہ وہ لوگ اب آس پاس ہی ذرا دیر کو عارضی ڈیرا ڈالے ہوئے ہوں۔ میرا خیال درست ثابت ہوا۔ نہر کنارے چند قدم آگے چلنے کے بعد جدھر نہر کا چوڑا پاٹ دائیں جانب بل کھا رہا تھا، اس طرف مجھے راجا تیمور کی سفید نیونا درخت تلے ترچھی کھڑی نظر آگئی۔

میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ میں جھاڑیوں اور درختوں کی آڑ لیتا ہوا محتاط روی کے ساتھ آگے بڑھنے لگا۔ یکلخت جنگل کا ماحول مجھے ٹھٹکا دینے والا محسوس ہونے لگا۔ یوں جیسے کچھ ہونے والا ہو..... مگر کیا.....؟ ابھی شاید یہ پردۂ اسرار میں تھا کہ میری چھٹی حس کچھ ایسا اشارہ کر رہی تھی یا میرے ساتھ کچھ ہونے والا تھا یا پھر پہلے ہی کچھ کسی اور کے ساتھ ہو چکا تھا۔

میرے تجسس نے مجھے آگے کی جانب کھدیڑا اور میں اب دبے پاؤں جھکا جھکا جھاڑیوں کا حصہ بنا کار کی طرف بڑھتا رہا۔ یہ سارا حصہ مجھے نہر والی گھاٹ کا ہی معلوم ہو رہا تھا۔ میں کار کے قریب پہنچا۔ نہر کے کنارے کی جانب ذرا گردن اونچی کر کے دیکھا تو دھک سے رہ گیا۔ وہاں واقعی کسی کے ساتھ کچھ ہو چکا تھا۔

☆☆☆

خون کی چھپڑی میں پڑی وہ دو لاشیں ہی تھیں لیکن نہیں، ان میں سے ایک زخمی وجود مجھے متحرک محسوس ہوا۔ میں نے گھات سے نکلنے میں جلد بازی نہیں کی اور آگے بڑھنے سے پہلے اس کے گرد و پیش دیکھا۔ یہ تسلی کرنے کے بعد اور کوئی وہاں موجود نہیں تھا، میں تیزی سے آگے بڑھا اور نہر کے گھاس والے کنارے پر پہنچ کر ایک بار پھر اکناف کا جائزہ لیا کہ کہیں میری... ہی گھات میں کوئی چھپا نہ بیٹھا ہو مگر سناٹے اور ٹھٹکا دینے والے گمبھیر سکوت کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

ایک مر چکا تھا، وہ غیر ملکی مرد تھا۔ اس نے خاکی رنگ کی پینٹ شرٹ پہن رکھی تھی، ڈاڑھی اور سر کے بال ڈارک براؤن تھے، عمر درمیانی تھی۔ دوسرا اس کا ساتھی جو کراہ رہا تھا، وہ ایک جوان اور صحت مند عورت تھی۔ خاصی خوبصورت مگر اس وقت وہ جان کنی کے عالم میں تھی اور شاید اسے مار ڈالنے والے لوگ مردہ سمجھ کر آگے چل دیے تھے اور بعد میں اسے ہوش آیا تھا۔

میری جانب دیکھتے ہی اس کے خون آلود ہونٹ تھرکنے لگے مگر وہ کچھ کہے بغیر ہی ایک جانب اپنی مخروطی گردن ڈھلکا کر موت کی انجانی تاریک وادیوں کی طرف

چل دی۔

میں بے اختیار ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ نہ جانے یہاں کیسا خونی ڈراما کھیلا جا رہا تھا جو میرے پہنچنے سے پہلے ہی اختتام پذیر ہو جاتا۔ بہرکیف، میں نے ان کی پہلے جامہ تلاشی لی۔ ان کا کچھ سامان بھی قریب بکھرا پڑا تھا۔ اس کی حالت بھی ایسی ہی نظر آئی جیسے کسی نے ان میں سے اپنے مطلب کی اشیا نکال لی ہوں۔

ان کی جامہ تلاشی کے دوران ان کے شناختی کاغذات دیکھ کر میں الجھن میں مبتلا ہو گیا لیکن اگلے ہی لمحے ایک اور بھی شے میرے ہاتھ لگی جو غالباً ان کی اصل شناخت کے لیے کافی تھی۔ کم از کم میری حد تک۔

ہاں، ان کی جیب سے نقاب برآمد ہوئے تھے اور میں یہ اندازہ لگائے بنا نہ رہ سکا تھا کہ یہی وہ دو نقاب پوش تھے جنہوں نے راجا تیمور کے مختصر سے قافلے پر ہلّا بولنے کے بعد انہیں قتل کیا اور مجسمہ لے اڑے تھے لیکن پھر یہ خود بھی اپنے جیسے ہی خونی قاتلوں کے ہتھے چڑھ گئے۔ اب وہ کون تھے جنہوں نے ان پر حملہ کیا تھا؟

مرد گورا تھا اور لڑکی جرمن۔ اس کی رنگت تانبے جیسی تھی۔ مجھے حیرت ہوئی ان کا آپس میں کیسے تعلق قائم ہوا یا یہ بھی کسی تنظیم یا گروہ سے متعلق تھے جن کا مقصد بومبورگا کے مجسمے کا حصول ہو سکتا تھا۔

دفعتاً ایک آواز پر میں چونکا۔ جنگلی جھاڑیوں اور درختوں سے گھری بل کھاتی نہر کی سطح سے دو درجن مرغ عجیب سی آوازیں نکالتے ہوئے اڑتے ہوئے آئے اور مجھ سے ذرا پرے گھاس والی ڈھلان کا رخ کیا اور وہاں جا بیٹھے۔ ان کی گردنیں گدھ کی طرح بالوں سے عاری تھیں مگر کھوپڑیاں گنجی نہیں تھیں۔ البتہ گردن سے سرخ سرخ کلغیوں کی تھیلیاں جھول رہی تھیں۔ مجھے یہ کوئی دریائی یا پانی کے گدھ ہی محسوس ہوئے۔

وہ شاید بھوکے تھے اور میری قریب موجودگی کی پروا کیے بغیر جلدی جلدی چونچیں مارنے لگے۔ میں جیسے گردوپیش سے بے نیاز یک ٹک انہیں تکتا رہ گیا، چونکہ اس وقت جب مجھے ان کی چونچوں میں سرخ سرخ آلائشیں دبی محسوس ہوئیں جنہیں وہ جلدی جلدی نگلے جا رہے تھے۔

میں بدکا اور اٹھ کر ان کی جانب بڑھا۔ وہ مجھے دیکھ کر پھدک کر دور چلے گئے۔ وہاں میرے لیے ایک اور لرزہ خیز منظر منتظر تھا۔ وہاں تین لاشیں اور بھی آڑی ترچھی پڑی تھیں۔ نہ جانے یہاں کیسا خونریز ڈراما رچایا گیا تھا۔ ابھی میری عقل کچھ اور سمجھنے سے قاصر تھی کیونکہ خود مجھے بھی اپنے لیے یہاں ہر لحہ خطرہ محسوس ہونے لگا تھا۔

میں نے غور سے ان تینوں لاشوں کا جائزہ لیا۔ ایک پر مجھے راجا تیمور کے ڈرائیور فتح خان کی لاش کا گماں ہوا اس لیے کہ میں نے گیٹ تھری سے اس کی جھلک دیکھ لی تھی جبکہ باقی دو لاشیں ایسے افراد کی محسوس ہوئیں جو مجھے قبائلی قسم کے لگے۔ ان کے جسموں پر لباس بھی اسی قسم کے تھے۔ قریباً ننگ دھڑنگ اور کھالوں میں ملفوف۔

میں نے پرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ قیاسات کی حد تک معاملہ اسی قدر ہی سمجھ آسکا تھا کہ اس منحوس مجسمے بومبورگا کے حصول کے لیے ہی یہ سارا خونی ڈراما رچایا گیا تھا جس کی وجہ سے پہلے راجا تیمور کے قافلے پر حملہ ہوا پھر حملہ کرنے والوں پر غالباً کسی قبائلی گروہ نے ہلّا بول دیا۔ اب مجسمہ ان کے حوالے ہو چکا تھا اور انہوں نے کدھر کا رخ کیا تھا؟ یہ مجھے نہیں معلوم تھا۔

ان حالات میں سب کچھ ممکن ہو سکتا تھا۔ میں بہرحال جلد سے جلد اس وحشت ناک جگہ سے نکل جانے کا ارادہ رکھتا تھا کہ کہیں کسی مقامی فرد کی نگاہ میں آجاؤں اور وہ شور مچا دے لہٰذا میں نے فوراً اپنی منزل کا رخ کیا۔

نہر کنارے مجھے مچھیروں کی کئی چھوٹی بڑی کشتیاں نظر آئیں۔ مچھیروں کو چونکہ مچھلی اور جھینگے پکڑنے کے لیے اکثر اوقات دور تک سفر کرنا پڑتا تھا اسی لیے انہوں نے اپنی لمبی لمبی کشتیوں پر رہائشی کوٹھریاں اور جھونپڑیاں بھی بنا رکھی تھیں۔ بہ الفاظ دیگر یہ ان کی ایک طرح سے ''بوٹ ہاؤس'' کہلاتی تھیں۔ بقول بگا کے، ان میں سے اکثر مچھیروں کا گھر بھی یہی ہوا کرتا تھا۔

بیاسی یا توی کی اس معاون نہر کی سطح پر انواع و اقسام کے آبی پرندے محوِ پرواز تھے۔ جسے مچھلی کی ایک جھلک نظر آتی، وہ بڑے ماہرانہ انداز میں غوطہ مارتا اور اپنا شکار لے اڑتا۔ قریب ہی جنگل تھا۔ دائیں جانب آبادی جہاں سے دھواں سا اٹھتا نظر آیا۔ مجھے اندازہ یہی ہوا کہ مچھیروں کی یہ ندی کنارے آباد بستی ان سے الگ تھلگ تھی۔ قصبے (میران پور) کے لوگ یہاں آکر ان سے مچھلی خرید کر لے جاتے۔ مچھیروں نے جگہ جگہ ٹھیے بھی لگا رکھے تھے۔ ان کی جھونپڑیاں بھی بنی ہوئی تھیں۔

میں ان سے ذرا فاصلے پر جدھر لنگر انداز کشتیوں کی بہتات تھی، وہاں خاموشی سے گھات لگائے بیٹھا تھا کہ کب اور کون سی کشتی روانہ ہوتی ہے اور میں اس میں چوری چھپے

سوار ہونے کی کوشش کرتا۔ میرا یہ انتظار طویل تو ضرور ثابت ہوا مگر بے ثمر نہ رہا کیونکہ گھنٹے بھر بعد مجھے دو کشتیوں کی روانگی کا اندازہ ہو چلا تھا۔ ان میں جال، کانٹے اور بڑے بڑے بکسے لادے جا رہے تھے۔

کشتیاں دخانی تھیں۔ ہلکی گڑگڑاہٹ کی آواز ان میں پیدا ہوئی اور چمنیوں نے دھواں اگلنا شروع کر دیا۔ میں اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا نہایت محتاط روی کے ساتھ اپنی خفیہ کمین گاہ سے نکلا اور پانی میں اتر گیا۔ سب سے پیچھے لنگر انداز کشتی کا ایک محتاط اندازہ کرتے ہوئے سانس روک کر گہرائی میں تیرتا بالآخر کشتی کے سب سے اگلے حصے کے پاس ابھرا۔

سطحِ آب سے ابھر کر میں موٹے رسوں اور آہنی کنڈوں کے سہارے اٹھ کر اندر داخل ہو گیا۔ کونے میں ایک سیلن زدہ سی کوٹھری بنی ہوئی تھی جو غالباً اسٹور کے طور پر مستعمل تھی۔ میں اس کے اندر کسی طرح جا گھسا۔ یہ ایک چوبی کوٹھری تھی جو جال، کانٹے اور مچھلیوں کی فیڈ سے بھری ہوئی تھی۔ بساند بڑی ناگوار تھی۔ مجبوری تھی، یہ سب سہنا پڑا۔ میں دروازے سے ہٹ کر کونے میں جا دبکا۔ چار بائی چھ کا چوکھٹا تھا جہاں سے میں باہر اور ایک حد تک کشتی کے دنبالے اور درمیانی حصے کو دیکھ سکتا تھا۔

دوسری کشتی کا انجن ہلکی گڑگڑاہٹ کے ساتھ بند ہو گیا۔ اس کا انجن بدستور بیدار رہا پھر تھوڑی دیر بعد ہی کشتی نے حرکت کی اور آہستہ آہستہ چوڑے پاٹ والی نہر کے درمیان آ کر اس نے آگے کا سفر شروع کر دیا۔ میں نے بے اختیار اطمینان کی سانس لی اور محتاط ہو کر بیٹھا رہا۔ نہر کہیں سیدھی اور کہیں بل کھاتی ہو جاتی۔ کشتی درمیانی رفتار سے محوِ سفر تھی۔ ساحل کنارے بستی اب نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔

میں نے چوکھٹے سے جھانکا۔ کھلے نیلے آسمان پر بادل کے سفید ٹکڑے راج ہنسوں کی طرح اڑتے تیرتے نظر آئے۔ نہر کے ایک طرف کنارے پر لانبی لانبی گھاس، اس کے پار بانس اور سرو کا جنگل تھا جبکہ دوسری جانب نہر کا ایک کراڑا قدرے اونچا تھا۔ وہاں سفید ریت پر موٹے موٹے گہرے سبز رنگ کے پودے، کانٹے دار جھاڑیاں اور اس کے پار برف پوش پہاڑیوں کی چوٹیوں کے نظارے تھے۔ مجھے یہ سب ہم رکاب محسوس ہوئے۔ یوں جیسے کشتی کے ساتھ ساتھ چل رہے ہوں۔ کشتی میں مجھے چھ سات افراد کی موجودگی کا ہی اندازہ ہو سکا جن میں ایک بوڑھا، دو نوجوان، ایک ادھیڑ عمر عورت، باقی مرد تھے۔ کشتی کے درمیان میں جھونپڑی سی بنی ہوئی تھی۔

ایک مقام پر کشتی نہر کنارے ہو کر رک گئی۔ وہ وہاں تقریباً ڈیڑھ گھنٹا رکی رہی۔ معلوم ہوا انہوں نے جال ڈال رکھا تھا پھر وہ روانہ ہوئے۔ نہر بل کھانے لگی اور مجھے لگا جیسے برفیلی پہاڑیاں سرکتی سرکتی قریب آتی جا رہی ہوں، جنگل سکڑنے لگا ہو، کراڑے پر ریتیلا میدان وسعت اختیار کرنے لگا۔

جلد ہی نہر کا ایک جگہ پاٹ غیر معمولی طور پر کشادہ ہو گیا اور اس پر ایک چوبی پل دکھائی دیا۔ میں پہلے سے زیادہ محتاط ہو کر بیٹھ گیا۔ چوکھٹے سے جھانکا تو پل پر دائیں بائیں دو چوکیاں بنی نظر آئیں۔ وہاں انڈین سیکیورٹی کے چند مسلح افراد چوکس گشت کرتے دکھائی دیے۔

پل کی دوسری جانب بھی اسی طرح کی ایک دخانی لانچ موجود نظر آئی۔ ذرا دیر بعد لانچ کے بوڑھے نے ان سے کچھ کہا۔ دوسری طرف کی لانچ کے آدمی بھی ہاتھ ہلا کر چلائے۔ ایک بڑی سی چرخی کو گھمایا گیا تو درمیان سے پل دو حصوں میں تقسیم ہو کر فقط اسی قدر ہی اوپر کو اٹھ گیا کہ ایک کشتی ادھر اور دوسری اس پار جا سکے مگر دونوں طرف کی کشتیاں ایک ساتھ ہی پل پر موجود ایک باوردی شخص کے اشارے پر حرکت پذیر ہوئیں اور ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ پہنچ کر رک گئیں۔

یہ سب ایسا ہی تھا جیسے یہاں کا روز کا معمول ہو۔ میں نے تیزی سے حرکت کی۔ کشتی کے سیلن زدہ فرش پر کسی مچھلی کی طرح پھسلتا ہوا، دوسری کشتی میں جا پڑا۔ پل پر کھڑے آدمی اور دونوں اطراف کی چوکیوں پر موجود اشخاص کی مجھ پر نگاہ نہ پڑ سکی۔ اس میں میری چابکدستی اور ہوشیاری کا بھی دخل تھا۔

القصہ..... میں دوسری طرف کی کشتی میں سوار ہو گیا۔ اس کشتی میں تین چار ہی مرد نظر آئے۔ ایک نوجوان عورت بھی تھی جس نے قمیلی سی ساڑی باندھ رکھی تھی۔ یہ سب سانولی رنگت کے تھے۔ تھوڑی دیر تک دونوں کشتیوں کے ''سوداگران'' کے درمیان مچھلیوں اور جھینگوں کا لین دین ہوا۔ اس دوران میں ملکی اور غیر ملکی آبی سرحدوں کے چند مسلح گارڈز بھی کشتیوں میں اتر کر گشت کرتے رہے۔

مالکان نے انہیں بھی اپنے اپنے علاقے کی ''سوغات'' عطا کی۔ یہ سوغات تیار اور پکی ہوئی تھی۔ ایک گارڈ کو میں نے کیکڑے کے سوپ کی بھی فرمائش کرتے سنا۔ ایک انڈین کشتی گارڈ کمبخت ادھر بھی چلا آیا جدھر میں دبکا ہوا

تھا۔ میں خطرہ دیکھ کر پیچھے کو سرک گیا۔ وہاں جال کا ڈھیر رکھا تھا۔ میں نے خود کو اس کے اندر کسی نہ کسی طرح سمو دیا۔

خطرہ ٹلتے ہی میں نے جب نکلنے کی کوشش کی تو میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میں جال میں الجھ کر رہ گیا تھا۔ اس جال کے اندر کیکڑے تھے۔ خدا جانے مردہ تھے یا زندہ..... تاہم ان کی ابھرواں سی آنکھیں مجھے کھلی ہوئی اور گھورتی محسوس ہو رہی تھیں۔ میں جس قدر جال سے نکلنے کی کوشش کرتا، اتنا ہی الجھتا چلا جاتا۔ فی الحال خطرہ سر پر دیکھتے ہوئے میں نے اپنی سی یہ کوشش ترک کر دی۔ جب کشتی روانہ ہوئی اور پل برابر کر دیا گیا تو میں نے پھر نکلنے کی سعی کی۔ اچانک میرے حلق سے سسکاری خارج ہو گئی۔

ایکا ایکی مجھے یوں لگا جیسے میری داہنی ٹانگ پر کوئی پیوست ہونے کی کوشش کر رہا ہو۔ میں نے تڑپ کر دیکھا تو میرے اوسان خطا ہو گئے۔ وہ ایک غیر معمولی سائز کا کیکڑا تھا۔ اس کمبخت نے اپنے دونوں خم دار ناخن میری ٹانگ میں پیوست کر ڈالے تھے۔ میرے پورے وجود نے جھرجھری سی لی اور اپنے پیر کو زور زور سے جھٹکنے لگا۔ احتیاط بھی کر رہا تھا کہ کسی قسم کی کھڑبڑ کی آواز بھی پیدا نہ ہو کیونکہ کشتی گارڈ اب بھی ادھر ہی منڈلا رہا تھا۔ جب ذرا دیر بعد وہ اپنا اطمینان کر کے واپس چلا گیا تو میں نے اپنی تگ و دو تیز کر دی۔

بڑی مشکلوں سے میں نے اس کیکڑے سے پاؤں چھڑایا اور سرک کر مزید کونے میں چلا گیا جدھر نسبتاً کم ہی الا بلا رکھا تھا۔ شکر تھا کہ ذرا دیر بعد ہی ہماری کشتی کی گلوخلاصی ہو گئی۔ میں نے ذرا جھانکا اور یہ دیکھ کر خوشی سے نہال ہو گیا کہ میں سرحد پار پہنچ چکا تھا۔ کشتی ہنوز نہر میں بہے جا رہی تھی۔ اس کا دخانی انجن ایک یکساں اور مخصوص آواز کے ساتھ ''چھک..... چھک'' کر رہا تھا۔

اب میں اس کشتی سے بھی اترنا چاہتا تھا۔ اس کے لیے میں چھپتا چھپاتا ہوا اسی جگہ جا پہنچا جہاں سے میں اس پر چوری چھپے سوار ہوا تھا۔ کسی آبادی تک پہنچنے سے پہلے میں کشتی چھوڑ دینے کا ارادہ رکھتا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی مجھے اس کشتی میں دیکھ لے لہٰذا ایک موقع تاک کر میں مناسب رفتار سے بہتی کشتی سے اتر کر پانی میں چلا گیا اور وہاں سے اندر ہی اندر تیرتا ہوا کنارے پر پہنچا اور گھاس پر جا لیٹا۔

ذرا دیر تک لیٹا لمبے لمبے سانس لیتا رہا۔ اس کے بعد اٹھ کر اطراف و اکناف کا جائزہ لیا۔ نہر کنارے ذرا فاصلے پر مجھے سرسبز سی ڈھلان پر کسی آبادی کے آثار نظر آئے۔ میں ادھر کا رخ کرنے کے بجائے کچھ سوچ کر نہر کے کنارے کنارے ہی جنگل، جھاڑیوں اور درختوں کی آڑ لیے پیدل آگے بڑھتا رہا۔ میں دوڑ بھی سکتا تھا لیکن ابھی مجھے ٹھیک ٹھیک راستے کا تعین نہیں تھا۔ پہلی گھاٹ کے بارے میں یہاں کسی مقامی شخص سے استفسار کرنا ضروری تھا۔

کئی قدم چلتے رہنے کے بعد میں ایک مقام پر اچانک ٹھٹک کر رکا۔ مجھے نہر کے کنارے لگی ایک اور کشتی نظر آئی۔ پہلے تو میں یہی سمجھا کہ یہ وہی کشتی ہوگی جس میں سوار ہو کر یہاں تک پہنچا تھا مگر ذرا قریب پہنچنے پر مجھے اس کی ''شیپ'' پہلی والی کشتی سے مختلف ہی نظر آئی۔ اس کا سائز بھی چھوٹا تھا۔ البتہ اس کا دخانی انجن خاموش تھا اور ماحول پر بھی عجیب سا سناٹا طاری تھا۔

دن ڈھل رہا تھا۔ میں سنبھل سنبھل کر آگے بڑھنے لگا۔ جدھر گھنی جھاڑیاں تھیں، اسی میں دبکا چلتا ہوا بالآخر کشتی کے ذرا قریب پہنچا تو ایک منظر دیکھ کر وہیں ٹھہر گیا۔ نہر کنارے لنگر انداز کشتی سے چند قدم کنارے پر تین چار لوگ نظر آئے۔ دو افراد کشتی کی چمنی سے لگے کسی کام میں مشغول تھے۔ شاید کشتی میں کچھ خرابی ہو گئی تھی، وہ اس کی درستگی میں لگے ہوئے تھے۔ کنارے پر موجود گھاس اور قدرے ریتیلی زمین پر کچھ بچھائے وہ لوگ بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔

میں بھویں سکیڑ کر غور سے انہیں دیکھنے لگا۔ ان کے قریب مجھے بیک وقت دو قسم کے آتشیں اور دستی آہنی ہتھیار بھی رکھے نظر آئے۔ یہاں یہ چار افراد تھے۔ ان میں ایک سرو قد جوان عورت تھی۔ اس کے جسم پر قبائلیوں والا لباس تھا۔ مرمریں بانہیں ننگی تھیں، صدری نما سا شلوکا ٹائپ کرتہ جس کی کہنیوں سے اوپر تک کھلی آستینیں تھیں۔ اس کی عمر بھی بہ مشکل تیئس چوبیس کے پیٹے میں لگتی تھی۔

یہ سب سلیقے سے استر کیا ہوا کھال کا لباس اس قبائلی اور جنگلی حسینہ کے مناسب خدوخال پر بہت بھلا معلوم ہوتا تھا۔ ہلکے براؤن بال کھلے تھے۔ دوسرا اس کا قبائلی ساتھی لمبا اور دبلا سا اس کے قریب بیٹھا تھا۔ باقی دو مجھے قبائلی معلوم نہیں ہوئے۔ ان میں ایک ٹھگنا مگر گٹھی ہوئی مضبوط جسامت کا آدمی لگا۔ رنگت اس کی بھی سانولی تھی۔ دوسرا خاصا لحیم شحیم اور مضبوط جسم کا آدمی تھا۔ آخر الذکر ان دونوں افراد کے جسموں پر ٹائٹ پینٹ شرٹ تھی۔

یہ چاروں مجھے جنگجو محسوس ہوئے جیسے ذرا بدکنے پر لڑائی بھڑائی کے لیے تیار ہوں۔ تاہم یہ دونوں قبائلی تو نہیں لگتے تھے مگر ان کے قریبی ساتھی ضرور محسوس ہوئے۔ مجھے

ان پر یقین کی حد تک شبہ ہونے لگا کہ یہ وہی لوگ تو نہیں جنہوں نے ڈرائیور فتح خان سمیت اس برطانوی مرد اور جرمن عورت کا خون کیا تھا جن کے بارے میں میرا قیاس یہی تھا کہ یہ لوگ کالی لہر والوں کے آدمی ہو سکتے تھے۔

باقی دو افراد تنگ دھڑنگ خلاصی ہی نظر آئے جو چپنی میں مرمت کے کام میں مصروف تھے۔ میں ہونٹ بھینچے تھوڑی دیر وہیں دبکا رہا۔ میرا ذہن اس وقت تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اگر یہ وہی لوگ تھے تو ان کی کشتی میں بومبورگا کا مجسمہ ہونا چاہیے تھا تب ہی پوری طرح میرے قیاسات کی تصدیق ہوتی۔ میں تھوڑا اور قریب بڑھا۔

آثار بتاتے تھے کہ ان لوگوں کا زیادہ دیر یہاں رکنے کا ارادہ نہیں تھا کیونکہ لحیم شحیم آدمی کو میں نے بہ آوازِ بلند خلاصیوں کو آواز دیتے اور کچھ پوچھتے سنا تھا۔ کچھ ملی جلی اور دو ہندی کے الفاظ تھے جن کا لب لباب مجھے یہی سمجھ آسکا تھا کہ ''اور کتنا کام باقی رہ گیا ہے۔''

خلاصیوں نے شاید اسے باور کرا دیا تھا کہ کام زیادہ طول پکڑ سکتا ہے۔ یہی سبب تھا کہ اس کا ٹھگنا ساتھی اور قبائلی عورت کا آدمی دونوں نے اس لحیم شحیم آدمی سے کچھ کہا اور وہ دونوں وہاں سے اٹھ کر کشتی کی طرف چلے گئے۔

میں ہنوز ان کی ایک ایک حرکات وسکنات پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ دونوں لوٹے تو ان کے ہاتھوں میں کچھ سامان تھا۔ یہ کچھ کھانے پینے کی اشیا اور چائے کافی بنانے کا سامان تھا۔ پھر وہاں خشک لکڑیاں اکٹھی کر کے آگ روشن کر دی گئی اور وہ اس پر مچھلی بھوننے لگے۔ ایک بڑی شراب کی بوتل بھی تھی، تین گلاس بھی تھے۔ کافی کا برتن بھی الاؤ پر رکھ دیا گیا۔ ان کی باتیں سننے کے لیے میں تھوڑا اور سرکا۔

قبائلی عورت اسی طرح ملی جلی اور ہندی میں لحیم شحیم آدمی سے کہہ رہی تھی۔ ''رانگا صاحب بہت تیز دماغ کے آدمی ہیں۔ تاخیر کی صورت میں فوراً اور ساتھی روانہ کرنے میں دیر نہیں لگاتے۔ مجھے تو لگتا ہے اب ہماری تاخیر پر کہیں وہ خود ہی اس طرف کو روانہ نہ ہو جائیں۔''

لحیم شحیم آدمی نے اپنے سر کو ہولے سے اثباتی سی جنبش دیتے ہوئے جواب میں کہا۔ ''رانگا صاحب نہیں میڈم کہو۔ ان کے پیچھے میڈم لچھی کا دماغ چلتا ہے۔ رانگا بیچارے تو اپنی ایک ٹانگ گنوانے کے بعد کہیں کے نہیں رہے۔''

میں ان کے منہ سے رانگا لنگڑے اور میڈم لچھی کا نام سن کر بے اختیار ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ اب پرویز کی زبانی معلومات کے مطابق یہ لوگ مجھے شروپا قبیلے کے لوگ ہی معلوم ہوئے جن کی سرداری میڈم لچھی یا رانگا لنگڑا کے سپرد تھی۔ باقی ان کے معاون یا ہم خیال ساتھی تھے..... وغیرہ۔

''راجن اور شمو کہہ رہے ہیں کہ خرابی طویل ہو سکتی ہے۔ لگتا ہے ہمیں رات ادھر ہی نہر والے جنگل میں گزارنی پڑ جائے۔'' عورت بولی۔ اس کے لہجے میں تشویش تھی۔ راجن اور شمو شاید وہی دو خلاصی تھے جو چپنی کی مرمت کے کام میں مصروف کار تھے۔

''نہیں شینا! ان خطرناک حالات میں ہمارا اب کہیں بھی زیادہ دیر رکنا مناسب نہیں۔'' لحیم شحیم آدمی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ پھر وہ اپنے قریب موجود ٹھگنے ساتھی سے جو ان کی باتیں سننے میں محو تھا، مخاطب ہو کر بولا۔

''رامو! تم کشتی پر جاؤ اور ان دونوں سے کہو کہ اپنا کام جلد سے جلد ختم کرنے کی کوشش کریں۔ ہم زیادہ دیر یہاں نہیں رک سکتے۔''

رامو نامی وہ ٹھگنا آدمی اٹھا اور کشتی کی طرف چلا گیا۔ رامو کے اٹھ کر جانے کے بعد شینا نامی جنگلی حسینہ دوبارہ اس لحیم شحیم آدمی سے مخاطب ہو کر بولی۔

''لیکن گرد واس! اب ہمیں بھلا کس بات کا خطرہ ہے؟''

''صحرائی عقاب..... اور اس کے سربراہ البرٹ رمنڈو سے جو بذاتِ خود اپنے چند زیرک اور گھاگ ایجنٹوں سمیت ممبئی یا رتلام نگر میں ڈیرا ڈال چکا ہے۔'' گرد واس نامی لحیم شحیم بولا۔ مجھے اس کے لہجے میں ایک سنجیدہ سے خوف کی جھلک محسوس ہوئی جبکہ شینا نامی وہ قبائلی حسینہ ذرا بھی خائف نہ تھی۔ اسی لہجے میں بولی۔

''گرد واس! مت بھولو کہ ہم نہ صرف ان کے دو خاص ایجنٹوں بوتھم اور جولی کو ہلاک کر چکے ہیں بلکہ ان کے قبضے سے مقدس بومبورگا کا مجسمہ بھی حاصل کر چکے ہیں۔''

''ہاں، لیکن شاید تم پھر بھول رہی ہو کہ یہ اتفاقی ٹکراؤ تھا۔ اصل میں تو میڈم صاحبہ نے ہمیں راجا تیمور کے لیے روانہ کیا تھا۔'' گرد واس نے پھر یاد دلانے کے انداز میں کہا۔

''چلو یہی سہی۔'' شینا نے سر جھکا کر گرد واس کی بات ابھی پوری نہیں ہوئی تھی۔ وہ آگے بولا۔

''اور اسی خدشے کے سبب ہی میڈم نے ہمیں فوراً یہاں بھیجا تھا کہ ان کے پاکستانی ساتھی راجا تیمور کی اس سلسلے میں مدد کی جائے اگر وہ کسی مشکل میں ہوں۔ یوں تم نے دیکھ لیا، میڈم صاحبہ کا دماغ کس قدر تیز تھا۔ وہ اس خطرے کو پہلے ہی بھانپ چکی تھی۔''

''نہیں، انہیں اچانک اس بات کی اطلاع ملی تھی کہ صحرائی عقاب کے دو نہایت زیرک اور ہوشیار ایجنٹ مقدس بومبورگا کے مجسمے کی بُو پا چکے ہیں۔''

''کچھ بھی سہی، ہم خطرے کی بات کر رہے ہیں۔'' گرد واس پُرسوچ لہجے میں بولا۔ ''لگتا ایسا ہی ہے جیسے ان صحرائی عقاب والوں کا کوئی جاسوس ہمارے درمیان میں موجود ہے یا پھر ہمارا اپنا ہی ساتھی غداری پر مائل ہو چکا ہے جو انہیں بروقت مطلع کر دیتا ہے۔ لہٰذا اب صحرائی عقاب کو فوراً ہمارے ہاتھوں اپنے ان دونوں ایجنٹوں کی ہلاکت اور ناکامی کا علم ہو جائے گا۔ اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ.....''

اس کی بات ادھوری رہ گئی کیونکہ اسی وقت ان کا رامو نامی ٹھگنا سا ساتھی کشتی سے لوٹ آیا اور بولا۔ ''راجن اور شمو کہہ رہے ہیں کہ ایک گھنٹے تک خرابی درست کر لی جائے گی۔''

اس کی بات پر بالخصوص گرد واس نے سکون کی سانس لی۔ میں ان کی باتیں سن کر الجھن کا شکار ہو گیا۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ بومبورگا کے مجسمے کا قصہ میں اپنے لیے غیر متعلق سمجھے ہوئے تھا، اس قدر اہم ہو سکتا تھا کہ اس کے لیے کہاں کہاں تک خون خرابے کیے جا رہے تھے۔ سچ ہی کہا تھا کسی نے کہ کالی لہر والوں کی جان اسی مجسمے میں ہے۔

صحرائی عقاب اور اس کا سربراہ البرٹ رمنڈو کون تھا اور ان کا کیا معاملہ تھا؟ نظر تو یہ آتا تھا کہ یہ کوئی کرمنل گروہ ہوگا جس کا مقصد بھی اس مجسمے کو چرانا تھا۔ تو اس کا مطلب یہ تھا کہ جن دو غیر ملکی جوڑے نے راجا تیمور کے قافلے پر حملہ کیا تھا، وہ صحرائی عقاب نامی کسی تنظیم کے رکن تھے۔ اپنے مقصد میں کامیابی کے بعد وہ بدقسمتی سے اعلیٰ قیادت کی زیرک دماغی کے سبب دوبارہ کالی لہر کے جتھے چڑھے اور مجسمے سمیت اپنی جانیں بھی گنوا بیٹھے۔ وہ مجسمہ شرو پا قبیلے کے کسی عظیم دیوتا بومبورگا کا تھا جو سب کے لیے منحوس ہی ثابت ہو رہا تھا۔

مرنے والے غیر ملکی جوڑے کے نام بوتھم اور جولی ہی تھے۔ بہرکیف، ابھی بہت سے معاملات اور پردے اٹھنا باقی تھے۔ مزید انکشافات کا تجسس میرے لیے اتنا اہم نہ تھا جتنا کہ اپنا مشن۔ تاہم میں اب اپنے طور پر سوچنے لگا کہ ان پر ہلا بولا جائے یا پھر ان کے ساتھ سفر کیا جانا چاہیے؟ شینا اور اس جیسی وضع قطع کے ذہبے پتلے، لمبے قبائلی کو چھوڑ کر باقی چاہے مجھے ہندو بنگالی محسوس ہوئے تھے۔

میرا ذہن فوری سوچنے اور فیصلہ کرنے کا عادی ہو چکا تھا۔ فوزیہ کی تلاش اور بازیابی اس وقت میرا اہم ترین مقصد تھا جس کے لیے میں سرحد پار آ چکا تھا۔ ان پر ہلا بولنے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ ہاں، ان کے ساتھ خفیہ ہم رکابی اور سواری میرے لیے نسبتاً زیادہ سودمند ثابت ہو سکتی تھی۔ یہ مجھے پہلی گھاٹ تک پہنچا سکتے تھے۔

بگا کی دی گئی معلومات کے مطابق کالی لہر کی تمام اعلیٰ قیادت پہلی گھاٹ نامی مقام پر موجود تھی۔ اب پتا نہیں وہ ان مردود لوگوں کا عارضی ٹھکانا تھا یا پھر مستقل، اس کا ادراک مجھے نہ ہو سکا۔ لہٰذا میں نے یہی مناسب سمجھا کہ ان کی کشتی پر ''خاموش'' سواری کی جائے تو منزلِ مقصود تک یہ لوگ مجھے خود ہی پہنچا دیں گے۔ یہ سوچ کر میں موقعے کا منتظر رہا۔ سرحد پار جمنوں کے علاقے کی مغربی سمت سے بہتی نہر بقول بگا کے، بیاسی نہر کہلاتی تھی جو دریائے توی کا ہی حصہ تھی۔

رات پوری طرح پھیل چکی تھی۔ کشتی کی مرمت کا کام ہو چکا تھا اور اب راجن اور شمو کشتی کے بوائلر روم میں کوئلہ دہکانے میں مصروف ہو گئے تھے۔ کھانا پینا انہوں نے وہیں الاؤ کے گرد کر لیا تھا اور اب یہ چاروں مختصر سا سامان سمیٹنے کے بعد کشتی میں سوار ہو کر روانگی کی تیاری کرنے لگے۔ میں نے بھی ''تیاری'' پکڑ لی تھی اور ذرا فاصلہ دے کر قریب نہر کنارے رینگتا ہوا گیا اور خاموشی سے پانی میں اتر گیا۔

اندر ہی اندر تیرتا ہوا میں کشتی کے پیندے کو نگاہ میں رکھتا اس کی دنبالے والی جگہ پر پہنچ گیا اور اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد میں کشتی میں سوار ہو گیا۔ میں سب جائزہ لے چکا تھا۔ مثلاً کشتی میں کُل چھ افراد تھے۔ دو خلاصی، جو نیچے یا کسی دور گوشے میں دخانی انجن کو جگانے کی تیاری میں مصروف تھے۔ باقی چار میں دو افراد یعنی راموا اور قبائلی وہیل روم میں چلے گئے تھے جبکہ شینا اور گرد واس نے کشتی کے درمیان بنے ڈھلوانی چھت والے چوبی کیبن کا رخ کیا تھا۔

عرشے پر الا بلا سامان پھیلا ہوا تھا جن میں جال، کانٹے، فش راڈ اور مچھیروں میں مستعمل ہونے والا ساز و سامان تھا۔ یہ لوگ آبی راستوں کی پوری جانکاری رکھتے تھے اور بھارت کی کسی بھی دور دراز ریاست بشمول سرحد پار تک چلے جانے کے سب چور طریقوں کو بروئے کار لاتے۔ یہ بلاشبہ ایک ہاؤس بوٹ ہی کی طرح کی کشتی تھی۔

اس بار میں کشتی میں ایسی جگہ پر جا بکا تھا کہ ان سمیت اندرونی اور بیرونی نظر رکھ سکوں نیز یہ وقتِ ضرورت اور موقع محل کے مطابق کوئی جارحانہ کارروائی عمل میں لائی جا سکے تو وہ بھی فوری طور پر عمل پذیر ہو سکے۔

معاً کھلی اور جنگلاتی تاریک فضا میں مخصوص گڑگڑاہٹ کی آواز ابھری، ساتھ ہی کشتی کا چوبی فرش تھرتھرایا۔ کشتی کا دخانی انجن بیدار ہو چکا تھا، چمنی نے دھواں چھوڑنا شروع کیا اور اس کے ساتھ ہی وہ حرکت میں آگئی۔

کشتی کے دنبالے اور وہیل روم کی طرف کی روشنی ہو چکی تھی۔ اندر مدھم لیکن باہر کی روشنی ذرا تیز تھی جو وہیل روم کی پیشانی پر نصب تھی۔ وہ شاید ہیڈ لائٹ تھی۔ یوں رہائشی کیبن کی بھی ایک گول اور دوسری چوکور کھڑکی سے اندر بلب جلتا دکھائی دینے لگا تھا۔

کشتی مدھم رفتار سے پہلی گھاٹ کی جانب رواں دواں تھی۔ نہر کی سطح میں ایک حد تک ہلچل ہوتی رہی اور دور پرے پانی کی سطح پُرسکون نظر آتی۔ ایسے میں سر پر کھلا تاروں بھرا آسمان اور بائیں جانب چاند کا سنہری ارتھ سبزے سے ڈھکی ڈھلوانوں پر ایستادہ گھنیرے درختوں کے اوپر چاندنی نچھاور کرتا گویا کشتی کے ساتھ ساتھ تیرتا دکھائی دیا۔

دوسرے کنارے کا منظر قدرے میدانی اور لانبی لانبی جنگلی جھاڑیوں سے اٹا پڑا گھور تاریکی میں ڈوبا نظر آتا۔ ایسے میں کشتی اپنی چمنی سے سیاہی مائل گاڑھا دھواں فضا میں بکھیرتی درمیانی رفتار سے بڑھی چلی جارہی تھی۔ اس کے دخانی انجن کی مخصوص ''پھٹ...... پھٹ'' فضا میں عجیب تاثر پیش کرتی محسوس ہوئی۔ بڑا سحر انگیز سا ماحول تھا۔

میری نظریں کشتی اور باہر کے دونوں کناروں پر گردش کررہی تھیں۔ یہ ساری فضا مجھے جانے کیوں ٹھٹکا دینے والی محسوس ہورہی تھی، یوں جیسے کچھ ہونے والا ہو۔ ایسے میں مجھے اپنے ساتھیوں اور گھر والوں کی بھی فکر ہوئی۔ حالات ہی کچھ ایسے رہے کہ میں انہیں مطلع بھی نہ کرپایا تھا۔ تاہم سوچ تو رکھا تھا کہ کہیں بھی موقع ملا تو ٹیلی فون کردوں گا۔ میرے سر پر بس فوزیہ کو بازیاب کرانے کی دھن سوار تھی، بائی رانا لنگڑا اور میڈم پھپھی بظاہر میدان چھوڑ چکے تھے مگر جگنو کی موت کا بدلہ ان دونوں رذیلانِ ازل سے لینا بھی اب مجھ پر واجب ہو چکا تھا۔

میرے اندازے کے مطابق رات کا یہ درمیانی پہر تھا۔ ذرا دیر بعد میں نے رامو کو وہیل روم سے نکل کر چوبی کیبن کی طرف جاتے دیکھا جبکہ لمبا سا دبلا قباٹلی وہیں موجود رہا۔ اس کی شاید رات بھر وہیں ڈیوٹی تھی۔ راجن اور شمو بوائلر روم میں تھے لیکن تھوڑی دیر بعد راجن کو میں نے کہیں نچلے گوشے (بوائلر روم) سے اوپر ابھرتے دیکھا۔

وہ بھی شاید کہیں نکلنے کی تیاری میں تھا۔ دیکھا تو میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ اپنے سونے کا ٹھکانا رہائشی کیبن کی چھت پر بنا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ادھ بھری دارو کی بوتل بھی تھی۔ وہ شاید پی کر سونے کا عادی تھا۔

راجن اور شمو غالباً باری باری بوائلر روم کی ڈیوٹی پر مامور تھے۔ راجن بہرحال اوپر کھلی فضا اور ہوا میں بستر سا بچھا کر لیٹ گیا۔ کیبن کی دیوار پر عقبی سمت چھوٹی سی فولادی سیڑھیاں نصب تھیں۔ وہ اسی کے سہارے چھت تک چڑھا تھا۔

رامو بے دھڑک رہائشی کیبن میں جا گھسا جہاں شینا اور گردواس پہلے ہی موجود تھے۔ اگرچہ وہ جاگ رہے تھے کیونکہ وہاں سے ہنوز روشنی آرہی تھی۔ میں اسی طرح اپنی جگہ دبکا بیٹھا رہا۔ میری زیادہ نقل وحرکت یا جلد بازی بنے بنائے کام کو بگاڑنے کا موجب بن سکتی تھی اس لیے میرے پاس انتظار اور صبر وسکون سے منزل پر پہنچنے کے سوا اور کوئی راستہ نہ تھا۔

نصف گھنٹا بیتا تو میں نے رامو کو بھی کیبن سے نکلتے دیکھا۔ ساتھ ہی کیبن کی گول اور چوکور کھڑکیاں بھی جیسے بجھ کر تاریک ہوگئیں۔ شینا اور گردواس سونے لگے تھے۔ میں یونہی رامو کو نظروں میں لیے رہا کہ اب یہ حضرت کہاں اپنے سونے کا بندوبست کرتے ہیں؟ وہ دنبالے کی طرف بڑھ گیا۔ کچھ سوچ کر میں بھی کشتی کی ریلنگ کے سہارے جھکا جھکا اس کے پیچھے جانے لگا۔ مجھے اس کے ''ٹکنے'' کا گوشہ دیکھنا تھا۔

وہ وہاں کونے میں جا کر بیٹھ گیا۔ اس نے پھولی پھولی سی قمیص اور نیچے لفافہ سی پتلون پہن رکھی تھی۔ یہ لباس اس نے شاید کیبن میں جا کر تبدیل کیا تھا کیونکہ اس سے پہلے وہ گردواس کی طرح ٹائٹ پینٹ اور گیلس شرٹ میں تھا۔ اب وہ شاید اس لباس میں کھلا ڈلا ہو کر سونا چاہتا تھا۔

میں اس کے ٹکنے کی جگہ سے مطمئن ہو کر ابھی اسی خاموشی کے ساتھ پلٹنے ہی والا تھا کہ دفعتاً اس کی ایک حرکت پر چونک کر رک گیا۔ مجھے اس کی یہ حرکت مشکوک ہی لگی۔ وہ گردن اونچی کر کے وہیل روم اور چوبی کیبن کی چھت کو دو تین بار دیکھتا رہا۔ وہ شاید اس دبلے قباٹلی اور راجن کی وہاں موجودگی کی تسلی کرنا چاہتا تھا۔ اس کے بعد وہ دنبالے کے کونے میں ایک جگہ بیٹھ گیا۔ بیٹھنے کی وجہ سے وہ میری نظروں سے اوجھل ہوگیا لہٰذا اس کے لیے میں ذرا اور آگے کو سرکا اور عرشے کے ریلنگ والے حصے سے بے آواز کھسک کر ایسے رخ پر آگیا کہ اسے دیکھ سکوں کہ یہ آخر کیا

pklibrary.com

کرنے والا تھا؟
پھر یہی وہ وقت تھا جب دفعتاً ہی میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا۔ وہ جس جگہ ''فروکش'' تھا اس کے دائیں جانب قریب لکڑی کا ایک چبوترا سا تھا جس کے بغل میں کوئی خانہ تھا جسے کھول کر اس نے اندر سے کچھ باہر نکالا۔ مجھے شدید قسم کے تجسس نے گھیر لیا اور مزید آگے کو سرکا۔

اوپر ساتھ ساتھ سفر کرتے ہم رکاب چاند تاروں کی روشنی میں، میں نے دیکھا، وہ ایک خفیہ لاسلکی آلہ تھا۔ یکلخت میرا دل رک رک کر دھڑکنے لگا۔ وہ کسی سے خفیہ رابطہ کرنے کی کوشش میں تھا۔ میرے ذہن میں کھٹک بیدار ہوئی۔ بقول گرداس کے جو اس نے شبینا سے کہا تھا کہ ضرور صحرائی عقاب نامی تنظیم کا کوئی جاسوس یا غدار ہمارے درمیان میں موجود ہے جو ہماری نقل وحرکت کی پل پل خبریں ان تک پہنچا رہا ہے۔ تو کہیں یہ...... اس سے آگے مجھے سوچنے کی ضرورت نہیں ہوئی۔ اسی وقت میری سماعتوں سے رامو کی آواز ٹکرائی۔

اگرچہ وہ سرگوشی میں کسی سے کہہ رہا تھا، ایسے میں دخانی انجن کی ''پھٹ پھٹ'' میں بھلا کہاں یہ سرگوشی سنائی دیتی مگر میری غیر معمولی سماعتیں یہ گفتگو سن سکتی تھیں۔ میں نے سنا۔ وہ کانوں سے لگے آلے کے ایک مائکروفون پر کسی سے کہہ رہا تھا۔

''ہیلو، مس لارا! باس سے کہہ دینا کہ ہماری چال بری طرح ناکامی سے دوچار ہوئی ہے۔ جولی اور بوتھم ان کے ہاتھوں مارے گئے ہیں۔'' پھر مختصر ترین الفاظ میں نیم صراحت اور اپنی موجودہ پوزیشن کے بارے میں بتا کر وہ پھر آخر میں ''اوور'' کہہ کر دوسری طرف سے کچھ سننے لگا۔ یہ گفتگو وہ کسی سے انگریزی میں کر رہا تھا۔

معاً میں نے ایک سایہ قریب میں لہراتے دیکھا اور ابھی کچھ سمجھ بھی نہیں پایا تھا کہ اچانک بری طرح چونک پڑا۔ وہی پراسرار سایہ جسے میں نے کیبن کی چھت سے نیچے حرکت کرتے اور اس کی جانب سرکتے دیکھا تھا، وہ آن کی آن میں رامو کے سر پر جا پہنچا۔ وہ راجن تھا۔

☆☆☆

''ہوں...... اگر داس جی کو پہلے ہی تم پر شک ہو چکا تھا رامو...... کہ تم ہی وہ غدار ہو۔ انہوں نے مجھے تم پر نظر رکھنے کی ہدایت کی تھی۔ اب تم نہیں بچ سکتے۔'' راجن نے نفرت انگیز لہجے میں کہا اور اسی وقت مجھے مدھم چاند کی روشنی میں خنجر کے بے رحم پھل کی جھلک نظر آئی۔

رامو نے اپنے دفاع کے لیے سنبھل کر اس پر حملہ کرنا چاہا تھا کہ راجن نے اپنے ہاتھ میں پکڑے خنجر سے اس پر وار کردیا۔ پانی اور انجن کی پھٹ پھٹ تلے مجھے رامو کی دردناک چیخ سنائی دی۔ میں نے تیزی سے کچھ سوچا اور ان کی جانب لپکا۔

رامو شاید راجن کے خنجر سے گھائل ہوگیا تھا کہ اچانک نہ جانے کس طرح رامو نے بھی کوئی داؤ چلایا...... لہٰذا جب تک میں قریب پہنچا، میں نے رامو کو دیوانہ وار راجن سے لپٹتے دیکھا۔

ٹھگنے اور گٹھی ہوئی جسامت والے رامو نے زخمی ہونے کے باوجود جانے کون سا داؤ کھیلا تھا کہ راجن کو دنبالے کی ریلنگ سے اٹھا کر اس پر نصف حد تک لٹکا دیا۔

میں نے دیکھا رامو کے دائیں پہلو سے بھل بھل خون بہنے لگا تھا۔ وہ خود سخت اذیت اور جان کنی کے عالم میں تھا مگر بقا اور شاید انتقام کے جوش نے اس کے وجود میں ایک نئی طاقت بھر دی تھی۔

میں ابھی ان کی نظروں کے سامنے نہیں آیا تھا اور لکڑی کے قدرے ابھرے ہوئے چبوترے کی دیوار سے آڑ میں آگیا۔ رامو ریلنگ میں نصف بدن ٹکے ہوئے راجن کو نہر میں دھکا دینے کی اپنی سی سرتوڑ کوشش میں مصروف تھا اور ایک حد تک کامیاب بھی ہوا مگر دوسری جانب ڈھلکتے ڈھلکتے بھی اس نے رامو کی گردن اس طرح دبوچ لی کہ اب اسی کے سہارے وہ کشتی کے کنارے والے تختے پر دوسری جانب جھول کر رہ گیا۔

رامو کو ایک اور جان کنی عذاب سہنا پڑ گیا۔ دونوں کے درمیان زور آزمائی جاری تھی اور تب ہی میں نے کچھ سوچ کر حرکت کی۔ میں رامو کی مدد کرنے کو تیار تھا لہٰذا لکڑی کے فرش پر مجھے راجن کا گرا ہوا خنجر نظر آگیا، وہ میں اچکتے ہی آگے بڑھا اور بجلی کی سی پھرتی سے ریلنگ کے تختے پر جھک کر راجن کے ایک ہاتھ کی کلائی پر اس کا بے رحم پھل چلا دیا۔

راجن کے حلق سے چیخ بلند ہوئی اور اسے زخمی رامو کی گردن چھوڑتے ہی بنی۔ وہ نہر کے بہتے پانیوں میں غرق ہوگیا۔ کشتی آگے بڑھتی رہی۔ رات کا فسوں یونہی طاری رہا۔

رامو بری طرح ہانپتا اور کراہتا ہوا نیچے فرش پر گر سا گیا۔ میں نے کیبن اور وھیل روم کی جانب دیکھا لیکن اطمینان ہوا کہ وہاں کوئی نقل وحرکت محسوس نہ ہوئی۔ میں نے فوراً رامو کے قریب بیٹھ کر اسے سنبھالا دیا۔ وہ اکھڑی اکھڑی سانسیں لے رہا تھا اور ساتھ ہی مجھے نیم وا سی آنکھوں

pklibrary.com

سے دیکھنے اور پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا کہ آخر یہ کون اجنبی نہ صرف ان کے درمیان آ کودا تھا بلکہ اس کی مدد بھی کرنی چاہی تھی۔

اس کے قریب ہی وہ لاسلکی آلہ رکھا ہوا تھا۔ میں رامو کے زخم کا جائزہ لینے لگا۔

''تت..... تم..... کک..... کون ہو؟'' اس نے بمشکل اٹکتے لہجے میں مجھ سے کہا۔

''اپنا ہی ساتھی سمجھو۔'' میں نے گول مول جواب دیا۔ بدقسمتی سے اس کے پہلو کا زخم گہرا تھا۔ خنجر کے تیز پھل نے اندر تک چرکا لگا کر لیور (جگر) بھی کاٹ ڈالا تھا۔

''مم..... میں اب نہیں بچوں گا مگر..... تت..... تم کون.....؟'' اس نے دوبارہ کہنے کی کوشش کی مگر موت نے اسے جملہ پورا کرنے نہ دیا۔ اس کی گردن ایک جانب ڈھلک گئی۔ میری کوشش تھی کہ وہ زندہ بچ جاتا تو میرے بہت کام آسکتا تھا۔

میں نے ہونٹ بھینچ لیے اور ایک بار احتیاط کے پیشِ نظر دوبارہ ذرا گردن اٹھا کر لکڑی کے چبوترے کی آڑ سے کیبن اور وہیل روم کی طرف دیکھا۔ سرِدست سب مجھے ''تسلی بخش'' ہی نظر آیا۔ رامو کے زخمی پہلو سے گویا خون کی ندی بہے جا رہی تھی۔ میں نے تیزی سے ایک فیصلہ کیا اور اس کی لاش اٹھا کر نہر میں پھینک دی۔ اس کے بعد اِدھر اُدھر دیکھا تو چبوترے کے پلیٹ فارم میں ٹول نما رخنہ نظر آیا۔ اس کے اندر پرانے کپڑوں کے گندے سندے ڈھیر رکھے تھے۔ دو ایک کپڑے نکال کر ان سے میں نے جلدی جلدی فرش سے خون صاف کیا اور خون سے لتھڑے ہوئے کپڑے نہر میں پھینک دیے۔

اب وہاں ایسا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا کہ یہاں دو لوگوں کے درمیان مختصر سی مگر خونریز لڑائی ہوئی تھی۔ اس کے بعد میری توجہ آلے کی طرف ہوگئی۔ وہ جوں کا توں فرش پر رکھا رہ گیا تھا۔ میں نے پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ ٹھیک اسی وقت میں نے محسوس کیا کہ ماحول پر جیسے تاریکی گہری ہو چلی ہو۔ کشتی کا دخانی انجن بدستور اپنی مخصوص آواز میں چلے جا رہا تھا اور کشتی لگی بندھی رفتار سے محوِ سفر تھی۔ میں نے آسمان کی جانب سر اٹھا کر دیکھا تو تارے غائب تھے اور ساتھ ساتھ سفر کرتے چاند کا سنہری مکھڑا بھی اچانک اُمڈ پڑتے سیاہ بادلوں کے ٹکڑوں کے پیچھے جا چھپا تھا۔ نہر کے دونوں طرف کے جنگلاتی کناروں پر تاریکی اور ہو کا عالم تھا۔

پھر یہی وہ وقت تھا کہ ایک دم آسمان پر گڑگڑاہٹ ابھری، ساتھ ہی تیز بجلی چمکی۔ چند ثانیے کے لیے نہر میں تیرتی کشتی اور کناروں کے دور... واقع جنگل کے نظارے اسرار بھرے انداز میں چمکے پھر دوبارہ تاریکی چھا گئی لیکن اب ساتھ ہی موسلا دھار بارش ہونے لگی۔

میں نے کچھ سوچ کر جلدی سے وہ لاسلکی آلہ اٹھایا، اس کا قریب پڑا کینوسی غلاف بھی دکھائی دیا۔ آلے کو میں نے اس کے اندر رکھا اور پھر واپس پلٹ کر اسی جگہ پر آ گیا جدھر پہلے میں موجود تھا۔ یہاں سے کچھ سوچ کر میں نے وہیل روم کی جانب پیش قدمی کی۔ اچانک میں نے قریب عرشے سے ایک تختہ ہٹتے دیکھا۔ میں یکدم تاریکی میں دبک گیا۔ نیچے سے کوئی ابھرا تھا۔

یہ شموتھا جو بوائلر روم سے نکل کر شاید اب آرام کرنے اور کیبن کی چھت پر سوئے اپنے ساتھی خلاصی راجن کو اٹھانے اور بوائلر روم کی ڈیوٹی پر بھیجنے کے لیے نمودار ہوا تھا مگر اسے کیا پتا تھا کہ راجن اب وہاں نہیں تھا۔

اچانک مشکل سی آن پڑی تھی۔ گویا کیا اب مجھے شمو کو بھی ٹھکانے لگانا پڑتا۔ اس طرح تو کشتی میں بے چینی پھیل جاتی اور ممکن تھا کسی خطرے کے پیشِ نظر یہ جاری سفر روک دیا جاتا۔

ابھی میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کیا جائے تاہم شمو کو میں حرکت کرتے دیکھتا رہا۔ وہ بارش میں بھیگتا ہوا رہائشی کیبن کی جانب بڑھا اور جدھر سیڑھیاں تھیں، وہاں کا رخ کیا لیکن پھر اچانک میں نے اسے رکتے دیکھا۔ اس نے گردن موڑ کر گول کھڑکی کی طرف دیکھا تھا..... کیوں؟ یہ میں بغور تکنے لگا۔

پھر اس نے اِدھر اُدھر اور چھت کی جانب دیکھا، اس کے بعد گول کھڑکی کی جانب بڑھ گیا۔ میں بھی اس کی یہ عجیب حرکت دیکھنے کے لیے تھوڑا اور آگے سرکا۔ وہ اب بارش میں بھیگتا ہوا کھڑکی کے بالکل قریب پہنچ گیا اور اندر جھانکنے لگا۔ نہ جانے یہ کیوں اندر ''تاکا جھانکی'' کر رہا تھا؟ یہ میری سمجھ میں نہ آسکا۔

ذرا دیر تک وہ اپنا چہرہ گول کھڑکی سے لگائے اندر نہ جانے کیا دیکھتا رہا پھر اس نے سر ہٹا کر اوپر چھت کی طرف دیکھا، کچھ سوچا اور پھر کیبن کے دروازے کے قریب نصب مختصر سی سیڑھی کے ذریعے اوپر چھت پر چلا گیا۔ وہ شاید اپنے ساتھی راجن کو جگا کر نیچے بوائلر روم میں اپنی ڈیوٹی سنبھالنے کے لیے بھیجنا چاہتا تھا کیونکہ اب اس کی باری تھی۔

مگر اسے کیا معلوم تھا کہ راجن اب وہاں نہیں رہا

تھا۔ میں آگے بڑھا۔ میرے اندر کھڑکی والی حرکت کھد بد کر رہی تھی۔ آخر یہ کمبخت اندر کیسے تاک رہا تھا۔ اس تجسس کو ختم کرنے کے لیے جب میں نے آگے بڑھ کر ذرا اندر جھانکا تو میرے چودہ طبق روشن ہو چکے تھے اور تب ہی مجھے اس بدذات شمو کا اندر جھانکنے کا مقصد سمجھ میں آگیا۔

اندر بستر پر گردواس اور وہ جنگلی حسینہ..... ستر پوش آزاد سوئے پڑے تھے۔ میری طبیعت مکدر ہوئی اور میں پلٹا۔ اسی وقت میں نے ذرا آڑے کر اوپر چھت کی جانب دیکھا۔ بجلی اب بھی کڑک رہی تھی اور بارش جاری تھی۔ شمو کو اوپر راجن سویا ہوا نہیں ملا تھا۔ وہ اب چھت پر کھڑا چاروں طرف دیکھ رہا تھا، اس کے بعد وہ نیچے اتر آیا۔ اس نے سیدھا وہیل روم کا رخ کیا۔

میں بھی اس کے پیچھے چلا۔ میں سمجھ گیا کہ اب اس طوفانی رات میں راموا ور راجن کی ڈھنڈیا پڑنے والی تھی۔ مجھے اندازہ تو تھا کہ راموا ور راجن کے ''غیاب'' پر ان کا سفر جاری ہی رہے گا اسی لیے مجھے تسلی تھی لیکن خطرہ اپنی جگہ تھا۔ وہ کسی شک و شبے میں پڑ سکتے تھے۔ ممکن تھا مسلح ہو کر کشتی کی مکمل تلاشی لیتے اور انہیں کسی کی (میری) یہاں موجودگی کا شبہ ہونے لگتا۔

شمو کیا بات کرنے والا تھا، وہ سننے کے لیے میں بھی بارش کے طوفانی شور میں وہیل روم کے قریب چلا گیا، اس طرح کہ ان کی باتیں بھی سن سکوں اور نگاہ میں بھی نہ آؤں۔

''سمورا! راجن ادھر تو نہیں آیا تھا؟'' شمو اس دبلے پتلے قبائلی سے کہہ رہا تھا جو وہیل کے سامنے بیٹھا کبھی اونگھتا اور کبھی جاگتا۔

''نہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''تمہیں پتا ہے باہر طوفانی بارش ہو رہی ہے۔ کشتی دھیان سے قابو کرو۔'' شمو نے اس سے کہا۔

''مجھے معلوم ہے۔'' سمورا بولا۔ وہ شاید مختصر بات کرنے کا عادی تھا۔

''پتا نہیں کدھر چلا گیا راجن؟'' شمو بڑبڑاتا ہوا روم سے باہر آگیا۔ وہ اسے تلاشنے لگا۔ میں اپنی جگہ جا دبکا۔ اب جو ہونا تھا دیکھا جاتا مگر میرا دھیان اب بار بار اس لاسکی آلے کی طرف جا رہا تھا۔ دل و دماغ میں ایک ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔

تھوڑی دیر گزری، بارش کا شور کچھ ماند پڑا، بجلی کی کڑک میں کمی آئی اور بادلوں کا گڑگڑانا تھما تو اچانک میری سماعتوں سے ''دھڑ..... دھڑ..... دھڑ'' کی آواز ٹکرائی۔ میں چونک گیا۔ اٹھ کر دیکھا، مدھم روشنی میں شمو رہائشی کیبن کا دروازہ بڑے زور زور سے کھڑکھڑا رہا تھا۔ اسے یقیناً اپنے ساتھی کی جانب سے اب فکر و تشویش لاحق ہونے لگی تھی، نیز ضرور اس نے راموکو بھی تلاشنے کی کوشش کی ہوگی۔ وہ بھی اسے نہیں ملا ہوگا اسی لیے اس نے گھبرا کر گردواس وغیرہ کو مطلع کرنا ضروری سمجھا تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہی ہوا۔ گردواس نے یہ سن کر کہ اس کے دو ساتھی پراسرار طور پر کشتی سے غائب ہیں، اس نے کشتی فوراً روکنے کا حکم جاری کر دیا۔ کشتی نہر کے کنارے لے جا کر لنگر انداز کر دی گئی۔

یہ چاروں اب عرشے پر اکٹھے ہو گئے۔ دھواں دھار بارش کا زور کم ہوتے ہوتے اب بالکل ختم ہو چکا تھا۔ یہ قدرتی شور تھمنے کے بعد چہار اطراف ایک دم سناٹے کا راج طاری ہو گیا۔ نہر کے دور یہ کناروں پر واقع جنگل تاریک تھا۔ وہاں کبھی کبھی ہلکی سی گونج ابھرتی۔ کہیں پانی کے قطرے کشتی کے چوبی فرش پر بنے چھوٹے سے تالاب پر گرتے اور عجیب سا جلترنگ بجاتے۔ کشتی کے دخانی انجن کی مدھم آواز ہولے ہولے گونج رہی تھی۔

''کہیں ان دونوں کا آپس میں جھگڑا تو نہیں ہو گیا تھا؟'' یہ گردواس تھا۔ کمبخت کی عقل سلیم بہت تیز تھی۔ میں ایک کیبن والی دیوار کی آڑ میں قریب کھڑا ان کی گفتگو سن رہا تھا اور ان پر نگاہ بھی رکھے ہوئے تھا۔

''بھلا ان میں کیوں جھگڑا ہو سکتا ہے؟ اور پھر جھگڑا ہوتا تو ہمیں خبر نہ ہوتی؟'' یہ قبائلی حسینہ شینا تھی۔

''پھر بھلا وہ دونوں کشتی سے کیسے غائب ہو گئے؟'' شمو بولا۔ گردواس نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''تم نے اچھی طرح دونوں کو تلاش کیا؟ کیا خبر وہ بوائلر روم.....''

''ماسٹر! میں نے سب جگہ تلاش کر لیا ہے دونوں کو۔'' شمو نے یکدم جواب میں کہا۔

''میرا خیال ہے ہمیں خود بھی ایک بار الگ الگ کشتی کی چھان بین کر لینی چاہیے۔'' یہ شینا کا قبائلی ساتھی سمورا تھا۔ اس نے بڑی سنجیدگی سے ایک صائب مشورہ دیا تھا۔ سب نے اس کے مشورے پر صاد کیا اور پھر پوری کشتی کی چھان بین شروع کر دی گئی۔

اب میرے لیے مصیبت پیدا ہو گئی تھی۔ یہ چاروں الگ الگ کشتی کی تلاشی لینے میں مصروف ہو گئے۔ میرا نظروں میں آجانا یا دھر لیا جانا یقینی لگا تو میں فوراً عارضی طور

پر ہی سہی، کشتی کی پناہ چھوڑ کر بے آواز پانی میں اتر گیا اور وہاں سے اندر ہی اندر کچھ دور تک تیرتا ہوا پانی کی سطح پر تھوڑا سر ابھار کر دیکھا۔

ہر طرف تاریکی اور ہو کا عالم تھا۔ فقط ذرا فاصلے پر لنگر انداز کشتی پر روشنی تھی جو ہر سو طاری اندھیرے میں کسی قندیل کی طرح نہر کی سطح پر ٹکی نظر آ رہی تھی۔ ٹھنڈ کی وجہ سے میں پانی میں زیادہ دیر نہیں رہ پایا اور کنارے پر آ گیا۔

یہاں نہر کا کراڑا قدرے اونچا تھا۔ میں اس پر سینے کے بل لیٹ کر بلندی پر جانے لگا۔ یہاں بھی گھاس اور جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں، اس کے بعد ڈھلانی جنگل تھا۔ آسمان پر کالے بادل اب ٹکڑیوں کی صورت تیر رہے تھے جس سے چاند کی روشنی کبھی چھپ جاتی اور کبھی ابھرتی۔ اسی قدرتی آنکھ مچولی میں، میں کچھ سوچ کر کراڑے کی ڈھلان پر ہی رینگتا ہوا کشتی کے قریب تر ہونے کی جستجو کرنے لگا۔

اب میں قدرے عمودی سمت سے کشتی پر بہ آسانی نظر رکھے ہوئے تھا۔ میری تیز عقابی نظریں کشتی کے اندر تک کا نظارہ بڑی دلچسپی کے ساتھ دیکھ رہی تھیں۔ وہ چاروں دیوانوں کی طرح کشتی کی چھان بین کر رہے تھے۔ خواہ وہ اپنے ہی ساتھیوں کو تلاش رہے تھے لیکن ظاہر ہے میں بھی وہاں موجود ہوتا تو ان کی نظروں میں آ سکتا تھا۔

اب میں منتظر تھا کہ کب یہ لوگ اپنی ناکام تلاش کے بعد دوبارہ یہاں سے روانگی کا پروگرام بناتے ہیں اور میں دوبارہ کشتی پر خاموشی سے سوار ہونے کی کوشش کرتا۔ میرے عقب میں تاریک جنگل مجھے جانے کیوں بے چین بھی کیے ہوئے تھا۔ یہ قدرتی بات تھی۔ دور دراز کے اس ویران جنگلاتی اور نہری علاقے میں اس طرح کے ماحول کا اثر ذہن اور دماغ پر پڑنا لازمی امر ٹھہرتا ہے۔

میں نے ایک ذرا یونہی اپنی گردن موڑ کر گھور تاریک جنگل کے اندرونی گوشوں کی طرف دیکھا۔ تا حدِ نظر تک مجھے جنگلی جھاڑیاں، جھنڈ، درخت وغیرہ پراسرار ہیولوں کے مانند دکھائی دیے، اس کے بعد جیسے پردۂ ظلمت کا راج تھا۔ نہر کے دوسرے کنارے کے پار چاندنی میں دور برف پوش پہاڑیوں کی چوٹیاں بھی تاریک اور کبھی چمکتی دکھائی دیتیں۔ وہاں بھی ڈھلانی جنگل تھا۔

وقت جیسے بھاری سل کی طرح دبے پاؤں سرکتا رہا۔ کشتی کے دخانی انجن کی مدھم ''پھٹ پھٹ'' کی یکساں آواز تاریک جنگلی اور نہری فضا میں ابھرتی عجب تاثر پیش کر رہی تھی۔ اپنے عقب میں تاریک اور جنگلی جھاڑیوں کا ذرا دیر نظارہ کرنے کے بعد ابھی میں دوبارہ کشتی کی جانب اپنی گردن کا رخ پھیرنے ہی کو تھا کہ دفعتاً چونک پڑا۔

مجھے ذرا فاصلے پر قدرے داہنی جانب کوئی ہیولا سا متحرک محسوس ہوا۔ ایسے ویران اور تاریک ماحول میں اس متحرک اور پراسرار سے ہیولے نے ایک لمحے کو میرے بدن میں جھرجھری کی لہری دوڑا دی۔

کشتی کو چھوڑ کر اب میں اسی جانب غور سے تکتا رہا۔ میرا دل یکلخت تیزی سے دھڑکنے لگا اور کنپٹیوں میں سائیں سائیں محسوس ہونے لگی۔ میں اور محتاط ہو گیا۔ مجھے تجسّس تھا جو کسی خطرے کی بو سونگھنے کے باوصف، مجھے اکسا رہا تھا کہ میں اس پر سے پردہ اٹھاؤں لہٰذا خود کو آگے سرکنے سے نہ روک سکا۔

میں دیکھنا چاہتا تھا کہ آخر یہ متحرک ہیولے کس شے کے ہیں؟ میں نے آنکھیں سکیڑ کر پھر غور سے دیکھا۔ اس بار کوئی ہیولا دکھائی نہیں دیا۔ میں نے دوبارہ کشتی کی جانب نظریں جما دیں اور اسے وہم سمجھا لیکن دل و دماغ میں انجانی سی کھٹک پیدا ہو چلی تھی۔

کشتی پر ہنوز دھندلیا پڑی ہوئی تھی اور وہاں کبھی وقفے سے کسی کے تیز لہجے میں بولنے کی بھی آواز گونج جاتی۔ دفعتاً مجھے احساس ہوا کہ تاریکی میں کوئی میرے بہت قریب آن کھڑا ہوا ہے۔ مجھے یوں لگا جیسے میرا لہو ہی نہیں، خود میرا وجود بھی ساکت سا ہو گیا ہے۔

قریب..... بہت قریب کسی کے حیوانی انداز میں غراہٹ آمیز بھپکارے کی آواز ابھری۔ جیسے ہی میں نے گردن گھما کر عقب میں دیکھا، ایک سفید سے حیوانی وجود نے خوفناک غراہٹ سے مجھ پر جست لگائی۔ میں نے اس کے حملے سے بچنے کی کوشش کی لیکن اسے ''پہل'' مل چکی تھی۔ وہ مجھے رگیدتا ہوا ڈھلان پر چلا آیا۔

میں دفاع کے لیے اپنے دونوں ہاتھ اس کی گردن پر رکھ چکا تھا مگر گرنے اور ڈھلان پر پھسلنے کے سبب ہم دونوں ہی ڈھلانی کراڑے سے سیدھے نہر میں جا گرے۔

یہ کوئی جنگلی بھیڑیا تھا جو قریب واقع برفانی پہاڑی وادی سے شاید یہاں بھٹک کر آیا تھا۔ بھیڑیے عموماً پانی سے گھبراتے ہیں، یہی وجہ تھی کہ میں نے خود کو بھیڑیے کے نکیلے شکاری دانتوں سے ہی نہیں بلکہ اس کے تیز پنجوں سے بھی بچایا تھا اور ابھی دفاع کی حد تک ہی عمل کیا تھا کہ ہم نہر میں جا گرے۔

بھیڑیے کی گردن میں نے دبوچ رکھی اور اسے پانی

میں ڈبکیاں دینے لگا۔ یہ ''کھڑبڑ'' یقیناً کشتی والوں سے چھپی نہ رہ سکی ہوگی۔ ان میں سے کوئی ایک اس طرف متوجہ ہوا ہوگا لیکن اس وقت میں اس موذی سے جان چھڑانے کی فکر میں تھا۔

پانی میں گرتے ہی میں نے اس کی گردن چھوڑ دی اور خود تیزی سے تیرتا ہوا نیچے قدرے گہرائی میں چلا گیا۔ بھیڑیے کا تیرتا ہوا عکس تیزی سے کنارے کی طرف بڑھا جا رہا تھا۔

یوں میں نہر کے اندر ہی اندر تیرتا ہوا کشتی کے قریب چلا گیا۔ اس کا پیندا نظر آتے ہی میں اوپر آنے لگا پھر جیسے ہی ایک محتاط اندازے سے میں نے کشتی کے قریب سے تھوڑا سر ابھارا تو رات کے سناٹے میں گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دیں۔ ساتھ ہی حیوانی غراہٹوں اور چلّانے کی آوازیں بھی گونجیں۔

تب مجھے اندازہ ہو پایا کہ یہاں نہر کے اس کنارے پر صرف ایک ہی جنگلی بھیڑیا نہ تھا بلکہ شاید ان کا پورا غول تھا جنہوں نے کشتی والوں پر بھی ہلّا بول دیا تھا۔

یکدم کشتی کا دخانی انجن تیزی سے پھٹ..... پھٹ کرنے لگا۔ کشتی حرکت میں آ گئی۔ اس کی رفتار بڑھنے سے پہلے ہی میں تاریکی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بہ احتیاط کشتی کے دنبالے والی جگہ سے اندر آ چکا تھا۔

مگر یہ کیا..... کشتی کے اندر زبردست افراتفری کا عالم تھا۔ کنارے سے شاید چند بھوکے بھیڑیوں نے کشتی کے اندر چھلانگیں لگا دی تھیں۔ دو ایک کی خون آلود لاشیں بھی مجھے سیلن زدہ عرشے پر پڑی نظر آئیں۔ انہیں گولی ماری گئی تھی۔

شمو اپنی زخمی ٹانگ سے بمشکل رہائشی کیبن کی طرف کھسکنے کی کوشش میں تھا۔ ایک خونخوار بھیڑیے نے اس کی ٹانگ دبوچی ہوئی تھی جبکہ چھت پر گرد و اس اور شینا پہلے ہی موجود تھے۔ ان کے ہاتھوں میں پستول تھے۔ وہ تاک تاک کر کشتی میں پھیلے بھیڑیوں پر گولیاں برسا رہے تھے۔ وہیل روم میں سمورا دروازہ بند کیے ہوئے تھا۔

ادھر شمو کا چہرہ خوف و ہراس سے ستا پڑا تھا۔ کیبن کی چھت سے گرد و اس اور شینا تاک تاک کر بھیڑیوں پر فائر جھونک رہے تھے مگر کب تک..... شمو ابھی کیبن کے دروازے سے تھوڑا ہی دور تھا کہ اس پر مزید دو بھیڑیے پل پڑے۔

شمو کی دردناک چیخیں آسمان کو چھونے لگیں۔ مجھے اپنا بھی ڈر ہونے لگا۔ بھیڑیے میری بو بھی سونگھ سکتے تھے۔ مجھ پر حملہ کرنے کی صورت میں بیک وقت میں دو خطرات سے دوچار ہو جاتا۔ دشمنوں کی نظروں میں بھی آ جاتا اور ان خونخوار بھیڑیوں کے نرغے میں بھی۔

کشتی میں بھیڑیوں کی تعداد مجھے چار پانچ سے کم نہ لگی تھی۔ دو ایک کو میں نے سمورا کے وہیل کیبن کے باہر بھی غراتے دیکھا تھا۔

اس سے پہلے کہ بھیڑیے میری بو سونگھتے، میں نے اپنے بچاؤ کی تدبیر سوچی۔ سب سے پہلے میں نے لاسکی آلے کو جدھر چھپایا تھا، وہاں سے نکالا۔ وہ کینوسی کور میں لپٹا ہوا تھا جو واٹر پروف تھا۔ اسے میں نے کسی طرح اپنے پیٹ سے باندھ لیا۔

اب میں نے خود کو دنبالے کے کونے تک ہی محدود رکھا تھا کہ اگر کوئی بھیڑیا اس طرف آ نکلتا تو میں فوراً پانی میں اتر جاتا۔ یہاں تاریکی تھی۔ کیبن کی طرف کچھ روشنی نظر آتی رہی۔ بھیڑیے فی الحال وہیں ''مصروف'' تھے۔ انہوں نے شمو کو بھنبھوڑ ڈالا تھا۔ شمو کی موت کی تصدیق ہوتے ہی اب گرد و اس اور شینا نے بے دھڑک بھیڑیوں پر فائر کھول ڈالے۔

بھیڑیوں کی بھی چیخیں ابھریں۔ وہ مرنے لگے تھے۔ وہیل روم کی طرف والے دو بھیڑیوں میں سے ایک کی مجھے خون آلود لاش نظر آئی۔ اسے اندر سے ہی شاید سمورا نے اپنے پستول سے نشانہ بنا لیا تھا اور دوسرے کو بھی نشانہ بنانے کی کوشش میں تھا۔ اس پر دہری ذمے داری تھی۔ وہ کشتی کو بھی سنبھالے ہوئے تھا اور ان سے بھی نبرد آزما تھا۔

دفعتاً میں چونکا۔ ایک بھیڑیا شاید میری بو پر ایک کونے سے ابھر کر اچانک سامنے آ گیا۔ اس قدر کہ میرے پاس وقت بھی نہ بچا کہ میں دنبالے سے پانی میں چھلانگ مار سکتا۔ ایک خوفناک خطرے کو یکدم آنکھوں کے سامنے پا کر مجھے جیسے سانپ سونگھ گیا۔ بھیڑیا مجھے دیکھتے ہی تھوڑے فاصلے پر رک گیا۔ اس کے خوفناک جبڑے کھلے ہوئے تھے اور وہاں سے تیز نکیلے شکاری دانت صاف جھانکتے دکھائی دیے۔

اس مردود کی آنکھوں میں جانے کیا طلسم تھا کہ میں بت سا بن گیا یا پھر شاید یہ اچانک امڈ پڑنے والے خطرے کے سبب تھا۔ فقط چند ثانیوں کے لیے بھیڑیے نے رک کر مجھے دیکھا اور پھر ایک خوفناک غراہٹ کے ساتھ مجھ پر جست لگا دی۔

معاشرتی ناسوروں اور درندوں کی خوں ریز سازشوں اور زخم زخم ہونے والے ایک جنگ باز کی دلدوز داستان کے مزید واقعات اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

میری اچانک ہی راحیلہ پر نگاہ پڑی تھی۔ پہلے تو میں اسے پہچان ہی نہیں پایا۔ بس شک سا ہوا تھا لیکن جب غور کیا تو مجھے یقین ہو گیا۔ وہ بالکل ہی بدلی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک خوبصورت لڑکی تھی۔ قدرتی حسن کو جب سنوار لیا جائے تو سمجھیں حسن دو آتشہ ہو جاتا ہے۔ وقت کے ساتھ جہاں حسن ڈھلتا ہے وہاں اسے سجانے سنوارنے کا بھی ہنر آ جاتا ہے۔

میں اس وقت شہر کے ایک مشہور مال کے ریستوران

یہ حقیقت ہے کہ ہر راستہ اپنی منزل کا تعین بھی خود ہی کرتا ہے۔ اس نے بھی جو راہ اختیار کی اس کی زہرناکی سے فرار کسی طور ممکن نہ تھا مگر وہ خوش فہم حسینہ بے خبری کے عالم میں خوفناک انجام کی جانب بڑی ہمت سے گامزن ہوئی۔

روپ اور مقام بدلنے والی حسینہ کی عجیب روداد

بدلہ

امجد جاوید

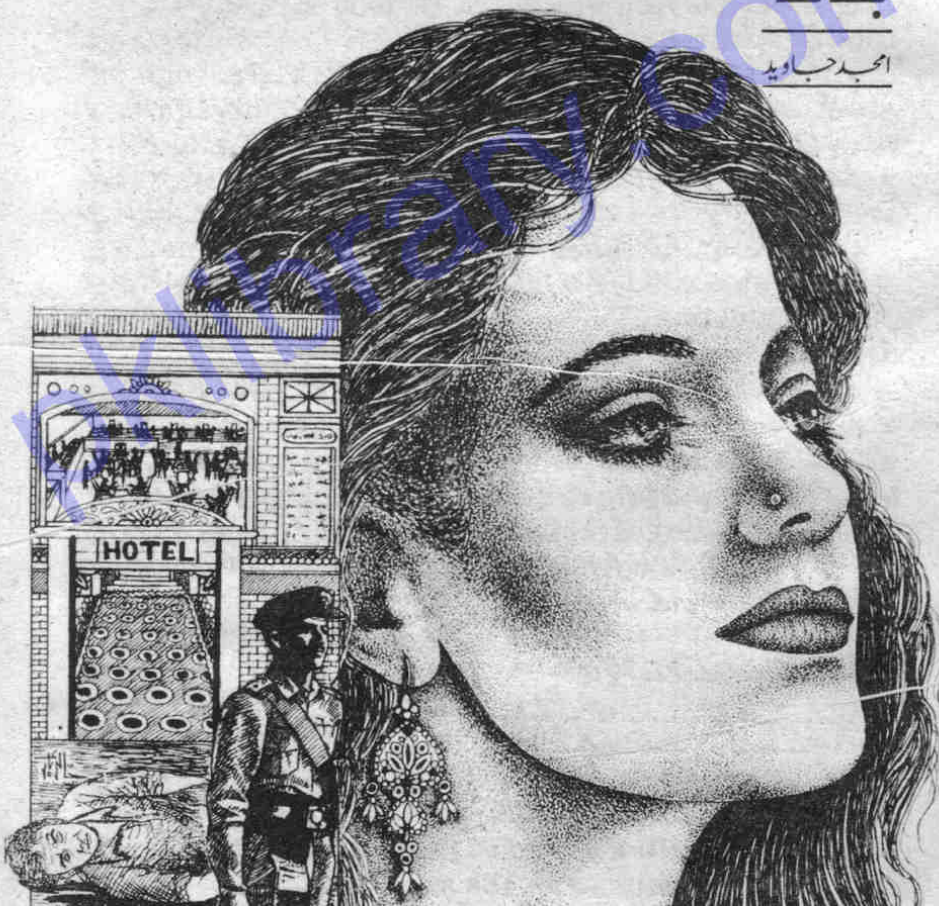

kklibrary.com

میں بیٹھا ہوا تھا جہاں سے وہ میری نگاہوں میں آئی تھی۔ وہ تنہا تھی۔ اسے کچھ خریدنا نہیں تھا یا شاید کوئی دوسرا مقصد تھا۔ ایک دم سے میرے اندر خوشی پھوٹی لیکن اس کے ساتھ ہی نفرت بھی جاگ اٹھی۔ میں خوشی اور نفرت کے درمیان ڈانواں ڈول ہو گیا۔ میرا من چاہا کہ اس کے ساتھ بیٹھ کر تھوڑی باتیں کروں۔ بھلے وہ جیسی بھی تھی، بہرحال اس کے ساتھ تھوڑا وقت گزارا تھا پھر مجھے احساس ہوا کہ پہلے کنفرم تو کرلوں کہ جسے میں دیکھ رہا ہوں وہ واقعی راحیلہ ہے یا میں کہیں دھوکے ہی میں ہوں۔ میں نے جیب سے سیل فون نکالا اور اس کے نمبر پش کر دیے۔ بیل جاتے ہی راحیلہ نے اپنے سیل فون کی اسکرین پر دیکھا پھر چند لمحے ٹھٹک کر دیکھتے رہنے کے بعد کال ریسیو کرتے ہوئے دھیمے سے کہا۔

''ہیلو ارشد! کیسے ہو؟''

''میں تو ٹھیک ہوں، تم سناؤ، کہاں ہو؟'' میں نے جان بوجھ کر پوچھا۔

''میں اس وقت ایک مال میں ہوں..... کیوں، خیریت؟'' اس نے پوچھا۔

''خیریت ہے۔ میں بھی مال ہی میں بیٹھا ہوں اور شاید میں تمہیں دیکھ رہا ہوں۔ کھلے گیسو، چہرے پر ہلکا میک اپ، سفید قمیص کے ساتھ نیوی بلو جینز، ہائی ہیل سیاہ سینڈل پہنے بڑے خراماں خراماں انداز میں چلتی چلی جا رہی ہو۔'' میں نے خوشگوار لہجے میں کہا تو وہ ایک دم ہنس دی پھر بولی۔

''کہاں بیٹھے ہو؟''

''اپنے دائیں جانب ہلکا سا مڑ کر سامنے دیکھو۔ میں اوپر ریستوران میں بیٹھا ہوں۔'' میں نے کہا تو وہ ذرا سا گھومی، مجھ پر ایک سرسری سی نگاہ ڈال کر دوسری جانب دیکھتے ہوئے دھیمے سے لہجے میں بڑی سنجیدگی سے بولی۔

''دیکھو، مجھے تم تک پہنچتے ہوئے کوئی دس پندرہ منٹ لگ جائیں گے۔ اپنے دائیں بائیں سے محتاط رہنا۔ یاد رکھنا کہ ہماری ملاقات بالکل ہی اچانک ریستوران میں ہوئی ہے۔ سمجھ گئے نا؟''

''یہ اتنا گمبھیر.....'' میں نے کہنا چاہا تو وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولی۔

''صبر کرو، آتی ہوں۔ جو کہا ہے وہ ذہن میں رکھنا۔''

''او کے۔'' میں نے کہا تو اس نے کال بند کر دی۔ میں نے بھی فون جیب میں رکھ لیا۔

☆☆☆

راحیلہ کو میں لڑکپن ہی سے جانتا تھا۔ بلاشبہ وہ ایک حسین لڑکی تھی لیکن گُدڑی میں پڑا بھلے جتنا حسین ہو، میلا تو بہرحال ہوتا ہے۔ ہم دونوں کے باپ معمولی سرکاری ملازم تھے۔ ہم شہر کے اس گنجان آباد علاقے میں رہتے تھے جہاں ٹیڑھی میڑھی گلیاں تھیں۔ اگر وہ گنجان آباد نہیں تو ویرانہ بھی نہیں تھا۔ سبھی ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ وہ تین بہن بھائی تھے۔ راحیلہ سب سے بڑی تھی، بھائی چھوٹا اور پھر بہن تھی۔ جب تک وہ اسکول میں پڑھتی تھی میرا اور اس کا آمنا سامنا بہت کم ہوتا تھا لیکن جیسے ہی کالج جانے لگی تو روزانہ ہی اس سے ملاقات ہو جاتی تھی۔ ہم گھر کے قریب ترین بس اسٹاپ سے بس میں سوار ہوتے اور وہ مجھ سے پہلے اسٹاپ پر اتر جاتی۔

انہی دنوں اس نے پر پُرزے نکالنا شروع کر دیے تھے۔ اس کا باپ اپنی محدود آمدنی میں بہت مشکل سے گزارہ کرتا تھا اس لیے کسی دوسری جگہ کام کر کے اپنی آمدنی بڑھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کا گھر میں ہونا نہ ہونا ایک برابر تھا۔ ماں کی بات کو وہ اتنی اہمیت نہیں دیتی تھی۔ سو وہ خود کو آزاد ہی سمجھتی تھی۔ صبح کالج کے لیے وقت پر نکلتی اور شام تک اپنی مرضی سے واپس آتی تھی۔ وہ کالج جاتی تھی یا نہیں، باقی وقت کہاں گزارتی تھی؟ اس بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔

مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہے جب وہ پہلی بار بس سے اتر کر کالج گیٹ کی طرف جا رہی تھی۔ ہماری بس رش کی وجہ سے رکی ہوئی تھی۔ وہ بس سے اتری تو ہمارا سینئر کلاس فیلو حامد بائیک لیے آگے بڑھا۔ راحیلہ جاتے ہی خاموشی سے اس کے پیچھے بیٹھ گئی۔ میری اور راحیلہ کی نگاہیں چار ہوئیں مگر اس نے مجھے نظر انداز کر دیا۔ وہ بس کے برابر سے ہماری مخالف سمت میں غائب ہو گئے تھے۔ ظاہر ہے مجھے جہاں اس کا یوں کالج کے بجائے حامد کے ساتھ جانا اچھا نہیں لگا، وہاں مجھے اپنی بے عزتی بھی محسوس ہوئی تھی۔ اس نے مجھے ذرا سی بھی اہمیت نہیں دی۔

اگلے دن وہ مجھے بس اسٹاپ پر ملی تو میرے قریب آتے ہی بولی۔

''اچھا کیا تم نے میرے اور حامد کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتایا۔''

''مجھے کیا ضرورت پڑی ہے بتانے کی۔ تم جانو، تمہاری زندگی۔ مجھے اس سے کیا۔'' میں نے کاندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

''یہی اچھا ہوگا تمہارے لیے۔'' اس نے عجیب سے

لہجے میں کہا تو مجھے ایک دم سے غصہ آ گیا۔ میں نے سرد لہجے میں پوچھا۔

''ورنہ کیا کرو گی؟''

''میں کچھ بھی کر سکتی ہوں۔ یاد رکھنا میرے راستے میں کبھی مت آنا۔'' اس نے دھمکی آمیز انداز میں کہا اور بس کی طرف دیکھنے لگی جو بالکل ہمارے نزدیک آ چکی تھی۔ میں اسے کوئی جواب نہیں دے سکا۔

مجھے اس سے کوئی لینا دینا نہیں تھا۔ نہ ہی مجھے اس سے کوئی دلچسپی تھی لیکن اسے دیکھ کر نہ جانے کیوں غصہ آنے لگتا تھا۔ میں نے بہت سوچا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ مجھے بس یہی سمجھ میں آیا کہ اس کا رویہ ہتک آمیز ہوتا تھا۔ یوں جیسے وہ کسی کو کچھ سمجھتی ہی نہیں تھی۔

گزرتے وقت کے ساتھ راحیلہ کے رنگ ڈھنگ بدلتے چلے گئے۔ گلی محلے کے لڑکے اس کے بارے میں باتیں کرتے، نت نئی اطلاعات دیتے، باہر کے لڑکوں سے اس کی دوستیوں کے تذکرے ہوتے۔ چونکہ اس سے مجھے نہ کوئی ہمدردی تھی اور نہ کوئی دشمنی تھی۔ سو سب کی سن لیتا اور دوسرے کان سے اڑا دیتا تھا۔ میں بھی گاہے بگاہے دیکھتا رہتا۔ سب سے پہلے اس کا پہناوا بدلا پھر وہ رکشے پر جانے لگی۔ یونیورسٹی تک پہنچتے ہوئے اس کے پاس ایک چھوٹی سی کار بھی آ گئی۔ میں نے کبھی تجسس نہیں کیا کہ اتنا سب کچھ کہاں سے آ رہا ہے۔ اگر کوئی کسی غلط راستے پر ڈھٹائی سے چل نکلا ہے تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔

ہمارے محلے کا ایک لڑکا اس پر عاشق تھا۔ وہی اس کی بڑی خبر رکھتا تھا۔ وہ اس کے بارے میں ہمیں بتاتا رہتا تھا۔ دوسرے کئی لڑکے صرف چسکے کی حد تک اس کا ساتھ دیتے رہتے تھے لیکن میں نے ایسے کسی معاملے میں ان کا ساتھ نہیں دیا تھا کیونکہ میں اس طرح کے کسی معاملے میں آنا ہی نہیں چاہتا تھا۔

وہ ان دنوں یونیورسٹی میں ہی تھی جب ہم نے وہ محلہ ہی چھوڑ دیا۔ ابا جی ریٹائرڈ ہو گئے، بڑے بھائی کی اچھی جگہ نوکری لگ گئی۔ ہم ایک سرکاری کالونی میں آ گئے جہاں بڑا بہترین گھر تھا۔ اگرچہ محلہ چھوڑ دیا تھا لیکن پرانے تعلقات تو وہیں جڑے ہوئے تھے۔ گاہے بگاہے راحیلہ کی کوئی نہ کوئی بات کانوں میں پڑ جاتی۔ آخری بار سنا تھا کہ اس کی شادی ہو گئی ہے۔ وہ اسی شہر میں کہیں بیاہی گئی تھی۔

وقت آگے بڑھتا چلا گیا۔ میں بھی مقابلے کا امتحان پاس کر کے ایک اچھے عہدے پر آ گیا تھا۔ میری زندگی کے بھی رنگ ڈھنگ بدل گئے تھے۔ سوشل میڈیا پر بہت سارے پرانے لوگوں کے ساتھ راحیلہ بھی مجھے مل گئی۔ پہلے پہل تو میں اسے پہچان ہی نہیں سکا۔ میں اس سے رابطہ کرنے کی سوچتا رہا پھر جب مجھے یقین ہو گیا کہ وہ ہمارے پرانے محلے والی راحیلہ ہی ہے تو میں نے خود اس سے رابطہ کیا۔ وہ مجھے پہچان گئی۔ بات حال احوال سے چلی تو نہ جانے کہاں کہاں سے ہوتے ہوئے ڈیڑھ برس بعد دوستی میں بدل گئی۔ ذاتی زندگی سے لے کر دنیا جہان کے موضوعات پر بات ہوتی رہی۔ میں نے اسے اپنے بارے میں پورا نہیں بتایا۔ بس وہی جو دنیا کے سامنے میرا چہرہ تھا۔ سوشل میڈیا پر ہم دنیا کو اپنا اصلی چہرہ دکھاتے ہی نہیں۔ یہاں کی ایک اپنی دنیا ہے جہاں پورا سچ کبھی نہیں ہوتا۔ وہ بھی اپنے آپ کو اسی طرح دنیا کے سامنے پیش کرتی تھی جیسے وہ کوئی بہت دولت مند اور کسی رئیس گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں تھا۔ یہ دوستی صرف سوشل میڈیا میسنجر تک ہی محدود رہی۔ نہ تو کبھی اس نے ملاقات کے لیے کہا اور نہ میں نے خواہش کی۔

☆☆☆

وہ مجھے اب کہیں بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ اس نے جو وقت دیا تھا اس میں بھی چند منٹ اوپر ہی ہو گئے تھے۔ مجھے یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے یہاں ریستوران تک آنے میں اتنا وقت کیوں لگ رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے اردگرد میزوں پر تین سے چار لوگ آ کر بیٹھ گئے تھے۔ بظاہر ان کی توجہ میری طرف نہیں تھی لیکن مجھے یہ احساس پوری طرح ہو گیا تھا کہ وہ میرے لیے ہی وہاں پر آ کر بیٹھے ہیں۔

راحیلہ اچانک ہی میرے سامنے ظاہر ہوئی تھی۔ اس نے یوں چونک کر میری طرف دیکھا جیسے بالکل غیر متوقع طور پر میں اسے ملا ہوں۔

''ارے تم..... یہاں..... کیسے ہو؟'' اس نے میری جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے اونچی آواز میں پوچھا۔

''میں ٹھیک ہوں۔'' میں نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

''بہت عرصے بعد ملاقات ہوئی تم سے۔ کہاں گم ہو؟'' اس بار اس کی آواز کافی زیادہ تھی۔ مجھے لگا جیسے وہ کسی کو سنا رہی ہو۔ میں نے کہا۔

''بس یہیں ہوں۔ تم سناؤ..... کئی برس ہو گئے تمہیں دیکھے ہوئے۔''

''یہ طے ہے کہ دنیا گول ہے۔ گھوم پھر کر ہم پھر کسی نہ کسی وقت ایک دوسرے سے مل ہی لیتے ہیں۔'' اس بار وہ کافی حد تک پُرسکون لہجے میں بولی۔

''یہاں آنے سے پہلے تم پراسرار سی باتیں کر رہی تھیں۔ خیریت، اتنا محتاط ہو رہی ہو، کوئی خاص وجہ؟'' میں نے پوچھا تو وہ دھیمے سے بولی۔

''میں یہاں کوئی خریداری کرنے نہیں آئی، کسی خاص کام کے لیے آئی ہوں۔ ظاہر ہے وہ کر کے ہی آنا تھا اور دوسرا..... میں اس وقت بھی نگرانی میں ہوں۔ میرے اردگرد اب بھی کچھ لوگ ہیں۔''

''اوہ اچھا۔ خیر، کیا لوگی؟ میں آرڈر دے دوں۔'' میں نے پوچھا اور پھر ویٹر کو اشارہ کیا۔ اسے آرڈر دے کر میں راحیلہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ''کیسی گزر رہی ہے، کتنے بچے ہیں؟ میرا خیال ہے تمہاری شادی ہو گئی تھی؟''

''ایک دم سے اتنے سوال؟ خیر، شادی تو ہو گئی تھی لیکن وہ زیادہ دیر چل نہیں سکی۔ خلع لے لیا تھا میں نے۔'' اس نے افسردہ لہجے میں بتایا۔

''پھر دوبارہ شادی کی؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں کی..... پھر اس کے بعد میں نے سوچا ہی نہیں شادی کے بارے میں۔ سو، بچے نہیں ہیں۔ بس ایک آزاد زندگی گزار رہی ہوں۔'' اس نے عام سے لہجے میں کہا تھا لیکن اس میں جو مہین سا کرب تھا، اس کا احساس مجھے ہو گیا تھا۔

''پوچھنا تو نہیں چاہیے لیکن پھر بھی ایسا کیا کرتی ہو جو اتنے ٹھاٹ سے رہ رہی ہو؟ تمہارا سوشل میڈیا تو یہی بتاتا ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا تو وہ ایک دم سے ہنس دی پھر بولی۔

''اوہ یار! وہاں کی زندگی کے بارے میں کچھ مت کہو۔ وہ تو ایسے ہی ہوتی ہے لیکن یہ سچ ہے کہ میں بڑے ٹھاٹ سے رہتی ہوں۔ سب کچھ ہے میرے پاس۔ اپنا بنگلا، گاڑیاں، بینک بیلنس..... وہ سب کچھ جو زندگی گزارنے کے لیے چاہیے۔'' اس کے لہجے میں قدرے رعونت تھی۔ اس کے ساتھ ہی مجھے اس نے بتایا کہ اس کے بنگلے کی لوکیشن کیا ہے۔ اس نے مجھے وہاں آنے کی باقاعدہ دعوت بھی دی۔

''راحیلہ! میں نہیں جانتا کہ تم کیا کرتی رہی ہو لیکن تم نے محنت بھی تو بہت کی لڑکپن سے۔'' میں نے کہا تو وہ دکھ سے بولی۔

''کیا وقت یاد کروا دیا تم نے۔ وہ بہت مشکل وقت تھا میرے لیے۔''

''مشکل وقت.....؟ میرے خیال میں تو اس وقت تم.....'' میں نے کہنا چاہا تو وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولی۔

''میں جانتی ہوں کہ اس وقت لوگ میرے بارے میں کیا کہتے تھے۔ خاص طور پر محلے کے لڑکے یہی سمجھتے تھے کہ میں کوئی کال گرل ٹائپ چیز بن گئی ہوں۔ اپنا جسم فروخت کرتی ہوں لیکن ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔''

''تو پھر کیا تھا؟ تمہارا تو بہت سارے لڑکوں کے ساتھ تعلق بنا ہوا تھا۔ وہ بھی باہر کے ہوتے تھے۔'' میں نے پوچھا۔

''کاش، تم اس وقت مجھ سے یہ پوچھ لیتے لیکن خیر، ایک بات مجھے تمہاری بہت اچھی لگی تھی۔ میں نے کبھی نہیں سنا کہ تم نے میرے بارے کوئی اوٹ پٹانگ یا غلط یا صحیح بات کسی سے کہی ہو۔ شاید تمہارا وہی اچھا رویہ تھا جس کے باعث آج میں تمہارے پاس بیٹھی ہوں۔'' اس نے کہا تو مجھے لگا جیسے وہ میری بات کو بڑی خوبصورتی سے ٹال گئی ہے۔ تبھی میں نے اسے موضوع پر رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

''سوال تو بنتا ہے نا..... لوگوں میں تجسس تو ہوتا تھا نا کہ اتنا پیسا کہاں سے آ رہا ہے؟''

''ہاں، فطری سی بات ہے۔ تجسس تو ہوتا ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ محنت سے اتنا پیسا، اتنی جلدی نہیں بنتا۔ بس اتنا سمجھ لو ہم کچھ لوگوں کا ایک گروپ بن گیا تھا۔ سو، کچھ خفیہ چیزیں اِدھر سے اُدھر کرتے رہتے تھے۔ اس سے کافی کچھ مل جاتا تھا۔'' اس نے اکتاہٹ بھرے لہجے میں کہا۔

''شاید طلاق کی وجہ بھی یہی بنا ہوگا؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں بلکہ وہ تو مجھ سے بھی دو ہاتھ آگے نکلا تھا۔ اس نے بھی سمجھا تھا کہ میں کوئی کال گرل قسم کی چیز ہوں۔ وہ مجھ سے شادی کر کے مجھ سے ہی مال بنانا چاہتا تھا۔ جیسے میں کوئی انسان نہیں، نوٹ بنانے والی مشین ہوں۔''

''اوہ..... پھر تو بہت اچھا کیا۔'' میں نے ہمدردی سے کہا تو وہ بولی۔

''دراصل میں نے خود کو مشین بنا لیا۔ بہت کمایا میں نے۔'' یہ کہہ کر وہ جذبات سے عاری ہنسی ہنس دی تو میں بولا۔

''سوری راحیلہ! میں سوشل میڈیا پر دیکھ رہا ہوں تمہارے بیرونِ ملک ٹور، نئی گاڑیاں، نت نئے ملبوسات۔ ان سب کے لیے تو بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔ کوئی مستقل بزنس وغیرہ۔''

''یار! کون کہتا ہے میرا بزنس نہیں ہے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ ہنس دی۔

''لیکن کہیں ذکر تو نہیں کیا؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''اوئے میرے بھولے..... ایسا بزنس بتایا نہیں جاتا۔ میرے ایک نہیں، کئی بزنس ہیں۔'' اس نے زیرلب مسکراتے ہوئے کہا۔

''مطلب؟ میں سمجھا نہیں۔'' میں نے بالکل نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

''دیکھو، جیسے تم کچھ نہ کچھ تو کرتے ہوگے، کیا کرتے ہو؟''

''میں سرکاری ملازم ہوں۔'' میں نے کہا۔

''اگر میں کوئی کام لے کر سرکاری ملازم کے پاس جاؤں، وہ مجھ سے اس کی رشوت طلب کرے اور میں اسے منہ مانگی رشوت دوں تو پھر میں جو چاہوں اس سے کام نکلواتی رہوں۔''

''ہاں..... جب تم رشوت دوگی تو جو چاہو کروگی۔'' میں نے کہا۔

''سو، اسی طرح میں نے اپنے اردگرد کئی ایسے لوگ پال لیے ہیں۔ کبھی کی ضرورت ہوتی ہے اور میں ان کی ضرورت پوری کرتی ہوں۔ یہی میرا بزنس ہے۔ ضرورت پوری کرنے کا بزنس۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''مطلب اگر مجھے اسلحہ چاہیے تو میں تمہیں کہہ دوں؟'' میں نے پوچھا۔

''بالکل۔ تمہاری ضرورت پوری ہوجائے گی اور مجھے نفع۔'' اس نے کاندھے اچکاتے ہوئے بے پروائی سے کہا تو میں دھیمے سے بولا۔

''اوہ..... اچھا۔ خیر، یہ تمہاری زندگی ہے، جیسے چاہو گزارو۔''

''بس یہی بات تمہاری اچھی ہے۔ تم کسی کی زندگی میں دخل نہیں دیتے۔ یہ باتیں تم نے کبھی مجھ سے نہیں پوچھی تھیں اسی لیے میں نے بتادیں۔ ویسے تم کیا کرتے ہو؟'' اس نے پوچھا تو میں نے بے چارگی سے بتایا۔

''وہی سرکاری نوکری۔ بس یار! زندگی گھسٹ رہی ہے۔ وہی لگی بندھی زندگی، کوئی چارم نہیں۔ خرچ بڑھ رہے ہیں دن بدن لیکن آمدن وہی محدود سی۔''

''ہاں، ایک یہی المیہ ہوتا ہے تم مڈل کلاس لوگوں کا۔ ساری زندگی اسی چکر میں گزار دیتے ہو۔ ذرا سا بھی رسک لینے کا حوصلہ نہیں ہوتا تم لوگوں میں۔ ہاں، دوسروں پر تنقید کروالو۔ یہ کام بہت اچھا ہوتا ہے۔'' اس نے یوں کہا جیسے وہ غریب لوگوں پر بھری بیٹھی ہو۔

''یار! کیا کریں پھر..... سب تمہاری طرح حوصلہ تو نہیں رکھتے۔'' میں نے کہا تو وہ کرب سے بولی۔

''میرے بہن بھائی اب بھی وہی غربت کی زندگی گزار رہے ہیں۔ بہت کہا میں نے لیکن نس سے مس نہیں ہوتے۔ شاید نفرت کرتے ہیں یا حسد کرتے ہیں مجھ سے۔'' یہ کہہ کر اس نے ایک لمبی سانس لی اور پھر میرے چہرے کی جانب دیکھ کر بولی۔ ''چلو چھوڑو، وہ جانیں اور ان کی زندگی۔''

لفظ اس کے منہ ہی میں تھے کہ ویٹر آگیا۔ وہ ہمارے سامنے کھانا سجانے لگا۔ ہم خاموش ہوگئے۔ کھانا کھاتے ہوئے وہ مجھے اپنی زندگی کی مشکلات کے بارے میں بتاتی رہی جس کا لبِ لباب یہی تھا کہ اسے کافی سارے غیر قانونی کام کرنے پڑے جس میں ڈرگز سپلائی کرنا تھا۔ تبھی کھانا ختم کرتے ہوئے میں نے کہا۔

سنہری باتیں

☆ جب تک ہم کوشش نہ کریں ہم نہیں جانتے کہ ہم کیا کچھ حاصل کرسکتے ہیں۔

☆ جو حیا کا جامہ پہن لے، لوگ اس کے عیب نہیں دیکھتے۔

☆ تمہاری قسمت وہی ہے جس کی تم کوشش کروگے۔

☆ اعتبار ایک ایسا شیشہ ہے جو ایک بار ٹوٹ جائے تو دوبارہ نہیں جڑتا۔

☆ انسانی رویے موسموں کی طرح ہوتے ہیں جن سے نمٹنے کے لیے لہجوں کے لباس بدلنا پڑتے ہیں۔

☆ بعض رشتوں کو برقرار رکھنا ان کو توڑ دینے سے زیادہ اذیت ناک ہوتا ہے۔

☆ ہر خوبصورت چیز کو حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرو۔ چاند ستارے آسمان کی خوبصورتی کے لیے ہیں، دامن بھرنے کے لیے نہیں۔

☆ یہ ٹھیک ہے کہ محبت مرتی نہیں مگر اس کے معیار ضرور بدلتے رہتے ہیں۔

☆ جب ہمارا خود اپنے دل پر اختیار نہیں تو کوئی دوسرا ہم مزاج کیسے بن سکتا ہے۔

(مرسلہ: محمد انور ندیم۔ حویلی لکھا، اوکاڑہ)

''اب چھوڑو یہ سب..... شادی کرو اور سکون سے زندگی گزارو۔''

''اب نہیں نکل سکتی۔ جس دن نکلنے کی خواہش کروں گی، اسی دن ماردی جاؤں گی۔'' اس نے کرب سے کہا۔

''کوشش بھی نہیں کی؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں، ایک بار کی تھی تو شوہر سے جدا ہونا پڑا۔'' اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ تبھی اس کے فون پر میسج آنے کی ٹون بجی۔ اس نے فون پر میسج پڑھا تو اس کے چہرے پر بے چینی پھیل گئی۔ اس نے یکلخت میری طرف دیکھا اور منتشر لہجے میں پوچھا۔

''میں اب چلوں؟''

''اتنی جلدی؟'' میں نے پوچھا تو وہ پرس اٹھا کر اٹھتے ہوئے بولی۔

''بس مجھے جانا ہوگا۔''

''لیکن اب تم جا نہیں پاؤ گی۔'' میں نے اجنبی لہجے میں کہا۔

''وہ کیوں؟'' اس نے شدید حیرت سے پوچھا۔

''بیٹھو..... بتاتا ہوں۔'' میں نے کہا تو وہ بیٹھتے ہوئے بولی۔

''کہو، کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''پچھلے ڈیڑھ برس سے میں تمہیں نگاہوں میں رکھے ہوئے ہوں۔ بڑی مشکل سے آج تم تک رسائی ملی ہے۔ اس کے لیے مجھے پورا ایک ہفتہ انتظار کرنا پڑا۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''ڈیڑھ برس..... ایک ہفتہ انتظار..... کیسے..... میں تو یوں اچانک ملی ہوں تم سے؟'' اس نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا تو میں اس کی سنی ان سنی کرتے ہوئے بولا۔

''نہیں، اچانک نہیں ملی ہو بلکہ میں نے پوری کوشش کر کے تمہیں یہاں بلوایا ہے۔ ہاں، میری اور تمہاری ملاقات تقریباً پندرہ برس بعد ہوئی ہے۔ خیر، مجھے اچھا لگا کہ تم نے مجھ سے ایک سچ بولا اور وہ یہ کہ تم لوگوں کی ضرورت پوری کرتی ہو۔ لوگوں کے کام آنا اچھی بات ہے لیکن کسی کو قتل کرنا اچھی بات نہیں۔''

''کیا بکواس کر رہے ہو؟ میں اور قتل.....!'' اس نے کھردرے لہجے میں کہا۔

''میں تمہیں ایک بات بتاتا ہوں۔ ایک عورت کسی ادھیڑ عمر کے ساتھ یا کسی بھی عیاش بندے سے دوستی کرتی ہے۔ اس کے ساتھ چند دن رہتی ہے لیکن پھر اسے قتل کر کے غائب ہو جاتی ہے۔ اب تک وہ چھ قتل کر چکی ہے۔'' یہ کہہ کر میں سانس لینے کے لیے رکا اور پھر کہتا چلا گیا۔

''ہر جگہ سے ایک ہی ثبوت ملا ہے، طریقۂ واردات..... لیکن وہ عورت نہیں مل رہی تھی۔ بڑا مضبوط پلان بناتی ہے۔ اپنا ثبوت تو کیا، تصویر تک نہیں چھوڑتی۔''

''تو اس سے میرا کیا تعلق؟'' اس نے دھیمے سے پوچھا۔

''تم نے پہلے شوہر سے پریشان ہو کر خلع نہیں لیا بلکہ تم نے اس سے جان بوجھ کر طلاق لی تاکہ تم آزادانہ کام کر سکو۔ پہلا قتل ادھیڑ عمر شخص چودھری عمر دراز کا تھا جسے تم نے اور تمہاری گینگ نے قتل کر دیا تھا۔''

''یہ کیا بکواس کر رہے ہو تم؟'' اس نے ایک دم غصے میں کہا مگر اس کے چہرے کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا۔ ''یہ تم کیسے ثابت کر سکتے ہو کہ وہ میں ہی تھی؟''

''تم سے غلطی یہ ہوئی کہ تم نے طریقۂ واردات ایک ہی رکھا۔ وہ کیمیکل جسے کھلا کر تم قتل کرتی رہی ہو۔ اس بارے میں مجھے دو ہفتے پہلے پتا چلا۔ تمہارے گینگ کے ارشد نامی شخص کو میں نے دو ہفتے پہلے ہی پکڑا تھا۔''

''تم پولیس میں ہو؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''سمجھو..... پولیس سے بھی اوپر۔'' میں نے غضب ناک انداز میں کہا۔

''دیکھو، تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے اور.....'' اس نے کہنا چاہا لیکن میں نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا۔

''مجھے غلط فہمی نہیں ہوئی کیونکہ یہ میرا ہی بچھایا ہوا جال تھا جس کی وجہ سے تم یہاں آنے پر مجبور ہوئی ہو۔ تم یہ سمجھ رہی ہو کہ یہاں اردگرد تمہارے بندے بیٹھے ہیں۔ دیکھو، کہاں ہیں وہ؟''

میرے کہتے ہی اس نے فوراً اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔

''یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔'' اس نے مُردہ لہجے میں کہا۔

''وہ تو پکڑے گئے ہیں۔ اب تم بھی جانے کے لیے تیار ہو جاؤ۔'' میں نے سختی سے کہا تو اس نے رحم طلب نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''بس، ایک موقع دے دو..... یہاں سے جانے دو۔''

''میں کچھ نہیں کر سکتا۔'' میں نے کہا اور اٹھ کر چل دیا۔

سیڑھیوں سے نیچے اترتے ہوئے میں سوچ رہا تھا۔ میں نے اپنا فرض نبھایا ہے یا پھر اپنا کوئی پرانا بدلہ لیا ہے۔ میں اس بارے کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔

⌘⌘⌘

مسلمان نماز پڑھنے میں مشغول ہو گئے۔ جہاز کا ناخدا یہودی تھا اور اس کے عملے کے لوگ کچھ یہودی تھے اور کچھ عیسائی۔ وہ مسلمانوں کو نماز پڑھتے دیکھ رہے تھے اور مسلمانوں کی طمانیت اور سکون پر حیرت کر رہے تھے۔

دوسرا اور آخری حصہ

صاف بن صیاد

ضیا تسنیم بلگرامی

ایک ایسی متنازعہ شخصیت جو دجال اکبر جیسے کسی قسم کا دعویٰ کر دیتا تو بہت بڑے فتنہ و فساد کا سبب بن جاتا لیکن کسی خاص سبب سے اس نے ایسا نہیں کیا۔ اسی دور میں کئی جھوٹے دعویداروں نے فتنے برپا کیے مگر یہ شخص خاموش رہا جبکہ یہ کاہن بھی تھا اور اپنی کہانت میں شہرت رکھتا تھا۔ لوگ اس سے اپنے بارے میں سوال جواب کرتے تھے مگر... خود اس کے بارے میں عجیب وسوسے میں مبتلا رہتے تھے۔

اپنے دور کی ایک پراسرار مگر دلچسپ شخصیت کے حالات

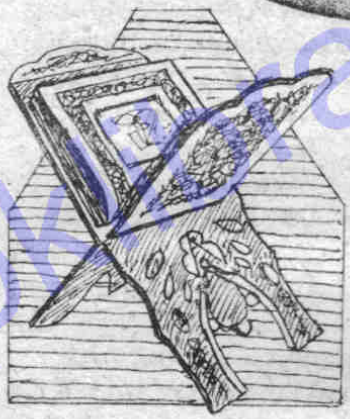

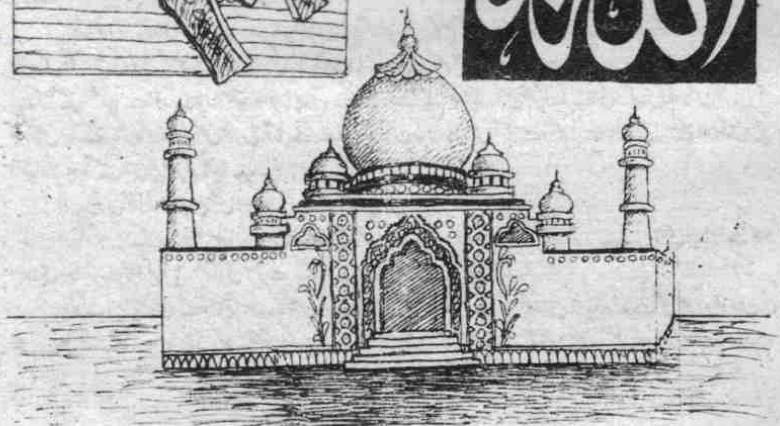

جہاز کہیں سے کہیں پہنچ چکا تھا اور ناخدا کا خیال تھا کہ رات ہو جانے کے بعد اگر طوفان ختم گیا، مطلع صاف ہوا اور آسمان میں ستارے نظر آنے لگے تو وہ ان کی مدد سے یہ جاننے میں کامیاب ہو جائے گا کہ اس کا جہاز ساحل سے کتنی دور آچکا ہے اور اب اسے کس سمت میں سفر کرنا ہے۔

لیکن اس کی نوبت ہی نہ آئی اور جہاز جگہ جگہ سے ٹوٹنے لگا۔ مسافر پانی میں ڈبکیاں کھانے لگے۔ عملے نے چند تختوں کا سہارا لیا اور اس پر بیٹھ کر ہوا کے رخ سفر کرنے لگے۔ ان میں ناخدا بھی شامل تھا۔ ان لوگوں نے مسلمانوں کے علاوہ کسی مسافر کی کوئی پروانہ کی اور کہا۔ ''ہماری طرح تم لوگ بھی جہاز کے ٹوٹے ہوئے تختوں پر بیٹھ جاؤ۔ یہ تختے ہم سب کو کہاں لے جائیں گے، ہمیں نہیں معلوم۔ ہوسکتا ہے یہ ہماری کچھ دیر اور کچھ دور تک مدد کریں پھر ہمیں سمندر کے حوالے کردیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ ہم ان کے ذریعے کسی محفوظ جگہ پر پہنچ جائیں جس کا امکان بہت کم ہے۔''

تھوڑی دیر بعد جہاز غائب ہو چکا تھا اور تختوں پر بیٹھے ہوئے لوگ اوپر نیچے ہو رہے تھے۔ ہر شخص جو زندہ تھا، اپنی زندگی سے مایوس ہو چکا تھا۔

آخر کار چند تختے ایک جزیرے تک انہیں لے گئے۔ ان میں تمیم داری بھی شامل تھے۔

اس جزیرے میں پناہ تو مل گئی مگر کھانے پینے کا مسئلہ ان سب کو پریشان کرنے لگا۔ بظاہر یہاں کوئی آبادی بھی نظر نہیں آرہی تھی اور یہ چند بچ جانے والے لوگ اتنے تھک چکے تھے کہ یہ جزیرے میں بہت دیر تک پیدل سفر بھی نہیں کر سکتے تھے۔

مجبوراً یہ لوگ ساحل پر ہی پڑے رہے اور یہ فیصلہ کیا کہ جب تھکان دور ہوگی تو وہ اس جزیرے کے اندرونی حصوں میں جا کر دیکھیں گے کہ وہاں سے کچھ کھانے پینے کا سامان مل سکتا ہے یا نہیں۔

زندہ بچ جانے والوں میں ناخدا اور عملے کے چند لوگ بھی شامل تھے۔

یہاں بیٹھے بیٹھے رات ہوگئی اور مطلع بھی صاف ہو گیا۔

ناخدا آسمان پر ستاروں کو تلاش کر رہا تھا۔ جب اکبر دیکھ کر اس نے اندازہ لگایا کہ وہ کسی قدر جنوب میں ہے۔

وقت گزاری کے لیے ناخدا اور اس کے ساتھی مسلمانوں سے باتیں کرنے لگے۔ وہ مسلمانوں سے پوچھ رہے تھے۔

''طوفان میں تم کس کو یاد کر رہے تھے اور کس سے مدد مانگ رہے تھے؟''

مسلمانوں نے جواب دیا۔ ''اللہ سے۔''

ناخدا نے پوچھا۔ ''تمہارا مذہب کیا ہے؟''

مسلمانوں نے جواب دیا۔ ''اسلام۔''

ناخدا اور اس کے ساتھیوں نے اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں کچھ سن تو رکھا تھا مگر انہیں کچھ زیادہ معلومات حاصل نہیں تھیں۔

ناخدا نے پوچھا۔ ''جب تم دعائیں مانگ رہے تھے تو کیا تمہیں یہ یقین تھا کہ تم اس طوفان سے زندہ سلامت بچ نکلو گے؟''

مسلمانوں نے جواب دیا۔ ''ہمارا یہ ایمان ہے کہ اللہ کا ہر کام مصلحت پر مبنی ہوتا ہے۔ یہ جو کچھ ہمارے ساتھ پیش آیا، اس میں بھی اللہ کی کوئی مصلحت کارفرما ہوگی۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ ہم اس مصلحت سے واقف نہ ہوں۔ دوسری ضروری بات یہ ہے کہ ہمیں یقین ہے اور یہ ہمارا عقیدہ اور ایمان ہے کہ موت ایک نہ ایک دن ضرور آئے گی۔ کہاں اور کس طرح آئے گی؟ ہم نہیں جانتے لیکن موت کو جس طرح آنا ہے، جہاں اور جن حالات میں آنا ہے، ہم اسے ٹال نہیں سکتے اور جس چیز پر ہمارا اختیار نہ ہو، ہمیں اس پر صبر کرنا چاہیے۔''

ان باتوں کا اثر ناخدا پر بھی ہوا اور اس کے عملے پر بھی۔

ان لوگوں کے سامنے مسلمان دیر تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کا ذکر کرتے رہے۔ اسلامی مساوات کا ذکر آیا۔ اسلامی معاشرت کا ذکر آیا۔ اسلامی اخوت کے بارے میں انہیں بتایا گیا۔

یہ لوگ ان باتوں سے متاثر ہوئے لیکن اب بھی انہیں اس طمانیت اور سکون پر زیادہ حیرت تھی جو وہ طوفان کی حالت میں دیکھ چکے تھے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ اگر یہ طمانیت اور سکون انہیں اسلام کے ذریعے حاصل ہوا ہے تو اسلام یقیناً ایک بڑا

مذہب ہے۔

رات کو انہیں بھوک بھی محسوس ہوئی اور پیاس بھی لیکن اندھیرے اور سنسان جزیرے میں کہیں جانے کی کوئی ہمت نہ کر سکا۔ یہاں انہیں درندوں کا بھی خوف تھا اور حشرات الارض سے بھی وہ ڈر رہے تھے لیکن مسلمانوں کا حال یہاں بھی وہی تھا۔ وہ احتیاط بھی کر رہے تھے اور اندھیرے میں خطرات کو دیکھنے کی کوشش بھی کر رہے تھے۔ انہوں نے قیام کے لیے ایک کھلی جگہ کا انتخاب کیا۔ انہیں ایک درخت کا سایہ بھی میسر تھا مگر جھاڑیاں اور درختوں کا جھنڈ ان سے دور تھا۔ آسمان پر چاند بھی نہیں تھا لیکن ستاروں کی روشنی اتنی ضرور تھی کہ وہ ان کی روشنی میں کسی درندے کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھ سکتے تھے۔ ان کی نظریں مسطح زمین کی بھی نگرانی کر رہی تھیں جس پر سانپ بچھو نمودار ہو سکتے تھے۔

ناخدا اور اس کے ساتھیوں کے لیے یہ بڑے عجیب لوگ تھے۔ ایک طرف ان میں بلا کی احتیاط پسندی پائی جاتی تھی تو دوسری طرف تقدیر الٰہی پر بے پایاں صبر و شکر تھا جو انہیں مطمئن کیے ہوئے تھا۔

ناخدا نے شب گزاری کے لیے باتوں کا سہارا لیا۔ اس نے مسلمانوں سے پوچھا۔ ''تمہیں ہماری طرح بھوک تو لگی ہوگی؟''

مسلمانوں نے جواب دیا۔ ''جب تک زندگی ہے، ہمارا جسم اپنے معدے کے ذریعے غذا کی اشتہا کرتا رہے گا۔ پانی کی کمی ہوگی تو جسم پانی کا مطالبہ کرے گا۔''

ناخدا نے کہا۔ ''اگر ہمیں یہاں یہ دونوں چیزیں نہ ملیں تو ہم کیا کریں گے؟''

مسلمانوں نے جواب دیا۔ ''اللہ رزاق بھی ہے۔ اس نے پیدا کیا ہے تو وہ ہمیں رزق بھی دے گا۔ یہ رزق ہمیں ضرور تلاش کرنا پڑے گا۔ ہمیں یہاں پانی بھی ملے گا اور ہم کسی حال میں اللہ سے مایوس نہیں ہو سکتے کیونکہ اللہ نے اپنی کتاب قرآن پاک میں یہ فرمایا ہے کہ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔''

ناخدا اور اس کے عملے کے لوگ اسلام کا اثر قبول کرتے جا رہے تھے۔ انہوں نے بڑی کوشش کی کہ مسلمانوں کے اعتقاد پر عمل پیرا ہو کر طمانیت اور سکون حاصل کر لیں مگر ناکام رہے کیونکہ بھوک اور پیاس انہیں مسلسل ستا رہی تھی اور جزیرے کا اندھیرا اور ویرانیاں انہیں مستقل خوفزدہ کیے جا رہے تھے۔

ان لوگوں نے مسلمانوں سے وہ طریقہ پوچھا جس سے وہ اپنے اندر طمانیت پیدا کر کے بھوک پیاس اور دوسرے اندیشوں سے نجات پا جائیں۔

پہلے تو ان کا یہ خیال تھا کہ اگر وہ باتوں میں مشغول ہو جائیں گے تو دکھ درد کا احساس کسی حد تک کم ہو جائے گا لیکن تھوڑی تھوڑی دیر بعد ان کے ہاتھ سے صبر کا دامن چھوٹ جاتا تھا اور ناحق پریشانیاں انہیں تنگ کرنے لگتی تھیں۔

پوری رات اسی کرب میں گزار دی۔ صبح ہوئی تو انہیں جزیرے کے راستے نظر آنے لگے۔ جزیرے کے جنگلات، جھاڑیاں، پودے دکھائی دینے لگے۔ ان سب نے یہ طے کیا کہ ہر کوئی اپنے اپنے طور پر جزیرے میں نکل جائے اور جس کو جہاں سے انسانی ضروریات و زندگی کی چیزیں ملیں، ایک دوسرے کو ان سے مطلع کر دے۔

ان سب کو یہ یقین تو تھا کہ اگر اس جزیرے میں کوئی آبادی ہوگی تو اس کی ہر چیز ان مصیبت زدہ اور آفت رسیدہ لوگوں سے مختلف ہوگی۔ ان کی زبان، ان کے لباس، ان کا رہن سہن، ان کی غذا، غرض یہ کہ کسی چیز میں بھی ان سے مماثلت ناممکن تھی۔

تمیم داری نے اپنے لیے جس راستے کا انتخاب کیا تھا، وہ بظاہر ایک غار کی طرف جا رہا تھا جبکہ دوسرے لوگ کھلے اور واضح راستوں کا انتخاب کر چکے تھے۔ اگر کوئی تمیم داری سے یہ پوچھتا کہ انہوں نے اپنے لیے اس خطرناک جگہ کا انتخاب کیوں کیا تو بظاہر ان کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔

اور خود تمیم داری بھی یہ سوچ رہے تھے کہ اللہ نے انہیں جس راستے پر چلنے کا حکم دیا ہے، وہ آگے جا کر ختم ہو جاتا تھا۔ وہاں ایک بہت بڑا غار کسی مہیب دیو کی طرح منہ کھولے کھڑا تھا۔

تمیم داری اس راستے پر چلتے رہے اور سوچتے رہے کہ اگر اس غار میں کوئی مخلوق رہتی بھی ہوگی تو یہ تنہا اس سے کس طرح نمٹیں گے اور پھر وہاں سے ان کی واپسی ناممکن ہو جائے گی۔

تمیم داری دیر تک چلتے رہے۔ انہیں حیرت تھی کہ جس جگہ انہیں جانا تھا اور جو بظاہر غار کی طرح منہ کھولے کھڑی تھی، وہ

بظاہر قریب نظر آتی تھی مگر چلتے رہنے کے بعد احساس ہوا کہ وہ جگہ بہت دور ہے۔
راستہ بالکل سنسان تھا۔ کسی طرف کوئی آدمی نظر نہیں آ رہا تھا۔
جہاز کے دوسرے لوگ کہاں بھٹک رہے ہوں گے اور کس حال میں ہوں گے؟ تمیم داری کو کچھ پتا نہ تھا۔
اچانک ایک چٹان کی آڑ سے ایک عجیب و غریب عورت نمودار ہوئی۔ یہ عورت عجیب وضع قطع کی تھی جس کے بال بہت لمبے لمبے تھے۔
تمیم داری نے اس سے پوچھا۔ ''تو کون ہے اور یہاں کیا کر رہی ہے؟''
عورت نے جواب دیا۔ ''اس راستے میں، میں تنہا رہتی ہوں۔''
تمیم داری نے کہا۔ ''میں نے تجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ تو یہاں صرف تنہا رہتی ہے یا یہاں دوسرے کون لوگ آباد ہیں۔ میں تو صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تو کون ہے اور یہاں کیا کرتی ہے؟''
عورت نے جواب دیا۔ ''میں جاسہ ہوں اور کسی کے لیے مخبری کے فرائض انجام دیتی ہوں۔''
تمیم داری کو بڑی حیرت ہوئی۔ انہوں نے کہا۔ ''جس طرح تیری صورت، شکل، وضع قطع اور حلیہ عجیب و غریب ہے، اسی طرح تیری باتیں بھی عجیب و غریب ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ تیری مخبری کس کے لیے ہے؟''
عورت نے جواب دیا۔ ''تو جس طرف جا رہا ہے، وہ راستہ ایک دیر کی طرف جاتا ہے۔ وہاں تیری ملاقات جس شخص سے ہوگی وہ مجھ سے بھی زیادہ عجیب و غریب ہوگا۔ تو اس سے جا کر مل سکتا ہے۔''
تمیم داری ان پیچیدہ باتوں سے الجھن محسوس کر رہے تھے۔
عورت نے اصرار کیا۔ ''وقت ضائع نہ کر۔ جو کچھ بات کرنا ہے، وہاں فوراً چلا جا۔''
تمیم داری نے سوچا۔ 'میں اس عجیب و غریب شخص کے پاس جا کر کہیں اور بے وقوف نہ بن جاؤں۔'
عورت کن انکھیوں سے تمیم داری کو دیکھ رہی تھی اور تمیم داری کے تذبذب سے ناخوش تھی۔
کچھ دیر بعد عورت نے کہا۔ ''میں تجھ کو جس شخص کے پاس بھیج رہی ہوں وہ عجیب الخلقت ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بہت بڑی نشانی ہے اور اس کی وجہ سے تجھے اتنی شہرت حاصل ہوگی کہ ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔''
تمیم داری نے پوچھا۔ ''اس جزیرے میں اور کون رہتا ہے اور یہاں انسانوں کے لیے خوراک میسر ہے یا نہیں؟''
عورت نے جواب دیا۔ ''یہاں سب کچھ ہے۔ آخر یہ جزیرہ ہے۔ تیرے جو آدمی اِدھر اُدھر بھٹک رہے ہیں، انہیں ان کی ضرورت کی چیزیں مل جائیں گی۔'' یہ کہتے کہتے وہ عورت تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے غار کی طرف چل دی۔
کچھ دیر بعد تمیم داری بھی اسی طرف روانہ ہو گئے۔ کافی دیر بعد یہ مذکورہ دیر میں پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ وہاں وہ عورت پہلے سے موجود تھی۔
دیر میں ایک عجیب الخلقت دیو نما شخص بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ بہت لمبے تھے۔ یہ دونوں ہاتھ گھٹنوں کے نیچے سے نکل کر گدی تک پہنچ گئے تھے اور وہاں انہیں رسی سے باندھ دیا گیا تھا۔ تمیم داری حیرت سے اس کوہ پیکر شخص کو دیکھتے رہے۔ اس وقت وہ اس قدر حیرت زدہ تھے کہ ان سے بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔
کچھ دیر بعد جب ہوش آیا تو عورت کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''یہ کون شخص ہے اور یہاں اسے باندھ کر کیوں رکھا گیا ہے؟''
عورت نے جواب دیا۔ ''تمہارے سوال کا جواب یہ شخص خود دے گا اور تمہیں جتنے سوالات کرنے ہوں، اس سے براہِ راست کرو۔''
تمیم داری نے اس شخص سے پوچھا۔ ''تو کون ہے اور تجھے یہاں باندھ کر کیوں رکھا گیا ہے؟''
اس شخص نے جواب دیا۔ ''اے شخص! تم نے مجھے اس حال میں دیکھ لیا ہے اس لیے میں بھی کوئی بات تم سے چھپاؤں گا نہیں لیکن پہلے تم اپنے بارے میں یہ بتاؤ کہ تم کون ہو اور اس دور دراز جزیرے میں کس طرح آئے ہو؟''
تمیم داری نے جواب دیا۔ ''ہمارا تعلق ملک عرب سے ہے اور ہم بحری سفر پر نکلے تھے لیکن بدقسمتی سے ہمارا جہاز طوفان میں گھر گیا۔ شروع شروع میں جہاز کا عملہ اور ناخدا طوفان کا مقابلہ کرتے رہے اور جہاز کو آگے بڑھاتے رہے۔ دنوں کا کوئی حساب نہیں لیکن ایک اندازے کے مطابق ہمارا جہاز شاید تیس دن تک پانی کی مخدوش سطح اور لہروں پر ڈانواں

ڈول رہا۔ آخر بادبان بھی جواب دے گئے اور جہاز میں ٹوٹ پھوٹ شروع ہوگئی اور ہم سب کو اپنی اپنی موت سامنے نظر آنے لگی۔ اب دعاؤں سے ہی کام چل سکتا تھا۔ ہم لوگ دعائیں مانگتے رہے اور اس جزیرے تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئے۔ رات کا وقت تھا۔ آسمان پر چاند بھی نہیں تھا۔ تاروں کی روشنی میں کھلے میدان میں ایک درخت کے سائے میں رات بسر کی اور ہم سب بے چینی میں دل بہلانے کی باتیں کرنے لگے۔ صبح ہوئی تو آبادی کی فکر میں نکل کھڑے ہوئے۔ اسی جستجو میں میری ملاقات تیری جماسہ سے ہوگئی۔ اس نے مجھے اس دیر میں پہنچنے کی تلقین کی اور اب میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ یہ عورت مجھ سے پہلے پہنچ چکی ہے۔''

اس شخص نے پوچھا۔ ''اب تم یہ بتاؤ کیا نخل بیسان میں پھل آرہے ہیں؟''

تمیم داری نے جواب دیا۔ ''بیسان کے نخلستان میں برابر پھل آرہا ہے۔''

اس شخص نے مایوسی سے کہا۔ ''تو گویا ابھی میری رہائی کا وقت نہیں آیا اور میں فی الحال اسی جزیرے اور اسی دیر میں قید رہوں گا۔''

تمیم داری نے پوچھا۔ ''کیا کوئی ایسا وقت بھی آنے والا ہے کہ بیسان میں کھجوروں کے درخت ثمر آور نہیں ہوں گے؟''

اس شخص نے جواب دیا۔ ''ہاں، ایسا وقت ضرور آئے گا۔''

کچھ دیر بعد اس شخص نے دوسرا سوال کیا۔ ''کیا بحیرۂ طبریہ میں ابھی تک پانی موجود ہے اور وہ خشک نہیں ہوا؟''

تمیم داری نے جواب دیا۔ ''بحیرۂ طبریہ میں پانی وافر مقدار میں موجود ہے اور اس کے خشک ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

اس نے مایوسی سے کہا۔ ''تو گویا مجھے ابھی رہائی کا حکم نہیں ملے گا۔''

تمیم داری نے پھر حیرت سے پوچھا۔ ''تیری رہائی کا بحیرۂ طبریہ کی خشکی سے کیا تعلق ہے؟''

اس شخص نے جواب دیا۔ ''مجھے بتایا گیا ہے کہ جب وہ خشک ہوجائے گا تو مجھے رہائی مل جائے گی۔''

کچھ دیر بعد اس شخص نے تیسرا سوال کردیا۔ ''کیا چشمۂ زغر میں پانی موجود ہے اور وہاں کے لوگ اس پانی سے زراعت کررہے ہیں؟''

تمیم داری نے کہا۔ ''چشمۂ زغر میں پانی کی بہتات ہے اور لوگ اس سے اپنی زمینوں کو سیراب کررہے ہیں۔''

اس نے پھر ناامیدی سے کہا۔ ''تو گویا میری رہائی کے دن ابھی نہیں آئے اور میں یوں ہی پابند سلاسل رہوں گا۔''

اس نے ایک اہم سوال کردیا۔ ''اچھا تو یہ بتا، کیا عرب میں امیوں کے نبی نے ظاہر ہوکر کچھ کیا ہے؟''

تمیم داری نے جواب دیا۔ ''وہ ظاہر ہوچکے ہیں اور اپنی قوم پر غالب بھی آچکے ہیں۔ لوگوں نے ان کی اطاعت قبول کرلی ہے۔''

اس خبر نے اس شخص کو نڈھال سا کردیا۔ وہ کہنے لگا۔ ''تب پھر فی الحال میری رہائی کا کوئی سوال ہی نہیں ہوتا اور جن لوگوں نے اس امی کی اطاعت کرلی ہے، انہوں نے اچھا ہی کیا۔ قصہ دراصل یہ ہے کہ میں دجال اکبر ہوں۔ وہ ساری علامتیں جن کا میں نے ذکر کیا ہے، باری باری ظاہر ہوں گی اور اس وقت مجھے اجازت ملے گی کہ میں آزادی سے اِدھر اُدھر چل پھر سکوں۔ اس وقت میں جہاں چاہوں گا، چلا جاؤں گا اور دنیا کی کوئی آبادی ایسی نہیں ہوگی جہاں چالیس دن کی مدت میں پہنچ نہ جاؤں لیکن مکے اور طیبہ میں، میں نہیں جاسکوں گا کیونکہ یہ میرے لیے ممنوعہ شہر قرار دیے گئے ہیں۔''

تمیم داری نے دریافت کیا۔ ''اگر تو مکے اور طیبہ میں داخل ہونے کی کوشش کرے گا تو کیا آسمانوں سے فرشتے تجھ کو ایک ناپسندیدہ شخص سمجھ کر آتشیں تلواروں سے اندر داخل ہونے سے روک دیں گے اور تجھ میں اتنی سکت نہیں ہوگی کہ تو ان کا مقابلہ کرسکے۔''

دجال اکبر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''جناب! میں کسی سے بھی نہیں ڈرتا اس لیے تجھے بھی کسی سے نہیں ڈرنا چاہیے لیکن جہاں مقدرات الٰہی کارفرما ہوں، وہاں پیچھے ہٹ جانا چاہیے کیونکہ انسان سب سے لڑسکتا ہے لیکن تقدیرِ الٰہی سے نہیں لڑسکتا۔''

آہستہ آہستہ دوسرے لوگ بھی وہاں پہنچنے لگے۔ کسی دوسرے مسلمان نے دجال اکبر سے واقف ہونے کے بعد کہا۔

''لیکن مدینے میں تو ایک دجال پیدا ہو چکا ہے۔ اس کا نام صاف بن صیاد ہے۔ لوگ اسے ابنِ صیاد کہتے ہیں اور مدینے کے لوگ اس کو چھیڑنے کے لیے دجال بلکہ دجال اکبر تک کہتے ہیں۔''

اس شخص نے کہا۔ ''لیکن امیوں کے نبی نے اس کے دجال ہونے کی تصدیق نہیں کی ہوگی۔''

تمیم داری نے محسوس کیا کہ دجال اکبر نے جن دو شہروں کا نام لیا تھا اس میں شاید مدینے کی جگہ کسی اور شہر کا ذکر کیا تھا۔ چنانچہ وضاحت کے لیے تمیم داری نے دجال اکبر سے کہا۔ ''جن دو شہروں میں تو داخل نہیں ہو سکے گا، ان کے کیا نام ہیں؟''

دجال اکبر نے جواب دیا۔ ''مکہ اور طیبہ۔''

جب یہ واقعات تمیم داری باتفصیل مدینہ طیبہ کی مسجد نبوی میں بیان کر چکے تو رسول اللہ ﷺ نے اپنا عصا منبر پر کئی بار مار کر تین مرتبہ فرمایا۔ ''یہی طیبہ ہے، یہی طیبہ ہے، یہی طیبہ ہے۔''

اب یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ ابنِ صیاد دجال نہیں تھا اور جب خود اسے یہ معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے اسے دجال ہونے سے بری قرار دیا ہے تو وہ بہت خوش ہوا۔

☆☆☆

رسول اللہ ﷺ کے وصال کے کچھ عرصے بعد حضرت ابوسعیدؓ خدری نے ابنِ صیاد سے پوچھا۔ ''اچھا اب یہ بتا کہ رسول اللہ ﷺ نے تجھے عرصہ ہوا دجالی سے بری کر دیا ہے لیکن دجال کو اللہ نے بڑے اختیارات دیے ہیں جیسا کہ بتایا جاتا ہے کہ وہ دنیا کے بعید ترین خطوں میں چالیس دن میں پہنچ جائے گا۔ اس کو دوسرے کمالات بھی ملے ہوں گے۔ وہ دنیا کی بیشتر آبادی کو ورغلانے میں کامیاب ہو جائے گا۔ لوگ اس کا حکم مانیں گے اور اپنے عہد میں وہ دنیا کا نامی گرامی آدمی ہوگا۔ اب مجھے یہ بتا کہ ان خصوصیات کے ساتھ تو دجال ہونا پسند کرے گا؟''

اس نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ ''وہ تمام قدرت، کمالات، خصوصیات اور اختیارات جو دجال اکبر میں بیان کیے گئے ہیں، اگر مجھے عطا کر دیے جائیں تو میں دجال اکبر بننا پسند کروں گا۔''

حضرت ابوسعیدؓ خدری نے کہا۔ ''تیرا جُرا ہو۔ تیرا یہ جواب تیرے دلی خیالات اور عقائد کا صحیح آئینہ ہے اور مجھے یہ معلوم ہو گیا ہے کہ یہ تیرے دل پر شیطنتی اسلام اور ایمان کے نقش کہاں تک مرتسم ہیں۔''

ابنِ صیاد کے اس جواب نے لوگوں کو موقع دیا کہ وہ اس سے چھیڑ چھاڑ کریں۔ چنانچہ ایک بار پھر اس کی زندگی اجیرن ہو گئی اور لوگوں نے اسے ستانا شروع کر دیا۔ ہر کوئی اسے دجال کہہ کر مخاطب کرتا۔ اس نے بازاروں میں آنا جانا چھوڑ دیا۔

اتفاق سے ایک مرتبہ ابنِ صیاد کسی قافلے میں شریک ہو کر مکہ معظمہ جا رہا تھا۔ اسی قافلے میں حضرت ابوسعیدؓ خدری بھی سفر کر رہے تھے۔ اس نے حضرت ابوسعیدؓ خدری کو دیکھا تو مسافروں سے کہا۔ ''یہی وہ شخص ہے جس نے میرے بارے میں غلط خبریں لوگوں کو دے رکھی ہیں۔ اگر اس نے ہم دونوں کی باتوں میں پیش آنے والے سنجیدہ معاملات پر مجھ سے بحث و مباحثہ نہ کیا ہوتا تو آج رسول اللہ ﷺ کی وضاحت کے بعد کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ اس فضول مسئلے پر بات کرے مگر اس شخص نے لوگوں میں ایسا تاثر دے رکھا ہے کہ وہ مجھے اب بھی دجال اکبر سمجھتے ہیں۔''

حضرت ابوسعیدؓ خدری نے کہا۔ ''اگر تو نے میرے سوال کا جواب اتنی دلیری سے نہ دیا ہوتا تو لوگ اسے بھلا چکے ہوتے اور تجھے بھی ہم سے کوئی شکایت نہ ہوتی۔''

ابن صیاد نے کہا۔ ''جناب! آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں نے اسلام قبول کر لیا ہے اور نمازیں بھی پڑھتا ہوں، زکوٰۃ ادا کرتا ہوں، حج بھی کرتا ہوں۔ آپ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ دجال مدینے اور مکے میں داخل نہیں ہو سکتا لیکن دنیا جانتی ہے کہ میں مدینے میں پیدا ہوا، مدینے میں پلا بڑھا اور اب آپ کے ساتھ مکے جا رہا ہوں پھر میں دجال کس طرح کہلاؤں گا؟ رسول اللہ ﷺ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ دجال کافر ہوگا لیکن میں مسلمان ہوں۔ آپ مجھے کیوں ستاتے ہیں؟''

حضرت ابوسعیدؓ خدری نے کہا۔ ''مجھے یاد ہے کہ تُو نے ایک بار دجالی اختیارات اور قدرت کا حال سن کر یہ اقرار کیا تھا کہ اگر یہ چیزیں تجھے میسر آ جائیں تو، تو دجال بننا قبول کر لے گا۔ تیرے ایمان کی یہی کمزوری مجھے پریشان کرتی رہتی ہے۔''

کافی عرصے بعد بازار میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ابنِ صیاد کو اس حال میں دیکھا کہ لوگ اسے چھیڑ رہے ہیں اور وہ ان سے تنگ آیا ہوا ہے۔ وہ لوگوں سے بے حد ناراض تھا۔ چھیڑنے والوں کو بُرا بھلا کہہ رہا تھا۔ بالکل حالتِ دیوانگی میں تھا اور چھیڑنے والوں پر غضب ناک ہو رہا تھا۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے لوگوں کو تو منع نہیں فرمایا بلکہ حضرت ابوسعیدؓ خدری کا حوالہ دیتے ہوئے کہا۔ ''سچ بتا، کیا تُو نے دجال اکبر بننے کی خواہش کا اظہار نہیں کیا تھا۔ میں جانتا ہوں کہ تو مسلمان ہے مگر تیرا ایمان کمزور ہے اسی لیے لوگ تجھے چھیڑتے اور ستاتے ہیں۔ صبر کر اور میں دعا کرتا ہوں کہ لوگوں کے دل تیری طرف سے صاف ہو جائیں اور وہ تجھے ستانا چھوڑ دیں۔''

نافع راوی ہے کہ یہ جواب سن کر ابنِ صیاد نے ایک خوفناک چیخ ماری۔ یہ چیخ پورے بازار میں گونج گئی۔ لوگ اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ بھی اپنے گھر چلے گئے۔ وہاں ام المومنین حضرت حفصہؓ تشریف رکھتی تھیں۔

حضرت ابنِ عمرؓ نے اس واقعے کا ذکر اپنی بہن سے کیا لیکن ان سے پہلے حضرت حفصہؓ کو یہ بات کوئی اور بتا چکا تھا اور یہ تاثر دیا تھا کہ ابنِ صیاد کے اشتعال کا سبب آپ کے بھائی ابن عمرؓ کا کوئی مکالمہ تھا۔

حضرت حفصہؓ نے اپنے بھائی کو سمجھایا۔ ''کیا تم نہیں جانتے کہ ایک بار رسول مقبول ﷺ نے فرمایا تھا کہ دجال کسی بات پر غضب ناک ہوگا اور پھر یہی غیظ و غضب اس کے خروج کا سبب بن جائے گا۔ اللہ تم پر رحم کرے۔ تم نے ابن صیاد کو کیوں مشتعل کر دیا۔ اگر ذرا سا بھی احتمال باقی ہو کہ یہی شخص دجال اکبر ہو سکتا ہے تو پھر یہ بات تمہیں زیب نہیں دیتی کہ اسے برانگیختہ کر کے فتنوں کا دروازہ کھول دو۔''

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے وعدہ کیا۔ ''آئندہ میں احتیاط سے کام لوں گا۔''

ابنِ صیاد نہ تو اپنے شہر سے خوش تھا نہ شہریوں سے۔ مسلمانوں کو کہانت سے کوئی دلچسپی نہ تھی جبکہ کہانت ہی اس کے لیے وجہِ افتخار تھی۔ وہ خود بھی مسلمان ہو چکا تھا اور یہ جانتا تھا کہ اسلام نے کاہن اور اس کی کہانت کا خاتمہ کر دیا ہے مگر وہ اپنے خداداد وصف سے کام لینے میں فخر محسوس کرتا تھا۔ کبھی کبھی اتفاقیہ کوئی غیر مسلم اس کے پاس پہنچ جاتا اور اس سے اپنے اور زمانے کے بارے میں سوالات کرتا۔ یہ ان کے جوابات دیتا مگر ان کا کچھ حصہ سچ ہوتا اور کچھ جھوٹ۔ اس کے باوجود لوگ اس کی کہانت کے قائل تھے۔

یہ لوگ اس کو طعنے بھی دیتے اور ورغلاتے بھی تھے۔ ان میں سے بیشتر یہی کہتے تھے۔ ''جب خود تجھے ایک ایسی فطری خوبی میسر ہے کہ تو آئندہ پیش آنے والے واقعات سے قبل از وقت خبردار ہو جاتا ہے تو پھر تجھ کو مسلمان ہونے کی کیا ضرورت تھی۔ تو خود کچھ بن جاتا۔ آج تیرے پیچھے تیرے پرستاروں کی بھیڑ بھاڑ ہوتی۔''

ابنِ صیاد جواب دیتا۔ ''میں کچھ بھی بن جاؤں، کبھی بھی وہ مقام حاصل نہیں کر سکوں گا جو ایک نبی کو حاصل ہوتا ہے۔ لوگ میری کہانتوں میں بس کسی حد تک دلچسپی لیتے ہیں اور میں خوب جانتا ہوں کہ میں اپنے پرستاروں میں وہ جذبہ جاں فروشی کبھی بھی پیدا نہیں کر سکوں گا جو عرب کے نبی ﷺ نے مسلمانوں میں پیدا کر دیا ہے۔''

کئی بار اس کے دل میں آیا کہ وہ اس شہر کو ہی چھوڑ کر کہیں اور چلا جائے لیکن وہ اپنے وطن کو نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ اسے اپنے وطن کے گلی کوچوں سے محبت تھی اور اپنی صورت شکل کے پیشِ نظر یہ احساس بھی ہوتا تھا کہ وہ دنیا کے کسی خطے میں بھی جائے، اپنی اس مخصوص شکل و صورت سے تو پیچھا نہیں چھڑا سکتا تھا۔ وہ جہاں بھی جائے گا، لوگ اس کا مذاق اڑائیں گے اور جب انہیں یہ معلوم ہوگا کہ مدینے کے لوگ اسے دجال کہتے ہیں تو نئی جگہ کے لوگ بھی اسے دجال کہنے لگیں گے اور وہاں بھی یہی مدینے کی فضا تیار ہو جائے گی۔

اس کے چیخنے چلّانے کی آوازیں اکثر گونجتی رہتیں جن سے لوگ پریشان ہو جاتے تھے اور جب اس کو اس سے منع کیا جاتا تو وہ نہایت کرب سے کہتا تھا۔ ''تم لوگ بھی اپنا روپ بدلو اور جن مشکل حالات سے میں دوچار ہوں، ان کا خیال کرو۔''

لوگ پوچھتے۔ ''یہ جو تو چیخیں مارتا ہے تو اس سے تجھے کیا حاصل ہوتا ہے؟''

اس نے جواب دیا۔ ''جب کسی شخص کو بے تحاشا مارا پیٹا جائے اور پٹنے والا چیخ چلّائے اور لوگ اس سے چیخنے چلّانے کا سبب پوچھیں تو تم ہی بتاؤ کہ وہ مظلوم کیا جواب دے گا؟''

ایک شخص جو ابنِ صیاد سے چھیڑ چھاڑ میں بڑی دلچسپی لیتا تھا، کہنے لگا۔ ''لیکن تجھ کو تو کوئی مارتا پیٹتا نہیں پھر تُو کیوں چیختا

چلّاتا رہتا ہے؟‘‘

ابنِ صیاد نے جواب دیا۔ ’’تم لوگ ہاتھ پاؤں سے تو مارتے نہیں اور میرا جسم اس چوٹ سے محفوظ رہتا ہے مگر میں اس چوٹ کی بات کرتا ہوں جو تم لوگ میرا مذاق اڑانے کی غرض سے اپنے تکلیف دہ لفظوں سے میرے دل اور میری روح پر لگاتے ہو اور یہ خدا یہ چوٹ جسمانی چوٹ سے زیادہ شدید ہوتی ہے۔‘‘

کسی حد تک لوگ باز بھی آ گئے لیکن کچھ ایسے مسلمان بھی تھے جو ابنِ صیاد کو پکا مسلمان نہیں سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ شخص شہر بھر کے مسلمانوں کے دباؤ میں آ گیا ہے اور اگر ایسا نہ ہوتا تو ابنِ صیاد بھی مسلمان نہ ہوتا۔

اس قسم کی سوچ رکھنے والے مسلمانوں کو منع کیا گیا کہ وہ ابنِ صیاد کے بارے میں اپنے دلی خیالات کا برملا اظہار نہ کیا کریں۔

لوگ جہادوں میں حصہ لیتے مگر ابنِ صیاد نے کسی جہاد میں بھی حصہ نہیں لیا حالانکہ اس شخص نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کا دورِ خلافت دیکھا۔ حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں رہا۔ حضرت عثمانؓ کا زمانہ خلافت گزارا۔ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے دورِ خلافت میں بھی یہ زندہ رہا اور یہ ادوار ہر قسم کی جنگ و جدل سے معمور رہے۔ ان میں عرب و شام کی فتوحات حاصل کی گئیں۔ ایران میں اسلام داخل ہو گیا۔ مصر سرنگوں ہوا اور افریقا میں مسلمان داخل ہو گئے۔

ان ادوار میں کہیں بھی ابنِ صیاد کسی محاذ پر نظر نہیں آیا اور نہ کسی راوی نے اس کا ذکر کیا۔ شاید ابنِ صیاد لوگوں کے اس ناروا سلوک کی وجہ سے سب سے الگ تھلگ رہا ہو اور مسلمانوں نے اس پر کوئی خاص توجہ اس لیے نہ دی ہو کہ وہ خوامخواہ بے دلی سے جہاد میں حصہ لے گا اور دیکھنے والوں کے لیے تماشا بن جائے گا۔

معتبر ثقہ حضرات اس کے اسلام پر شبہ نہیں کرتے تھے کیونکہ جو شخص مدینے میں رہتا ہو اور کئی بار مکے بھی ہو آیا ہو اور تیم داری کے ذریعے دجال اکبر کا بھی پتا چل گیا ہو پھر ثقہ لوگ ابنِ صیاد کو کس طرح دجال مان لیتے۔

۶۱ھ میں سانحۂ کربلا پیش آیا اور پھر ۶۳ ہجری میں مدینہ بھی جنگ و جدل کی لپیٹ میں آ گیا۔ شامی فوجیں مدینے میں داخل ہو گئیں۔ مدینے والوں نے ان کا مقابلہ کیا اور بے حد خون خرابا ہوا۔ دارالخلافہ دمشق تھا۔ مدینے کے لوگ احساسِ محرومی کا شکار تھے۔

بوڑھے ابنِ صیاد نے کئی زمانے دیکھے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کا زمانہ اس نے دیکھا تھا اور کسی قسم کا نقصان اٹھائے بغیر زندہ رہا تھا پھر حضرت ابوبکر صدیقؓ کا ڈھائی سالہ دور دیکھا اور اس میں بھی اس سے چھیڑ چھاڑ نہیں کی گئی۔ حضرت عمرؓ کا دس سالہ دورِ خلافت نظر سے گزرا اور امن و سکون سے زندگی بسر کرتا رہا پھر بارہ سالہ دورِ خلافت حضرت عثمانؓ کا رہا اور اس میں بھی وہ زندہ و سلامت رہا پھر حضرت علیؓ کا دورِ خلافت آیا اور اس مختصر دورِ خلافت کے بعد شش ماہی حضرت حسنؓ کا دورِ خلافت دیکھا۔

اس دوران مرکزِ خلافت پہلے مدینے سے کوفہ گیا اور حضرت حسنؓ کے خلافت سے دستبردار ہونے کے بعد کاروبارِ خلافت امیر معاویہؓ کے سپرد ہوا اور اسلامی دارالخلافہ کوفے سے دمشق منتقل ہو گیا۔ حضرت معاویہؓ کے بعد خلافت یزید کو ملی اور حضرت عبداللہ ابنِ زبیرؓ نے اس کے خلاف اعلانِ جہاد کر دیا اور ۶۳ ہجری میں مدینہ اس کی لپیٹ میں آ گیا۔ اسلامی فوجوں نے مدینے پر تسلط حاصل کر لیا۔

اس جنگ میں مدینے کے جتنے لوگ مارے گئے تھے، ان میں ابنِ صیاد بھی شامل تھا۔ مرنے والوں کی نمازِ جنازہ پڑھی گئی۔ کچھ لوگوں کو اختلاف ہوا لیکن ابھی وہ لوگ زندہ تھے جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کا زمانہ دیکھا تھا اور انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد کسی خلیفہ نے بھی ابنِ صیاد کو ایمانی اور دینی نقطۂ نظر سے شک و شبہے کی نظر سے نہیں دیکھا تھا۔

ان لوگوں نے صاف صاف اعلان کر دیا کہ ابنِ صیاد مسلمان تھا اور اس کی نمازِ جنازہ ضرور پڑھی جائے گی۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کے صحابیوں نے اس کی نمازِ جنازہ پڑھی اور اسے مسلمان کی حیثیت سے دفن کر دیا گیا۔

(ختم شد)

ماخذات

اس مضمون میں بیان کردہ حالات و واقعات ان مجموعۂ احادیث سے لیے گئے ہیں۔ صحیح بخاری، صحیح مسلم، ابوداؤد، ترمذی، مشکوٰۃ

شاکا

نازیہ کامران کاشف

نواں اور آخری حصہ

جب ڈاکٹر وینزو کافز نامی جزیرے پر پراسرار اموات کی وجہ جاننے کے لیے آیا تو اس کا سامنا کئی عفریتوں سے ہوا... جن کے خاتمے کے لیے شاکا جیسی پراسرار طاقت نے ایک دنیا سے دوسری دنیا کا سفر کیا... چار صدیوں پر پھیلی یہ کہانی بار بار دہرائی جاتی رہی جس کے بعد چند سائنس دانوں کی ایک بھیانک غلطی نے اس دنیا کو ایک بہت بڑے خطرے سے دوچار کر دیا مگر... اس بار کوئی پراسرار طاقت ان کی مدد کے لیے ان کے ساتھ نہ تھی اور انہیں ایک بار پھر شاکا جیسی اسرار بھری ہستی کو ڈھونڈنا تھا چاہے کتنا ہی مشکل سفر ہو جاتا... گزشتہ عہد کے ڈاکٹر وینزو کی ڈائری میں لکھے تحیر انگیز راز انہیں دوسری دنیا کا رستہ دکھا رہے تھے لیکن شاکا تک پہنچنا اب اتنا آسان بھی نہ تھا...

سترھویں صدی کی اندھیری راتوں سے جنم لینے والی

ایک لرزہ خیز داستان......

pklibrary.com

''شاکا! کیا بات کرنا تھی تمہیں؟'' بورس نے خود ہی اس طویل ہوتی خاموشی کو توڑا۔

''تم جانتے ہو کہ آج شاکال میں میری شادی کی تقریب تھی۔'' بالآخر شاکا نے اس سے بات کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا۔

''ہاں، جانتا ہوں۔'' بورس بولا۔

''ہماری ایک رسم ہے کہ جسے چاند اور روحیں میرے لیے چُن لیتی ہیں، وہی عورت میری جیون ساتھی بنتی ہے اور ہماری نسل کو آگے بڑھاتی ہے۔ اس کی جگہ دوسری عورت نہیں لے سکتی۔ یہ رسم ہزاروں سال سے چلی آرہی ہے اور شاکا ایسے ہی پیدا ہوتا آیا ہے۔ تمہیں یہ بات عجیب لگتی ہوگی مگر شاکا اور اس کے ساتوں بھائی ہزاروں سال سے اسی عورت کی کوکھ سے جنم لیتے ہیں اور اسی ترتیب سے جنم لیتے ہیں۔ تمہاری دنیا میں شاید یہ بات انوکھی ہو لیکن ہماری دنیا کا یہی طور طریقہ ہے۔ جنگڈال کے لیے جتنا شاکا اہم ہے، اتنی ہی وہ عورت بھی اہم ہے کیونکہ وہی جنگڈال کو اس کا وارث دیتی ہے۔ شاکا اپنی عمر کے چھبیس سال پورے ہونے تک کسی دوسری عورت پر نظر نہیں ڈالتا۔ نہ ہی کسی کو اپنے دل میں جگہ دیتا ہے کیونکہ اس عورت کی جگہ اور کوئی نہیں لے سکتا۔'' شاکا گمبھیر لہجے میں بولا۔

''ہاں، تم نے یہ سب پہلے بھی بتایا تھا۔'' بورس کو شاکا کی لمبی تمہید عجیب لگی۔

''میں تم سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں۔'' شاکا نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

''ہاں، پوچھو۔'' اس کی آنکھوں میں نہ جانے کیا تھا۔ بورس کو جھرجھری آگئی۔

''اگر وہ عورت شاکا کو نہ ملے تو کیا ہوگا؟'' شاکا کی آواز میں لرزش تھی۔ بورس حیرانی سے اسے دیکھنے لگا۔

''شاکا کی نسل ختم ہوجائے گی۔'' بورس نے ڈرتے ہوئے اپنی بات مکمل کی۔

''تم نے کبھی شاکا کو کمزور پڑتے دیکھا ہے؟'' وہ اس سے ایک اور سوال پوچھ رہا تھا۔

''کبھی نہیں۔ کمزور کا لفظ تمہارے لیے بنا ہی نہیں ہے مگر تم یہ سب کیوں پوچھ رہے ہو؟'' وہ بے چین ہوا۔

شاکا کی آنکھوں میں عجیب سی بے بسی تھی۔

''آج چاند نے جس لڑکی کو میرے لیے چنا، جانتے ہو وہ کون ہے؟'' شاکا بولا۔

بورس نے نفی میں سر ہلایا۔

''صوفیہ!'' شاکا نے اس کے سر پر بم پھوڑا۔

''کیا..... یہ تم کیا کہہ رہے ہو شاکا؟ یہ ناممکن ہے۔ ہوسکتا ہے تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہو؟'' بورس نے بے یقینی سے سر ہلایا۔

''مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی۔ نہ چاند کو ہوسکتی ہے اور نہ روحوں کو۔ میں زبردستی کرنے کا قائل نہیں ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم صوفیہ سے بات کرو۔ اسے سمجھاؤ۔'' شاکا بولا مگر اس بار اس کے لہجے میں التجا تھی۔

''شاکا! یہ ناممکن ہے۔ صوفیہ ہماری دنیا کی رہنے والی ہے۔ اسے یہاں کے طور طریقوں کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔ وہ کسی صورت بھی یہاں نہیں رہنا چاہے گی اور دوسری اہم بات یہ کہ ہیری اس کا منگیتر ہے۔ وہ دونوں شادی کرنے والے ہیں۔ کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ تم چاند سے کہو کہ وہ تمہارے لیے کوئی اور لڑکی چن لے؟'' بورس نے اپنے تئیں بہترین مشورہ دیا۔

''رینزو! یہ رات شاکا کی زندگی میں ایک ہی بار آتی ہے۔ اگر چاند نے اسے میرے لیے چنا ہے تو وہ ضرور مان جائے گی۔ میری دنیا سے اسے کوئی نہیں سمجھا سکتا مگر تم اسے سمجھا سکتے ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ تم صوفیہ سے بات کرو اور اس کی مرضی معلوم کرکے مجھے بتاؤ۔'' شاکا نے بورس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''مگر.....'' بورس نے کچھ کہنا چاہا تو شاکا نے اس کا کندھا دبایا۔ بورس سر ہلا کر سرائے کی طرف بڑھ گیا۔ وہ اندر داخل ہوا تو سب اس کے انتظار میں جاگ رہے تھے۔

''کیا ہوا؟ پھر کوئی نئی مصیبت نازل ہوئی ہے کیا؟'' اینڈریو بولا تو بورس نے صوفیہ کی طرف دیکھا۔

''کیا ہوا؟'' صوفیہ نے بورس کو اپنی طرف متوجہ دیکھ کر بے چینی سے پہلو بدلا۔

''میں جو بات کہنے جارہا ہوں اسے سب غور سے سنیں گے اور اس کے بعد ہم اس کا حل تلاش کرنے کی کوشش کریں گے۔'' بورس کے چہرے پر گہری سنجیدگی طاری تھی۔ وہ سب ہمہ تن گوش ہوگئے۔ بورس نے انہیں شاکا کی ساتھی چننے کا طریقہ اور اس کی نسل آگے بڑھانے کے لیے صدیوں سے چلے آتے وہ رسوم و رواج تفصیل سے بتائے۔

''تو ہم کیا کریں۔ یہ ہمیں کیوں بتا رہے ہو؟'' اسٹیو کو غصہ آیا۔

''آج چاند نے جس لڑکی کو شاکا کے لیے چنا ہے، وہ کوئی اور نہیں بلکہ صوفیہ ہے۔'' بورس نے دھماکا کیا۔

''کیا.....! کیا بکواس ہے یہ۔'' ہیری غصے سے کھڑا ہوگیا۔

''وہ جنگلی پاگل تو نہیں ہوگیا ہے؟'' اینڈریو کو بھی طیش آیا۔

بورس نے صوفیہ کی طرف دیکھا۔ وہ اس کے چہرے سے اس کے دل کا حال جاننے میں ناکام رہا تھا۔

''اب یہ نئی مصیبت نازل ہوگئی ہے۔ اس شاکا کی نیت ٹھیک نہیں ہے۔'' اسٹیو نے تاسف سے سر ہلایا۔

''شاکا ایسا نہیں ہے۔ غلط بات مت کرو۔'' بورس نے اسے ٹوکا۔

''تو کیا ہے صحیح بات، تم بتاؤ۔ صوفیہ کو اس جنگلی کے حوالے کردیں؟'' ہیری کا خون کھول رہا تھا۔

''اگر اسے صوفیہ چاہیے تو ہم اسے یہ کام کرنے سے روک نہیں سکتے۔ ہم اس کے رحم و کرم پر ہیں۔ وہ بہ آسانی ہمارا خاتمہ کرکے صوفیہ کو حاصل کرسکتا ہے۔'' جیکال نے انہیں آئینہ دکھایا۔

''صوفیہ! تم کیا چاہتی ہو؟'' بورس، صوفیہ سے مخاطب ہوا جو اس ساری گفتگو کے دوران خاموش بیٹھی تھی۔

''یہ ناممکن ہے۔ میں یہاں نہیں رہ سکتی۔ ہمارا زندگی گزارنے کا طریقہ بالکل الگ ہے اور اس کے علاوہ بھی بہت ساری چیزیں ہیں۔ مجھ پر کوئی زبردستی نہیں کرسکتا۔'' صوفیہ تیز لہجے میں بولی۔ وہ اس شاک سے باہر نکل آئی تھی جو بورس نے اسے تھوڑی دیر پہلے دیا تھا۔

''تم ہمیں یہاں لے کر آئے تھے اور اب تم ہی ہمیں یہاں سے صوفیہ سمیت صحیح سلامت باہر نکالو گے۔'' اینڈریو چلّایا۔

بورس خاموشی سے ایک طرف بیٹھ گیا۔ اسے جلد از جلد اس مسئلے کا کوئی حل سوچنا تھا۔ صبح زیادہ دور نہیں تھی۔ شاکا سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی انہیں وہاں سے روانہ کرکے صوفیہ کو اپنے ساتھ روک سکتا تھا اور وہ کچھ نہیں کرپاتے۔

''میرے پاس ایک حل ہے۔'' اچانک ہیری اچھل پڑا۔

''وہ کیا؟'' شمشیر کا ذہن حل سوچتے سوچتے شل ہوچکا تھا۔

''اگر صوفیہ اسے کہہ دے کہ وہ اس سے شادی کرنے کے لیے راضی ہے مگر شرط یہ ہے کہ شاکا کو ہمارے ساتھ ہماری دنیا میں چل کر جوشوا کا خاتمہ کرنا ہوگا تو وہ اس کی بات مان کر ہمارے ساتھ چلنے پر راضی ہوجائے گا اور جوشوا کا خاتمہ بھی ہوجائے گا۔ ہماری دنیا سے وہ زبردستی صوفیہ کو یہاں نہیں لاسکتا۔ ہم وہاں اسے روکنے یا ختم کرنے کی کوئی تدبیر بھی کرسکتے ہیں کیونکہ یہاں ہمارے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔'' ہیری بولا تو صوفیہ کو اس کی بات پر شدید غصہ آیا۔

''تمہارے کہنے کا مطلب ہے کہ میں شاکا سے جھوٹی محبت کا ڈھونگ رچاؤں اور اسے دھوکے سے اپنی دنیا میں لے کر جاؤں؟ تم ایسا سوچ بھی کیسے سکتے ہو؟'' صوفیہ نے بے یقینی سے سر ہلایا۔

''شاکا نے بھی ہمیں دھوکا دیا ہے۔ پہلے وہ تم لوگوں کے ساتھ چلنے پر راضی ہوا اور اس کے بعد ہمیں دو دن زبردستی یہاں قید رکھا پھر ہمارے ساتھ جانے سے بھی انکار کردیا اور اب اسے صوفیہ چاہیے۔'' اسٹیو تیز لہجے میں بولا۔

''میں شاکا کو دھوکا نہیں دے سکتا۔ ہمیں اس سے دو ٹوک بات کرنا ہوگی۔ وہ زبردستی نہیں کرے گا۔'' بورس نے ان کی بات ماننے سے انکار کیا۔

''آخر اس میں حرج ہی کیا ہے؟ ہم یہاں اسے اپنے ساتھ لے جانے آئے تھے۔ واپس جاکر بھی ہمیں جوشوا کے ہاتھوں مرنا ہی ہے۔ ہم اپنی دنیا میں تو شاکا کو کسی نہ کسی طرح روک سکتے ہیں مگر یہاں ہم کچھ نہیں کرسکیں گے۔'' ہیری نے صوفیہ کو سمجھانے کی کوشش کی۔ وہ خاموشی سے ہونٹ کاٹنے لگی۔ سب کی نظریں اس پر لگی ہوئی تھیں۔

''صوفیہ! تم اس دھوکے کا حصہ نہیں بنو گی۔ ہم شاکا سے بات کرلیتے ہیں۔ وہ ہمیں نقصان نہیں پہنچائے گا۔'' اینڈریو بولا۔

''تمہیں کیسے پتا کہ وہ نقصان نہیں پہنچائے گا؟ تم نے سنا نہیں کہ اس کی نسل بڑھانے کے لیے صوفیہ اس کے لیے کتنی اہم ہے۔ وہ اسے یہاں روکنے کے لیے کچھ بھی کر گزرے گا۔'' ہیری کو اس کی کم عقلی پر افسوس ہوا۔

''یہ دھوکا دفعی نہیں ہے بلکہ یہ شاکا کی بقا کا معاملہ ہے۔ اس کا نام و نشان مٹ جائے گا۔ اس دنیا میں اس کے بعد کوئی سردار نہیں ہوگا۔'' جیکال بولا۔

''تو تم کیا چاہتے ہو؟ اس کی نسل آگے بڑھانے کے لیے ہم صوفیہ کو قربان کردیں؟ جب شاکا کو ہماری فکر نہیں ہے تو ہم اس کی فکر کیوں کریں؟'' ہیری تیز لہجے میں بولا۔

''میں یہ نہیں کہہ رہا کہ ہمیں صوفیہ کو قربان کردینا چاہیے لیکن.....'' جیکال بولنے ہی لگا تھا کہ صوفیہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

''میں شاکا سے خود بات کروں گی۔ میں اس سے شادی نہیں کرسکتی اور نہ ہی کسی دھوکے کے تحت اسے اپنی دنیا میں لے جانا چاہتی ہوں۔'' صوفیہ دوٹوک لہجے میں بولی۔

بورس نے اثبات میں سر ہلادیا۔ یہی ٹھیک طریقہ تھا۔

''تو پھر سب مرنے کی تیاری کرو۔ ہمارے چاہنے یا نہ چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ تم خود کہہ رہے ہو کہ صوفیہ کا ہونا اس کی نسل کو پروان چڑھانے کے لیے کتنا ضروری ہے۔ وہ اسے یہاں روک کر ہمارا خاتمہ کردے گا اور اگر یہاں خاتمہ نہیں ہوا تو ہم اپنی دنیا میں پہنچتے ہی جوشوا کے ہاتھوں مارے جائیں گے۔ مجھے یقین نہیں ہو رہا کہ تم لوگ ایک جنگلی کے بارے میں اتنا سوچ رہے ہو بجائے اس کے کہ تم لوگ ہماری دنیا کے بارے میں سوچو، وہاں پھیلی تباہی کے بارے میں سوچو۔ قدرت نے ہمیں ایک نادر موقع دیا ہے اس مسئلے کو حل کرنے کا۔'' ہیری کو ان کی بے وقوفی پر غصہ آیا۔

''حد ہے ہیری! تم اپنے فائدے کے لیے صوفیہ کا استعمال کرنا چاہتے ہو۔'' اینڈریو نے بے یقینی سے سر ہلایا۔

''تو تم بتاؤ تمہارے پاس کیا حل ہے؟'' ہیری نے کندھے اچکائے۔

''ہم شاکا سے بات کریں گے۔ وہ زبردستی نہیں کرے گا۔ جوشوا کے بارے میں اپنی دنیا میں چل کر سوچیں گے۔'' بورس سنجیدگی سے بولا۔

''سلام ہے تم سب کی عقل کو۔'' ہیری نے ہاتھ جھٹکے۔

''بس کرو ہیری!'' صوفیہ روتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی۔ اینڈریو اس کے پیچھے جانے لگا۔

''تم کہاں جا رہے ہو؟ تم یہیں رکو، میں صوفیہ سے بات کرتا ہوں اور اسے سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ فی الحال شاکا سے کوئی بھی بات نہیں کرے گا۔'' وہ صوفیہ کو منانے چل دیا۔

صوفیہ سرائے کے باہر بنی سیڑھیوں پر بیٹھی ہوئی رو رہی تھی۔ اس کا دل بلاوجہ ہی بھر آیا تھا۔ ہیری اس کے ساتھ آ کر بیٹھ گیا۔

''صوفیہ! میری جان، میری بات سنو۔ میرا مقصد تمہیں دکھ دینا نہیں تھا۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم خیریت سے ایک بار یہاں سے نکل جاؤ۔ اپنی دنیا میں پہنچ کر ہم اسے سب کچھ سچ بتا دیں گے۔ اگر تم نے یہ بات نہیں مانی تو وہ تمہیں یہاں سے نہیں جانے دے گا۔ کیا تم رہ سکتی ہو یہاں؟ یہ لوگ بالکل جنگلی ہیں۔ ان کے بجائے اپنے بارے میں سوچو۔ اپنی حفاظت کے لیے بہت ساری جگہوں پر برداشت سے کام لینا پڑتا ہے۔ آگے بڑھنے کے لیے جھوٹ کا سہارا بھی لینا پڑتا ہے۔ ہمارے مستقبل کا سوچو۔ اپنے چینل کا سوچو۔'' ہیری نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

صوفیہ نے آنسو پونچھتے ہوئے شاکا کے گھر کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے گھر کی کھڑکی میں کھڑا اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

ایک لمحہ لگا تھا اسے فیصلہ کرنے میں۔

''ٹھیک ہے۔ میں تیار ہوں یہ جھوٹ بولنے کے لیے۔'' وہ فیصلہ کن لہجے میں بولی۔

''زبردست۔ یہ ہوئی نا عقل مندی والی بات۔ میں سب کو یہ خوشخبری سناتا ہوں۔'' ہیری وہاں سے جا چکا تھا۔

وہ شاکا کو دیکھنے لگی۔ شاکا نے آگے بڑھ کر اپنے گھر کی کھڑکی بند کردی۔ وہ ایک گہری سانس لے کر وہاں سے اٹھ آئی۔ اب اسے شاکا کا سامنا کرنے کی تیاری کرنا تھی۔ وہ اسے اس کی زندگی کا سب سے بڑا دھوکا دینے والی تھی جس کا خلا کبھی نہیں پُر ہو سکتا تھا۔

☆☆☆

صوفیہ کے آمادگی ظاہر کرتے ہی وہ سب شاکا سے بات کرنے کے لیے باہر نکل آئے۔ انہیں سورج کی پہلی کرن نظر آتے ہی اپنی دنیا کی طرف سفر کرنا تھا۔ وہ دیر نہیں کرنا چاہتے تھے۔

شاکا ان کی موجودگی کو محسوس کر کے گھر سے باہر آ گیا۔ وہ اپنی مخصوص نشست پر بیٹھ چکا تھا۔ شاکال کے لوگ سو رہے تھے۔ ابھی صبح ہونے میں کافی وقت تھا۔ شاکا کے بھائی بھی اس کی نشست کے ساتھ کھڑے ہو گئے۔

صوفیہ نے ہیری کی طرف دیکھا اور اکیلی ہی شاکا کی نشست کی طرف بڑھنے لگی۔

شاکا اسے اپنی طرف آتا دیکھ کر نشست سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ قریب پہنچی تو شاکا نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ صوفیہ نے جھجکتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ شاکا نے ہاتھ کی گرفت مضبوط کر کے اسے تحفظ کا احساس دلایا۔ صوفیہ کا دل ڈوبنے لگا۔

وہ اس کے ساتھ ہی نشست پر بیٹھ چکا تھا۔

''کیا فیصلہ ہے تمہارا؟'' شاکا نے خود ہی بات شروع کر کے اس کے لیے آسانی کردی تھی ورنہ وہ اس کے سامنے ایک لفظ بھی نہ بول پاتی۔ اس کی شخصیت کا رعب و دبدبہ ہی زبان کو تالے لگانے کے لیے کافی تھا۔

''وہ..... میں.....'' صوفیہ انگلیاں مروڑنے لگی۔

شاکا نے اس کا ہاتھ تھاما۔ اس کی انگلیاں ٹھنڈی ہو رہی تھیں۔ اس نے اپنے کاندھوں پر پڑا ہوا مفلر جو کسی جانور کی کھال سے بنا تھا، اتار کر صوفیہ کے کاندھے پر ڈال دیا۔

''تمہیں مجھ سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ جو بات کہنا ہے، کھل کر کہو۔ میں تمہیں نقصان پہنچانے کا سوچ

بھی نہیں سکتا۔'' شاکا دھیمے لہجے میں بولا۔

وہ اس کے لہجے کی گرمی سے پگھلی۔ شاکا کے اس قدر قریب ہونا اس کے حواس معطل کر رہا تھا۔

''میں شادی کے لیے تیار ہوں مگر..... مگر.....'' وہ بات مکمل نہیں کر پا رہی تھی۔

''مگر کیا؟'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

''مگر میری کچھ شرائط ہیں۔'' صوفیہ کو اس کے نرم لہجے کی وجہ سے بات مکمل کرنے میں آسانی ہوئی۔

شاکا کے بھائی صوفیہ کی بات سن کر حیران ہو گئے۔ کازا کچھ کہنے کے لیے آگے بڑھا مگر شاکا نے ان سب کو وہاں سے جانے کا اشارہ کیا۔ وہ اس کے حکم کی تعمیل میں وہاں سے چلے گئے۔

''اور وہ کیا شرائط ہیں؟'' وہ اس کی ٹھوڑی کو اوپر کر کے بولا۔

''میں چاہتی ہوں کہ یہ شادی میری دنیا میں ہمارے رواجوں کے مطابق ہو اور میرے والد بھی اس میں شامل ہوں..... اور..... اور میں چاہتی ہوں کہ تم ہمارے ساتھ چل کر ہماری دنیا کو ان بلاؤں سے آزادی دلواؤ۔ میں اپنے لوگوں کو، خاص کر اپنے والد کو ان خونی بلاؤں کے ہاتھوں مرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی۔'' صوفیہ نے ایک ہی سانس میں اپنی بات مکمل کی۔

شاکا مسکرا دیا۔

''ٹھیک ہے۔ میں یہ شرائط ماننے کے لیے تیار ہوں۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

''کک..... کیا واقعی؟'' صوفیہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

''تمہاری خوشی کے لیے میں ہر شرط ماننے کو تیار ہوں۔ مجھے روحوں سے تمہیں ملوانا ہے۔ یہ ہماری رسم ہے جو شادی کی رات سورج نکلنے سے پہلے پوری کرنا ہوتی ہے۔ تم میرے ساتھ چلو۔ ہم سورج نکلنے سے پہلے واپس آجائیں گے۔ اس کے بعد میں تمہارے ساتھ تمہاری دنیا کا سفر کروں گا۔'' وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

صوفیہ انہیں دور سے ہاتھ ہلا کر شاکا کا ہاتھ تھام کر جنگل کی طرف روانہ ہو گئی۔

''یہ..... یہ کہاں لے کر جا رہا ہے صوفیہ کو؟'' اینڈریو پریشان ہوا۔

''میں معلوم کر کے آتا ہوں۔'' بورس، شاکا کے بھائیوں کی طرف بڑھ گیا۔

''شاکا کوئی رسم پوری کرنے گیا ہے۔ وہ سورج نکلنے سے پہلے آجائے گا۔ چلنے کی تیاری مکمل کر لو۔'' بورس، شاکا کے بھائیوں سے معلومات لے کر واپس لوٹا۔

''کیا وہ ہمارے ساتھ چل رہا ہے؟'' شمشیر بولا۔

''صوفیہ کے ساتھ شادی کی رسم پوری کرنے کا مطلب یہی ہے کہ صوفیہ اپنی شرائط منوا چکی ہے۔'' بورس سنجیدگی سے بولا تو وہ سب سکون کا سانس لے کر جانے کی تیاری کرنے لگے۔

گو کہ بورس، شاکا سے جھوٹ بولنے والی بات کے حق میں نہیں تھا مگر سب کے متفق ہونے پر مجبور ہو چکا تھا۔ اب وہ بے صبری سے سورج کی پہلی کرن نکلنے کا انتظار کر رہا تھا۔

☆☆☆

شاکا اس کا ہاتھ تھامے گھنے جنگل کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ایک جگہ پہنچ کر وہ نیچے بیٹھ گیا۔ میری پشت پر سوار ہو جاؤ۔ وہ اس کے بازو اپنی گردن میں حائل کرتے ہوئے بولا۔ صوفیہ جھجکتے ہوئے اس کی پشت پر سوار ہو گئی۔ وہ جنگل کے بیچ تیزی سے دوڑنے لگا۔ وہ جلد از جلد روحوں کے درخت تک پہنچنا چاہتا تھا تاکہ سورج نکلنے سے پہلے ان تمام رسموں کو پورا کر سکے۔ برگد کے اس مخصوص درخت کے نیچے پہنچتے ہی اس نے صوفیہ کو اس درخت کے نیچے بٹھا دیا اور ایک طرف کھڑے ہو کر اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

صوفیہ کو اس اندھیرے جنگل میں خوف محسوس ہو رہا تھا مگر وہ یہ سب کرنے کے لیے مجبور تھی۔

چند لمحوں بعد صوفیہ کو سفید بادلوں نے گھیرے میں لے لیا۔ وہ حیرانی سے یہ ساری کارروائی دیکھتی رہی۔ شاکا کو غفراش کی آواز سنائی دی۔ اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ غفراش برگد کے درخت سے اتر کر صوفیہ کے کندھے پر سوار ہو گیا۔

صوفیہ نے ڈر کر ہلکی سی چیخ ماری مگر شاکا نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ غفراش کا اس کے کندھے پر بیٹھنا اس بات کا اشارہ تھا کہ شاکا رسم پوری کر چکا ہے اور صوفیہ کو یہاں سے لے جا سکتا ہے۔

وہ سفید بادل اب غائب ہو چکے تھے۔ غفراش اڑ کر برگد پر جا بیٹھا۔ شاکا نے صوفیہ کو چلنے کا اشارہ کیا۔ وہ دوبارہ اس کی پشت پر سوار ہوئی اور اب وہ تیزی سے عظیم آبشار کی طرف بڑھ رہا تھا۔ یہاں سے اسے غسل لے کر واپس اپنے قبیلے پہنچنا تھا۔ اس نے صوفیہ کو ایک خشک چٹان پر بٹھایا اور اپنی قمیص اتار کر آبشار کے پانی میں غوطے لینے لگا۔

pklibrary.com

وہ مبہوت ہو کر اسے تکنے لگی۔ اس کے کسرتی جسم پر بہتا وہ شفاف پانی۔ اس کے دل میں شاکا کے ساتھ پانی میں اترنے کی خواہش جاگی۔ اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا کر پانی کو چھوا۔ پانی برف کی طرح ٹھنڈا تھا۔ اس نے اپنا ہاتھ واپس کھینچ لیا۔ نہ جانے شاکا کیسے اس یخ پانی سے نہا رہا تھا۔ وہ اس کی نظروں کو خود پر محسوس کر سکتا تھا لیکن اس کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہا تھا۔ وہ کمزور نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ اس کی ''مختلف'' کی خواہش نے آج اسے اس مشکل مقام پر لا کھڑا کیا تھا۔ وہ چاہتے ہوئے بھی اسے چھو نہیں سکتا تھا۔

شاکا غسل کے بعد قبیلے کی طرف روانہ ہو گیا۔ قبیلے پہنچ کر اس نے صوفیہ کو تیاری کرنے کا کہا اور خود اپنے بھائیوں کو الوداع کہنے چل دیا۔ اس کے بھائی اس کا بے صبری سے انتظار کر رہے تھے۔

''کیا ہوا، کیا شرائط ہیں صوفیہ کی؟'' یاگا سے مزید صبر کرنا مشکل ہو رہا تھا۔

''وہ چاہتی ہے کہ یہ شادی اس کی دنیا کے رسم و رواج کے مطابق ہو اور اس کے والد بھی اس شادی میں شریک ہوں۔ اس کے علاوہ میں ان کی دنیا میں جا کر ان عفریتوں کا خاتمہ کروں۔ اس کے بعد ہی وہ میرے ساتھ واپس لوٹے گی۔'' شاکا سنجیدگی سے بولا۔

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو شاکا! اگر وہ اپنی دنیا میں جانے کے بعد یہاں واپس نہیں لوٹی تو پھر تم کیا کرو گے؟'' زعود بولا۔

''تو پھر میں اکیلا لوٹ آؤں گا۔'' وہ کپڑے تبدیل کرنے لگا۔ اس کے کپڑے آبشار کے پانی سے گیلے ہو چکے تھے۔

''شاکا! یہ کوئی عام بات نہیں ہے۔ جنگدال اپنے وارث سے محروم رہ جائے گا۔ تمہیں اس کی دنیا میں جانے کی اور اس کی شرائط ماننے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تم اسے یہیں روک لو اور باقی سب کو روانہ کر دو۔'' یاگا بولا۔

''شاکا نے کبھی زبردستی نہیں کی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ میرے ساتھ ضرور لوٹے گی۔'' وہ قمیص کے اوپر چمڑے کا بکتر پہننے لگا۔

''شاکا! یہ غلطی مت کرو۔'' کازا اس کے ارادے جان کر پریشان ہوا۔

''بس، اب کوئی ایک لفظ بھی نہیں بولے گا۔ میں سردار ہوں اور یہ میرا فیصلہ ہے۔ میں نے آج سے کئی سال پہلے بھی یہ سفر کیا تھا اور میں کامیاب لوٹا تھا۔ میرے کامیاب لوٹنے کی دعا کرو۔ جنگدال تمہارے حوالے۔'' وہ یہ کہہ کر گھر سے باہر نکل گیا۔

وہ ساتوں اس کے پیچھے باہر نکل آئے۔ صوفیہ بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ سرائے کے باہر کھڑی تھی۔

''سورج نکلنے والا ہے۔ ہمیں چلنا چاہیے۔'' وہ ان کو اشارہ کر کے ایک طرف چلنے لگا۔

''شاکا! اگر میں یہاں سے سیدھا اپنی لیب میں جانا چاہوں تو کیا یہ ممکن ہے؟'' بورس اس کے ساتھ چلنے لگا۔

شاکا نے رک کر اس کے ماتھے پر اپنی ہتھیلی رکھ دی۔

''ہم...... ٹھیک ہے۔ بالکل ممکن ہے۔ چلو۔'' شاکا یہ کہہ کر آگے بڑھ گیا۔

شاکا کے بھائی اس کی نشست کے پاس رک کر اسے جاتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ جنگل میں داخل ہونے سے پہلے اس نے پیچھے مڑ کر انہیں الوداع کہا اور درختوں کے درمیان غائب ہو گیا۔ وہ ساتوں یہ بات جانتے تھے کہ یہ شاکا کی زندگی کا سب سے مشکل ترین سفر ثابت ہونے والا تھا۔ اس بار وہ دو جنگیں لڑنے والا تھا۔ ایک عفریتوں سے اور ایک خود سے۔

اس بار اس کی بقا کو اس کی ذات سے ہی خطرہ لاحق ہو چکا تھا۔ رینزو اور اس کے ساتھیوں کے نظروں سے اوجھل ہوتے ہی وہ اداسی سے اپنے گھر لوٹ آئے۔ اب انہیں شاکا کے لیے روحوں سے روز دعا کرنا تھی۔

☆☆☆

Year 2020

Dr. Boris Lab- Moscow- Russia

ایڈرک، ہیری اور اسٹیو کے جانے کے بعد بے صبری سے ان سب کے لوٹنے کا انتظار کر رہا تھا مگر چپ مشین دو دن سے ہیری اور اسٹیو کی لوکیشن بھی وہیں ظاہر کر رہی تھی جہاں بورس اور اس کے ساتھی موجود تھے۔ اب وہ سوائے انتظار کرنے کے اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ بورس کے فلیٹ کا فون دو دن سے مسلسل بج رہا تھا اور اس نے بالآخر ہمت کر کے فون ریسیو کر لیا۔ اس کی آرمی چیف سے بات ہوئی۔ ان کے مطابق یہ کال خفیہ تھی لہٰذا ایڈرک نے انہیں ساری معلومات فراہم کر دیں۔ انہوں نے ایڈرک کی لوکیشن خفیہ رکھنے کا وعدہ کیا۔ اب انہیں بھی اسٹیو کے واپس آنے کا انتظار تھا۔ ایڈرک نے اس کال کے بعد فون کی تار نکال دی ورنہ یہ گھنٹی بلاؤں کو اس کی طرف متوجہ کرنے کا ذریعہ بن سکتی تھی۔

دو دن گزر چکے تھے۔ اسے ٹی وی چینلز کے ذریعے جوشوا کے ماسکو پر قبضے کی خبریں پتا چل رہی تھیں۔ وہ اس

pklibrary.com

لیب میں بند ہو کر رہ گیا تھا۔ بورس کے فریج سے تیار شدہ کھانے کے ٹن لے کر اس نے خود کو لیب میں مقید کر لیا تھا۔ باہر ہر طرف جوشوا کی بلائیں موجود تھیں۔ لوگ اپنے گھروں میں بھی محفوظ نہیں تھے۔ اگر وہ بلائیں بورس کے فلیٹ میں گھس آتیں تو انہیں وہاں سامان کے علاوہ اور کچھ نہ ملتا۔ یہ لیب دوسری جگہوں کے مقابلے میں محفوظ تھی۔

اس کا یہاں سے باہر نکل کر ان بلاؤں کے ہتھے چڑھنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اس نے ایک دن مزید انتظار کر کے خود بھی بورس کے پیچھے جانے کا فیصلہ کیا۔ یہاں رہ کر ویسے ہی ان بلاؤں کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتر جانا تھا۔ اس سے بہتر تھا کہ وہ دوسری دنیا میں چلا جاتا لیکن ساتھ ہی وہ یہ دعا بھی کر رہا تھا کہ بورس جلد از جلد واپس لوٹ آئے۔ اس رات بھی وہ ان نقطوں پر نظر رکھ کر بیٹھا تھا۔ اسی دوران اس کی آنکھ لگ گئی۔ اسے احساس ہوا کہ کوئی اسے جھنجوڑ رہا ہے۔ جوشوا کا خوف اتنا زیادہ تھا کہ وہ نیند میں ہی چلانے لگا۔ شاید بلاؤں نے اس پر حملہ کر دیا تھا مگر آنکھیں کھولتے ہی وہ ساکت رہ گیا۔ اس کے سامنے بورس کھڑا اسے گھور رہا تھا۔

''میرے بعد تم نے ان خوابوں کی روایت کو برقرار رکھا ہے۔'' بورس اسے دیکھ کر مسکرایا۔

وہ تیزی سے اٹھ کر اس کے گلے لگ گیا۔

''بس، بس۔ مجھے بھینچ کر مار ہی ڈالو گے کیا؟'' بورس بولا تو ایڈرک ہنستے ہوئے اس سے الگ ہوا۔ اس نے باقی افراد پر نظر ڈالی۔ وہ سب بورس کے ساتھ صحیح سلامت واپس لوٹے تھے مگر ان کے ساتھ ایک عجیب سے حلیے والے شخص کو دیکھ کر وہ چونکنے پر مجبور ہو گیا۔ اس کا کسرتی جسم پہلی نظر میں ہی کسی کی بھی توجہ اس کی طرف مبذول کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ اس میں عجیب سی کشش تھی۔ وہ لیب کے اندر گھوم پھر کر وہاں رکھی چیزوں کا جائزہ لے رہا تھا۔

''یہ شاکا ہے؟'' وہ حیرانی سے بولا۔

بورس نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا۔ ایڈرک رشک سے اس کا جائزہ لینے لگا۔

''مجھے یہاں کے حالات سے آگاہ کر سکتے ہو؟'' اسٹیو بے چین تھا۔

''حالات بہت زیادہ خراب ہو چکے ہیں۔ جوشوا نے ماسکو پر قبضہ کر لیا ہے۔'' ایڈرک بولا۔

ایڈرک نے آگے بڑھ کر لیب میں لگے ٹی وی کا بٹن آن کر دیا۔ مختلف چینلز پر جوشوا کی تقریر بار بار چلائی جا رہی تھی۔

''اوہ نہیں۔ اس نے تو ہمارے چینل پر قبضہ کر لیا ہے۔'' صوفیہ پریشانی سے اسکرین کی طرف بڑھی۔

اس کی بات سن کر شاکا بھی اسکرین کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ غور سے اسکرین کو تکنے لگا۔ اس نے گزری صدیوں میں آج تک اس طرح کا عفریت نہیں دیکھا تھا۔

''مجھے فوراً نکلنا ہوگا۔'' اسٹیو بولا۔

''ٹھہرو۔ تمہارا اس طرح جانا ٹھیک نہیں۔ یہاں سے نکلتے ہی تم ان بلاؤں کے ہتھے چڑھ جاؤ گے۔ وہ چاروں طرف موجود ہیں۔'' ایڈرک نے اسے خبردار کیا۔ جیکال، شمشیر اور ہیری جوشوا کو دیکھ کر خوفزدہ ہو گئے تھے۔ وہ پہلے کے مقابلے میں کافی طاقتور لگ رہا تھا۔

''تم آرمی چیف کو اپنی خیریت کی اطلاع دو۔ اس کے بعد ہم کوئی لائحہ عمل ترتیب دیتے ہیں۔'' بورس بولا۔

''جوشوا نے ان دو دنوں میں یہاں تباہی مچا دی ہے۔'' شمشیر افسوس سے سر ہلاتے ہوئے بولا۔

''اس کے مقابلے کے لیے آرمی اور پولیس کے کئی جوان بھیجے گئے مگر کوئی بھی واپس نہیں لوٹا۔ اس پر کسی طرح کا ہتھیار اثر نہیں کر رہا۔'' ایڈرک بولا۔

''میں بتاتا ہوں کہ اس کا خاتمہ کیسے ہوگا۔'' اچانک شاکا بولا۔

وہ سب حیرت سے اس کی طرف پلٹے۔

بورس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ جانتا تھا کہ شاکا ہی انہیں اس عذاب سے نجات دلا سکتا ہے۔

☆☆☆

Year 2020

Russian News Channel-Moscow Russia

جوشوا کو نیوز چینل پر قبضہ کیے دو دن گزر چکے تھے۔ اس کی آرمی دو حصوں میں تقسیم ہو چکی تھی۔ کچھ اس کے ساتھ نیوز چینل کی بلڈنگ میں موجود تھے اور باقی اس گودام پر حکومت کی طرف سے بھیجے جانے والے ٹرکس کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ ماسکو سے لوگوں کو پکڑ کر گودام لے گئے تھے۔ جوشوا کے پاس ویکسین ختم ہو چکی تھی مگر وہ چھ سو طاقتور بلائیں تیار کر چکا تھا۔ اس نے چند فوجیوں کے علاوہ باقی سب کو گودام پر ہی رکنے کا حکم دیا۔ وہ اسے ہیڈ کوارٹر مقرر کر چکا تھا۔ اب وہ چینل کے ذریعے اپنے مطالبات منوا رہا تھا۔

پولیس اور فوج نے اس سے مقابلہ کرنا بند کر دیا تھا۔ شاید وہ بھی حالات سے ہار مان کر خاموش بیٹھ گئے تھے۔

جوشوا کو مزید ویکسین کی تیاری کے لیے ان خون کے نمونوں کی ضرورت تھی اور اب وہ جیکال کی تلاش میں تھا۔

اس نے حکومتی اہلکاروں سے مطلوبہ کیمیائی مرکبات، کچھ مشینیں فراہم کرنے اور جیکال کو اس کے حوالے کرنے کی شرائط رکھیں۔ حکومت نے اس سے دو دن کی مہلت مانگی تھی اور آج وہ مہلت ختم ہونے والی تھی۔ جیکال کو ہر جگہ تلاش کیا جا رہا تھا مگر اس کا کچھ پتا نہ تھا۔ جوشوا کی آرمی نے کوبکا ائربیس پر بھی حملہ کیا تھا مگر وہاں بھی اسٹیو اور جیکال کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ آرمی چیف کے علاوہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ لوگ کہاں ہیں اور وہ اپنی زبان پر تالا ڈالے خاموش بیٹھا تھا۔

اتفاق سے اس کا ایڈرک سے رابطہ ہو گیا۔

اسے یقین تھا کہ اسٹیو اس وارم پورٹل سے اس مسئلے کے حل کے ساتھ ہی واپس لوٹے گا اور یہی ہوا تھا۔ آج کی صبح اسٹیو کے لوٹنے کی خوشخبری ساتھ لائی تھی۔ آرمی چیف نے اسے جوشوا کے مطالبات سے آگاہ کیا۔ حکومت نے جوشوا کے مطلوبہ سامان کے ٹرک تیار کر لیے تھے اور اب وہ جیکال کو ڈھونڈ رہے تھے۔

اسٹیو نے ان ٹرکس کو رکوانے اور ایک گھنٹے بعد خود رابطہ کرنے کا کہہ کر کال منقطع کر دی۔

حکومت نے جوشوا کو یقین دلایا تھا کہ اس کے مطالبات آج ہی پورے کیے جائیں گے لہٰذا وہ اپنی آرمی کو گودام پہنچنے کا حکم دے کر خود نیوز چینل کی بلڈنگ میں موجود تھا۔ فوج کی طرف سے ممکنہ گڑبڑ کی صورت میں اس کی آرمی گودام میں بڑی تعداد میں موجود ہوتی اور کسی بھی طرح کے حملے کا بھرپور مقابلہ کرتی۔

آرمی چیف کو اسٹیو کی اگلی کال کا بے صبری سے انتظار تھا۔ اسٹیو کے مطابق وہ ان بلاؤں کے خاتمے کا حل تلاش کر چکا تھا اور ماسکو کو آج رات ہی ان بلاؤں سے نجات ملنے والی تھی۔

☆☆☆

Year 2020

Dr. Boris Lab- Moscow Russia

شاکا نے ان بلاؤں کے خون کے نمونے دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ شمشیر نے اسے ویکسین کی شیشی دکھائی جسے وہ سیمپل کے طور پر ساتھ رکھ کر لے آئے تھے اور وہ باکس مہیا کر دیا تھا جس کی مدد سے یہ عفریت تیار کیے گئے تھے۔

بورس نے اسے ان بلاؤں کی تصاویر کا پرنٹ بھی نکال کر دیا۔ انٹرنیٹ پر ان کی کافی تصاویر موجود تھیں جو شاید لوگوں نے موبائل سے لے کر انٹرنیٹ پر ڈال دی تھیں۔

وہ اس وقت ان خاکوں کو اپنے سامنے پھیلائے غور سے انہیں دیکھنے میں مصروف تھا۔ اسٹیو نے آرمی چیف سے بات کر لی تھی اور اب وہ شاکا کے ساتھ کھڑا اس کی کارروائی دیکھ رہا تھا۔

''یہ تصویریں اس عفریت سے مختلف ہیں جو اس وقت یہاں بات کر رہا تھا۔'' شاکا نے ٹی وی اسکرین کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

''اوہ ہاں۔ جوشوا ان سے الگ ہے۔'' جیکال بولا۔

''مجھے اس کی تصویر بھی چاہیے۔'' شاکا نے کہا تو بورس نے جوشوا کی تصویر کا بھی پرنٹ نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔

''ایسا لگتا ہے جیسے مانا مانا نگل، چوپا کابرا اور وینڈیگو کو ملا دیا گیا ہو۔'' وہ ان تصاویر کو دیکھتے ہوئے بولا تو بورس اچھل پڑا۔

''اوہ ہاں، تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ ہم نے بھی یہی اندازہ لگایا تھا۔ جوشوا نے ان بلاؤں کو مختلف عفریتوں کے خون کے نمونے ملا کر تیار کیا ہے۔ یہ وہی نمونے ہیں جو میں نے کانفز میں اکٹھا کیے تھے۔'' بورس اس کے سامنے رکھے باکس کی طرف اشارہ کر کے بولا تو شاکا کے چہرے پر غصے کی لہر ابھری۔

''میں نے تم سے کہا تھا کہ ان نمونوں کو جمع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اب دیکھو یہ تمہاری دنیا پر کیا مصیبت لے کر آئے ہیں۔ برائی سے کبھی اچھائی حاصل نہیں ہو سکتی۔ یہ بدکال کی مخلوق کے خون کے نمونے تھے۔ ان سے بھلا کیا فائدہ ہاتھ آتا؟'' شاکا بولا۔ بورس نے بغیر کچھ کہے اس کی بات کی تائید میں سر ہلا دیا۔ وہ واقعی شرمندہ تھا۔

''جب یہ سب ایک جیسے ہیں تو یہ ان سے الگ کیوں ہے۔ اگر یہ عفریت ہیں تو عفریت کی طرح شکار کریں۔ ان کا کام خون پینا ہے۔ شاید یہ تجربہ انسانوں پر کیا گیا اس لیے انہیں حکم ماننے کی عادت بھی ہے۔ جو بھی ان کا سردار بولے گا یہ مانیں گے لیکن یہ ان سب سے الگ ہے۔ اس کا ذہن کام کر رہا ہے۔ یہ بات کرتا ہے اور حکم دیتا ہے۔'' شاکا، جوشوا کی تصویر کو غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔

''مجھے وہ دوا اور خون کے نمونے دکھاؤ۔'' شاکا بولا۔

بورس نے اس کے ہاتھ میں ویکسین کی شیشی تھما کر باکس کو کھول دیا۔ شاکا نے ویکسین کی شیشی کھول کر اسے

سونگھا اور باکس سے مختلف شیشیاں اٹھا کر سونگھنے لگا۔

''لیمیا..... یہ تو لیمیا کا خون ہے۔ اس دوا میں لیمیا کے خون کی بو بھی ہے۔'' وہ مزید شیشیاں اٹھا کر سونگھنے لگا۔

''چوپا کابرا، لیمیا، وینڈیگو اور مانا نانگل..... لیکن ہم نے تو مانا نانگل کا خون.....'' وہ سوچ میں پڑ گیا۔

''یہ لورین کے خون کے سیمپل ہیں۔'' بورس افسردگی سے بولا۔ وہ سب خاموش کھڑے ان کی باتیں سن رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے دو پرانے دوست کچھ سالوں بعد دوبارہ ملے ہوں مگر ان کی اس ملاقات کے بیچ میں کئی صدیاں حائل تھیں۔ تب بھی وہ منظر حال کی طرح واضح تھا۔

شاکا نے تاسف سے سر ہلایا۔

''کیا تمہیں لگتا ہے کہ جوشوا، لورین کے خون کی وجہ سے الگ ہے؟'' بورس نے شاکا سے پوچھا۔

''نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو باقی عفریت بھی اسی کی طرح دماغ اور زبان کا استعمال کرتے۔ ان سب کے پر مانا نانگل کی طرح ہیں۔ اس نے اپنی دوا میں کوئی خاص چیز ملائی ہے۔'' شاکا جوشوا کی تصویر کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

باکس میں چار شیشیاں اور تھیں جن میں سے دو آدھی خالی تھیں۔

شاکا نے وہ شیشی اٹھائی اور اسے غور سے دیکھنے لگا۔

''اس شیشی کے بارے میں ہمیں بھی نہیں پتا چل سکا کہ یہ کس عفریت کا خون ہے۔ یہ شیشیاں شاید لوئس نے بعد میں اس باکس میں رکھی ہوں گی۔ ان کے بارے میں مجھے کوئی معلومات نہیں۔'' بورس بولا۔

شاکا نے اس شیشی کو کھول کر اپنی ناک سے لگایا مگر اگلے ہی لمحے اسے کرنٹ لگا۔

''کیا ہوا شاکا؟ کس عفریت کا خون ہے یہ؟'' بورس حیران ہوا۔

''یہ میرا خون ہے۔'' اس نے گویا دھماکا کیا۔

''کیا؟'' ان سب کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ لوئس کے پاس تمہارا خون کہاں سے آیا؟'' بورس شاک کی کیفیت میں تھا۔

شاکا نے بورس کی آنکھوں میں دیکھا۔ بورس کے دماغ میں جھماکا ہوا۔

''اوہ..... اوہ..... وہ گولی..... فلپس کی گولی سے تم زخمی ہو گئے تھے۔'' بورس اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

''ہمیں بتاؤ آخر تم لوگ کیا بات کر رہے ہو؟'' اسٹیو بولا۔

''جوشوا نے اپنی فوج بنانے کے لیے چار عفریتوں کے خون کا استعمال کیا ہے مگر وہ ان سب سے الگ اس لیے ہے کہ اس کے جسم میں شاکا کا خون بھی دوڑ رہا ہے۔'' جیکال کو ساری بات سمجھ آ گئی۔

ان سب کے چہروں کا رنگ اڑ گیا۔

''اب..... اب کیسے خاتمہ ہوگا اس کا؟ وہ تو بہت طاقتور بن چکا ہے۔ شاکا کیسے مقابلہ کرے گا اس کا؟'' شمشیر پریشانی سے بولا۔

''شاکا کرے گا اس کا مقابلہ اور اس کا خاتمہ کر کے ہی یہاں سے جائے گا۔'' شاکا سرد لہجے میں بولا۔

''تمہارے پاس کیا لائحہ عمل ہے؟'' اسٹیو بے چینی سے بولا۔

''سب سے پہلے تو رینزو کو ان خون کے نمونوں کو ضائع کرنا ہوگا تاکہ جوشوا دوبارہ ان کا استعمال نہ کر سکے۔ وہ یقیناً ان شیشیوں کو ڈھونڈ رہا ہوگا۔ اسے کمزور کرنے کے لیے ہمیں سب سے پہلے اس کی فوج کو ختم کرنا ہوگا۔ یہ کام تم بھی کر سکتے ہو۔'' شاکا ان سب کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''وہ کیسے؟'' اسٹیو پُرجوش ہوا۔

''ان تمام عفریتوں کی عادت ہے کہ یہ مخصوص جگہ پر ہی رہنا پسند کرتے ہیں۔ یقیناً جوشوا نے اپنی فوج کو کسی ایک جگہ جمع کر رکھا ہوگا اور یہ وہیں سے نکل کر حملہ کرنے جاتی ہیں۔ ہمیں وہ جگہ تلاش کرنا ہے۔ انہیں بڑی تعداد میں ایک جگہ رہنے کی عادت ہے۔ اگر ہم اس جگہ پر حملہ کر کے ان کا وہیں خاتمہ کر دیں تو شہر میں ان کی تعداد کم رہ جائے گی۔ جوشوا کو نئی فوج بنانے کے لیے ان نمونوں کی ضرورت پڑے گی اور جب یہ اسے نہیں ملیں گے تو وہ خود مقابلہ کرنے نکلے گا۔ تب اس کا سامنا مجھ سے ہوگا۔'' شاکا بولا۔

''لیکن ہم اس کی فوج کا خاتمہ کیسے کر سکتے ہیں؟ یہ اتنا آسان نہیں ہے۔'' اسٹیو بولا۔

''ان تمام عفریتوں کی کوئی نہ کوئی کمزوری تھی۔ جیسے مانا نانگل کو لہسن اور نمک چھڑکنے سے ختم کیا جا سکتا تھا۔'' شاکا بولا تو اسٹیو چونک پڑا۔

''اوہ ہاں، تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ جوشوا سے مقابلے کے دوران ہم ایک ایسی فیکٹری میں پھنس گئے تھے جہاں لہسن کو پیس کر پاؤڈر بنایا جا رہا تھا اور جوشوا وہاں سے مقابلہ کیے بغیر ہی بھاگ گیا تھا۔'' اسٹیو بولا۔

''ان کے پر مانا نانگل کی دین ہیں۔ لہسن کی بو ان کے اڑنے کی طاقت کو کمزور کر دے گی مگر یہ صرف لہسن کے ذریعے ختم نہیں ہوں گے کیونکہ یہ کسی ایک عفریت کے خون

سے تیار نہیں ہوئے لہٰذا ہمیں ہر عفریت کی کمزوری کو مدنظر رکھتے ہوئے لائحہ عمل ترتیب دینا ہے۔ ان کے پر کمزور پڑتے ہی ہم ان کی آنکھیں ضائع کریں گے۔ لیمیا کی آنکھیں ضائع ہوجائیں تو اس کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔ اس طرح ان کے جسم سے لیمیا کی طاقتیں بھی ختم ہوجائیں گی۔ یہ کام ہم کسی تیز مرچ کے ذریعے بھی کرسکتے ہیں جو دور سے ان پر پھینکی جائے لیکن تب بھی ان کے پاس وینڈیگو اور چوپاکابرا کی طاقتیں موجود ہوں گی اور ان دونوں کی ایک ہی کمزوری ہے۔ اگر ان کے نرخروں کو چیر دیا جائے تو ان کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔ بنیادی طور پر ہمیں ان کے جسموں سے ان عفریتوں کو ایک ایک کرکے باہر نکالنا ہے۔ ان کے اڑنے اور دیکھنے کی طاقت ختم ہوتے ہی ہم ان پر آسانی سے قابو پاکر ان کا نرخرہ ادھیڑ سکتے ہیں لیکن اس کے لیے ہمیں زیادہ لوگوں کی مدد کی ضرورت پڑے گی جو تمہاری طرح مضبوط جسم کے مالک ہوں۔'' شاکا اسٹیو کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا تو اسٹیو کو شاکا اس وقت کسی دیوتا کی طرح لگا تھا جس نے اس مصیبت کا آسان ساحل ان کے سامنے رکھ دیا تھا۔ اس کی باتوں پر عمل کرکے انہیں جلد از جلد اس عذاب سے چھٹکارا پانا تھا۔ وہ بلائیں جو خطرناک ہتھیاروں سے بھی قابو نہیں آرہی تھیں، شاکا کی وجہ سے آسان شکار لگنے لگی تھیں۔

''چیف نے مجھے بتایا ہے کہ جوشوا نے شہر سے کچھ دور ایک گودام پر اپنی آرمی کو اکٹھا کرنا شروع کیا ہے اور وہ وہیں پر ویکسین بنانے کی تیاری کررہا ہے۔ اس نے حکومت سے کچھ سامان کا مطالبہ کیا ہے اور وہ سامان آج رات ٹرکوں کے ذریعے اس گودام پر بھیجا جائے گا۔ ہمارے پاس ایسی گیس موجود ہے جس کے استعمال سے ہم دشمن کی آنکھوں میں آنسو یا جلن پیدا کرسکتے ہیں۔ یہ ہم کافی عرصے سے استعمال کررہے ہیں مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم ان کے پروں کو کمزور کرنے کے لیے لہسن کا استعمال کیسے کریں گے؟'' اسٹیو سوچ میں پڑ گیا۔

''لہسن کی تیز بو ان سے اڑنے کی طاقت چھین لے گی۔ یہ کرنا بہت ضروری ہے ورنہ وہ اڑ کر ہم پر حملہ کریں گے یا وہاں سے نکل کر جوشوا کو بھی خبردار کرسکتے ہیں۔ ہمیں انہیں اسی علاقے میں ختم کرنا ہے۔ سب سے پہلے مانا نگل سے نمٹنا ہوگا۔ جوشوا کو جو سامان بھیجا جارہا ہے اس کی جگہ لہسن کو وافر مقدار میں اس گودام کے اندر پہنچا دو۔ وہ اندر ہی کمزور پڑ جائیں گے۔ باہر نکلنے کے لیے وہ پروں کے بجائے پیروں کا استعمال کرنا چاہیں گے مگر تم لوگ فوراً ان کی آنکھوں کو نشانہ بنانا۔ وہ گیس اسی وقت گودام میں پھیل جانی چاہیے۔ انہیں سنبھلنے کا موقع نہیں دینا۔ ان ٹرکوں میں سامان کی جگہ اپنے ساتھیوں کو لہسن کے ساتھ وہاں پہنچا دو۔ جوشوا خود کو ناقابلِ تسخیر سمجھ بیٹھا ہے اس لیے ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ کوئی ان سے مقابلہ کرنے آرہا ہے۔ وہ لاعلمی میں مارے جائیں گے۔'' شاکا بولا۔

وہ سب حیرت سے منہ کھولے اسے تک رہے تھے۔

''اور اگر وہ گودام کے باہر بھی موجود ہوئے تو؟'' اینڈریو بولا۔

''باہر والے عفریتوں سے میں نمٹ لوں گا۔ اسٹیو کے ساتھی ٹرک میں چھپ کر بہ آسانی گودام کے اندر پہنچ سکتے ہیں۔ میں بھی باہر موجود عفریتوں کا خاتمہ کرکے اندر آجاؤں گا۔'' شاکا کے پاس ہر مسئلے کا حل تھا۔

''میں چیف سے بات کرکے انتظامات مکمل کرتا ہوں۔'' اسٹیو فون کی طرف بڑھ گیا۔

''مجھے ایک بات سمجھ نہیں آرہی۔ یہ عفریت اتنے خطرناک ہتھیاروں سے نہیں مرے تو لہسن اور گیس سے کیسے مرسکتے ہیں؟'' ہیری استہزایہ انداز میں بولا۔

شاکا اس کی بات کا جواب دیے بغیر بورس کے ساتھ ان کے نمونوں کو ضائع کرنے میں مصروف ہوگیا۔ وہ انہیں تیزاب میں.... ملا کر ضائع کررہے تھے تاکہ وہ اپنا اثر کھودیں اور قابلِ استعمال نہ رہیں۔

صوفیہ نے ہیری کو گھورا اور شاکا کی طرف بڑھ گئی۔

''تم ہمارے لیے اتنے بڑے خطرے سے ٹکرانے جارہے ہو۔ میں تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں۔'' صوفیہ جھجکتے ہوئے بولی۔ وہ اس کی ذہانت سے متاثر ہوئی تھی۔ وہ واقعی سب سے الگ تھا۔

''مجھے عادت ہے۔ تمہیں شکریہ ادا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں صوفیہ!'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

صوفیہ بھی بورس کی مدد کرنے لگی۔

اسٹیو نے آرمی چیف سے بات کرکے انہیں شاکا کے لائحہ عمل سے آگاہ کیا۔ چیف کو یہ ساری باتیں سمجھنے میں وقت لگا مگر اس نے اسٹیو کو تمام انتظامات ان کی خواہش کے مطابق مکمل کرنے کی یقین دہانی کروائی۔ اب اسٹیو اور شاکا کو جوشوا کی آرمی کی نظروں میں آئے بغیر اس گودام تک پہنچنا تھا۔ باقی فورس ٹرکوں کے ذریعے وہاں مخصوص وقت پر پہنچ جاتی۔

"ٹھیک ہے۔ رات ہونے کا انتظار کرو۔ میری رفتار تیز ہے تو یہ عفریت مجھ تک پہنچنے میں ناکام رہیں گے اور نہ ہی یہ میری خوشبو پا سکتے ہیں۔ میں ان کی نظروں سے بچ کر وہاں پہنچ سکتا ہوں مگر تم وہاں تک کیسے پہنچو گے؟" شاکا اس کی بات سن کر بولا۔

"میں آرمی جیپ منگوا لیتا ہوں۔" اسٹیو بولا۔

"نہیں۔ اس میں خطرہ ہے۔" جیکال کو اسٹیو کی جیپ والی بات ٹھیک نہیں لگی۔

"اس طرح تم ان کی نظروں میں آجاؤ گے۔ میں تمہیں اپنی پشت پر سوار کر کے وہاں لے جا سکتا ہوں۔" شاکا نے انہیں ایک بار پھر یاد دلایا تھا کہ وہ عام انسان نہیں ہے۔

اب انہیں رات ہونے کا انتظار تھا۔ شاکا نے اس کے بعد ان سے کوئی بات نہیں کی۔ وہ آنکھیں بند کر کے روحوں سے بات کرنے میں مصروف ہو گیا۔

☆☆☆

رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ چیف نے اسٹیو کو ٹرکس کے روانہ ہونے کی اطلاع دی۔

"شاکا! ہمیں نکلنا ہوگا۔" اسٹیو نے اسے مخاطب کیا۔ شاکا نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ اسٹیو ان سب کو الوداع کہنے لگا۔ بورس بھی شاکا کے گلے لگ گیا۔ یہ موت اور زندگی کے بیچ کی جنگ تھی۔ کچھ بھی ممکن تھا۔ اسٹیو اور شاکا لیب سے باہر نکل گئے۔

بورس نے صوفیہ کی طرف دیکھا۔ وہ کشمکش میں مبتلا تھی۔ بورس نے اسے اشارہ کیا۔ وہ فوراً شاکا کے پیچھے گئی۔ شاید وہ اسی اشارے کی منتظر تھی۔ ہیری نے اس کے پیچھے جانے کی کوشش کی مگر بورس نے اسے روک دیا۔

شاکا اور اسٹیو فلیٹ سے باہر نکل رہے تھے۔

"شاکا!" صوفیہ نے اسے پکارا۔ اسٹیو نے صوفیہ اور شاکا کو اکیلا چھوڑنا مناسب سمجھا۔ وہ فلیٹ کے دروازے سے باہر نکل گیا۔

اب وہاں ان دونوں کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔

"شاکا! وہ...... میں تمہیں الوداع کہنا چاہتی تھی۔" وہ اتنا ہی کہہ سکی۔

وہ بغیر کچھ کہے وہاں سے جانے لگا مگر رک گیا۔

"تم جانتی ہو، میری سماعت بہت تیز ہے۔ میں کافی فاصلے سے بھی آوازوں کو صاف سن سکتا ہوں۔" شاکا سنجیدگی سے بولا۔

صوفیہ نہ سمجھنے والے انداز میں اسے دیکھنے لگی۔

خوشی اور غم

جس طرح پھول اور کانٹوں، اندھیروں اور اجالوں کا آپس میں گہرا تعلق ہے، اسی طرح زندگی بھی غم اور خوشی کے بغیر نامکمل ہے۔ زندگی میں جب تک غم نہ ہوں اس میں لوچ اور لچک پیدا نہیں ہوتی۔ غم زندگی کا دوسرا نام ہے کیونکہ خوشیاں بے وفا ہوتی ہیں جو چند لمحوں کے لیے اپنی جھلک دکھا کر انسان کو ہمیشہ کے لیے یادوں کی وادی میں دھکیل دیتی ہیں جبکہ غم انسان کی زندگی کے ساتھی ہوتے ہیں۔ زندگی کے جو قیمتی لمحات بیت گئے، اب واپس نہیں آسکتے لیکن آنے والے لمحات کی قدر جانو اور ہمیشہ یادِ الٰہی کا چراغ لے کر سیدھا اور سچا راستہ تلاش کرو۔

خوبصورتی

حُسن اور خوبصورتی میں بہت فرق ہوتا ہے۔ خوبصورت مطلب خوبصورت لیکن حُسن بہت وسیع لفظ ہے۔ اس کے اَن گنت معنی ہیں۔ ہر خوبصورت چہرہ حسین نہیں ہوتا۔ کوئی کہتا ہے کہ حُسن بے پروا اچھا لگتا ہے۔ اسے خبر ہی نہ ہو کہ وہ حسین ہے لیکن میرا خیال ہے کہ حُسن باخبر زیادہ اچھا ہوتا ہے یا حُسن کے لیے باخبر ہونا زیادہ اچھا ہوتا ہے۔ اس کے انداز میں، رکھ رکھاؤ میں ایک خاص ادا ہو لیکن حیا کے ساتھ۔ اسے خبر ہو کہ وہ چاہے جانے کے قابل ہے۔ وہ مسکرائے تو ایسے لگے کہ تمام عالم پر احسان کیا ہے۔ اس کے جنبشِ ابرو سے ایک زمانہ گھائل ہو لیکن وہ رہے اپنی حدوں میں۔ وہ شانِ بے نیازی سے بس اپنی ہی طے کردہ سمت میں چلتی جائے۔ زمانے کی میلی نگاہیں اس کے کردار سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائیں۔ ایسا حسن لائقِ تحسین و عزت احترام ہے۔

(مرسلہ: محمد انور ندیم۔ حویلی لکھا، اوکاڑہ)

pklibrary.com

''میں نے اس دن ہیری اور تمہاری گفتگو سنی تھی۔ میں جانتا ہوں تم نے اس سے کیا وعدہ کیا تھا۔'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

صوفیہ سن ہوگئی۔ شاکا اس دھوکے کے بارے میں سب کچھ جانتا تھا تب بھی وہ ان کی مدد کے لیے یہاں تک آگیا تھا۔

صوفیہ نے اپنی صفائی دینے کے لیے منہ کھولا ہی تھا مگر شاکا نے اس کے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

''میں تمہیں مجبور نہیں کرنا چاہتا مگر جب سے میری روح نے اس جسم میں سانس لینا شروع کی ہے تب سے آج تک تمہارے علاوہ اور کسی کی خواہش نہیں کی ہے۔ میں اپنی دنیا میں تمہارا انتظار کروں گا ورنہ شاکا اپنے نام کے ساتھ ہمیشہ کے لیے دفن ہوجائے گا۔'' وہ یہ کہہ کر وہاں سے چلا گیا۔

صوفیہ وہیں بیٹھ کر رونے لگی۔ اس کے دل و دماغ کے بیچ میں کئی دنوں سے یہ جنگ جاری تھی۔ اس کا دل شاکا کے لیے مچلتا مگر دماغ اسے حقیقت سے آگاہ کرنے کی کوشش کرتا۔

''صوفیہ! کیا ہوا، کیوں رو رہی ہو؟'' اینڈریو جو اس کا انتظار کرنے کے بعد اس کے پیچھے آیا تھا، اسے روتا ہوا دیکھ کر پریشان ہوگیا۔

''اینڈریو.....! شاکا کو سب کچھ معلوم ہے۔ وہ جانتا ہے کہ میں نے اسے دھوکا دیا ہے پھر بھی وہ ہماری مدد کر رہا ہے۔'' وہ روتے ہوئے بولی۔

اینڈریو اس کی بات سن کر خاموش ہوگیا۔

''تو کیا وہ تمہیں.....'' اینڈریو نے اپنی بات ادھوری چھوڑی۔

''نہیں۔ وہ مجھ سے زبردستی نہیں کرنا چاہتا۔'' صوفیہ آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

''اور تم..... تم کیا چاہتی ہو صوفیہ؟'' اینڈریو اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

صوفیہ بے بسی سے ہونٹ کاٹنے لگی۔

''میں نہیں جانتی۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا۔'' اس نے اپنا سر تھام لیا۔

''اوہ صوفیہ! تم شاکا سے محبت کر بیٹھی ہو۔'' وہ اداسی سے بولا۔

صوفیہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

''کیا تمہیں لگتا ہے کہ ایسا ہے اور کیا یہ صحیح ہے اینڈریو؟'' وہ بھیگی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔

اسے ایک مخلص دوست کی شدید ضرورت تھی۔

''محبت صحیح یا غلط نہیں ہوتی۔ اس کے ہونے کا وقت مقرر نہیں۔ نہ اس پر کسی کا اختیار ہے مگر تمہیں لگتا ہے کہ تم اس کے ساتھ اس کی دنیا میں رہ پاؤ گی؟'' اینڈریو اس وقت اپنے جذبات کو ایک طرف رکھ کر صوفیہ کی مدد کرنا چاہتا تھا۔ وہ خود بھی اس کیفیت سے گزر چکا تھا لہٰذا اس کا درد سمجھ سکتا تھا۔

''مجھے نہیں معلوم۔'' صوفیہ نے دوبارہ اپنا سر تھام لیا۔

''ہم سب اس دنیا میں آتے ہیں، یہاں کام کرتے ہیں، خاندان بناتے ہیں اور اپنی مدت پوری کر کے چلے جاتے ہیں مگر جانتی ہو زندگی کا اصل مقصد کیا ہے؟ دل کی خوشی۔ اس کے سامنے ہمارا روزگار، دولت اور آسائشیں کوئی معنی نہیں رکھتیں صوفیہ! تم اپنے دل کی سنو۔ کیا تم شاکا کے بغیر رہ پاؤ گی؟'' اینڈریو نے اسے بازوؤں سے تھاما۔

''اینڈریو! یہ کیا فضول باتیں کر رہے ہو؟'' ہیری جو کافی دیر سے خاموش کھڑا ان کی باتیں سن رہا تھا، اپنے غصے پر قابو نہیں رکھ پایا۔

صوفیہ اسے دیکھ کر اپنے آنسو پونچھنے لگی۔

''فضول بات تم کرتے ہو۔ تم نے صوفیہ کو اس مشکل میں ڈالا۔ تم نے شاکا کو دھوکا دینا چاہا۔ وہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی ہماری مدد کر رہا ہے۔'' اینڈریو کو ہیری پر بے تحاشہ غصہ آیا۔

''اگر وہ ہماری مدد کر رہا ہے تو کیا اس کے بدلے میں ہم صوفیہ کو قربان کر دیں؟'' ہیری تیز لہجے میں بولا۔

''کوئی بھی صوفیہ کو قربان نہیں کر رہا۔ وہ اپنی مرضی سے شاکا کے ساتھ جانا چاہتی ہے۔'' اینڈریو بولا۔

''مجھے لگتا ہے کہ تمہارا دماغی توازن درست نہیں ہے۔ صوفیہ اس جنگلی کے ساتھ وہاں نہیں جائے گی۔ تم اسے گمراہ کرنے کی کوشش مت کرو۔ جاؤ یہاں سے۔'' ہیری چلایا۔

''جنگلی وہ نہیں، جنگلی تم ہو۔'' اینڈریو یہ کہہ کر وہاں سے چلا گیا۔

ہیری نے صوفیہ کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے آنسو پونچھ رہی تھی۔

''صوفیہ! تم اینڈریو کی باتوں کو دماغ پر سوار مت کرو۔ شاکا کی طرف کھنچاؤ محسوس کرنا فطری عمل ہے۔ اس کے پاس ایسی طاقتیں ہیں جس کی مدد سے وہ دوسروں کی سوچ کو اپنے بس میں کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس کھنچاؤ کو محبت سے تشبیہ دینا بے وقوفی ہے اور یہ تم کن چکروں

میں پڑ رہی ہو؟ تمہیں اپنا چینل کھولنا ہے، ہمیں اپنا گھر بنانا ہے۔ میں شہر کے سب سے بہترین علاقے میں ایک ولا خریدنے کی تیاری کر رہا ہوں۔ خود کو سنبھالو۔ جیسے ہی شاکا یہاں سے جائے گا، تم اس کے سحر سے نکل آؤ گی۔'' ہیری نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

وہ اسے جواب دیے بغیر وہاں سے چلی گئی۔

ہیری نے لاؤنج میں رکھی میز کو ایک لات رسید کی اور صوفے پر بیٹھ گیا۔ وہ صوفیہ کو کسی بھی قیمت پر شاکا کے حوالے نہیں کرنے والا تھا۔ چاہے اس کے لیے اسے شاکا پر گولی ہی کیوں نہ چلانا پڑ جاتی۔

☆☆☆

Year 2020

Moscow-Russia

شاکا اور اسٹیو گودام سے کچھ فاصلے پر درختوں کے جھنڈ میں موجود تھے۔ آرمی کے ٹرکس کسی بھی وقت یہاں پہنچ سکتے تھے۔ اسٹیو نے انہیں گودام میں داخل ہونے سے پہلے درختوں کے پاس رکنے کا پیغام دیا تھا۔ چونکہ یہ ٹرک جوشوا کا مطلوبہ سامان لے کر جا رہے تھے اس لیے انہیں نقصان نہیں پہنچایا گیا تھا۔

یہ چار بڑے ٹرک تھے۔ فورس کے بہترین فوجی ہتھیاروں کے ساتھ ان ٹرکس میں چھپے بیٹھے تھے۔ ان کے پاس گیس شیلز بھی موجود تھے۔ ساتھ ہی اسٹیو نے انہیں ہائی پاور ڈرائیرز ساتھ لانے کا حکم دیا تھا۔ یہ ڈرائیرز عام طور پر بھاری کپڑوں یا میٹریس کو سکھانے کے کام آتے تھے۔ انہیں یہ ڈرائیرز بہ آسانی نیول ہیڈکوارٹر کے ڈرائی کلیننگ سینٹر سے مل گئے تھے۔ ان ڈرائیرز کو بیٹری سے اٹیچ کر کے ٹرکس میں رکھ دیا گیا تھا۔ چیف نے اسٹیو کی ہدایات کے مطابق لہسن پاؤڈر کی بوریاں بھی ان ٹرکس میں رکھوادی تھیں۔ اس کے لیے انہیں کافی بھاگ دوڑ کرنا پڑی تھی۔

شہر میں کرفیو نافذ ہونے کی وجہ سے اسٹور اور گودام بند تھے اور جوشوا کی بلائیں ہر جگہ گھوم رہی تھیں مگر نیول ہیڈکوارٹر کے قریبی علاقوں میں فی الحال سکون تھا لہٰذا انہی علاقوں میں موجود گوداموں تک رسائی حاصل کی گئی تھی۔

ٹرکس کے پہنچتے ہی اسٹیو نے مطلوبہ سامان [illegible] ہو [illegible] کی اور ایک ٹرک کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ یہاں سے گودام زیادہ دور نہیں تھا۔

شاکا کو وہاں پہنچ کر پہرے داروں سے نمٹنا تھا۔ وہ آگے نکل گیا تھا۔ اسٹیو نے بھی ٹرکس کو آگے بڑھنے کا حکم دے دیا۔

شاکا نے گودام کے قریب پہنچ کر اطراف کا جائزہ لیا۔ گودام کی چھت پر جوشوا کے کچھ پہرے دار موجود تھے جو وقفے وقفے سے اڑ کر آس پاس کے علاقے پر بھی نظر رکھ رہے تھے۔ ان کی زیادہ تعداد گودام کے اندر ہی موجود تھی۔

وہ گودام کی عقبی دیوار کے قریب پہنچ کر ٹرکس کے پہنچنے کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر کے بعد آرمی کے ٹرک گودام کی طرف آنے والے راستے پر نمودار ہوئے۔ جوشوا کے پہرے دار نیچے اترنے لگے۔ وہ ٹرکس کو دیکھ کر چوکنا ہو گئے تھے۔ ان میں سے دو اب بھی گودام کی چھت پر موجود تھے۔ گڑبڑ کی صورت میں یہی سب سے پہلے اڑ کر جوشوا کو مطلع کرنے جاتے۔ شاکا کو انہی سے سب سے پہلے نمٹنا تھا۔ وہ عقبی حصے سے چھت پر چڑھنے لگا۔

وہ عفریت ان ٹرکوں کو اندر جانے کا اشارہ کر رہے تھے۔ وہ چاروں ٹرک گودام کے اندر داخل ہو گئے۔ اسٹیو نے گودام کے وسط میں پہنچ کر ٹرک کو روک دیا۔ باقی ٹرک بھی رک گئے۔ یہ ایک بہت بڑا گودام تھا۔ جوشوا کی تیار کی گئی خونی بلائیں یہاں بڑی تعداد میں موجود تھیں۔ کچھ گودام کی چھتوں پر چپکی تھیں، کچھ نیچے ٹہل رہی تھیں۔ انہوں نے ٹرک کو گھیر لیا تھا۔ ان کا ارادہ ٹرک ڈرائیورز کا خاتمہ کر کے اپنی بھوک مٹانے کا تھا۔

اسٹیو نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے ہی گودام پر ایک تفصیلی نظر ڈالی۔ اگر شاکا کا لائحہ عمل غلط ثابت ہوتا تو ان سب کی موت یقینی تھی۔ اس نے آنکھیں بند کر کے ہارن پر ہاتھ رکھ دیا۔ ہارن کی آواز سنتے ہی ٹرک کے پچھلے حصے کے دروازے دھماکے سے کھلے۔ فوجیوں نے لہسن کی بوریوں کے منہ کھول کر ان پر ڈرائیر فل پاور سے آن کر دیا۔ ڈرائیر سے نکلنے والی گرم ہوا نے لمحوں میں اس پاؤڈر کو اڑانا شروع کیا۔ وہ پاؤڈر اڑ کر چاروں طرف پھیلنے لگا۔ گودام میں لہسن کی تیز بو پھیلنا شروع ہو گئی۔

ٹرک کے پچھلے حصے کی طرف کھڑی بلائیں چیختی ہوئی پیچھے ہٹنا شروع ہو گئیں۔ کچھ فوجی [illegible] بوریاں اور ڈرائیرز لیے ٹرک سے نیچے اتر آئے۔ بلاؤں کے پیچھے ہٹنے سے انہیں جگہ مل گئی تھی اور اب وہ ڈرائیرز کا رخ گودام کے اگلے حصے کی طرف کر کے انہیں آن کر چکے تھے۔ ان بلاؤں کو سنبھلنے کا موقع نہیں ملا تھا۔

شاکا بھی ہارن کی آواز سنتے ہی چھت پر موجود بلاؤں پر جھپٹ پڑا۔ اس نے ایک کو پروں سے پکڑ کر پٹخا

اور دوسرے عفریت کی آنکھیں پھوڑ دیں۔ وہ چنگھاڑتی ہوئی نیچے جا گری۔ گودام کے دروازے پر کھڑی بلائیں شاکا کی طرف متوجہ ہوگئیں۔ وہ دوسرے عفریت کی آنکھیں پھوڑنے کے بعد چھلانگ لگا کر نیچے اتر آیا۔ اس نے برق رفتاری سے گودام کا دروازہ بند کر دیا۔ اسٹیو کے ساتھی اپنا کام شروع کر چکے تھے۔ وہ ان بلاؤں کے لیے ہر راستہ بند کر دینا چاہتا تھا۔ اب اس کا مقابلہ باہر کھڑی ان پانچ بلاؤں سے تھا جن میں سے ایک اڑنے کے لیے پر تول رہی تھی۔ وہ سب سے پہلے اسی پر جھپٹا اور ٹانگ سے پکڑ کر اسے پٹخنے لگا۔ وہ چیختی ہوئی اس پر حملہ آور ہوئیں۔ جن کی آنکھیں پھوٹ چکی تھیں وہ اڑنے کی کوشش کرنے لگیں۔ شاکا ان سب کو برق رفتاری سے ٹانگوں سے کھینچ کر دوبارہ نیچے پٹخ دیتا تھا۔ بالآخر وہ ان سب کی آنکھیں پھوڑنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ وہ بار بار پٹخے جانے کی وجہ سے اٹھنے کی کوشش کرتیں مگر شاکا انہیں موقع ہی نہیں دے رہا تھا۔ اس نے گودام کا دروازہ لات مار کر کھولا۔ اندر سے لہسن کی تیز بو اور دھواں باہر نکلنا شروع ہوا۔ اندر چیخ و پکار جاری تھی۔ وہ باہر پڑے عفریتوں کو اٹھا کر اندر پھینکنے لگا اور آخر میں خود بھی اندر داخل ہو کر دروازے کو دوبارہ بند کر دیا۔

اچانک اسٹیو دوڑتا ہوا اس کی طرف آیا۔ اس کے منہ پر ماسک لگا تھا۔ یہ ماسک وہ اور اس کے ساتھی پہلے ہی لگا چکے تھے۔

''شاکا! یہ ماسک لگاؤ۔'' وہ شاکا کو ماسک پہنانے لگا۔ اس سے شاکا کی آنکھیں گیس سے محفوظ رہتیں۔

اسٹیو کے ساتھیوں نے لہسن کی بو کے پھیلتے ہی گیس شیل پھینکنا شروع کر دیے اور اب گودام کی صورت حال عجیب و غریب ہو چکی تھی۔ یہاں کسی جنگ کا سا ماحول تھا۔ جوشوا نے یقیناً بڑی تباہی کی تیاری کر رکھی تھی۔

وہ بلائیں ان پر حملہ کرنے کے لیے پر کھولنے کی کوشش کرتیں مگر ان کے پر کمزور پڑ چکے تھے۔ ان کی اڑنے کی طاقت ختم ہو رہی تھی۔

گیس شیل سے پہلے [illegible] نے ان کی آنکھوں میں عجیب سی جلن پیدا کی۔ بے شک وہ طاقتور تھیں مگر ان کے جسم کے یہ اعضا ان کی کمزوری بن گئے تھے۔ وہ دیکھنے کی طاقت بھی کھو رہی تھیں۔

''آگے بڑھو۔'' شاکا نے چلا کر کہا۔

ان سب نے اپنے لباس میں موجود خنجر باہر نکال لیے۔ وہ ان بلاؤں پر حملہ کر کے ان کے زخموں پر وار کرنے لگے۔ بلائیں جو اس افتاد سے سنبھلنے کی کوشش کر رہی تھیں، نظر نہ آنے کے باعث ایک دوسرے پر حملہ کرنے لگیں۔

''ان کی آنکھیں بھی ساتھ ہی ضائع کرو۔'' شاکا یہ کہہ کر ایک بلا پر جھپٹ پڑا۔ گودام سے اب چنگھاڑیں بلند ہو رہی تھیں۔

کچھ کمانڈوز ایروگن سے ان کا نشانہ لینے لگے۔ انہیں ہتھیار سنبھالنے کا موقع مل گیا تھا۔ ایروگن کا تیر سیدھا ان کی آنکھوں اور زخموں کو نشانہ بنانے لگا۔

شاکا نے انہیں احتیاط سے حملہ کرنے کا حکم دیا تھا۔ کمانڈوز اپنے سامنے آنے والی بلاؤں کا زخرہ ادھیڑتے جا رہے تھے۔ شاکا کی رفتار بہت تیز تھی۔ وہ انہیں سنبھلنے کا موقع ہی نہیں دینا چاہتا تھا۔ بالآخر آدھے گھنٹے کی اس اعصاب شکن جنگ کے بعد ان عفریتوں کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ اسٹیو کے ساتھی خوشی سے چلّانے لگے۔

گودام میں ہر جگہ ان بلاؤں کی لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔ چاروں طرف لہسن کی بو پھیلی تھی۔ دھواں آہستہ آہستہ ختم ہو رہا تھا۔ کچھ کمانڈوز ان لاشوں کی آنکھیں پھوڑ رہے تھے۔ شاکا نے گودام پر ایک تفصیلی نظر ڈالی۔

''ان کے مردہ جسموں پر لہسن کے پاؤڈر کا چھڑکاؤ کر دو تاکہ یہ ہمیشہ کے لیے راکھ بن جائیں۔'' شاکا چلّایا۔

اس کے حکم کی تعمیل کی گئی۔ اسٹیو دوڑ کر اس کے گلے لگ گیا۔

''تمہارا بہت شکریہ شاکا! ان کا خاتمہ تمہارے بغیر ناممکن تھا۔ تم واقعی حیرت انگیز ہو۔'' اسٹیو کے لہجے میں اس کے لیے احترام تھا۔

شاکا نے صرف مسکرانے پر ہی اکتفا کیا۔

''شاکا! تمہیں کیا لگتا ہے، جوشوا بھی ان میں موجود ہے؟'' اسٹیو نے وہاں بکھری لاشوں کی طرف اشارہ کیا جو اب راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہو رہی تھیں۔

''نہیں، وہ یہاں نہیں ہے۔ وہ یقیناً کہیں اور ہے۔ ہمیں راستے میں بھی بلائیں اڑتی نظر آئی تھیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ جوشوا کے ساتھ ہیں مگر اب ان کی تعداد کم ہوگئی ہے۔'' شاکا بولا۔

''مجھے لگتا ہے کہ وہ اب تک رشیا یونیورسٹی [illegible] کی بلڈنگ میں موجود ہے۔ یہ یقیناً وہیں پہرا دے رہی ہیں۔ میں چیف سے بات کر کے ان کی تعداد معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہوں اور انہیں یہ خوشخبری بھی سناتا ہوں۔'' وہ ٹرک میں لگے ٹرانسمیٹر کی طرف بڑھ گیا۔

pklibrary.com

شاکا ماسک اتار کر گودام سے باہر نکل آیا۔ اب جوشوا سے مقابلے کا وقت آچکا تھا۔ اس کے بعد اسے یہاں سے روانہ ہوجانا تھا۔ وہ فیصلہ کر چکا تھا کہ صوفیہ پر زبردستی نہیں کرے گا اور جوشوا کا خاتمہ کرتے ہی صوفیہ سے ملے بغیر یہاں سے چلا جائے گا۔ صوفیہ سے مل کر اسے یہاں چھوڑ دینا اس کے لیے ناممکن ہوجاتا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ سفر اس کا آخری سفر ثابت ہونے والا تھا۔

☆☆☆

Year 2020

Moscow Russia-News Office

Russia

جوشوا کی تمام شرائط مان لی گئی تھیں اور آرمی کے ٹرک اس کا مطلوبہ سامان لے کر گودام پہنچنے والے تھے مگر جیکال انہیں ابھی نہیں ملا تھا۔ حکومت نے جیکال کو ڈھونڈنے کے لیے مزید مہلت مانگی تھی لیکن اسے جیکال اور اس باکس کی شدید ضرورت تھی۔ وہ اس کے بغیر ویکسین تیار نہیں کرسکتا تھا۔

جوشوا نے خود ہی جیکال کو ڈھونڈنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے جیک کو صوفیہ سے رابطہ کرنے کے کام پر لگایا ہوا تھا۔ جوشوا کو یقین تھا کہ جہاں صوفیہ موجود تھی، وہیں پر جیکال بھی موجود تھا مگر جیک صوفیہ سے رابطہ کرنے میں مسلسل ناکام ہورہا تھا۔ اس کا فون لگتا ہی نہیں تھا۔ وہ اس بلا کو کیسے سمجھاتا کہ صوفیہ مرچکی تھی۔

جیک کا آدھا خون خشک ہوچکا تھا۔ وہ اس بلا سے جلد از جلد جان چھڑانا چاہتا تھا لہٰذا اس نے ہی جوشوا کو اینڈریو سے رابطہ کرنے کا مشورہ دیا مگر اینڈریو کا فون بھی چار دن سے بند جارہا تھا مگر آج اس کے موبائل پر جاتی بیل نے جیک کا سیروں خون بڑھا دیا تھا۔ جوشوا اس کے ساتھ ہی کھڑا تھا۔ اس نے بیل سن کر اسپیکر آن کردیا۔

''ہیلو۔'' فون پر اینڈریو کی آواز ابھری۔

''ہیلو..... ہیلو..... اینڈریو شکر ہے تم نے فون اٹھایا۔ کہاں غائب ہو تم؟'' جیک نے فوراً ہی مطلوبہ سوال کیا۔

''اوہ جیک! تم زندہ ہو۔'' اینڈریو کی آواز میں حیرانی تھی۔

''ہم..... ہم..... میں اپنے فلیٹ میں چھپا بیٹھا ہوں۔ تم کہاں ہو۔'' جیک نے جھوٹ بولا۔

''مت پوچھو کہاں تھا۔ فی الحال ہم سب ڈاکٹر بورس کی لیب میں محفوظ ہیں۔'' اینڈریو بولا۔

''ڈاکٹر بورس کون ہے اور یہ لیب کہاں ہے؟'' جیک حیرانی سے بولا۔

''اوہ، یہ خفیہ لیب ان کے فلیٹ میں ہی موجود ہے۔ باکس ٹاور بلڈنگ میں۔'' اینڈریو بولا۔

''اوہ، اچھا۔ میں بس تمہاری خیریت معلوم کرنا چاہتا تھا۔'' جیک نے رسمی جملے کہہ کر فون رکھ دیا۔

جیک کا کام ختم ہوچکا تھا۔ جوشوا اس کا خاتمہ کرکے چینل کی بلڈنگ سے باہر نکل آیا۔ اس نے جیکال سے نمٹنے کے بعد گودام جانے کا ارادہ کیا۔ اب وہ اور اس کی آرمی باکس ٹاور کی طرف بڑھ رہے تھے۔

☆☆☆

اینڈریو نے اپنا موبائل چارج کرکے اسے آن کیا تو اس پر جیک کے کئی میسجز موصول ہوئے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ اسے کال کرتا، جیک کی کال آگئی۔ وہ جیک سے بات کرکے پلٹا تو جیکال اس کے پیچھے کھڑا تھا۔

''کس سے بات کررہے تھے تم؟'' جیکال کو اینڈریو کا کال کے دوران باکس ٹاور کا نام لینا کھٹکا تھا۔ وہ سب جو خبریں دیکھنے میں مصروف تھے، ان دونوں کی طرف متوجہ ہوگئے۔

''میرے باس جیک کی کال تھی۔'' اینڈریو مسکرایا۔

صوفیہ تیزی سے اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔

''کیا کہہ رہا تھا وہ؟'' جیکال کو اپنے خدشے سچ ثابت ہوتے محسوس ہوئے۔

''وہ میری خیریت معلوم کرنا چاہتا تھا۔'' اینڈریو کو اس کے سوالات پر حیرانی ہوئی۔

''تم نے اسے بلڈنگ کا نام کیوں بتایا۔'' جیکال تیز لہجے میں بولا۔

''اوہ، اینڈریو! یہ کیا، کیا تم نے؟'' صوفیہ پریشانی سے بولی۔

''کیا ہوگیا آخر ایسا؟ اس نے پوچھا تو میں نے بتادیا۔ وہ اپنے فلیٹ میں چھپا بیٹھا ہے۔'' اینڈریو نے کندھے اچکائے۔

''وہ اپنے فلیٹ پر نہیں، جوشوا کے ساتھ ہے۔ کیا تم بھول گئے کہ تمہارے چینل پر جوشوا کا قبضہ ہے۔ یہ یقیناً اسی کی چال ہوگی۔'' جیکال کے چہرے کا رنگ سفید پڑگیا۔

''اس کا مطلب ہے کہ وہ یہاں آرہا ہے۔ ہمیں فوراً شاکا سے رابطہ قائم کرنا ہوگا۔'' بورس تیزی سے ٹرانسمیٹر کی طرف بڑھا۔ اسے جلد از جلد اسٹیو کو مطلع کرنا تھا۔

اینڈریو نے دوبارہ جیک کا نمبر ڈائل کیا۔ وہ ان سب

کا شک دور کرنا چاہتا تھا مگر دوسری طرف سے کال ریسیو نہیں کی گئی۔ وہ پریشانی سے ہونٹ چبانے لگا۔

بورس نے اسٹیو سے رابطہ کرنا شروع کر دیا۔ وہ سب بے چینی سے لیب میں ٹہلنے لگے۔ ایڈرک نے سی سی ٹی وی اسکرین آن کر دی۔ اس بلڈنگ میں ان کے علاوہ اور بھی لوگ اپنے گھروں میں چھپے بیٹھے تھے۔ فلیٹ کے دروازے کے سامنے فی الحال سکون تھا مگر جوشوا کسی بھی وقت وہاں پہنچ سکتا تھا۔ ان سب کے چہروں پر خوف کے آثار تھے۔

''ہیلو اسٹیو ہیئر! اوور۔'' اچانک ٹرانسمیٹر سے اسٹیو کی آواز ابھری۔

''اسٹیو، جوشوا کو ہماری لوکیشن پتا چل چکی ہے۔ وہ یہاں آرہا ہے، اوور۔'' بورس نے جلدی سے اپنی بات مکمل کی۔

''اوہ، نہیں۔ تم لوگ لیب میں رہو۔ ہم فوراً پہنچتے ہیں۔ اوور۔'' اسٹیو کی آواز سنائی دی۔

بورس نے ٹرانسمیٹر بند کر دیا۔

''بب..... بورس!'' ایڈرک نے اسے مخاطب کر کے سی سی ٹی وی اسکرین کی طرف اشارہ کیا۔

جوشوا اپنی بلاؤں کے ساتھ بلڈنگ میں داخل ہو چکا تھا اور اب وہ فلیٹس کے دروازے توڑ کر انہیں ڈھونڈنے کی کوشش کر رہے تھے۔ فلیٹس میں چھپے لوگوں نے انہیں دیکھتے ہی چیخ و پکار شروع کر دی تھی۔

جوشوا اچانک بورس کے فلیٹ کی طرف بڑھا اور فلیٹ کا دروازہ ایک دھماکے سے ٹوٹ کر دور جا گرا۔

''جوشوا!'' جیکال اسے پہچان گیا۔ اس کی زبان خوف سے گنگ ہو چکی تھی۔ وہ اس کی خوفناک غراہٹ واضح طور پر سن سکتے تھے۔ ان سب کے چہرے خوف سے سفید پڑ چکے تھے۔

وہ اس کے فلیٹ میں گھس کر انہیں ڈھونڈنے کی کوشش کر رہے تھے۔ جیکال جانتا تھا کہ اس کا آخری وقت آپہنچا ہے۔

☆☆☆

اسٹیو نے چیف کو گودام کی تباہی کی خوشخبری دی اور اب وہ ان ٹرکس میں سوار ہو کر شاکا کے ساتھ رشیا نیوز چینل کی طرف بڑھ رہے تھے۔ چیف ہیلی کاپٹر فورس کے ساتھ اسی طرف روانہ ہو چکا تھا۔ ان کا ارادہ اس بار کلورو فام اسپرے کے بجائے اسٹیو کے طریقے پر عمل کرتے ہوئے لہسن کا پاؤڈر اور گیس شیلز گرانے کا تھا۔

وہ ٹرکس کو چینل کی بلڈنگ سے کچھ فاصلے پر روک کر ہیلی کاپٹرز کے پہنچنے کا انتظار کرنے لگے۔ راستے میں کہیں بھی ان کا سامنا جوشوا یا اس کی آرمی سے نہیں ہوا تھا ورنہ ان بلاؤں کی نظروں میں آئے بغیر شہر کے درمیان میں پہنچنا ناممکن تھا۔ چینل کی بلڈنگ بھی خالی لگ رہی تھی۔ ان حالات سے صاف ظاہر تھا کہ جوشوا کی آرمی کی بڑی تعداد گودام میں ہی جہنم واصل ہو چکی تھی اور اب وہ بہت کم تعداد میں رہ گئے تھے۔

اسٹیو ٹرک کے بونٹ کے ساتھ کھڑا دوربین سے چینل کی بلڈنگ کا جائزہ لے رہا تھا۔ شاکا اس کے ساتھ ہی موجود تھا۔ اسے اچانک ٹرانسمیٹر کی بیپ سنائی دی تھی۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ بورس نے اسے جوشوا کو لیب کی طرف روانہ ہونے کی خبر سنائی تھی۔

''کیا ہوا؟'' شاکا، اسٹیو کو پریشان دیکھ کر اس کے پاس ہی چلا آیا۔

''جوشوا، بورس کے فلیٹ پر پہنچنے والا ہے۔'' اسٹیو پریشانی سے بولا۔

شاکا کو اچانک صوفیہ کا خیال آیا۔ اگر وہ صوفیہ کو کوئی نقصان پہنچا دیتا تو شاکا اسے ادھیڑ کر رکھ دیتا۔

''فوراً وہاں چلو۔'' وہ سرد لہجے میں بولا۔

''ہمیں یہاں سے بورس کے فلیٹ تک پہنچنے میں دس سے پندرہ منٹ لگیں گے۔'' اسٹیو پریشانی سے بولا۔

''میں وہاں تم سے پہلے پہنچ سکتا ہوں۔ میں جا رہا ہوں۔ تم لوگ میرے پیچھے آجاؤ۔'' شاکا یہ کہہ کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔ وہ آج اتنا تیز دوڑا تھا کہ ہوا بھی اس سے مقابلہ نہیں کر سکی تھی۔

چند ہی منٹوں میں اسے بورس کے فلیٹ کی بلڈنگ نظر آنا شروع ہو گئی۔ اس کے لیے جگہیں یاد رکھنا کبھی مشکل نہیں رہا تھا۔ وہ خوشبوؤں سے بھی جگہیں تلاش کر لیتا تھا۔

جوشوا کی بلائیں اس بلڈنگ کے اردگرد منڈلا رہی تھیں۔ اسے ہر حالت میں بلڈنگ کے اندر داخل ہونا تھا۔ ان سب سے اسٹیو اور اس کے ساتھی بہ آسانی نمٹ سکتے تھے۔ دور سے ہیلی کاپٹرز کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ یقیناً اسٹیو نے ہیلی کاپٹرز کو اس بلڈنگ کی طرف روانہ کر دیا تھا۔ وہ بلڈنگ کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اسے بلڈنگ کی طرف دوڑتا دیکھ کر ان بلاؤں نے اس پر حملہ کر دیا۔ وہ ان کو پروں سے پکڑ کر پٹختے ہوئے بلڈنگ کے اندر داخل ہو گیا۔ اسے جلد از جلد بورس کے فلیٹ تک پہنچنا تھا۔ وہ ان کے ساتھ الجھ کر وقت ضائع

نہیں کرنا چاہتا تھا۔

☆☆☆

جوشوا نے دروازہ توڑنے کے بعد اس فلیٹ کا جائزہ لیا۔ وہاں کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ وہ باہر نکلنے ہی لگا تھا کہ اس کی نظر لاؤنج کی دیوار پر لگے پینل پر پڑی۔

''یہ خفیہ لیب ان کے فلیٹ میں ہی موجود ہے۔ باکس ناور بلڈنگ میں۔'' اس کے کانوں میں اینڈریو کا جملہ گونجا۔ اس نے آگے بڑھ کر اس پینل کا بٹن دبا دیا۔ دیوار بیچ سے شق ہو چکی تھی۔ اس کے دشمن اس کے سامنے موجود تھے۔ ان سب کے چہرے فق ہو چکے تھے۔ وہ غراتا ہوا جیکال کی طرف بڑھا اور اسے گردن سے پکڑ کر اٹھا لیا۔

''بہت بھاگ لیا تم نے مجھ سے۔ اب تم نہیں بچ سکتے۔'' اس نے غراتے ہوئے جیکال کو لیب کی دیوار پر دے مارا۔

''کہاں ہے وہ باکس؟'' وہ شمشیر کی طرف بڑھا اور اسے بھی اٹھا کر پٹخ دیا۔

''باکس یہاں نہیں ہے جوشوا!'' ہیری اسے اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر چلانے لگا۔ جوشوا کو اس کی بات سن کر شدید غصہ آیا۔ وہ بورس کی طرف بڑھا اور اسے گردن سے پکڑ کر اوپر اٹھا لیا۔

''بتاؤ کہاں ہے وہ باکس ورنہ تمہاری موت بہت بھیانک ہوگی۔'' اس کی آواز میں عجیب سی غراہٹ تھی۔ صوفیہ خوف سے چیخنے لگی۔ اینڈریو اور ایڈرک بھی خوف سے کانپ رہے تھے۔

''شش..... شش..... شاکا کے پاس ہے لوئس!'' بورس گھٹی ہوئی آواز میں بولا۔

جوشوا نے اسے نیچے پٹخ دیا۔

''کیا کہا تم نے؟'' وہ غراتا ہوا اس پر جھکا۔

''میں نے کہا کہ وہ شاکا کے پاس ہے لوئس!'' بورس اپنی گردن مسلتے ہوئے اطمینان سے بولا۔

''کون ہو تم؟'' جوشوا نے اپنے نکیلے ناخن اس کی گردن میں گاڑ دیے۔

''تم ڈاکٹر ریزو کو کیسے بھول سکتے ہو؟'' بورس سرد لہجے میں بولا۔

جوشوا نے اپنے ناخن اس کی گردن میں گاڑ دیے۔ بورس کی گردن سے خون بہنے لگا۔ جوشوا کے لمبے ناخن کسی خنجر کی طرح اس کی گردن میں پیوست ہو گئے تھے۔

''چھوڑ دو اسے۔'' ایڈرک نے جوشوا کی پشت پر کرسی سے وار کیا مگر وہ بھی اڑتا ہوا دور جا گرا۔

بورس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔

اچانک جوشوا ایک دھماکے سے جا کر لیب کی دیوار سے ٹکرایا۔ دیوار ٹوٹ گئی۔ وہ خود کو سنبھالتے ہوئے اٹھا اور حیرت سے بورس کی طرف دیکھا۔

بورس زمین پر پڑا تھا اور اس کے ساتھ ایک شخص کھڑا تھا۔ اس کا حلیہ عجیب سا تھا۔ اس کی آنکھیں شعلے اگل رہی تھیں۔

اچانک جوشوا کے ذہن میں جھماکا ہوا۔ وہ ڈائری جسے وہ اتنے سالوں سے سنبھالتا آرہا تھا، اس ڈائری میں بنا شاکا کا وہ ادھورا خاکہ آج مکمل ہو گیا تھا۔

''یہ ناممکن ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' وہ غراتا ہوا شاکا کی طرف بڑھا۔

شاکا کا ہاتھ گھوما اور اگلے وار کے ساتھ ہی وہ دیوار توڑتا ہوا فلیٹ سے باہر نکل آیا۔ اس نے اپنے پر کھول لیے تھے۔ وہ غصے سے چنگھاڑا۔

اسٹیو بلڈنگ کے نیچے پہنچ چکا تھا۔ ہیلی کاپٹرز نے ہر طرف لبسن کا پاؤڈر گرانا شروع کر دیا تھا، ساتھ ہی گیس شیلز بھی پھینکے جا رہے تھے۔ جوشوا کی آرمی کی اڑنے کی طاقت ختم ہو رہی تھی۔ وہ بری طرح پھڑپھڑانے لگے۔ جوشوا کو یہ سب دیکھ کر شدید طیش آیا۔ وہ چیختا ہوا دوبارہ شاکا پر جھپٹا اور اس بار اسے پنجوں سے گھسیٹتا ہوا باہر نکال لایا۔

وہ اپنے پنجوں میں شاکا کو دبوچے اوپر اڑنے لگا۔ شاکا خود کو چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔ گیس شیلنگ سے جوشوا کی آنکھوں پر بھی دھندلاپن طاری ہونے لگا۔ اس نے بلندی ہو کر شاکا کو اپنے پنجوں سے آزاد کر دیا۔ وہ بلندی سے نیچے آگرا اور اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ جوشوا کے لیے اڑنا مشکل ہو رہا تھا۔ لبسن کی بو اس کے اعصاب شل کر رہی تھی۔ جوشوا نیچے اترا اور شاکا پر جھپٹ پڑا۔ وہ اپنے نکیلے دانت شاکا کی گردن میں گاڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ شاکا نے اس کے پیٹ میں ایک لات رسید کی۔ وہ دور گرتے ہی دوبارہ اڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کی بلائیں اڑنے کی طاقت کھو کر نیچے گر رہی تھیں۔ گیس شیلنگ نے ان کی آنکھوں میں شدید جلن پیدا کر دی تھی۔

اس جنگلی نے اس کی برسوں کی محنت کو تہس نہس کر دیا تھا۔ وہ دوبارہ شاکا پر جھپٹا اور اسے پنجوں سے پکڑ کر اوپر اڑنے لگا۔ شاکا نے اس کے پنجوں کو مروڑنے کی کوشش کی مگر وہ ناکام رہا۔

جوشوا نے بلندی پر پہنچ کر شاکا کو اپنے پنجوں سے

آزاد کر دیا۔ اس بار نیچے گرتے ہوئے اس کا سر فلیٹ کے داخلی دروازے پر لگے شیشے کے شیڈ سے ٹکرایا۔ اس کے سر سے خون بہنے لگا۔

وہ سب جو اس ٹوٹی ہوئی دیوار سے یہ دہشت ناک منظر دیکھ رہے تھے، شاکا کے نیچے گرتے ہی اس کی موت کا یقین کر بیٹھے تھے۔ کوئی بھی اتنی بلندی سے گرنے کے بعد زندہ نہیں بچ سکتا تھا۔

''شاکا..... شاکا!'' صوفیہ چیختی ہوئی سیڑھیوں کی طرف بڑھی۔ اینڈریو نے اسے تھام لیا۔ اس وقت نیچے جانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ وہ آرام سے جوشوا کا شکار بن سکتی تھی۔

جوشوا دوبارہ شاکا کی طرف بڑھا اور اسے اٹھا کر پٹخنے لگا۔ اسٹیو نے جوشوا پر فائر کھول دیے۔ جوشوا پر ان گولیوں کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ اسٹیو کو ٹھکانے لگانے کے لیے اس کی طرف بڑھنے لگا۔

شاکا لڑکھڑاتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے دوڑتے ہوئے جوشوا پر چھلانگ لگا دی۔ جوشوا نے اسے ایک جھٹکے سے دور گرا دیا۔ شاکا شاید یہ بھول چکا تھا کہ جوشوا نے خود کو طاقتور بنانے کے لیے اس کے خون کا بھی استعمال کیا ہے۔ وہ دوبارہ اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کے سر سے خون مزید تیزی سے بہنے لگا۔

جوشوا، اسٹیو کو چھوڑ کر دوبارہ شاکا کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس جنگلی کی موت زیادہ ضروری تھی۔ اس ڈائری کے پنوں سے نکلا یہ بہروپیا آج اس کے ہاتھوں ہمیشہ کے لیے ختم ہونے والا تھا۔

''شاکا..... شاکا!'' اسٹیو چلایا۔

شاکا نے اچانک ہی اپنی آنکھیں کھولیں۔ وہ تیزی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

جوشوا اسے کھڑا ہوتے دیکھ کر چلاتا ہوا اس پر لپکا مگر اس بار شاکا نے اسے ایک لات رسید کی۔ جوشوا اڑتا ہوا ایک دھماکے سے سڑک پر جا گرا۔ اس کے گرنے سے سڑک جگہ جگہ سے ٹوٹ گئی۔ شاکا دوڑتا ہوا اس کے اوپر سوار ہو گیا۔ وہ اس کی گردن توڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ جوشوا نے ایک بار پھر اسے اپنے اوپر سے اچھال دیا۔ وہ پرواز بھرنے کی تیاری کرنے لگا۔

شاکا نے دوڑ کر اس کے پنجوں کو پکڑا اور اسے نیچے کی طرف کھینچ کر سڑک پر پٹخ دیا۔ جوشوا دوبارہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اب وہ ایک بار پھر آمنے سامنے تھے۔

''تم نے سب کچھ ختم کر دیا ہے لیکن میں تمہیں ختم کیے بغیر مرنے والا نہیں ہوں۔'' جوشوا یہ کہہ کر غراتا ہوا شاکا پر حملہ آور ہوا۔ اس نے شاکا کی گردن کو دبوچا اور اسے نیچے کھینچ کر گھسیٹتا ہوا پیچھے کی طرف لے جانے لگا۔ شاکا کے سر سے بہتا خون اس کی آنکھوں میں داخل ہونے لگا۔ اس کی آنکھیں دھندلی ہونے لگیں۔

جوشوا نے اسے اٹھا کر دیوار سے لگایا اور اپنے دانت اس کی گردن میں گاڑنے کی کوشش کرنے لگا۔

یہی وہ لمحہ تھا جس کا شاکا نے فائدہ اٹھایا اور اپنا دایاں ہاتھ جوشوا کی آنکھ میں گھسا دیا۔ جوشوا درد سے چلاتا ہوا پیچھے ہٹا۔ اس کی دونوں آنکھیں ضائع ہو چکی تھیں۔

شاکا چیختا ہوا جوشوا کی طرف بڑھا۔ جوشوا نے آواز کے ذریعے اس کی سمت کا اندازہ لگانے کی کوشش کی مگر وہ اس کی گردن پر سوار ہو چکا تھا۔ جوشوا نے اپنے دونوں ہاتھ پشت پر لے جا کر اسے پکڑ کر اپنے سامنے پٹخ دیا۔

آنکھیں ضائع ہونے کے بعد بھی وہ اتنا ہی طاقتور تھا۔

شاکا نے نیچے گرتے ہی اس کی ٹانگوں کو پکڑ کر اسے پیٹ کے بل نیچے گرا دیا۔ اس کے نیچے گرتے ہی شاکا نے اپنے بازو اس کی گردن میں حائل کر کے زور لگانا شروع کیا۔ وہ جوشوا کی گردن توڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جوشوا نے اپنے لمبے دانت شاکا کے بازو میں گاڑ دیے۔ شاکا درد سے چلانا شروع ہوا مگر وہ یہ موقع ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اچانک ہی اس نے اپنے دانت جوشوا کی گردن میں گاڑ دیے۔ جوشوا بھیانک انداز میں چیخنے لگا۔ شاکا اس کا نرخرہ ادھیڑ رہا تھا۔ جوشوا کا جسم ڈھیلا پڑ رہا تھا۔ اچانک شاکا ہوا میں اچھلا۔ وہ اس کا نرخرہ ادھیڑ چکا تھا۔ جوشوا کی گردن سے خون کا فوارہ بلند ہوا۔ شاکا لڑکھڑاتا ہوا پیچھے ہٹنے لگا۔ جوشوا بری طرح چنگھاڑ رہا تھا۔ اس کی آرمی بھی ختم ہو رہی تھی۔ شاکا کے سر سے بہتا خون اس کی آنکھوں میں داخل ہو رہا تھا۔ اس نے دھندلائی ہوئی آنکھوں سے اسٹیو کو اپنی طرف دوڑتے دیکھا اور پھر سر اٹھا کر بورس کے فلیٹ کی طرف دیکھا۔ وہ سب اس ٹوٹی ہوئی دیوار سے اس خونی جنگ کا اختتام دیکھ رہے تھے۔ ان کے چہروں پر خوف، حیرت اور بے یقینی نے ڈیرا ڈالا ہوا تھا۔ شاکا نے بند ہوتی آنکھوں سے صوفیہ پر ایک آخری نظر ڈالی۔ وہ شاید رو رہی تھی، چلا رہی تھی یا اس کا نام پکار رہی تھی۔

آوازیں گڈمڈ ہونے لگی تھیں۔ اچانک اس کا دماغ

اندھیروں میں ڈوب گیا۔ وہ چکرا کر زمین پر گر پڑا۔

☆☆☆

Year 2020

Health Care Hospital-Moscow Russia

اسپتال کے باہر نیوز رپورٹرز کا رش لگا ہوا تھا۔

ان بلاؤں کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ شاکا کو بے ہوشی کی حالت میں اسپتال لایا گیا تھا۔ وہ سب بھی اس وقت آئی سی یو کے باہر بیٹھے شاکا کے ہوش میں آنے کا انتظار کر رہے تھے۔

بورس اور جیکال کی بھی مرہم پٹی کر دی گئی تھی۔ آرمی اور پولیس بڑی تعداد میں شہر میں داخل ہو چکی تھی۔ شہر میں ہونے والے نقصان کا تخمینہ لگایا جا رہا تھا۔ حکومتی ادارے بھی شہر میں مختلف جگہوں پر امدادی کارروائیاں کرنے میں مصروف ہو چکے تھے۔ ان بلاؤں کا خطرہ ٹل چکا تھا۔ ماسکو شہر کی رونقیں دوبارہ لوٹ رہی تھیں۔

آرمی چیف اور حکومتی ادارے اسٹیو کی بہادری کے گن گا رہے تھے مگر وہ جانتا تھا کہ اس تعریف کا اصل حقدار کون ہے۔ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی شاکا کسی کی نظروں کے سامنے آئے بغیر دنیا کو اس عذاب سے نجات دلا چکا تھا۔ اس نے شاکا کو جوشوا سے لڑتے دیکھا تھا۔ اگر شاکا نہ ہوتا تو جوشوا کو شکست دینا ناممکن تھا۔ وہ ان سب کو لمحوں میں چیونٹیوں کی طرح مسل دیتا۔ نہ صرف وہ بلکہ اس کی تیار کی گئی وہ خونی بلائیں بھی ان کے بس سے باہر تھیں۔ شاکا کا بنایا گیا لائحہ عمل ہی ان کو اس مصیبت سے چھٹکارا دلا سکا تھا ورنہ تو وہ ہر ترکیب آزما کر دیکھ چکے تھے۔

وہ آئی سی یو کے بیڈ پر آنکھیں موندے لیٹا تھا۔ صوفیہ نے آئی سی یو کے دروازے میں نصب شیشے کی کھڑکی سے اندر جھانکا۔ وہ اب تک بے ہوش تھا۔ اسے گہری چوٹیں آئی تھیں۔ صوفیہ کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔

''صوفیہ! کیا تم ٹھیک ہو؟'' اینڈریو نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ صوفیہ نے آنسو پونچھ کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

ہیری جو کافی دیر سے اسے آئی سی یو کے باہر اسی حالت میں کھڑا دیکھ رہا تھا، اٹھ کر اس کے پاس چلا آیا۔

''چلو میرے فلیٹ پر چلتے ہیں۔ جب شاکا کو ہوش آئے گا، ہم اس سے ملنے آجائیں گے۔'' وہ بولا۔

صوفیہ نے اسے دیکھا اور اپنی انگلی سے انگوٹھی اتار کر اس کے ہاتھ میں تھما دی۔ وہ حیرت سے انگوٹھی کو دیکھنے لگا۔

''صوفیہ! اس بات کا کیا مطلب ہے؟'' اسے صوفیہ کی اس حرکت پر شاک لگا۔

''اس بات کا مطلب یہ ہے کہ میں تم سے شادی نہیں کر سکتی۔'' وہ دوٹوک لہجے میں بولی۔

''شادی نہیں کر سکتی مطلب؟ تو پھر کس سے شادی کرو گی تم؟'' ہیری تیز لہجے میں بولا۔

صوفیہ نے اس کی بات کا جواب دیے بغیر منہ پھیر لیا۔

''اوہ، تو تم اس جنگلی کے ساتھ اپنی زندگی گزارنے والی ہو۔'' وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔

''ہیری! تم یہاں سے جا سکتے ہو اور اسے جنگلی کہنا بند کرو۔'' صوفیہ کو ہیری پر شدید غصہ آیا۔

ہیری اسے گھورتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

جیکال جو کافی دیر سے ان دونوں کی گفتگو سن رہا تھا، صوفیہ کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔

''یہ ایک بہت بڑا اور مشکل فیصلہ ہے صوفیہ! مجھے امید ہے تم نے جلد بازی نہیں کی ہو گی۔'' وہ اسے تسلی دینے لگا۔

راہداری میں اسٹیو داخل ہوا تھا۔ اس کے ساتھ آرمی چیف بھی موجود تھا۔

''سر! ابھی شاکا کو ہوش نہیں آیا ہے۔'' وہ آئی سی یو کے دروازے سے اندر جھانکتے ہوئے بولا۔

''ڈاکٹر بورس! ہم آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھولیں گے۔'' آرمی چیف، بورس کو وہاں بیٹھا دیکھ کر اس کی طرف چلا آیا۔

''جیسے ہی مسٹر شاکا کو ہوش آتا ہے، ہم ایک پریس کانفرنس کرنا چاہ رہے ہیں۔ آپ بھی ہمارے ساتھ اس پریس کانفرنس میں شامل ہوں گے۔'' بورس نے چیف کی بات سن کر اسٹیو کی طرف دیکھا۔

''مجھے نہیں لگتا کہ شاکا کیمروں کے سامنے آنا چاہے گا۔'' بورس ہچکچایا۔

''پہلے مسٹر شاکا کو ہوش میں تو آنے دیں پھر انہیں راضی کر لیں گے۔'' آرمی چیف یہ کہہ کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔

''آپ لوگ میرے ساتھ چلیں۔ پریس کو ایک بریفنگ دینا بہت ضروری ہے۔ مجھے امید ہے شاکا کو جلد ہی ہوش آجائے گا۔ تب تک آپ لوگ میرے ساتھ پریس کے سوالات کے جوابات دیں۔'' اسٹیو نے ان سب کو مخاطب کیا۔ وہ سب اس کے ساتھ اسپتال کے سیمینار روم کی

طرف بڑھ گئے۔

☆☆☆

شاکا کی آنکھیں کھلیں۔ وہ کسی ٹھنڈے کمرے میں موجود تھا۔ اس کے جسم پر عجیب سی تاریں لگی ہوئی تھیں۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے جسم سے ان تاروں کو کھینچ کر اتارا اور اس سخت گدے سے اتر کر کھڑا ہوگیا۔ کمرا بالکل خالی تھا۔ کمرے کے دروازے پر شیشے کا ایک دائرہ بنا ہوا تھا۔ اس نے دائرے سے باہر جھانکا۔ راہداری خالی پڑی تھی۔ شاید وہ چوٹ لگنے کی وجہ سے بے ہوش ہوگیا تھا لیکن اب وہ بہتر محسوس کر رہا تھا۔ اسے کمرے میں کھڑکی نظر آئی۔ وہ کھڑکی کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے کھڑکی کا پردہ ہٹایا۔ آسمان سورج کے طلوع ہونے کی نوید دے رہا تھا۔ اسے پرندوں کی آواز سے اندازہ ہوا کہ سورج نکلنے ہی والا ہے۔ اس نے مڑ کر دروازے پر نظر ڈالی اور اپنے زخموں کا جائزہ لینے لگا۔ اس کے زخم اس کی دنیا میں زیادہ جلدی بہتر ہو سکتے تھے۔

اچانک اسے آسمان پر سورج کی پہلی کرن نظر آنا شروع ہوئی۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ اس کے تصور میں صوفیہ کا چہرہ ابھر آیا۔ شاکا کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ اس لمحے کو ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے قدم آگے کی طرف بڑھا دیے تھے۔

☆☆☆

وہ لوگ پریس کانفرنس کرکے واپس لوٹے اور آئی سی یو کے باہر بنی کرسیوں پر ڈھے گئے۔ ان کو شدید تھکن محسوس ہو رہی تھی۔ انہیں آرام کی اشد ضرورت تھی۔ صوفیہ نے آئی سی یو کے اندر جھانکا مگر دوسرے ہی لمحے وہ بری طرح بوکھلا کر آئی سی یو کے اندر داخل ہوگئی۔

وہ سب اس کی بوکھلاہٹ دیکھ کر اس کے پیچھے ہی آئی سی یو میں آگئے۔ شاکا کمرے میں موجود نہیں تھا۔ صوفیہ نے سارے اسپتال کو اکٹھا کرلیا تھا مگر کسی نے بھی اسے جاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ آئی سی یو میں موجود سی سی ٹی وی کی ریکارڈنگ چیک کی گئی مگر اس میں بھی وہ صرف کمرے میں ٹہلتا نظر آیا تھا۔ اس کے بعد وہ کہاں گیا یہ کسی کو معلوم نہیں تھا۔

''شاکا جاچکا ہے۔ وہ عفریتوں کے خاتمے کے بعد اپنی دنیا کے علاوہ کہیں رکنا پسند نہیں کرتا۔ وہ سورج کی پہلی کرن دیکھتے ہی یہاں سے روانہ ہوگیا ہے۔'' بورس جو کافی دیر سے یہ بھاگ دوڑ دیکھ رہا تھا، صوفیہ کو مخاطب کرکے بولا۔

تو صوفیہ وہیں بیٹھ کر رونے لگی۔ وہ سب افسوس اور اداسی سے اسے تکنے لگے۔

اسٹیو نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ آسمان پر سورج اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ ان کا محسن شاکا، اپنی دنیا میں واپس جاچکا تھا۔ شاید اب وہ اسے دوبارہ کبھی نہیں دیکھ پاتے۔

☆☆☆

شاکا کو وہاں سے گئے دو ہفتے ہوچکے تھے۔ صوفیہ نے آفس دوبارہ جوائن کرلیا تھا مگر کچھ بھی پہلے جیسا نہیں رہا تھا۔ نہ ہی اس نوکری میں وہ بات رہی تھی اور نہ ہی اس کی چیتل کھولنے کی خواہش باقی رہی تھی۔ ہیری نے اس سے کئی دفعہ رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر صوفیہ نے اس کی کال ریسیو کرنا بند کردی تھی۔ وہ اینڈریو کے ساتھ زیادہ وقت گزار رہی تھی۔ ایک وہی تھا جو اس کی کیفیت کو سمجھ سکتا تھا۔ اینڈریو اس کی حالت دیکھ کر پریشان تھا اور اسی نے صوفیہ کو اس کے والد کے پاس کچھ دن گزارنے کا مشورہ دیا تھا۔ اسے چھٹیاں مل گئی تھیں اور وہ دو دن اپنے والد کے پاس بھی گزار آئی تھی مگر اسے وہاں بھی چین نہیں ملا تھا۔ اس وقت بھی وہ اینڈریو کے فلیٹ میں اس کے سامنے بیٹھی رو رہی تھی۔

''صوفیہ! ایسے تو تم خود کو ختم کرلوگی۔'' اینڈریو پچھلے ایک گھنٹے سے مسلسل اس کی دلجوئی کر رہا تھا مگر اب وہ بھی تھک چکا تھا۔

''بتاؤ میں کیا کروں؟ میں نے ہر ممکن کوشش کرکے دیکھ لی۔ وہ میرے دل و دماغ سے نہیں نکلتا۔'' صوفیہ نے اپنا سر پکڑ لیا۔

''تم شاکا کے پاس چلی جاؤ۔'' اینڈریو سنجیدہ لہجے میں بولا۔ وہ شاید اس کے منہ سے یہی سننا چاہ رہی تھی پھر بھی حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

اینڈریو کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

☆☆☆

رات کے تین بج رہے تھے۔ کوئی بورس کے فلیٹ کی بیل بجا رہا تھا۔ وہ آنکھیں ملتا ہوا اٹھا اور گھڑی پر نظر ڈالی۔

''اتنی رات کو کون ہوسکتا ہے۔'' بورس حیران ہوا۔

اس نے دروازے پر پہنچ کر کی ہول سے باہر جھانکا۔ دروازے کے باہر صوفیہ اور اینڈریو موجود تھے۔

بورس نے جلدی سے دروازہ کھول دیا۔

''خیریت ہے؟ اتنی رات گئے تم دونوں کا کیسے آنا ہوا؟'' وہ پریشانی سے بولا۔

''خیریت نہیں ہے۔ صوفیہ بہت پریشان ہے اور اس کی پریشانی کا حل صرف تمہارے پاس ہے۔'' اینڈریو سنجیدگی سے بولا۔

بورس انہیں اندر لے آیا۔ صوفیہ کی خواہش سن کر اس نے بے یقینی سے ان دونوں کی طرف دیکھا۔

''کیا تم نے یہ فیصلہ سوچ سمجھ کر کیا ہے؟ تم جانتی ہو نا کہ وہاں جانے کے بعد تم کبھی واپس نہیں لوٹ سکو گی۔'' بورس بولا۔

''میں وہاں سے واپس نہیں آنا چاہتی۔'' وہ اٹل لہجے میں بولی۔

''ایک بار پھر سوچ لو۔'' وہ سنجیدہ تھا۔

''میں سوچ چکی ہوں۔ مجھے مزید انتظار نہیں کرنا۔ مجھے شاکا کے پاس بھجوا دو۔'' وہ رونے لگی۔

بورس نے اینڈریو کی طرف دیکھا۔ اس نے بھی کندھے اچکا دیے۔

کیا تھا آخر شاکا؟ وہ جانتا تھا کہ صوفیہ ضرور لوٹے گی۔ اس لیے وہ اس پر زبردستی کیے بغیر اسے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ اس نے صوفیہ کی خوشی کے لیے اپنی بقا کو بھی داؤ پر لگا دیا تھا۔ وہ بغیر کسی صلے کے ان سب کو اس عذاب سے نجات دلا کر اپنی دنیا کی طرف روانہ ہو گیا تھا لیکن یہ قدرت کی طرف سے اس کے لیے صلہ ہی تو تھا۔ اسے صوفیہ کے واپس آنے کا یقین تھا۔ وہ اسے سوچنے کا وقت دینا چاہتا تھا تاکہ صوفیہ کو بعد میں اپنے فیصلے پر پچھتاوا نہ ہو۔

بورس ان دونوں کے ساتھ لیب میں آ گیا اور اب وہ شاکا کی دنیا کا دروازہ کھول رہا تھا۔ سورج کی پہلی کرن کے نمودار ہوتے ہی وہ صوفیہ کو دیکھنے لگا۔

''کیا تم تیار ہو؟''

صوفیہ نے بیسی آنکھوں سے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ جلد از جلد شاکا کے پاس جانا چاہتی تھی۔

''میں نے آبشار تک جانے والے راستے کی فریکوئنسی سیٹ کی ہے۔ وہاں سے شاکا تک کیسے پہنچنا ہے، یہ تم اچھی طرح جانتی ہو۔'' بورس مسکرایا۔

صوفیہ، اینڈریو کے گلے لگ گئی۔ اس کے بعد وہ بورس سے مل کر اگلو میں داخل ہو گئی۔ وارم ہول میں داخل ہونے سے پہلے اس نے ان دونوں پر ایک الوداعی نظر ڈالی۔

''بورس! یہ راستہ ہمیشہ کے لیے بند کر دو۔'' وہ مسکرائی۔

''اگر شاکا چاہے گا تو میری یادداشت سے یہ فریکوئنسی ہمیشہ کے لیے مٹ جائے گی۔'' بورس نے کندھے اچکائے۔ صوفیہ سر کو خم دے کر ہالے کے اندر غائب ہو گئی۔

اینڈریو کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

☆☆☆

Year 2020

Parallel Universe-Jungdaal

سورج نکل رہا تھا۔ وہ آبشار کے پانی میں اتر کر

عجائبات

امریکی ریاست انڈیانا کا باشندہ سام ڈیوس اینٹیں بنانے کا کام کرتا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے ایک اینٹ پر تفریحاً اپنا نام کندہ کر دیا۔

32 سال بعد جب وہ ایک نئے مکان میں رہائش پذیر ہوا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس کے نام والی اینٹ اس کے نئے مکان میں لگی ہوئی تھی۔

☆☆☆

دنیا بھر کو جو تازہ پانی مہیا کیا جاتا ہے، اس میں سے 97 فیصد پانی سطح زمین کے نیچے سے حاصل ہوتا ہے اور یہ اس پانی سے 27 گنا زائد ہے جو جھیلوں اور دریاؤں میں پایا جاتا ہے۔

☆☆☆

خنجر بیگ کسی انسان کا نام نہیں بلکہ یہ ایک قسم کا مہلک پھوڑا ہے جو پیٹھ پر ہوتا ہے اور یہ پھوڑا انسان کی ہلاکت کا موجب بنتا ہے۔

(مرسلہ: مہتاب احمد، حیدر آباد)

راز

ایک محفل میں بحث چھڑ گئی کہ عورتیں کوئی راز، راز نہیں رکھ سکتیں۔

ایک خاتون نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

''میں نے اپنی عمر 24 برس کی عمر سے ہمیشہ راز میں رکھی ہے۔''

''لیکن ممکن ہے کبھی نہ کبھی آپ یہ راز فاش کر ہی دیں۔'' ایک صاحب بولے۔

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' وہ خاتون دوبارہ بولیں۔ ''جب گزشتہ بیس سال میں، میں نے یہ راز فاش نہیں کیا تو بھلا اب کیوں کرنے لگی۔''

(مرسلہ: شاہین تبسم، ملتان)

pklibrary.com

نہانے لگا۔ اس کے زخم ٹھیک ہو چکے تھے مگر صوفیہ کا دیا ہوا زخم سب سے گہرا تھا۔ وہ واپس لوٹنے کے بعد بالکل خاموش ہو گیا تھا۔ اس کے بھائیوں نے اس سے صوفیہ کی واپسی کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی بہت کوششیں کیں مگر وہ انہیں اس بات کا کوئی جواب نہیں دیتا تھا۔ وہ جان گئے تھے کہ شاکا اب دوبارہ کبھی جنم نہیں لے گا۔ یہ جنگد ال کا آخری شاکا تھا۔ وہ بہت دکھی تھے مگر شاکا نے انہیں اپنے دکھ میں شریک نہیں کیا تھا۔ اب وہ اکیلے ہی جنگلوں میں نکل جاتا تھا۔ اس نے روحوں سے بات کرنا بھی چھوڑ دی تھی۔ وہ ساتوں پہلی بار بے بسی محسوس کر رہے تھے۔ آج بھی وہ اکیلے آبشار کی طرف چلا گیا تھا۔ وہ ساتوں شاکال کے الاؤ کے پاس اداس بیٹھے تھے کہ اچانک انہیں گھوڑوں کی آواز نے اپنی طرف متوجہ کیا۔ کوئی آرہا تھا۔ وہ کھڑے ہو کر جنگل کی طرف دیکھنے لگے۔

عکرف قبیلے کا سردار چند گھوڑوں کے ساتھ شاکال میں داخل ہوا۔ وہ سب اچھل پڑے۔ ان میں سے ایک گھوڑے پر صوفیہ سوار تھی۔ انہوں نے ایک دوسرے کو حیرانی سے دیکھا اور خوشی سے نعرے لگاتے ہوئے گھوڑوں کی طرف دوڑنے لگے۔

''سردار کہاں ہیں؟ ان کی ساتھی نے ہمارے قبیلے کو عزت بخشی۔ ہم فوراً ہی انہیں لے کر روانہ ہو گئے تھے مگر یہاں پہنچنے میں ہمیں دو دن لگ گئے۔ میں فرات کے ذریعے پیغام پہنچانا چاہتا تھا مگر مجھے انہوں نے روک دیا تھا۔'' وہ صوفیہ کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ صوفیہ گھوڑے سے اتر چکی تھی۔

''کہاں ہے وہ؟'' وہ بے صبری سے چاروں طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''آبشار پر۔'' یاگا مسکرایا۔

''مجھے وہاں لے چلو۔'' وہ بے قرار تھی۔

اور انہوں نے سردار کی ساتھی کے حکم کی تعمیل میں سر خم کر دیا۔

کازا نے اسے اپنی پشت پر سوار کیا اور وہ آبشار کی طرف دوڑنے لگے۔

وہ نہا کر چٹانوں پر ہی لیٹ گیا تھا۔ سورج کی تپش بڑھ گئی تھی مگر اس کے اندر کی تپش اس سے کہیں زیادہ تھی۔ سورج کے آگے بادل کا ایک ٹکڑا آ گیا تھا۔ وہ آنکھیں بند کیے اس کے ہٹنے کا انتظار کرنے لگا۔ اچانک اسے عجیب سے احساس نے گھیرا۔ اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔

کوئی اس کے سامنے کھڑا تھا مگر سورج سامنے ہونے کی وجہ سے اس کی آنکھیں چندھیا رہی تھیں اور پھر یہ چمک ماند پڑنا شروع ہوئی۔ صوفیہ کا جذبات سے دمکتا چہرہ واضح ہو گیا تھا۔

وہ حیرت سے کھڑا ہو گیا۔

''صوفیہ؟'' اسے یقین نہیں آیا۔

صوفیہ روتے ہوئے اس کے گلے لگ گئی۔ وہ اپنی آنکھیں بند کر کے اس لمحے کو محسوس کرنے لگا۔ شاید یہ خواب تھا۔

''کیوں چھوڑ کر آئے تھے مجھے وہاں۔'' وہ آنسوؤں سے لبریز آنکھوں کے ساتھ اس سے شکوہ کرنے لگی۔

شاکا نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ یہ خواب نہیں بلکہ حقیقت تھی۔

''صوفیہ تم؟'' وہ اسے خود سے الگ کر کے دیکھنے لگا۔

''میں آ گئی ہوں ہمیشہ کے لیے اور اب کبھی نہیں جاؤں گی مگر میری ایک شرط ہے۔'' وہ روتے ہوئے بولی اور شرط کا سن کر شاکا سمیت ان سب کے چہروں پر بے چینی پھیل گئی۔

''ایک اور شرط؟'' عروف نے اپنے ماتھے پر ہاتھ مارا۔

''ہاں۔'' صوفیہ آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

''اور وہ کیا ہے؟'' شاکا پریشانی سے بولا۔

''روحوں سے کہنا، آج کے بعد شاکا کی ہر ساتھی کو میرا چہرہ ہی دیں۔ میں تمہارے ساتھ کسی اور کو برداشت نہیں کر سکتی۔'' وہ غصے سے بولی تو وہ سارے ہنس پڑے۔

''صرف یہ چہرہ ہی نہیں بلکہ یہ روح بھی، یہ دل بھی اور یہ دماغ بھی۔ مجھے اب ہر زندگی میں صرف صوفیہ ہی چاہیے۔'' شاکا مسکرایا تو وہ روتے ہوئے دوبارہ اس کے گلے لگ گئی۔

وہ ساتوں انہیں گھیر کر کھڑے ہو گئے۔

جنگد ال صرف شاکا کا تھا اور ہمیشہ اسی کا رہنے والا تھا مگر آج سے صوفیہ بھی ہمیشہ کے لیے اس دنیا کی حصے دار بن چکی تھی۔

آج بھی سورج کی پہلی کرن نکلنے سے پہلے چاند کو غور سے دیکھنے پر وہ دونوں اس عظیم آبشار کے کنارے سات بھیڑیوں کے پہرے میں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے نظر آتے ہیں۔

☆☆☆

Year 2050

City Museum New York-USA

وہ سیڑھیاں پھلانگتا ہوا تیزی سے میوزیم کے اندر

pklibrary.com

داخل ہوگیا۔

''آؤ رسل! مجھے تمہارا ہی انتظار تھا۔'' مسٹر ونسٹن اسے دیکھتے ہی تیزی سے اس کی طرف بڑھے۔

''معافی چاہتا ہوں کہ مجھے تھوڑی دیر ہوگئی۔ نیو یارک کے ٹریفک کا تو آپ کو معلوم ہی ہے۔'' رسل نے اپنی ٹائی درست کی۔

''کوئی بات نہیں۔ تمہاری اس عظیم دریافت کی وجہ سے تمہاری ساری غلطیاں معاف۔'' مسٹر ونسٹن ہنسنے لگے۔ وہ بھی ہنس پڑا۔

آج میوزیم میں خلافِ توقع ذرا زیادہ رش تھا۔ شہریوں کے علاوہ اخبارات اور مختلف چینلز کے نمائندے بھی رپورٹنگ میں مصروف تھے۔

رسل ایک مشہور ماہر آثارِ قدیمہ تھا اور یہ سب اس کی نئی دریافت کی نمائش دیکھنے یہاں پہنچے تھے۔ مسٹر ونسٹن جو کہ میوزیم کے انچارج بھی تھے، رسل کی اس دریافت کو دنیا کے سامنے لانے کے لیے رسل سے زیادہ بے تاب تھے۔

''وقت ہوچکا ہے۔ سب ہال میں تشریف لے آئیں۔'' برٹنی نے اعلان کر کے سب کو مطلع کیا۔ وہ سب ہال کی طرف بڑھ گئے۔ ہال کے وسط میں شیشے کے ایک بڑے سے باکس کو نیلے کپڑے سے ڈھانک کر کھڑا کیا گیا تھا۔

مسٹر ونسٹن نے افتتاحی تقریر کرنے کے بعد مائیک رسل کے حوالے کردیا۔ اس نے گلا کھنکھار کر مجمعے پر ایک نظر ڈالی۔

''میرا نام رسل ہے اور میں ماہر آثارِ قدیمہ ہوں۔ میرا یہ تعارف سب کو معلوم ہے مگر آج میں جس شخصیت سے آپ کا تعارف کرواؤں گا، وہ ہیں میرے عظیم دادا ڈاکٹر بورس!'' اس نے اپنے کوٹ کی جیب سے ایک بوسیدہ سی ڈائری نکال لی۔ ''انہوں نے بہت سی اہم دریافت کیں جن میں سے ایک وارم پورنل کے ذریعے دوسری کائنات کا سفر بھی ہے۔'' وہ لمحے بھر کو رکا۔

وہاں موجود افراد ایک دوسرے کے کان میں سرگوشیاں کرنے لگے۔

''انہوں نے کئی خوفناک عفریتوں کا خاتمہ بھی کیا اور ان کی مدد کے لیے دوسری کائنات سے ایک عظیم جنگجو یہاں آیا جس کا نام شاکا تھا۔'' وہ ڈائری کے صفحات پلٹنے لگا۔ وہ صفحات اس کے پیچھے لگی اسکرین پر بھی نظر آرہے تھے۔ وہ شاکا کے خاکے پر رک گیا۔

مجمع حیرت سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔

''اس بات کا کوئی ثبوت ہے آپ کے پاس؟'' ایک رپورٹر بولا۔

''میں اسی طرف آرہا ہوں۔ یہ جنگجو تو واپس اپنی دنیا میں چلا گیا مگر اپنی بہادری کا ثبوت یہیں چھوڑ گیا۔'' رسل نے آگے بڑھ کر باکس پر ڈھکا وہ نیلا کپڑا کھینچ کر اتار لیا۔

مجمعے کو سانپ سونگھ چکا تھا۔ ہال میں دبی دبی چیخیں گونجنے لگیں۔

''گزشتہ ماہ سمندر کی کھوج کے دوران میں اس راز کو دریافت کرنے میں کامیاب ہوگیا جو نصف صدی پہلے دفن کردیا گیا تھا۔'' رسل مسکراتے ہوئے بولا۔

''کیا آپ اپنے دادا کی ریسرچ کو آگے بڑھانے کا ارادہ رکھتے ہیں؟'' دوسرا رپورٹر تجسس لہجے میں بولا۔

''بالکل۔ میں اس پر کام شروع کرچکا ہوں اور جلد ہی آپ سب کو خوشخبری سناؤں گا۔'' رسل نے مجمعے پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی۔ وہ سب ہمیشہ کی طرح اس کے کام سے متاثر ہوچکے تھے۔ یہی تو اس کا خواب تھا۔

شام تک وہ اس طرح کے کئی سیشن نمٹا چکا تھا۔ اسے مختلف جگہوں سے انٹرویو کی کالز آنا شروع ہوگئی تھیں۔ اس کی دریافت نے ہلچل مچادی تھی۔

وہ آخری سیشن ختم کر کے کچھ طالب علموں کو آٹو گراف دینے میں مصروف ہوگیا۔ ہال تقریباً خالی ہوچکا تھا۔ اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ رات کے نو بج رہے تھے۔

''سر! میوزیم کی لائٹس بند کرنے کا وقت ہوچکا ہے۔'' برٹنی جو میوزیم کی ایڈمنسٹریٹر تھی، تھکن زدہ لہجے میں اس سے مخاطب تھی۔

''اوہ ہاں۔ میں بس نکل رہا ہوں۔'' رسل ان طالب علموں کے ساتھ ہال سے باہر نکل گیا۔

برٹنی نے لائٹ بجھانے سے پہلے اس باکس پر ایک نظر ڈالی۔

یہ عجیب سی بلا تھی۔ اس کی دونوں آنکھیں ضائع ہوچکی تھیں۔ اتنا عرصہ سمندر کی تہ میں پڑے رہنے کے باوجود بھی اس کا جسم گلا نہیں تھا۔ اسے دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے وہ ابھی اپنے لمبے دانتوں سے سامنے والے پر حملہ کردے گی۔ ڈاکٹر رسل اس خوفناک بلا کے ڈی این اے پر ریسرچ کرنے والے تھے۔

برٹنی کو جھرجھری آگئی۔ وہ میوزیم کی لائٹ بند کر کے تیزی سے باہر نکل گئی۔

رسل اس خوفناک تاریخ کو دہرانے جارہا تھا۔

(ختم شد)

وہی راستے وہی منزلیں

ناہید سلطانہ اختر

”یہ دنیا ایک اسٹیج ہے اور ہم سب اس کے کردار“ بہت مشہور قول ہے جسے اکثر لوگ فیشن کے طور پر کہہ جاتے ہیں مگر... ہر بار ایسا نہیں ہوتا... اس کی حقیقت کبھی کبھی حالات اتنی وضاحت کے ساتھ پیش کردیتے ہیں کہ سمجھنے والے پر حیرت کے پہاڑ ٹرٹ پڑتے ہیں... وہ جو حسن کی ملکہ تھی... جسے اپنے وجود کی اہمیت کا ادراک تھا... اس کے باوجود اس نے ایک اندھے کنوئیں میں چھلانگ لگادی کیونکہ اس نے کہیں سُن رکھا تھا کہ بڑا فاصلہ طے کرنے کے لیے انسان کو تھوڑی سی پسپائی اختیار کرنا پڑتی ہے مگر... پسپائی اختیار کرنے کے فریب میں جب انسان پستی میں گرتا ہے تو ایسے ہی انجام سے دوچار ہوتا ہے... ”نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم“ کے شکنجے میں قید ہوکر اس کے پاس پھر سوائے پچھتاوے کے کچھ نہیں بچتا... حیرت ہے خالی دامن رہ کر بھی اس کا خود پر سے زعم ختم نہ ہوا... اور جسے وہ وفا کی راہوں میں سسکتا چھوڑ گئی تھی، قدرت نے اس کے تمام انسوؤں کا مداوا کرڈالا کیونکہ... قدرت کے ترازو میں ظالم اور مظلوم برابر نہیں ہوسکتے۔

پلٹ پلٹ کر گمشدہ راستوں اور منزلوں کو تلاش کرنے والی ایک عاقبت نااندیش حسینہ کی داستان

pklibrary.com

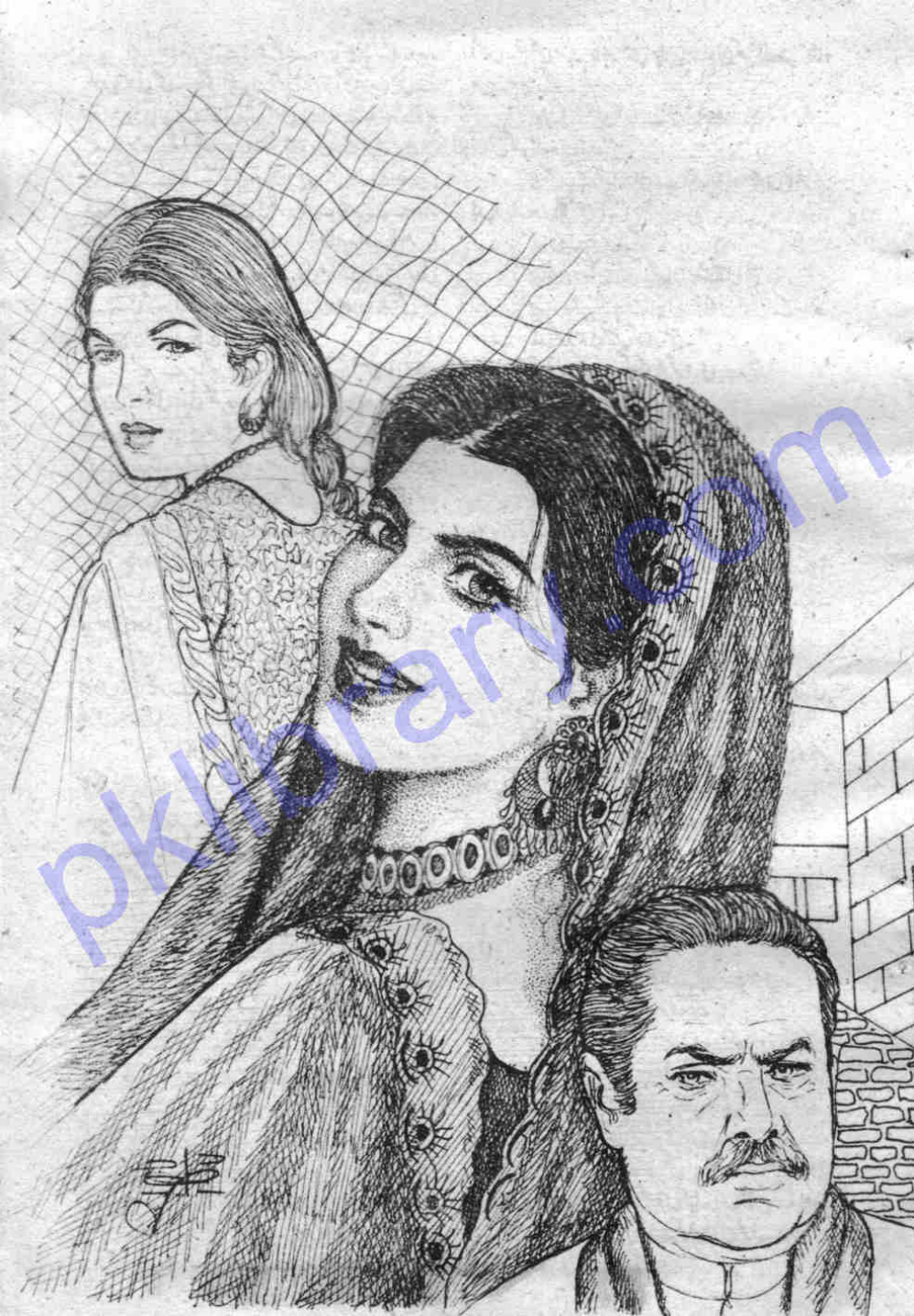
pklibrary.com

ابر آلود شام اسے ہمیشہ خوف اور یاسیت سے دوچار کر دیا کرتی تھی۔ وہ بھی ایک ابر آلود شام ہی تھی جب اس نے اپنی ماں کی باپ سے طویل خفگی کو ان کے راستے جدا ہونے پر نتیجہ پذیر ہوتے دیکھا۔ راستے تو شاید ان کے ہمیشہ سے ہی جدا تھے مگر اپنی اپنی مصلحتوں اور مجبوریوں میں بندھے وہ ریل کی پٹڑی کی دو متوازی لائنوں کی طرح ایک دوسرے سے دور دور مگر ساتھ چلنے پر مجبور رہے۔ وہ ابر آلود شام سانپ کی طرح کنڈلی مار کر ہمیشہ کے لیے ایک خوف کی صورت اس کے دل میں بیٹھ گئی تھی۔ اسے یاد نہیں تھا کہ اس کے بعد وہ پھر کبھی کسی بات پر دل کھول کر سچ مچ ہنس پائی ہو۔

''میرے ساتھ کون جا رہا ہے؟'' حسن آرا ان چاروں کو اچٹتی ہوئی نظر سے دیکھتے ہوئے پوچھ رہی تھیں۔ شاہ مراد سے ان کی طویل ناراضگی اس شام اپنی قسمت کو کوسنے اور شاہ مراد کو ان کی بدصورتی اور نااہلیت کے طعنے دینے پر ٹوٹی تھی۔ جواباً شاہ مراد بھی چیخے چلائے تھے اور حسن آرا نے ان کا گھر چھوڑ کر جانے کا اعلان کر دیا تھا۔

چاروں میں سب سے بڑی انیتا جو ماں کی سب سے زیادہ لاڈلی اور چہیتی تھی، تیزی سے لپک کر ماں کے ساتھ جا کھڑی ہوئی تھی۔

حسن آرا کی نظریں اب باقی تین پر تھیں۔ بھائی بہنوں میں تیسرے نمبر پر اور اکلوتا بیٹا شاہ تاج بھی ماں کی طرف بڑھ گیا۔

''انیقہ!'' ماں نے اس کی طرف دیکھا۔ انیتا اور شاہ تاج کی طرح وہ بھی ماں کی سمت جانے کو تھی کہ اس کی نظریں باپ کی نگاہوں سے ملیں اور ان نگاہوں میں ڈوبتی بے چارگی سے اس کا دل ڈانواں ڈول ہو گیا۔

''انیقہ!'' ماں نے اس بار ذرا کڑک کر اسے مخاطب کیا۔

اس نے باپ کا بازو پکڑ لیا۔

''آؤ امینہ!'' ماں نے پانچ سالہ امینہ کو اپنی طرف آنے کا اشارہ دیا۔

باپ نے اپنا ہاتھ امینہ کے سر پر رکھ دیا۔ ''امینہ تو رات کو میرے بغیر سوتی ہی نہیں۔''

ماں نے ہاتھ بڑھا کر امینہ کو اپنی طرف کھینچنا چاہا۔

''اسے..... اسے یہیں رہنے دو۔ انیقہ کو اکیلا کیوں کر دینا چاہتی ہو۔'' شاہ مراد نے غصے سے کہا۔

''انیقہ ہے نا آپ کے پاس۔ امینہ چھوٹی ہے۔'' حسن آرا نے ترش لہجے میں کہا۔

''چھوٹے تو ابھی سبھی ہیں۔ کیوں برباد کرنا چاہتی ہو انہیں۔ تم بھی مت جاؤ۔ میں چلا جاتا ہوں گھر سے۔'' شاہ مراد نرم پڑ گئے۔

''ہونہہ!'' حسن آرا نے نخوت سے اپنے سر کو جھٹکا۔ ''اس گھر میں ہے کیا۔''

''جو بھی ہے، تمہارا ہی ہے۔ تمہارا اور بچوں کا خرچہ میں دیتا رہوں گا تمہیں۔''

''کہاں سے دیں گے؟''

''جہاں سے بھی..... یہ تمہارا مسئلہ نہیں۔''

''میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں ایک کنگال آدمی کے ساتھ سسک سسک کر زندگی نہیں گزار سکتی۔''

''تم نے اچھی زندگی بھی تو گزاری ہے۔''

''خواب لگتا ہے وہ۔''

''سب ٹھیک ہو جائے گا حسنہ!''

''میں تسلیوں اور وعدوں پر نہیں جینا چاہتی۔''

''کہاں جاؤ گی؟''

''آپ کا مسئلہ نہیں۔''

''میرے بچوں کا تو ہے۔ کیوں انہیں بے گھر کرنا چاہتی ہو۔''

''آپ سے بہتر رکھ سکتی ہوں انہیں۔''

''جانتا ہوں۔''

''جانتے ہیں تو آڑے آنے کی کوشش کیوں ہو رہی ہے؟'' حسن آرا نے شاہ مراد کو ٹیڑھی نظروں سے دیکھا۔

''تمہیں سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ بچوں کو ہم دونوں کی ضرورت ہے..... بالخصوص تمہاری۔''

''تو جانے دیں باقی دو کو بھی میرے ساتھ۔''

''میں تو راستہ نہیں روک رہا۔''

''آؤ۔'' حسن آرا نے انیقہ اور امینہ کو اپنی طرف بلانا چاہا۔

انیقہ نے پھر باپ کا بازو پکڑ لیا۔ امینہ بھی پہلو میں دبک گئی۔ ان دونوں کو تند نظروں سے دیکھتی ہوئی حسن آرا، انیتا اور شاہ تاج کو اپنے ساتھ لیے دروازے کی سمت مڑیں۔

''حسنہ! رک جاؤ۔'' شاہ مراد نے کہا۔

حسن آرا نے انہیں غصے سے دیکھا اور دونوں بچوں کے ساتھ کمرے سے نکل گئیں۔ انیقہ اور امینہ دائیں بائیں باپ کے پہلوؤں میں دبک گئیں۔ امینہ اپنی مٹھیوں سے آنکھیں مسلنے لگی۔ بارہ سالہ انیقہ نے کمرے کی کھلی کھڑکی سے جھانکتی ابر آلود شام کو بیخ کی طرح اپنے دل میں گڑتے محسوس کیا۔ اس شام کے بعد جب بھی شام ابر آلود ہوئی، انیقہ کو اپنا دل خوف اور درد

میں ڈوبتا محسوس ہوا۔

☆☆☆

وہ ایسی ہی کٹھن رات تھی جیسی کسی بہت پیاری، بہت عزیز ہستی کے مرنے کے بعد پہلی رات ہوا کرتی ہے۔ امینہ چھوٹی تھی، معصوم تھی۔ روزانہ کی طرح باپ کے سینے پر اپنا سر رکھ کر سوگئی۔ انیقہ کبھی سوتی، کبھی جاگتی رہی تھی۔ اسے ڈر لگ رہا تھا۔ ماں، انیتا اور شاہ تاج یاد آرہے تھے۔ ماں پر غصہ بھی آرہا تھا۔ کیوں چلی گئی تھیں وہ انیتا اور شاہ تاج کو لے کر۔ انیتا ان کی لاڈلی تھی تو کیا، وہ بھی تو ماں سے پیار کرتی تھی..... ان کے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ ماں کو نہیں جانا چاہیے تھا۔

انیقہ کو بہت سی فکریں پریشان کررہی تھیں۔ صبح کو ناشتا کون بنائے گا..... اپنی اور امینہ کی یونیفارم تو خیر وہ استری کرلے گی مگر ان کے لنچ باکس کون تیار کرے گا..... وہ خود تو اسکول بس میں چڑھ جائے گی، امینہ کو بس میں کون بٹھائے گا..... بڑی بس تھی۔ روزانہ تو ماما اسے اپنے بازوؤں میں اٹھا کر بس میں چڑھایا کرتی تھیں..... دوپہر کو کھانا کون پکائے گا..... کپڑے کون دھوئے گا..... سب سے بڑی بات یہ کہ جب وہ اسکول سے گھر آکر ماں کو پکارے گی تو..... اس کی پکار کا جواب کون دے گا..... ماما کہاں سے دکھیں گی..... وہ تو ہوں گی ہی نہیں..... امینہ کو نہلائے گا کون..... انیتا، ماں کی چہیتی تھی تو کیا، وہ بھی تو ماں سے پیار کرتی تھی..... بلکہ شاید اپنے بھائی بہنوں سے زیادہ..... ماما ذرا ادھر ادھر ہوتیں تو وہ انہیں زور زور سے پکارنے لگتی تھی اور اس بات پر ماما اکثر اس کی گوشمالی بھی کردیا کرتی تھیں۔ ''کیا مرگئی تھی میں جو تم اتنی زور زور سے پکار رہی تھیں.....'' اللہ نہ کرے جو ماما کبھی مریں..... دن بھر میں وہ نہ جانے کتنی مرتبہ گڑگڑاتی تھی۔ ''اللہ میاں! میری ماما کو کبھی کچھ نہ ہو.....'' نہ جانے کیوں اس کے ذہن میں یہ خوف بیٹھ گیا تھا کہ اللہ نہ کرے ماما کو کچھ ہوجائے گا..... ماما چلی جائیں گی..... اور ماما واقعی چلی گئی تھیں۔

صبح ہوئی تو شاہ مراد نے ہی ناشتا بنایا۔ اس کا بالکل بھی جی نہ تھا کچھ کھانے پینے کو مگر باپ نے اصرار کرکے اسے کھلایا پلایا، اس کی اور امینہ کی یونیفارمز پر استری کی، دونوں کے لنچ بکس تیار کیے، امینہ کے بال سنوارے۔ اسکول بس کے آنے کا وقت ہوا تو وہ ہی ان دونوں کو ساتھ لے کر بس اسٹاپ پر گئے۔ بس آئی تو امینہ کو اپنی گود میں لے کر بس میں چڑھایا اور جب تک بس دوبارہ نہ چل پڑی، کھڑے دیکھتے رہے۔

اسکول میں وہ دن بھر بے حد اداس رہی۔ ماما، انیتا اور شاہ تاج اسے بہت یاد آرہے تھے۔ چھٹی جماعت میں گئے اسے چند ہی دن ہوئے تھے۔ امینہ بھی نئی اسکول میں داخل ہوئی تھی۔ وقفے کی گھنٹی بجتے ہی وہ امینہ کی کلاس کی طرف لپکی۔ پاپا نے اسے امینہ کا خیال رکھنے کو کہا تھا۔

اپنے اپنے لنچ بکس کے ساتھ دونوں بہنیں اسکول گراؤنڈ میں اس درخت کے نیچے کنکریٹ کی بینچ پر جا بیٹھیں جہاں چوتھی جماعت میں اس کی ایک ہم جماعت ربیکا وقفے میں بیٹھ کر اللہ میاں کو عرضی لکھا کرتی تھی کہ اس کی امی کو واپس بھیج دیا جائے۔ موٹے موٹے دبیز شیشوں کی عینک پہننے والی ربیکا جس کی آنکھیں دبیز عدسوں سے کانچ کی گولیوں کی طرح جھانکا کرتی تھیں، اس کی امی اللہ میاں کے ہاں جا چکی تھیں۔ ربیکا ہر روز اللہ میاں کے نام عرضی لکھتی کہ اس کی امی کو واپس بھیج دیا جائے۔ چوتھی جماعت کے دوران ہی ربیکا اسکول چھوڑ گئی تھی۔ پتا نہیں اسکول گیٹ کے باہر سرخ رنگ کے لیٹر بکس میں اللہ میاں کے نام پوسٹ کی گئی اس کی عرضیوں کا کیا بنا تھا جو وہ ہر روز چھٹی کے بعد گھر جاتے ہوئے اس لیٹر بکس میں ڈال دیا کرتی تھی۔ ماما کو تو ربیکا کی امی کی طرح اللہ میاں نے اپنے پاس نہیں بلایا تھا..... وہ تو خود سے گئی تھیں..... اس کی سمجھ میں نہ آرہا تھا ماما کو واپس بلانے کے لیے عرضی کسے لکھے۔

☆☆☆

شاہ مراد اور حسن آرا پر ''اوڈ کپل'' کی ترکیب سو فیصد منطبق ہوئی تھی۔ ان کا نہ ظاہراً کوئی جوڑ تھا نہ باطناً۔ حسن آرا غیر معمولی خوبصورت تھیں اور شاہ مراد ان کے بالکل الٹ۔ حسن آرا جامہ زیب تھیں۔ اپنے بناؤ سنگھار اور ہمیشہ اچھا نظر آنے کا خیال رکھتیں۔ شاہ مراد اپنے لباس اور ایپرنس کے بارے میں خاصے بے پروا تھے۔ حسن آرا کا نظریہ تھا کہ لوگوں کا مال و دولت دوسروں کو مرعوب کرتے ہیں۔ شاہ مراد کا خیال تھا کہ لوگ ہمارے اخلاق، لیاقت اور ذہانت سے متاثر ہوتے ہیں۔ حسن آرا مادہ پرست تھیں، شاہ مراد قناعت پسندی کے قائل۔ غرض دونوں صرف ظاہری طور پر ہی نہیں، عادات و خصائل اور نظریات میں بھی ایک دوسرے کی ضد تھے مگر اس تضاد کے باوجود دونوں ایک دوسرے کے نہ صرف شریکِ زندگی بنے تھے بلکہ چار بچوں کی اس دنیائے رنگ و بو میں آمد کا ذریعہ بھی۔

شاہ مراد خاندانی اور پڑھے لکھے آدمی تھے۔ طبعاً نہایت شریف النفس، فنونِ لطیفہ سے رغبت تھی۔ نوعمری ہی

سے فلم بینی کے شوقین تھے۔ والد کٹر مذہبی آدمی۔ انہیں شاہ مراد کے شوقِ فلم بینی سے سخت چڑ تھی۔ مسلسل روکتے ٹوکتے بلکہ دو چار مرتبہ ان کے کان بھی کھینچے۔ شاہ مراد گھر سے بھاگے اور فلمی دنیا میں آکر سانس لی۔ کچھ عرصہ چھوٹے موٹے کام کیے پھر ہدایت کاروں کی معاونت کرنے لگے۔ باصلاحیت اور ذہین تو تھے۔ معاون ہدایت کار سے جلد ہی ہدایت کار بن گئے۔ قسمت نے یاوری کی..... پہلی فلم ہی ہٹ ہوگئی۔ یکے بعد دیگرے فلمیں ملنے لگیں اور وہ چند ہی برسوں میں نامور ہدایت کار بن گئے۔ فلم انڈسٹری میں ان کے نام کا سکہ چلنے لگا۔ فلم ساز ان کی ہدایت کاری میں بننے والی فلموں میں آنکھ بند کرکے سرمایہ لگاتے اور نامور اداکار اور اداکارائیں ان کی ہدایت کاری میں بننے والی فلموں میں کام کرنے کے خواہشمند رہتے۔ فلمی صنعت میں شاہ مراد کا طوطی بولتا تھا۔ کسی نے ایک مرتبہ ان سے کہا۔ ”آپ کی فلمیں باکس آفس پر اس لیے کامیاب ہوتی ہیں کہ فلم ساز ان میں دل کھول کر پیسا لگاتے ہیں اور معروف اداکاران میں اداکاری کے جوہر دکھاتے ہیں۔ کم بجٹ اور غیر معروف اداکاروں کی کوئی کامیاب فلم بنا کر دکھائیں تو آپ کو مانیں۔“

شاہ مراد نے چیلنج قبول کیا۔ ایک نووارد فلم ساز کے لیے کم بجٹ اور تمام تر نئی کاسٹ لے کر ایک فلم بنائی جس نے مسلسل ساٹھ ہفتے بزنس کیا۔ شاہ مراد نے پردۂ سیمیں کو کئی نئے اداکار دیے جن کا برسوں طوطی بولتا رہا۔

حسن آرا ایک ادب نواز اور روشن خیال گھرانے کی فرد تھیں۔ والد شاعری کرتے تھے اور آئے دن ان کے گھر میں مشاعرے کی محفلیں سجتیں۔ ان محفلوں میں ایک نوجوان فلمی گیت نگار عطرت خیال بھی شرکت کیا کرتے تھے۔ عطرت خاندانی نوجوان تھے۔ حسن آرا کے والد نے اپنی تین بیٹیوں میں سب سے بڑی عالم آرا کی شادی عطرت خیال سے کردی تھی۔ فلم انڈسٹری میں ہونے کی وجہ سے عطرت خیال کا شاہ مراد سے بھی تعلق تھا۔ شاہ مراد کی ان دنوں بحیثیت فلم ڈائریکٹر بہت شہرت تھی۔

حسن آرا اپنی تین بہنوں میں سب سے چھوٹی، نہایت خوبرو، بلا کی شوخ و چنچل اور فلم بینی کی شوقین تھی۔ جب کوئی نئی فلم لگتی، ضد کرکے والدہ، بہنوں اور محلے دار سہیلیوں کے ساتھ دیکھنے جاتی۔ فلم بینی کے شوق نے اس کے دل میں خود بھی ہیروئن بننے کی خواہش کو ہوا دے رکھی تھی مگر اس کا اظہار کرتے ڈرتی تھی۔ گھرانا روشن خیال ضرور تھا مگر اتنا بھی نہیں کہ اس کی فلمی ہیروئن بننے کی خواہش کو تسلیم کیا جاتا۔

شاہ مراد کی زیرِ ہدایت بننے والی ایک فلم کی مہورت میں عطرت خیال اپنی بیوی کو اسٹوڈیو لے گئے تو حسن آرا بھی ان کے ہمراہ تھی۔ افتتاحی شاٹ کے بعد کھانے پینے کا سلسلہ شروع ہوا تو شاہ مراد فلم ساز کے ساتھ مہمانوں کا شکریہ ادا کرنے کو فرداً فرداً ملے۔ عطرت خیال جو اس فلم کے نغمہ نگار بھی تھے، انہوں نے بیگم اور سالی کو شاہ مراد اور فلم ساز سے متعارف کرایا۔ شاہ مراد جو ایک سے بڑھ کر ایک خوبرو فلمی حسیناؤں کے ساتھ کام کرنے کے عادی تھے، عطرت خیال کی بیگم اور سالی سے ویسے ہی ملے جیسے وہ دیگر شرکائے تقریب خواتین سے مل رہے تھے مگر حسن آرا جو فطرتاً اپنی عمر کے مقابلے میں نہایت چالاک اور کائیاں تھی، دل میں کچھ اور ہی سوچ رہی تھی۔ شاہ مراد اس کے دل میں چھپی فلمی ہیروئن بننے کی خواہش پوری کرنے کا ذریعہ بن سکتے تھے۔

☆☆☆

حسن آرا نے شاہ مراد سے شادی کی خواہش کا اظہار بڑی بہن عالم آرا سے کیا تو وہ بھبک کر بولیں۔ ”تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟“

”کیوں، اس میں دماغ ٹھیک ہونے یا نہ ہونے کی کیا بات؟“

”شکل دیکھی ہے اس کی..... کالا کوا..... بلکہ کوا بھی اس سے کچھ کم کالا ہوتا ہے..... دانت ہی دانت نظر آتے ہیں سیاہ چمڑی پر۔“

”مجھے فرق نہیں پڑتا۔ اتنے مشہور تو ہیں وہ۔“ حسن آرا اٹھلا کر بولی۔

”شہرت کے ساتھ زندگی نہیں گزرتی۔ میاں بیوی کا کچھ جوڑ بھی ہونا چاہیے۔ پہلوئے حور میں لنگور تو نہ دکھائی دے شوہر۔“

”مجھے پسند ہیں۔“

”بے وقوفی کی بات مت کرو۔ پہلے دن ہی صورت بری لگنے لگے گی تمہیں اس شخص کی۔“

”صورت کو چھوڑیں۔ آپ اماں، ابا سے بات تو کریں۔“

”مجھے پتا ہے دونوں میں سے کوئی نہیں مانے گا۔ اماں تو تمہارے لیے کسی شہزادۂ گلفام کی آرزو رکھتی ہیں۔“

”زندگی مجھے گزارنی ہے عالمہ آپا!“

”ہاں..... تو اسے عذاب بنانے کی کوشش تو نہ کرو۔“

”عذاب کیوں؟“

”تمہارا اور اس کا کوئی جوڑ نہیں۔ اس کی شہرت اور کمائی پر مت جاؤ..... ہوائی روزی ہے۔ مرد کا ذریعۂ معاش

مستقل ہونا چاہیے۔"

"عطرت بھائی کا کون سا مستقل ذریعۂ معاش ہے۔ آپ کا گزارہ ہو رہا ہے کہ نہیں۔"

"ان کے باپ اتنا چھوڑ کر مرے ہیں کہ عطرت ساری زندگی بھی کچھ نہ کریں تو گزارہ ہو سکتا ہے..... ایک یہ کوٹھی ہے..... دو کرائے پر اٹھی ہوئی ہیں..... چھ دکانوں کا کرایہ آتا ہے۔ عطرت اپنے والدین کے اکلوتے بیٹے، نہ کوئی بھائی، نہ بہن۔ باپ جو کچھ چھوڑ کر مرے، اس میں حصہ بٹانے والا کوئی ہے نہیں۔ خدا نے ابھی تک اولاد بھی نہیں دی۔ عطرت کچھ نہ بھی کریں تو ساری زندگی آرام سے بیٹھ کر کھا سکتے ہیں۔ جس شخص سے تم شادی کرنے کی فرمائش کر رہی ہو، اس کے پاس اپنا گھر تک تو ہے نہیں۔ کرائے کے گھر میں رہتا ہے۔ عطرت بتاتے ہیں، جو کماتا ہے، اڑا دیتا ہے۔ ذمے داری کوئی ہے نہیں..... ماں باپ، بہن بھائیوں کو پردیس میں چھوڑا..... خود یہاں بھاگ آیا۔ باپ کٹر مولوی تھے، اسے فلموں کی لت..... باپ نے زیادہ سختی کی تو بھاگ نکلا۔ سنا ہے اپنی کمائی سے گھر والوں کو پیسے بھجوانے کی کوشش کی اس نے تو واپس کر دیے گئے اور آئندہ کے لیے سختی سے منع کر دیا گیا۔ اب جو کماتا ہے، فیاضی سے خود پر اور دوست احباب پر لٹا دیتا ہے۔"

"میں سنبھال لوں گی آپا!"

"تمہاری سوئی اسی پر کیوں اٹک گئی ہے؟" عالم آرا نے چھوٹی بہن کو ٹیڑھی نظر سے دیکھا۔

"آپ ابا سے بات کریں نا۔" حسن آرا مچلی۔

"میری بے عزتی کروانا چاہتی ہو ان سے۔ باقی تو چھوڑو، اس کی شکل ہی دیکھنے مطلب کی نہیں۔ خدا جانے تمہیں اس میں کیا نظر آ گیا ہے۔"

"اچھی آپا..... اکرا دیں میری اس سے شادی۔ ساری زندگی آپ کی احسان مند رہوں گی۔ ابا کو بتا دیجیے گا میری اس سے شادی نہ کی انہوں نے تو میں کسی سے بھی نہیں کروں گی۔"

عالم آرا بہن کو دیکھنے لگیں۔ "مجھے لگتا ہے تمہارا دماغ واقعی گھوم گیا ہے یا شاید اس نے کچھ پڑھ کر پھونک دیا ہے تم پر۔"

"وہ تو اتنے شریف ہیں کہ انہوں نے مجھے نظر بھر کر بھی نہیں دیکھا۔ مجھے اچھے لگے ہیں وہ۔"

"حسنہ! تمہاری اور اس کی عمر میں بھی فرق ہے۔ تم انیسویں برس میں ہو، وہ پینتیس سے کم تو کسی حال نہ ہوگا۔"

"کوئی بات نہیں۔"

"فلمی پریوں میں گھرا رہتا ہے۔ کیا معلوم کس قماش کا ہو؟ بعض مرد اوپر سے شریف نظر آتے ہیں مگر اندر سے سارے گن پورے ہوتے ہیں۔"

"مجھے پھر بھی انہی سے شادی کرنی ہے۔ آپ نے ابا سے بات نہ کی تو میں نے اسٹوڈیو تو دیکھ ہی لیا ہے..... خود جا کر کہہ دوں گی ان سے کہ میں آپ سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔"

"ائے ہئے! ایسا کر بھی نہ دینا کہیں..... عطرت بھی ہوتے ہیں وہاں۔ ان کی تو عزت خاک میں مل جائے گی۔ مجھے بھی نکال باہر کریں گے اپنے گھر سے وہ۔"

"تو پھر آپ بات کریں ابا سے۔"

"میں تو کیا کروں گی..... عطرت سے کہتی ہوں۔ داماد ہیں..... ابا شاید انہیں کچھ نہ کہیں سنیں۔" عالم آرا نے توقف کیا اور حسن آرا کو گھورتے ہوئے بولیں۔ "ویسے ہے تمہاری یہ بات بہت غلط..... رشتے کوئی اس طرح ہوتے ہیں کہ تم ایک بار سرسری اس سے ملیں اور یوں فریفتہ ہو گئیں۔ کچھ تو دیکھتا ہے آدمی..... نہ صورت، نہ شکل، نہ خاندان سے واقفیت..... نہ گھر نہ دوار اور تم اس سے شادی کرنے کو تیار۔"

"مجھے کچھ نہیں چاہیے۔"

"پہلے تو مجھے یہ سوچنا ہوگا کہ عطرت سے کیا کہوں۔"

"کہہ دیجیے گا حسنہ شادی کرنا چاہتی ہے ان سے۔"

"بہت خوب! کتنی آسانی سے کہہ دی تم نے یہ بات۔ عطرت خاندانی آدمی ہیں..... میرے جنم میں نہ ٹھوکیں گے وہ۔"

"کیوں؟"

"شریف خاندان میں لڑکیاں منہ کھول کر کب کہتی ہیں کہ انہیں فلاں آدمی سے شادی کرنی ہے۔ عطرت سے بات بناؤں گی کہ مجھے شریف انسان لگا ہے۔ اس سے حسنہ کا رشتہ ہو جائے تو کیسا..... دیکھتی ہوں وہ کیا کہتے ہیں۔"

"چلیے..... یوں ہی سہی۔"

☆☆☆

عالم آرا نے شوہر سے بات کی تو وہ بولے۔ "اپنی بہن سے پوچھنا ذرا۔ وہ تین فٹ اونچا اچھلے گی۔"

"کیوں بھلا؟"

"دونوں کا جوڑ جو نہیں ہے۔ شاہ مراد عمر میں بھی بڑے، صورت شکل بھی بس اللہ کی بخشی ہوئی۔"

"شرافت تو ہے..... اس روز جب مہورت پر آپ نے ملاقات کرائی تو بے چارے نے نظر بھر کر نہیں دیکھا

کسی عورت کو۔"

"شرافت میں تو کوئی کلام نہیں۔"

"آدمی کو شریف ہی ہونا چاہیے۔"

"گھر بھی نہیں ہے اس کے پاس۔"

"کوئی بات نہیں۔ بیوی بچے ہوتے ہیں تو آدمی گھر بھی بنالیتا ہے۔ نا ٹھاگوڑا مرد گھر کس کے لیے بنائے۔"

"ہاں، یہ تو ہے۔"

"پہلے تو آپ شاہ مراد سے پوچھیں کہ وہ شادی کرنا بھی چاہتے ہیں یا نہیں پھر ان سے کہیں میں اپنی سسرال میں بات چلاؤں..... بتا دیجیے گا کہ اسی سالی سے جو فلم کی مہورت پر آئی تھی۔"

"فلم کی مہورت پر تو بہت مہمان تھے۔ اسے کیا یاد رہا ہوگا۔"

"حسنہ کی تصویریں ہیں میرے پاس..... آپ کو ایک دے دوں گی..... بٹوے میں رکھ لیجیے گا، ضرورت پڑنے پر دکھانے کو۔"

"اپنے گھر میں بات کرو پہلے۔"

"پہلے آپ اس کی رضا تو لیں..... پھر ابا سے بھی آپ ہی کو بات کرنی ہوگی۔"

"اچھا! ڈول ڈالتا ہوں۔"

☆☆☆

عطرت خیال نے شاہ مراد سے بات کی تو وہ بولے۔

"جی ہاں..... شادی تو کرنا چاہتا ہوں میں..... لیکن آپ کی اہلیہ کی ہمشیرہ تو خاصی خوش رو دوشیزہ ہیں۔"

عطرت بے ساختہ ہنسے پھر بولے۔ "میری اہلیہ قصیدہ پڑھ رہی تھیں تمہاری شرافت کا کہ مہورت والے دن انہوں نے نظر بھر کر نہیں دیکھا کسی عورت کو۔ اب جا کر بتاؤں گا کہ تمہاری بہن خوب اچھی طرح یاد ہیں شاہ مراد کو۔"

"ارے نہیں..... ایسا نہ کیجیے گا..... ان کا اعتماد برقرار رہنے دیں..... ویسے انہوں نے اتنا غلط بھی نہیں کہا..... آپ کی سالی صاحبہ مجھے اس لیے یاد رہیں کہ اس ہجوم میں وہ مجھے غیر معمولی خوش رو دکھائی دیں۔"

"بات چلاؤں؟"

"دیکھ لیجیے..... لیکن فرق صاف ظاہر ہے۔"

"جب خدا کی رضا ہو تو سارا فرق ایک طرف دھرا رہ جاتا ہے..... سمجھے آپ؟" عطرت خیال نے کہا۔

"ٹھیک کہتے ہیں۔"

"اب سنو غور سے..... میرے سسرال میں ادبی بیٹھکوں کا معمول ہے۔ اتوار کے دن بھر سسر صاحب نے اپنے ادب نواز احباب کو بلا رکھا ہے۔ میری شرکت یقینی ہوتی ہے۔ میں انہی بیٹھکوں میں شرکت کر کے ان کا داماد بنا ہوں۔ اب تمہاری باری ہے۔ اتوار کو تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا اور تمہارا تعارف کرواؤں گا ان سے..... اس کے بعد جو مرضی معبود!"

"اتوار..... ٹھیک ہے، چلوں گا۔"

☆☆☆

حسن آرا کے والد اختر حسین وضع دار آدمی تھے۔ شاہ مراد سے نہایت اخلاق سے ملے۔ شاہ مراد کے اطوار اور گفتگو سے متاثر ہوئے۔ ان کی خاطر خواہ تواضع کی اور دوبارہ آنے کو کہا۔ عطرت خیال نے شاہ مراد کو ان سے ادبی بیٹھک سے ہٹ کر ملوانا مناسب سمجھا۔ دوسری ملاقات میں شاہ مراد نے اختر حسین کو اپنے آباء اور خاندان کے بارے میں بتایا۔ اختر حسین ان کی نسبت و نجابت سے اور متاثر ہوئے۔ دوسری ملاقات کے بعد عطرت نے مدعا کیا تو وہ بولے۔

"ہے تو خاندانی آدمی مگر حسنہ سے دگنی عمر معلوم ہوتی ہے اور ظاہراً ابھی کوئی جوڑ نہیں۔"

"گستاخی معاف! مرد کی نجابت، صحت اور روزگار دیکھنا چاہیے۔ ہنرمند آدمی ہے..... اچھا کماتا ہے..... مستقبل روشن ہے۔ انڈسٹری میں اس کا طوطی بول رہا ہے..... آگے جائے گا..... کمائی کو سنبھالنے والی عورت گھر میں ہوگی تو راج کرے گی..... اکیلا ہے یہاں۔"

"عالم آرا سے کہو، اپنی والدہ سے بات کریں۔ گھر میں میرا حکم ضرور چلتا ہے مگر یہ ایسا معاملہ ہے کہ تمہاری ساس، شاہ مراد کو دیکھیں گی تو یہ اعتراض کریں گی کہ میری حسین بیٹی کو تم اس شخص کو دینے کی بات کرتے ہو..... اور ہاں، حسنہ سے بھی ضرور پوچھا جائے..... یہ اس کا حق ہے۔"

عالم آرا کے لیے والدہ کو شیشے میں اتارنا مشکل نہ ہوا۔ حسن آرا سے تو پوچھنے کی ضرورت ہی نہ تھی کہ اسی کی خواہش پر تو شاہ مراد جیسے کالے کلوٹے بدرو آدمی کا رشتہ اس کے لیے منظور کیا جا رہا تھا۔ شاہ مراد کو بروکھوے کے لیے مدعو کیا گیا تو دروازے کی جھری سے جھانکتی حسن آرا کی والدہ بھونچکا رہ گئیں۔

"یہ..... یہ موا سیاہ تو اسی ملا ہے تم لوگوں کو میری شہزادی بیٹی کے لیے؟" وہ عالم آرا پر خفا ہوئیں۔

اب عالم آرا کو والدہ کو اصل حقیقت سے آگاہ کیے

بنا چارہ نہ رہا۔ ''اماں! ہم نے اب تک ابا کی ناراضگی کی وجہ سے زبان نہیں کھولی...... حسنہ کی اپنی پسند ہے یہ...... وہ کہتی ہے اگر گھر والوں نے اس سے میری شادی نہ کی تو میں خود اس سے شادی کرلوں گی۔''

''الٰہی خیر!'' والدہ نے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''ابا کو پتا نہ چلے یہ بات۔''

''حسنہ کی اس سے پہچان کیونکر ہوئی؟''

''میرے اور عطرت کے ساتھ فلم کی مہورت پر گئی تھی یہ...... بس وہیں حسنہ نے اس شخص کو دیکھا تھا۔''

''روئے گی سر پکڑ کر...... پچھتائے گی۔''

''اس کا اپنا فیصلہ ہے اماں!''

''ہم فیصلہ کرنے والے مر گئے تھے کیا۔ ایک سے بڑھ کر ایک رشتہ ملتا اس کے لیے...... اور مل ہی رہے تھے...... رشیدہ بانو کا بیٹا...... زلیخا کا دیور...... میں نے دونوں کو انکار کیا...... میں سمجھتی تھی کہ اسے کوئی شہزادہ بیاہنے آئے گا۔'' والدہ روہانسی ہو رہی تھیں۔

''اب کچھ نہیں ہوسکتا اماں...... اس کے سر پر چڑھی ہے۔''

''سب تمہارا کیا دھرا ہے۔''

''میرا؟''

''اور نہیں تو کیا...... نہ تم اسے مہورت پر لے جاتیں، نہ اس کے سر پر اس موئے کالے توے سے عشق کی چڑھتی۔''

''ہونے والی بات تھی اماں...... ہو کے رہتی...... میں نہ لے جاتی کوئی اور بہانہ بنتا...... اب تو عزت اسی میں ہے کہ اسے اس سے بیاہ دیا جائے۔''

''تمہارا مطلب ہے بیاہ دیں حسنہ کو اس سے؟''

''جی، میرا یہی مطلب ہے۔''

''تمہارے ابا سے بات کرتی ہوں...... بتاتی ہوں انہیں کہ صاحبزادی کا آنکھ مٹکا ہوگیا ہے...... خاندان کو جوڑنے کی ضرورت نہیں...... اس سے کہیں چار آدمی اپنے لے آئے، چار ہمارے ہوں گے...... دو بول پڑھائے اور لے جائے اس منحوس کو۔''

''نہ...... نہ...... ابا کو یہ سب نہ بتایئے گا۔ عطرت بات کرچکے ہیں ابا سے۔ اصل بات نہیں بتائی انہیں...... بس اس کی ملاقات کروائی ابا سے اور بتادیا انہیں کہ وہ آپ کے گھر میں رشتہ کرنا چاہتا ہے۔''

''لو...... میرے فرشتوں کو بھی خبر نہیں۔ بالا بالا یہ سب بھی ہوگیا۔'' والدہ نے گلہ کیا۔

''اماں! پہلے تو مردوں ہی میں بات ہونی تھی نا۔''

عالم آرا نے ماں کا گلہ دور کرنے کی کوشش کی۔

''پھر...... تمہارے ابا نے کیا کہا؟''

''انہوں نے آپ سے بات کرنے اور حسنہ کی رضا لینے کو کہا ہے۔''

''وہ موئی تو پہلے ہی تیار بیٹھی ہے۔''

''ابا کو تھوڑی معلوم ہے...... وہ تو میں نے آپ کو بتادیا بس۔''

''جتنی جلدی ہوسکے، نمٹاؤ اسے...... کوئی چاند نہ چڑھا دے کہیں یہ ناشدنی۔'' والدہ خفگی سے بولیں۔

☆☆☆

حسن آرا کی شاہ مراد سے شادی ہوگئی۔ پھول تھا جو شاہ مراد کے گھر کے آنگن میں کھلا...... چاند تھا جوان کے گھر کے صحن میں اترا۔ شاہ مراد کے دوستوں کے علاوہ رشتے داروں میں ایک نوبیاہتا کزن سلمٰی بھی شوہر کے ساتھ شادی میں شریک ہوئی۔ حسن آرا رخصت ہوکر شاہ مراد کے گھر پہنچیں تو اسی پھوپی زاد بہن سلمٰی نے دودھ سے ان کے پاؤں دھلائے۔ یہ بھی عجب رسم تھی لیکن دیکھنے والی آنکھیں حیران تھیں کہ پری رو حسن آرا کو ان کے گھر والوں نے کس دل سے شاہ مراد سے بیاہ دیا تھا۔ بجا کہ وہ ایک کامیاب فلم ڈائریکٹر تھے...... فلمی صنعت میں ان کا طوطی بولتا تھا...... روزی ہوائی تھی۔ اب گھر میں گھر والی آئی تو انہیں احساس ہوا کہ کما کر لٹا دینا کوئی فخر کی بات نہیں۔ چھڑے بندے کو بھی آگے کی فکر رکھنی چاہیے۔

حسن آرا سے شادی کرکے وہ بہت خوش تھے مگر حسن آرا کے حسن کی ضوپاشی انہیں حسن آرا کے مقابلے میں احساس کمتری اور خوف سے دوچار رکھتی۔ ان کے دل کی حالت اس معصوم بچے کی سی تھی جو کھلونا پاکر خوش تو ہو مگر چھن جانے کے خوف سے ڈرتا بھی ہو۔

حسن آرا جس کے نرم و ملائم گلابی گلابی پاؤں شاہ مراد کے گھر کی دہلیز پار کرنے سے پہلے دودھ سے دھلوائے گئے تھے، شاہ مراد سے اپنی ناز برداری کراتی۔ شاہ مراد اسے ہنی مون منانے لے گئے۔ دن عید تھے، راتیں شب برات...... تقریباً مہینا بھر شاہ مراد کام سے بھی فراغت لیے رہے۔ حسن آرا کے حسن اور اداؤں نے انہیں اپنا اسیر کرلیا تھا۔ وہ گھر میں ہوتے تو پروانہ بنے بیوی کے ارگرد منڈلاتے رہتے۔ گھر سے باہر جاتے تو اسے ساتھ لے جاتے اور اس پر فریفتہ رہتے۔

شاہ مراد نے دوبارہ کام پر جانا شروع کیا تو دو چار

pklibrary.com

دن بعد بھی حسن آرا نے ان سے کہا۔ ''آپ تو اپنے کام پر چلے جاتے ہیں، میں گھر میں اکیلی بور ہوتی رہتی ہوں۔''

''میں کل سے گاڑی بھجوا دیا کروں گا، تم اپنے گھر چلی جایا کرو۔ واپسی پر میں تمہیں اپنے ساتھ لیتا ہوا آجایا کروں گا۔''

''آپ کی واپسی تو پرسوں رات تین بجے ہوئی تھی اور کل بھی ڈیڑھ بج گیا تھا۔ کیا میرے گھر والے آپ کی واپسی کے انتظار میں بیٹھے رہیں گے۔''

''شوٹنگ کا معلوم نہیں ہوتا، کب تک چلے..... آرٹسٹوں کے نخرے بھی بہت ہیں اور ہیروئن تو..... بس کیا کہوں..... اسٹوڈیو میں راتیں جاگتی ہیں۔''

''مجھے بھی اپنے ساتھ لے جایا کریں۔ رات کو مجھے اکیلے ڈر لگتا ہے۔ وہاں اکیلے پن کا خوف تو نہ ہوگا۔''

''یہ تو بہت اچھا خیال ہے۔ مجھے بھی تمہارے اکیلے پن کی فکر نہیں ہوگی۔ اطمینان سے کام کر سکوں گا۔''

حسن آرا خوش ہوگئی۔ اس کی دلی مراد بر آنے کے امکان کو راستہ مل گیا تھا۔ اسٹوڈیو جانے اور کسی فلم پروڈیوسر کی نظروں میں آجانے سے اسے فلمی دنیا میں داخل ہونے کا موقع مل سکتا تھا..... شاہ مراد کو منا لیتا تو اسے اپنے بائیں ہاتھ کا کھیل دکھائی دیتا تھا۔ گو حسن آرا کو اسٹوڈیو ساتھ لے جانا تو شاہ مراد کو مناسب نہ لگا مگر فلمی دنیا میں ان کی اپنی مصروفیات اتنی زیادہ تھیں کہ انہیں حسن آرا کا دن بھر اکیلے گھر میں بور ہوتے رہنے اور رات کو ان کی واپسی کے انتظار میں دیر تک جاگتے رہنے کا شکوہ معقول لگا۔ تاہم انہوں نے اسے اپنے ساتھ اسٹوڈیو لے جانے سے قبل کہا۔ ''میں تو کام میں مصروف ہوں گا، تم وقت گزاری کے لیے کیا کرو گی؟''

''کچھ بھی کر لوں گی۔ گھر میں اکیلے رہنے سے تو بہتر ہوگا۔ اکیلے تو مجھے ڈر بھی لگتا ہے۔ دروازے پر کوئی دستک سنتی ہوں تو جان نکل جاتی ہے کہ کوئی چور ڈاکو نہ آگیا ہو۔''

شاہ مراد نے حسن آرا کو اپنے ساتھ لے جانا شروع کر دیا۔ حسن آرا کوئی کتاب، کوئی رسالہ اپنے ساتھ لے لیتی۔ نہ بھی لیتی تو اسٹوڈیو میں اِدھر اُدھر سے کچھ نہ کچھ پڑھنے پڑھانے کو مل ہی جاتا۔ مطالعے کے علاوہ بھی اسٹوڈیوز میں اور بہت کچھ ہوتا تھا..... ہیروئنوں کی ادائیں..... ہیروز کی دل لگیاں..... کیریکٹر ایکٹرز کی باراں دیدگی..... ایکسٹراز کی بے چارگی..... فلم سازوں کی جوتیاں سیدھی کرتے اور ہدایت کاروں کی جھڑکیاں سنتے پنٹرز..... اداکاری کے شوق میں منڈلاتے نوجوان..... ہیروئن بننے کے شوق میں گھر سے بھاگ کر اپنی آبرو داؤ پر لگانے والی لڑکیاں..... اخبارات و رسائل کے فلمی نامہ نگار..... اسٹل فوٹو گرافی کرتے فوٹو گرافرز..... ہیرو، ہیروئنوں اور ہدایت کاروں کو پان، سپاری پیش کرنے کے عوض فلموں میں چھوٹے موٹے کردار حاصل کرنے کی ضرورت مند رنگے بالوں والی، پان چباتی اور بزرگانہ وقار سے محروم معمر عورتیں۔

حسن آرا اچھی طرح تیار ہو کر شاہ مراد کے ساتھ اسٹوڈیو جاتی اور کسی نمایاں جگہ پر نہایت تمکنت سے بیٹھی ایک ایک کو دیکھتی رہتی۔ ایک معروف ہدایت کار کی گھر والی ہونے کے ناتے وہ ٹھسے سے رہتی۔ اپنی خوبروئی کا اعتبار اسے جلد ہی کسی جوہر شناس کی نگاہوں میں آنے کے زعم میں مبتلا رکھتا۔ اسے یقین تھا کہ جوہر شناس نظروں میں آتے ہی وہ پردۂ سیمیں کی زینت بنے گی اور باقی ساری ہیروئنوں کا بھٹا بٹھا دے گی۔ فلم ساز اور ہدایت کار ہاتھ باندھے اس کے سامنے کھڑے رہیں گے۔ اس کی ستارہ آنکھوں میں غرور جھلکتا..... ٹانگ پر ٹانگ دھرے، ہاتھ سینے پر دھرے، گردن اکڑائے، اپنی نشیلی آنکھوں کو اِدھر اُدھر گھماتے ہوئے وہ کسی جوہر شناس کی منتظر رہتی۔

حسن آرا کسی جوہر شناس کی نظر میں تو کیا آتی، اس سے شادی کے بعد شاہ مراد کی نئی ریلیز شدہ فلم مقابلے پر ریلیز ہونے والی ایک اور فلم کی خوش ادا نئی ہیروئن اور اس کے مقبول گانوں کی وجہ سے متوقع بزنس کرنے میں ناکام رہی۔ شاہ مراد ہی نہیں، فلمی صنعت سے وابستہ اور لوگوں کے لیے بھی یہ اچنبھے کی بات تھی کہ شاہ مراد کی ہدایت کاری میں بننے والی فلم پر ایک نسبتاً کم معروف ہدایت کار کی فلم سبقت لے گئی تھی۔

حسن آرا نے موقع غنیمت جان کر شاہ مراد سے کہا۔ ''یہ نئی ہیروئن پچتی کیا ہے۔ آپ اپنی کسی فلم میں مجھے کاسٹ کر کے دیکھیں..... فلم ہٹ نہ ہو تو میرا نام بدل دیجیے گا۔''

''کبھی سوچنا بھی مت۔'' شاہ مراد نے کہا۔

''کیوں؟''

''جانتی ہو فلموں میں کام کرنے والی زیادہ تر ہیروئنیں کہاں سے آتی ہیں؟''

''جہاں سے بھی آتی ہوں..... مجھے اس سے کوئی غرض نہیں..... میں تو آپ کے ساتھ کام کروں گی۔''

''نہ میرے ساتھ..... نہ کسی اور کے ساتھ۔'' شاہ مراد نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''کیوں؟''

''میں عزت دار آدمی ہوں۔ تم سے شادی اس لیے نہیں کی کہ تم سے فلموں میں اداکاری کرواؤں۔''

''مگر میں نے تو آپ سے اپنے اسی شوق میں شادی کی تھی۔''

''کس شوق میں؟'' شاہ مراد نے چونک کر اسے دیکھا۔

''فلموں میں کام کرنے کے شوق میں..... مجھے بہت شوق ہے۔''

شاہ مراد اس کا منہ دیکھنے لگے۔

''ایسے کیا دیکھ رہے ہیں..... میں نے آپ سے شادی اسی لیے کی تھی۔''

''ورنہ نہ کرتیں؟''

''ہاں۔'' اس نے بلا جھجک اعتراف کیا پھر بولی۔

''ابا کا تو میں نہیں کہہ سکتی کہ وہ کس وجہ سے آپ سے میری شادی کرنے پر راضی ہوئے، امان ہرگز نہ مانتی تھیں۔ عالمہ آپا نے انہیں سمجھایا کہ جب حسنہ راضی ہے تو آپ کیوں منع کرتی ہیں۔''

''عالمہ آپا کو کس نے بتایا کہ تم راضی ہو؟''

''میں نے خود۔''

شاہ مراد نے لمبا سانس کھینچا۔ ''اور تم اس لیے راضی تھیں کہ.....''

''ہاں، مجھے شوق تھا فلموں میں کام کرنے کا..... آپ کے ساتھ اسٹوڈیو جا کر کتنی بہت سی ایکٹریسوں کو دیکھا ہے میں نے جن سے زیادہ خوبصورت ہوں میں..... اور ایکٹنگ بھی ان سے زیادہ اچھی کر سکتی ہوں۔ آپ مجھے چانس تو دے کر دیکھیں۔'' اپنی کم عمری، نادانی اور ناتجربہ کاری میں حسن آرا شوہر سے وہ سب کچھ کہے جا رہی تھی جو اسے نہیں کہنا چاہیے تھا..... اور شاہ مراد جنہوں نے اپنی بدصورتی اور حسن آرا کی خوبصورتی سے ڈرتے ہوئے بغیر کسی منفعت کے صدق نیت سے اسے اپنی زندگی میں شامل کیا تھا، اس کے اس انکشاف پر دم بخود تھے کہ اس نے محض فلموں میں کام کرنے کے شوق میں ان سے شادی کی تھی۔

شاہ مراد نے ایک ٹھنڈی سانس بھری پھر بولے۔

''تم نے مجھ سے جس لیے بھی شادی کی، مجھے اس سے غرض نہیں۔ میں نے تمہیں اپنے گھر میں عزت سے بٹھانے کے لیے تم سے شادی کی ہے۔ تم میری بیوی ہو، میری عزت ہو..... میں تمہیں فلموں میں کام کروانے کے لیے اپنے گھر نہیں لایا۔ آئندہ یہ خیال بھی اپنے دل میں نہ لانا۔''

''مگر میرا شوق.....''

''شوق بہت سے ہوتے ہیں انسان کے دل میں..... ہر شوق پورا نہیں ہو سکتا، نہ کیا جاتا ہے۔ بعض شوق آدمی کی جان کو آجاتے ہیں۔'' شاہ مراد نے اس کی بات کاٹ کر اسے سمجھانے کی کوشش کی پھر قدرے تیز لہجے میں بولے۔ ''آئندہ تم مجھ سے یہ بات کرنا بھی مت۔''

حسن آرا نے منہ پھلا لیا۔

دو چار دن وہ شاہ مراد سے اینٹھی اینٹھی رہی۔ شاہ مراد نے اسے منانے کی کوشش نہیں کی۔ حسن آرا کے اس انکشاف سے انہیں صدمہ پہنچا تھا کہ اس نے ان سے فلم میں کام کرنے کا شوق پورا کرنے کے لیے شادی کی تھی۔ وہ سمجھ دار آدمی تھے۔ فلم نگری میں انہوں نے عورت کے بہت سے روپ دیکھے تھے۔ جانتے تھے کہ اگر انہوں نے حسن آرا کو منانے کی کوشش کی تو اسے اپنی غلطی کا کبھی احساس نہ ہوگا۔ وہ کم عمر تھی مگر اتنی بھی نہیں کہ یہ نہ جانتی کہ وہ کیا کہہ رہی تھی اور کس سے کہہ رہی تھی۔ شوہر کو منہ در منہ یہ بتانا کہ اس سے استوار رشتۂ حیات کی بنیاد صدق و صفا اور بے غرضی نہیں، کوئی غرض تھی اور غرض بھی کیا..... ! بیوی کو زیب نہیں دیتا تھا..... حسن آرا کو اس کا احساس دلانا ضروری تھا۔

دو چار دن اینٹھی رہنے کے بعد حسن آرا خود ہی من گئی۔ شاہ مراد نے اپنی ناراضگی کو طول دینا مناسب نہیں سمجھا۔ حسن آرا سے رفاقت حیات کا رشتہ تھا۔ اس رشتے کی حفاظت اور برقراری کے لیے مرد ہی کو اکثر درگزر اور سمجھ داری سے کام لینا پڑتا ہے۔

''تمہیں معلوم نہیں کہ فلم میں کام کرنے کا شوق رکھنے والی لڑکیوں کو نگار خانوں میں کیا کچھ قربان کرنا پڑتا ہے۔'' انہوں نے حسن آرا کو سمجھانے کی کوشش کی۔

''میں کوئی گھر سے بھاگی لڑکی تھوڑی ہوں..... آپ کی بیوی ہوں۔'' حسن آرا کے پاس جواب موجود تھا۔

''ہاں، اسی لیے مجھے بھی گوارا نہیں ہوگا کہ تمہیں کسی غیر مرد کی بانہوں میں ناچتے دیکھوں یا کوئی میک اپ مین تمہارے چہرے کو چھوئے۔ کیا تمہیں اچھا لگے گا یہ سب..... اور ہاں ایک بات اور سمجھ لو..... میں نے کئی حسین لڑکیوں کا ایک ہی فلم کے بعد ڈبا گول ہوتے بھی دیکھا ہے..... پھر کوئی نہیں پوچھتا انہیں..... تم میری بیوی ہی نہیں، ایک شریف خاندان کی بیٹی بھی ہو۔ اپنی، میری اور اپنے خاندان کی عزت اور نیک نامی کا خیال رکھنا تم پر لازم ہے۔''

حسن آرا نے جس لالچ میں شاہ مراد سے شادی کی تھی، وہ تو تمام ہوئی ہی..... اس کے اور شاہ مراد کے رشتے

میں بھی ہمیشہ کے لیے ایک دراڑ پڑ گئی۔ تاہم شاہ مراد اس دراڑ کے باوجود حسن آرا سے رفاقتِ زندگی کا رشتہ نبھانے کے لیے اب بھی پُرعزم تھے۔

☆☆☆

حسن آرا امید سے ہو گئی۔

شاہ مراد نے حسن آرا کو اپنے ساتھ اسٹوڈیو لے جانا ترک کر دیا اور ایک بیوہ عورت کو گھر کے کام کاج میں حسن آرا کی معاونت اور فارغ وقت میں اس کی مصاحبت کے لیے ملازم رکھ لیا۔

سیانوں کا کہنا ہے مرد کو پیسا عورت کے نصیب سے ملتا ہے...... حسن آرا سے شادی کے بعد شاہ مراد کی محض ایک فلم ہی کا باکس آفس پر بزنس نہ کرسکنا اتفاق گردانا جاسکتا تھا مگر یکے بعد دیگرے تین فلموں کا فلاپ ہو جانا محض اتفاق نہ تھا...... عورت کی نیت راست ہو اور اس کی دعائیں ساتھ ہوں تو مرد پھلتا پھولتا ہے...... جہاں نیت ہی راست نہ ہو، وہاں عروج کو زوال ہو جاتا ہے۔

شوبز کی دنیا بڑی بے مروت اور بے وفا ہے...... چڑھتے سورج کی پجاری...... فلموں کی ناکامی نے شاہ مراد کو دیوار سے لگا دیا۔ اسٹوڈیوز میں گونجتی ان کی آواز معدوم ہو گئی اور ان کے نام کا سکہ کھوٹا قرار پایا۔ وہ سرمایہ کار اور فلم ساز جو شاہ مراد کے نام پر آنکھ بند کر کے فلم سازی میں پیسا لگانے کو تیار رہتے تھے، اب شاہ مراد سے آنکھیں پھیر کر چلتے۔ حسن آرا جس نے فلموں میں اداکاری کرنے کا موقع ملنے کے چکر میں شاہ مراد سے شادی کی تھی، اسے شادی کے بعد شاہ مراد سے پہلے بھی عشق نہ تھا، ان کا زوال شروع ہوا تو رہی سہی مروت بھی گئی۔ اس کے فلموں میں اداکاری کے شوق کو تو وہ پہلے ہی رد کر چکے تھے۔ ان کے معاشی زوال نے حسن آرا کا عیش وعشرت سے زندگی گزارنے کا خیال بھی محال کر دیا...... گو شاہ مراد اسے حالات بہتر ہو جانے کا دلاسا دیتے رہتے تھے۔ ہر روز وہ اپنا بستہ اٹھا کر جس میں دو چار رجسٹرز موجود ہوتے جن میں انہوں نے اپنی آئندہ فلموں کے موضوعات، کہانیوں کے خاکے، مجوزہ کاسٹ اور دیگر یادداشتیں رقم کر رکھی تھیں، اپنے ساتھ لے کر اسٹوڈیوز جاتے...... دن بھر کام کی تلاش میں مارے مارے پھرتے اور شام کو منہ لٹکائے تھکے ہارے گھر لوٹ آتے۔

"کچھ ہوا؟" حسن آرا پوچھتی۔

شاہ مراد مایوسی اور شرمندگی سے نفی میں سر ہلا دیتے۔

"کیسے گزرے گی؟" حسن آرا کہتی۔

"اللہ پر بھروسا رکھو۔"

"ہونہہ!" حسن آرا نخوت سے اپنا سر جھٹکتی۔

ہوٹل بازی، گاڑیوں میں گھومنا، ڈائریکٹر کی بیوی ہونے کے ناتے اسٹوڈیوز میں پذیرائی بھولا بسرا افسانہ بن گئے تھے۔ مکان کرائے کا تھا، گاڑی اب کم کم ہی استعمال ہوتی۔ شاہ مراد زیادہ تر بسوں میں ہی آتے جاتے تھے۔

شادی کے بعد ڈیڑھ دو سال ہی فراغت سے گزرے تھے۔ سات آٹھ سال میں چار بچے بھی دنیا میں آگئے...... انیتا، انیقہ، شاہ تاج اور امینہ...... حسن آرا، شاہ مراد سے اکھڑی اکھڑی اور شاہ مراد اس سے شرمندہ شرمندہ رہتے۔ شادی کے بعد خوشحالی کے دنوں میں یہی شاہ مراد تھے جن کا بازو تھام کر حسن آرا نازاں وفرحاں اسٹوڈیوز میں داخل ہوا کرتی تھی اور ایک ایک کو یوں دیکھتی جیسے فاتح اپنے مفتوحین کو دیکھا کرتے ہیں۔ بڑی بڑی ہیروئنیں اس سے تپاک سے ملتیں...... ہیرو جھک کر آداب کرتے...... چھوٹے موٹے اداکار تو اس کے سامنے بچھ بچھ جاتے اور شاہ مراد جن کی وجہ سے اسے یہ توقیر وتکریم ملتی تھی، اس کی جنبشِ ابرو کے پابند رہتے۔

حسن آرا سے شاہ مراد کی شادی کے بعد حسن آرا کو دیکھنے پر شاہ مراد کے حلقۂ احباب میں موجود سیانوں کا کہنا تھا...... "شاہ مراد غلطی کر گئے۔ انہیں اپنے سے آدھی عمر کی دوشیزہ اور وہ بھی حسینہ جمیل سے شادی کرنے کے بجائے اپنے جوڑ کی عورت سے بندھن باندھنا چاہیے تھا۔" بعض احباب نے تو سینہ ٹھونک کر دعویٰ کیا تھا کہ حسن آرا سے شاہ مراد کا رشتہ زیادہ عرصہ نہیں چلے گا۔

بہرحال ماں باپ ہی تھے جن کی وجہ سے حسن آرا، شاہ مراد کے معاشی معاملات دگرگوں ہونے کے باوجود ان کے ساتھ رہنے پر مجبور رہی۔ شادی سے پہلے بھی اسے اپنے حسن اور شاہ مراد کی بدصورتی کا بخوبی احساس تھا۔ اسی احساس نے شادی کے بعد شاہ مراد کے ساتھ اس کے رویے میں ہمیشہ غرور وتکبر کو غالب رکھا۔ ماں سمجھ دار عورت تھیں۔ ہمیشہ اسے سمجھاتیں۔ "شوہر مجازی خدا ہوتا ہے...... خدا کے علاوہ کسی کو سجدہ کرنے کی اجازت ہوتی تو وہ عورت کا شوہر ہی ہوتا۔"

بڑی بہن عالم آرا کی میکے میں موجودگی کے دوران ایک روز والد نے حسن آرا کو شاہ مراد کا مذاق اڑاتے سنا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "لائٹ چلی جائے تو مجھے شاہ مراد کو ڈھونڈنے کے لیے ٹارچ جلانا پڑتی ہے۔"

''کیا کہا؟'' والد سامنے آ کھڑے ہوئے اور آگ بگولا ہو کر بولے۔ ''شریف آدمی ہے..... ملتا کوئی لچا لفنگا تو دن کی روشنی میں بھی نہ ڈھونڈ پاتیں اسے تم۔''

''مذاق کر رہی تھی ابا!'' حسن آرا نے کان دبا کر کہا۔

''مذاق! شوہر کی تو تیر کی جاتی ہے کہ اس کا مذاق اڑایا جاتا ہے..... کبھی اپنی ماں کو میرا مذاق اڑاتے دیکھا؟''

حسن آرا نے کان دبا لیے۔

''آئندہ نہ سنوں۔'' والد نے تنبیہہ کی۔

حسن آرا ہی نہیں، گھر میں کسی کی بھی اختر حسین سے روگردانی کی مجال نہ تھی۔ انہی کا رعب دبدبہ تھا جو حسن آرا کو نہ چاہتے ہوئے بھی شاہ مراد سے ان کے زوال میں بھی نباہ کیے جانے پر مجبور رکھتا تھا۔ جب تک باپ حیات رہے، حسن آرا شوہر کے معاملے میں باپ کے سامنے دبی لجی رہی۔

امینہ کی پیدائش کے چند ماہ بعد جب والد مختصر علالت کے بعد چل بسے تو حسن آرا کو کسی کا خوف یا لحاظ نہ رہا۔ باپ کے انتقال کے کچھ ہی عرصے بعد ماں بھی چل بسیں تو کوئی سمجھانے بجھانے والے نہ رہا اور شاہ مراد کے ساتھ اس کا متکبرانہ رویہ توہین آمیز ہو گیا۔ وہ بات بات پر انہیں جھڑکتی..... چھوٹی چھوٹی باتوں پر ان سے لڑتی جھگڑتی..... ان کا کھلے عام مذاق اڑاتی..... انہیں بیروزگاری کے طعنے دیتی..... فلم انڈسٹری میں ان کے زوال کو ان کی نااہلی پر محمول کرتی..... سختی میں ان کا ساتھ دینے کے بجائے اپنی جا و بے جا خواہشات کی تسکین چاہتی۔ بچوں کے اسکول جانے کا مرحلہ آیا تو اس نے اپنے معاشی حالات کے مطابق سرکاری اسکول میں بچوں کو داخل کرانے کے بجائے مہنگی فیسوں والے پرائیویٹ اسکول کا انتخاب کیا۔

شاہ مراد فطرتاً شریف الطبع اور رکھ رکھاؤ والے آدمی تھے۔ بیوی سے بھی اپنی مفلوک الحالی پر دے میں رکھتے۔ کبھی اسٹوڈیوز میں چھوٹے موٹے کام کی اجرت سے، کبھی ہمدرد دوستوں سے قرض ادھار لے کر حسن آرا اور بچوں کی ضروریات پوری کرتے اور اس پر بھی حسن آرا کی کڑوی کسیلی باتیں اور طعن و تشنیع کو کان دبائے سنے جاتے۔ بھرے شہر میں بس دو نفوس تھے جن سے وہ اپنے دل کا درد بیان کر سکتے تھے۔ ایک ان کی پھوپی زاد بہن سلمیٰ جو برسوں پہلے بیاہ کر بھارت سے پاکستان آئی تھی، دوسرے عطرت خیال جن سے پہلے تو فلمی دنیا کے حوالے سے تعلق تھا، حسن آرا سے شادی کے بعد ہم زلف بن چکے تھے۔

عطرت خیال وضع دار آدمی تھے۔ شاہ مراد کا دورِ عروج دیکھے ہوئے تھے۔ ان کی تخلیقی صلاحیت سے آگاہ تھے اور فلم نگری کی بے مروتی سے بھی واقف تھے۔ خاندانی طور پر امیر تھے، اولاد بھی نہیں..... بس وہ اور بیوی..... اور آمدن کثیر۔ آبائی جائدادوں سے ملنے والا کرایہ ہی نہایت فراغت سے گزر بسر کے لیے بہت تھا۔ معاش کی فکر تھی نہ کوئی اور پریشانی۔ شاعری سے رغبت رکھتے تھے۔ فلموں کے لیے نغمہ نگاری روزگار نہیں، شوق اور وقت گزاری تھی۔

شاہ مراد کے بدلے ہوئے حالات میں بھی اپنی وضع داری اور ان سے ہم زلف کا رشتہ ہونے کے باعث پہلے کی سی عزت دیتے اور اکثر کسی نہ کسی بہانے ان کی مالی مدد بھی ان کی عزتِ نفس کو ٹھیس پہنچائے بغیر کرنے کی کوشش کرتے۔ شاہ مراد متردد ہوتے تو ان سے کہتے۔ ''ارے بھائی! یہ بچوں کے لیے پھل، مٹھائی کو دے رہا ہوں..... آخر میرا بھی ان سے کچھ رشتہ ہے کہ نہیں۔''

''آپ ہی کے بچے ہیں۔'' شاہ مراد کہتے۔

''تو پھر تکلف کیوں؟''

شاہ مراد کھسیانی سی مسکراہٹ کے ساتھ سر جھکا لیتے۔

عالم آرا بھی میاں سے چوری چھپے بہن کی مدد کرتی رہتیں۔ شاہ مراد سے اپنے شوہر کی دوستی کا انہیں بہ خوبی علم تھا۔ جانتی تھیں کہ وہ شاہ مراد سے ہمدردی رکھتے تھے اور اکثر اس ہمدردی کا اظہار بھی کرتے۔

''حسنہ کی تو قسمت پھوٹ گئی اس شخص سے شادی کر کے۔'' عالم آرا شوہر سے اکثر کہتیں۔

''اور میں اگر یہ کہوں کہ تمہاری بہن سے شادی کے بعد اس بے چارے کا تختہ بیڑہ گیا؟''

''آپ کا مطلب ہے حسنہ سزقدم رہی اس کے لیے؟''

''دونوں کے ستارے نہیں مل پائے۔''

''حسنہ کا حوصلہ ہے جو ایک بے روزگار آدمی کے ساتھ نباہ کر رہی ہے اور وہ بھی چار بچوں کے ساتھ۔''

''باصلاحیت آدمی ہے۔ یہ دنیا کے اتار چڑھاؤ ہیں۔ ہم نے اڑتے ہوؤں کو گرتے اور گرے ہوؤں کو اڑتے دیکھا ہے۔ خدا کو شاہ مراد کو دوبارہ اٹھاتے کیا دیر لگتی ہے۔''

''جب اٹھیں گے، اٹھیں گے..... ابھی تو حسنہ سختی میں ہے..... فلم نہیں مل رہی تو شاہ مراد کچھ اور کریں..... کوئی اور کام ڈھونڈیں..... حسنہ ایسے کب تک گزارے گی۔''

''شوہر کے مشکل حالات میں اس کا ساتھ دینا بیوی کا فرض ہے۔ وقت گزر جاتا ہے..... بُرے وقت میں ساتھ دینے والا یاد رہ جاتا ہے۔''

''حسنہ اکیلی نہیں ہے، بچے بھی ہیں اور بچوں کی ضرورتیں بھی..... کھانا پینا، کپڑے، اسکول کی فیسیں اور بہت سے اخراجات۔'' عالم آرا بہن کی وکالت کرتیں۔

''اپنی چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانے چاہئیں تمہاری بہن کو..... کیا ضرورت ہے بچوں کو مہنگے کپڑے پہنانے اور مہنگے اسکول میں پڑھانے کی؟ میں جب دیکھتا ہوں، بچوں نے نئے کپڑے پہنے ہوتے ہیں..... مفت تو نہیں ملتے ہوں گے۔''

''اپنی عزت رکھنے کو بچوں کو اچھا پہنانا پڑتا ہے۔''

''دو جوڑے کپڑوں میں بھی عزت رکھی جاسکتی ہے۔ دوسری بات یہ کہ عزت اچھا پہننے سے نہیں، اچھے کردار سے ہوتی ہے۔''

''شاہ مراد سے کہیں فلم کے بجائے کوئی دوسرا کام ڈھونڈیں۔''

''اسے اپنی ذمے داری کا ہم تم سے زیادہ احساس ہے۔''

''حسنہ تنگ آچکی ہے اس کے نکمے پن سے۔''

''وہ شخص نکما نہیں ہے..... ایماندار، محنتی اور باصلاحیت ہے..... بس قسمت کا ہیر پھیر ہے۔''

☆☆☆

فلم والوں کی بے مروتی سے دل شکستہ شاہ مراد نے ایک ہفت روزہ میگزین میں نائب مدیر کی ملازمت کرلی۔ پڑھے لکھے آدمی تھے۔ مطالعہ وسیع تھا۔ میگزین کی ملازمت میں مشاہرہ بس گزارے لائق تھا۔ اللے تللوں کی ذرا گنجائش نہ تھی۔ پاؤں سمیٹ کر اپنی چادر کے مطابق زندگی گزاری جاسکتی تھی بس..... سر دست یہ آسرا بھی بہت تھا۔ شاہ مراد کو امید تھی کہ جلد یا بدیر ان کا چراغِ شہرت پھر جل اٹھے گا۔

حسن آرا دن بہ دن بیزار ہوتی جارہی تھی۔ اس نے اس طرح کی بے مایہ زندگی کا تصور بھی نہ کیا تھا۔ شاہ مراد سے شادی کے بعد فلمی ہیروئن نہ بن سکی نہ سہی زندگی تو پرآسائش ملی ہوتی..... وہ خوبرو تھی..... خاندانی طور پر مستحکم تھی۔ بڑی بہن ایک شاعر اور فلمی نغمہ نگار مگر جدی پشتی مالدار آدمی سے بیاہی تھیں..... منجھلی بہن اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ برطانیہ میں مقیم تھی اور نہایت پرسکون اور خوشحال زندگی گزار رہی تھی۔ تینوں بہنوں میں وہ سب سے زیادہ خوبصورت اور گھر والوں کی لاڈلی رہی تھی۔ اسے تو بڑی دو بہنوں سے زیادہ پُرآسائش اور پُرسکون زندگی ملنا چاہیے تھی۔ یہ کیا کہ صبح کا شام کرنا مشکل ہو۔ شوہر بھی ایسا جس کی صورت دیکھنے کو جی نہ چاہے۔ حسن آرا دل ہی دل میں خود کو برا بھلا کہتی..... پھٹکارتی کہ تو نے فلمی اداکارہ بننے کے شوق میں اپنی زندگی ہی برباد کرلی۔

شاہ مراد کو نہ صرف اپنے کیریئر کے زوال کا دکھ تھا بلکہ فلمی دنیا کے باسیوں کی بے مروتی کا بھی..... حسن آرا سے شادی انہوں نے صدقِ دل اور خلوصِ نیت سے کی تھی۔ اس کا ہاتھ بنا کسی لالچ اور غرض کے تھاما تھا۔ انہیں اس سے محبت تھی..... اس لیے نہیں کہ وہ خوبصورت تھی..... بلکہ اس لیے کہ اس سے ان کا زندگی میں ہمسفری کا رشتہ تھا..... وہ ان کی شریکِ حیات تھی..... ان کے بچوں کی ماں تھی..... اس کے دم سے ان کا گھر آباد تھا..... اس کے ہونے سے ان کے گھر میں روشنی تھی..... زندگی تھی۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ حسن آرا ان کے ساتھ رہ کر خوش نہیں تھی۔ مارے باندھے گزارہ کررہی تھی۔ اجینہ کی پیدائش کے بعد سے ان کا حسن آرا سے ازدواجی رشتہ محض نام کی حد تک تھا۔ ایک ہی گھر کی چھت تلے وہ اور حسن آرا نامحرموں کی طرح رہ رہے تھے۔ وہ ان کے لیے ناشتا یا کھانا میز پر رکھ دینے کی بھی روادار نہ رہی تھی۔ شاہ مراد اپنے لیے چائے خود بناتے اور رات کے بچے سالن اور باسی روٹی کو توے پر گرم کرکے ناشتا کرتے۔ باہر سے گھر واپسی پر کھانا پکا ہوا ملتا تو کھانا خود نکال لیتے۔ اپنے جھوٹے برتن خود دھو لیتے..... میلے کپڑے خود دھوتے..... بیمار ہوتے تو خود ہی لوٹ پوٹ کر کھڑے ہوجاتے..... حسن آرا جھوٹوں بھی نہ پوچھتی۔ ان سے کوئی بات کرنی ہوتی تو کسی بچے کو بیغامبر بناتی۔ ان کے بستر کی چادر ملگجی اور شکن آلود رہتی۔ حسن آرا سے دھونا یا جھاڑنا، جھٹکنا تو کیا، ہاتھ لگانا بھی پسند نہ کرتی۔ شاہ مراد افسردہ دلی سے اور کن انکھیوں سے اس کی بے رحمی اور لاتعلقی دیکھتے مگر زبان سے کچھ نہ کہتے۔ فلم اسٹوڈیوز جہاں ان کے نام کا سکہ چلتا تھا، اب وہاں معمولی اجرت پر بھی جز وقتی کام ملتا تو سر جھکا کر کرلیتے۔ حسن آرا سے ان کی محبت برقرار تھی اور وہ ہر حال میں اس سے اپنا رشتہ جوڑے رکھنا چاہتے تھے۔

لیکن حسن آرا کا معاملہ الٹ تھا۔ اس کے دل میں ان سے محبت کی دور دور تک رمق نہ تھی۔ وہ ان سے لاتعلق رہنے میں خود کو بجا محسوس کرتی تھی..... اور اس کے اس احساس کو بڑی بہن عالم آرا مزید ہوا دیتی تھیں۔

''یہ آدمی تمہارے لائق تھا ہی نہیں حسنہ!'' وہ اکثر کہتیں۔

''آپ ٹھیک کہتی ہیں عالمہ آپا!''

''کہاں تم اور کہاں وہ..... ایک سے بڑھ کر ایک رشتہ مل سکتا تھا تمہارے لیے مگر..... تم ہی بے وقوفی کر گئیں۔''

''غلطی ہوگئی آپا!''

''تمہاری اس غلطی میں بے چارے تمہارے بچوں

کا کیا قصور؟''

حسن آرا نادم ہو کر اثبات میں سر ہلاتی اور رنجور ہو کر کہتی۔ ''انہی کے لیے تو پریشان رہتی ہوں میں...... ان کے باپ سے تو مجھے کوئی امید نہیں...... ان کے مستقبل کی فکر مجھے پریشان رکھتی ہے۔''

عالم آرا مسلسل شاہ مراد کو بُرا بھلا کہتیں اور حسن آرا کو ان سے پیچھا چھڑانے پر اکساتی رہتیں۔

''دل تو میرا بھی یہی چاہتا ہے آپا...... لیکن بچوں کو لے کر جاؤں گی کہاں۔ بچوں کو لے کر بیٹھنے کا کوئی ٹھکانا ہوتا تو میں کب کا فیصلہ لے چکی ہوتی۔''

''ٹھکانے کا کیا ہے...... ہمارے گھر کی اوپری منزل خالی پڑی ہے۔ عطرت کہتے ہیں کرائے دار رکھو تو روز کسی نہ کسی بات پر چخ چخ رہتی ہے...... آج پانی نہیں آ رہا...... آج یہ ہے...... اپنی پرائیویسی بھی نہیں رہتی۔ تم چاہو تو بچوں کے ساتھ اوپر رہ سکتی ہو۔'' ایک روز عالم آرا نے کہا۔

انگلی پکڑانے کی دیر تھی۔ حسن آرا کو آسرا ملا تو دل کھل اٹھا مگر خدشہ بھی ہوا۔

''عطرت بھائی کو اعتراض ہوا تو؟''

''انہیں بھلا کیا اعتراض ہوگا...... وہ تو میری مرضی کے تابع ہیں۔''

حسن آرا کو حوصلہ ملا۔ اس نے شاہ مراد سے طلاق حاصل کرنے کا فیصلہ کر لیا اور انیتا سے پیغامبری کرائی۔

''پاپا! ماما کہتی ہیں...... وہ آپ کے گھر سے جا رہی ہیں۔''

''کہاں؟'' شاہ مراد چونکے۔

انیتا ماں کی طرف گئی اور اگلا پیغام لائی۔ ''ماما کہہ رہی ہیں آپ کو اس سے مطلب نہیں ہونا چاہیے۔''

''کیوں نہیں ہونا چاہیے۔''

حسن آرا خود شاہ مراد کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

''مجھے فیصلہ چاہیے۔''

''کیسا فیصلہ؟''

''طلاق!''

شاہ مراد اس کا منہ دیکھنے لگے۔ ''تمہیں معلوم ہے تم کیا کہہ رہی ہو؟''

''اچھی طرح۔''

''بچوں کا سوچا تم نے؟''

''مجھے طلاق چاہیے۔'' وہ فیصلہ کن لہجے میں بولی۔

''کبھی نہیں دوں گا۔''

''میں پھر بھی اس گھر سے جا رہی ہوں۔''

بصیرت

☆ جس انسان میں بصیرت اور سوجھ بوجھ کا مادہ ہے، اسے علم و حکمت اور دانائی حاصل ہو جاتی ہے۔

☆ ذہن کی تیزی خداداد بصیرت کا ثمر ہوتی ہے۔

☆ صاحبانِ بصیرت کے لیے ہر نگاہ میں عبرت اور ان کے واسطے ہر ایک تجربے میں نصیحت ہوتی ہے۔

☆ تحقیق، قیادت کے آثار کھلے طور پر موجود ہیں۔ اس کی نشانیاں دیکھنے والوں کے سامنے ظاہر ہو چکی ہیں مگر یہ سب بھید اہلِ بصیرت پر منکشف ہوتے ہیں۔

☆ بصیرت، بیدار مغزی کی حامل ہوتی ہے۔

خوشیوں کا راز

☆ سچ بولنے میں ہے، خیالات کو پاکیزہ بنانے، دکھی انسانوں کے کام آنے، اپنا فرض، قرض سمجھ کر ادا کرنے، والدین کی خدمت اور استاد کا ادب کرنے میں ہے۔

☆ چہار سو علم کے چراغ جلانے، محبت کے خوشنما پھول کھلانے، نفرت کے کانٹوں کو جلا کر راکھ کرنے اور میٹھے بول بولنے میں ہے۔

☆ قلم کی حرمت کو برقرار رکھنے، دنیا کو امن کا گہوارہ بنانے اور دوسروں کو خوشیاں بانٹنے میں ہے۔

انمول باتیں

☆ خوبصورت ہونا اہم نہیں بلکہ اہم ہونا خوبصورت ہے۔ جس طرح کئی خوبصورت بادلوں میں پانی نہیں ہوتا اسی طرح کئی خوبصورت لوگوں میں خوبصورتی نہیں ہوتی۔

☆ یہ نہ دیکھو کہ کون بول رہا ہے بلکہ یہ دیکھو کہ کیا بول رہا ہے۔

☆ غصہ پی جانے کی عادت اچھی ہے کیونکہ اگر تمہارے اندر آگ لگی ہے تو دھواں باہر نہ نکلے تو اچھا ہے۔

☆ رشتے داری وہ گاڑی ہے جو پیٹرول کے بجائے خون مانگتی ہے۔

☆ کسی شخص کی سمجھ داری کی ضمانت وہ شخص ہے جس سے وہ محبت کرتا ہے۔

(مرسلہ: محمد انور ندیم۔ اسلام نگر، حویلی لکھا، اوکاڑہ)

pklibrary.com

''بیوقوف مت بنو۔''

''مجھے عقلمندی کا سبق مت پڑھائیں..... میں نے علیحدگی کا فیصلہ کرلیا ہے۔''

''بچوں میں سے کوئی نہیں جائے گا تمہارے ساتھ۔''

حسن آرا نے نام بنام چاروں بچوں کو پکارا اور وہ سامنے آکھڑے ہوئے۔

وہ ایک ابر آلود شام تھی۔

چاروں بچے سہمے ہوئے کھڑے تھے۔

''پوچھ لو ان سے۔'' شاہ مراد کو جیسے یقین تھا کہ بچے ان کا ساتھ دیں گے۔

''میرے ساتھ کون جارہا ہے؟'' حسن آرا نے چاروں بچوں کو اچٹتی ہوئی نظر مگر اس یقین سے دیکھا جیسے چاروں اسی کا ساتھ دیں گے۔

سب سے پہلے انیتا ماں کے ساتھ جا کھڑی ہوئی پھر شاہ تاج۔

''انیقہ!'' حسن آرا نے انیتا سے چھوٹی بیٹی کو دیکھا۔ وہ بھی ماں کی طرف جانے کو تھی کہ اس کی نگاہیں باپ کی نظروں سے ملیں اور ان میں ڈوبتی بے چارگی نے اس کے قدم پکڑ لیے۔

''انیقہ!'' حسن آرا نے اب کی بار ذرا کڑک کر کہا۔

اس نے باپ کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''آؤ امینہ!'' حسن آرا نے سب سے چھوٹی بیٹی کو اپنی طرف آنے کا اشارہ دیا۔

''یہ تو رات کو میرے بغیر سوتی ہی نہیں۔'' شاہ مراد نے امینہ کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

''انیقہ ہے نا آپ کے پاس۔''

''امینہ کو بھی یہیں رہنے دو۔''

حسن آرا نے انیقہ کو گھورا۔

''کیوں برباد کرنا چاہتی ہو بچوں کو..... کیوں انہیں بے گھر کرنا چاہتی ہو؟''

حسن آرا نے ایک نہ سننے کی ٹھان رکھی تھی۔

اس ابر آلود شام شاہ مراد اور حسن آرا کے درمیان بچوں کا بٹوارا ہوگیا..... انیتا اور شاہ تاج، حسن آرا کے ساتھ چلے گئے..... انیقہ اور امینہ، شاہ مراد کے ساتھ رہ گئیں۔

رات کو امینہ تو باپ کے سینے پر اپنا سر رکھ کر سو گئی..... دس سالہ انیقہ دیر تک جاگتی رہی۔ سوئی تو بار بار اس کی آنکھ کھلتی رہی۔ اسے ماں، انیتا اور شاہ تاج بے طرح یاد آرہے تھے۔

☆☆☆

اگلی صبح شاہ مراد نے انیقہ اور امینہ کو اسکول جانے سے قبل دروازے کے تالے کی چابی انیقہ کو دیتے ہوئے سمجھایا۔ ''بیٹا! میں تو دفتر جارہا ہوں گا۔ تم اسکول سے واپسی پر چابی سے تالا کھول کر گھر میں آجانا..... اندر سے دروازے کی چٹخنی چڑھا لینا۔''

''پاپا! میرا ہاتھ تو چٹخنی تک جائے گا ہی نہیں۔''

''کرسی یا اسٹول پر چڑھ کر بند کرلینا..... اور ہاں، جب تک میں نہ آجاؤں، دروازہ مت کھولنا۔''

''ٹھیک ہے۔''

''امینہ چھوٹی ہے۔ اس کا خیال رکھنا۔''

''ٹھیک ہے پاپا!'' انیقہ خود کو بہت بڑا اور ذمے دار محسوس کررہی تھی۔

''کوئی دروازہ کھٹکھٹائے تو کہہ دینا ماما گھر میں نہیں ہیں۔''

''اور پاپا دفتر گئے ہیں۔'' انیقہ نے باپ کی بات کو گرہ لگائی۔

''شاباش! میرا بچہ بہت سمجھ دار ہے۔'' شاہ مراد نے انیقہ کا گال تھپتھپایا۔

''پاپا!''

''جی بیٹا!''

''ماما کیوں چلی گئیں؟''

''ان کی مرضی بیٹا!''

''اب کبھی نہیں آئیں گی؟''

''پتا نہیں..... اور ہاں دیکھو، روٹی رکھی ہے..... سالن بھی ہے..... دونوں بہنیں مل کر کھالینا۔ چولہا جلانے کی ضرورت نہیں..... رات کا کھانا میں دفتر سے آکر پکاؤں گا..... کیا کھاؤ گی تم دونوں؟''

''پاپا جی، چاول!'' امینہ نے فوراً جواب دیا۔

''پاپا! ماما پاس کب چلیں گے؟'' امینہ نے نہایت معصومیت سے پوچھا۔

''چلو بیٹا! بیگ اٹھاؤ..... دیر ہورہی ہے۔ اسکول بس نکل جائے گی۔'' شاہ مراد نے امینہ کی بات کا جواب دینے کے بجائے کہا۔

گھر سے باہر نکل کر شاہ مراد نے انیقہ کو دروازے میں تالا ڈالنے اور کھولنے کی مشق کرائی پھر انہیں اسکول بس میں بٹھانے چل دیے۔ امینہ بار بار پوچھتی رہی۔ ''ماما کب آئیں گی؟''

شاہ مراد جانتے تھے حسن آرا کہاں گئی ہوں گی۔ انیقہ اور امینہ کو اسکول بھیجنے کے بعد دو خود تیار ہوئے اور حسبِ

معمول دفتر جانے کے بجائے عالم آرا کے ہاں پہنچے۔ عطرت خیال گھر پر ہی تھے۔ گزشتہ شام حسن آرا کی بچوں کے ساتھ آمد اور خلافِ عادت رات کو بھی قیام نے انہیں کھٹکا رکھا تھا۔ بیوی سے پوچھا تو وہ یہ کہہ کر ٹال گئیں۔ ''چلی جائے گی ایک دو دن رہ کر۔'' شاہ مراد کی اترے ہوئے چہرے کے ساتھ آمد نے عطرت کے اندیشے کو ہوا دی۔

''کیا کچھ کھٹ پٹ ہوگئی ہے تمہارے اور تمہاری بیوی کے درمیان؟'' انہوں نے شاہ مراد سے پوچھا۔

''کھٹ پٹ!'' شاہ مراد نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ ''حسنہ نے کچھ نہیں بتایا؟''

''نہیں۔'' عطرت سنبھل کر بیٹھ گئے۔

''اس نے مجھ سے علیحدگی کا فیصلہ کرلیا ہے..... طلاق کا مطالبہ کیا ہے مگر میں طلاق نہیں دوں گا۔''

''اچھا!'' عطرت چونکے۔ ''دونوں بہنوں میں سے کسی نے مجھے نہیں بتایا..... مگر تمہارے اور حسن آرا کے تعلقات سے مجھے اندازہ تھا کہ ایک نہ ایک دن ایسا ہوگا۔''

''عطرت بھائی! تین بیٹیاں ہیں..... کل ان کا شادی بیاہ بھی ہونا ہے..... لوگ پوچھیں گے ماں باپ میں طلاق کیوں ہوئی..... کس کس کو جواب دوں گا اور کیا جواب دوں گا۔''

''بھائی! یہ تو آج یا کل ہونا ہی ہے۔''

''طلاق اس لیے بھی نہیں دوں گا کہ اگر کل کلاں کو حسنہ کسی اور سے عقد کرلیتی ہیں تو ان کے دوسرے گھر میں میری بچیاں غیر محفوظ ہوجائیں گی۔''

''ہوں۔'' عطرت نے تائید میں سر ہلایا۔ ''مگر تمہاری بیگم کے پاس خلع کا آپشن بھی تو ہے۔''

''اسے اختیار ہے..... لیکن خلع کی صورت میں بچیوں کے رشتے ناتوں کے وقت لوگوں کو حسنہ کے بارے میں کوئی بدگمانی نہ ہوگی۔ وہ مجھے موردِ الزام ٹھہرا سکتی ہیں..... خیر یہ تو قبل از وقت اور امکانی باتیں ہیں۔ میں آپ کے پاس اس لیے حاضر ہوا ہوں کہ آپ اور عالمہ آپا سمجھائیں حسنہ کو کہ بچوں کی زندگی برباد نہ کرے..... وقتی پریشانی ہے۔ ان شاء اللہ ٹل جائے گی..... ایک فلم ملنے کی دیر ہے۔ اس بار ایسا دھماکا کروں گا کہ فلم بین اگلے پچھلوں کو بھول جائیں گے..... میرے اس بریف کیس میں ایک نہیں کئی معرکۃ الآرا آئیڈیاز موجود ہیں۔ ایک فلم تو میں خوبرو ہیرو کی روایت سے ہٹ کر بنانا چاہتا ہوں، کالا آدمی کے ٹائٹل سے..... ایک کالی رنگت کا آدمی جس کی شادی ایک پری پیکر لڑکی سے ہوجاتی ہے۔ شادی کے بعد دونوں کی زندگی کے اتار چڑھاؤ..... اینٹی کلائمکس پر کالے آدمی کے خراب حالات کا یکا یک پانسا پلٹنا..... اور کلائمکس پر کالے آدمی اور پری پیکر حسینہ کا دوبارہ یکجا ہوجانا..... پبلی اینڈنگ دوں گا فلم کو..... فلم بین خوش اٹھیں گے سنیما ہال سے۔'' شاہ مراد جو اس وقت بھی اپنا بریف کیس ساتھ لے کر آئے تھے، پُرامنگ لہجے میں بولتے چلے گئے۔

عطرت خیال کو فلمی دنیا کی بے حسی اور بے مروتی پر تاسف محسوس ہوا اور شاہ مراد پر ترس آیا۔ ''کالا آدمی'' کا جو خاکہ انہوں نے بیان کیا تھا، ان کی اپنی سوانح حیات کا خاکہ تھا۔ خدا جانے اس شخص سے کس مقام پر کوئی ایسی غلطی ہوئی تھی یا کلمۂ تکبر منہ سے نکل گیا تھا جس کی پاداش میں وہ سربلندیوں سے قعرِ مذلت میں پھینک دیا گیا تھا۔ عطرت کو شاہ مراد سے ہمدردی محسوس ہوئی۔

''سمجھائیے گا نا آپ حسنہ کو؟'' شاہ مراد نے نہایت امید سے پوچھا۔

''وعدہ نہیں کرتا..... میں عالمہ اور ان کے میکے کے معاملات میں مداخلت سے عموماً گریز کرتا ہوں۔ میری اپنی خانگی زندگی متاثر ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے..... اوراد و وظائف کے مجموعوں کے آخر میں عموماً اقوالِ حکمت کے ایک دو صفحات ہوتے ہیں..... وہاں تم یہ قول لکھا پاؤ گے کہ عورت کو اللہ نے مرد کی پسلی سے پیدا کیا ہے۔ اسے سیدھا کرنے کی کوشش کروگے تو ٹوٹ جائے گی..... بہتر یہی ہے کہ اسے ٹیڑھا ہی رہنے دو..... چھوڑ دو اپنی بیوی کو اس کے حال پر۔''

''بچوں کے ساتھ کہاں جائیں گی..... کب تک پڑی رہیں گی آپ کے ہاں۔'' شاہ مراد نے فکرمندی ظاہر کی۔

''یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہونا چاہیے۔ میرا اندازہ ہے کہ عالمہ گھر کے اوپری حصے میں بہن کا قیام رکھیں گی۔''

''آپ اعتراض نہیں کریں گے؟''

''بھائی، مجھے اسی گھر میں رہنا ہے..... اعتراض کروں گا تو خود نکالا جاؤں گا۔''

''کوٹھی تو آپ کی ہے۔''

''بیوی بھی میری ہی ہے..... مجھے دونوں کو رکھنا ہے۔'' عطرت مسکراتے ہوئے بولے۔

''حسنہ کو ایک مرتبہ میری موجودگی میں بٹھا کر بات تو کرلیجیے آپ اس سے۔''

''میں کیا بات کروں گا..... تم کہو تو عالمہ سے کہتا ہوں..... وہ حسنہ کو بٹھا کر تم سے مصالحت کی بات کریں۔''

''میں ممنون ہوں گا۔''

عطرت اٹھ کر گئے اور کچھ دیر بعد منہ لٹکائے واپس ہوئے۔ ''بھائی! تمہاری اہلیہ فرماتی ہیں..... انہیں تم سے کوئی بات نہیں کرنی ہے..... ان کا طلاق کا مطالبہ پورا کرتے ہو تو ٹھیک لیکن اگر نہیں بھی کرتے تو انہیں کوئی پروا نہیں۔'' انہوں نے شاہ مراد کو بتایا۔

''انیتا اور شاہ تاج ملنے کے لیے نہیں آئے مجھ سے..... کیسے ہیں دونوں..... اداس تو ہوں گے اپنے گھر اور دونوں بہنوں کے بغیر؟''

عطرت دھیرے سے ہنسے پھر بولے۔ ''کسی غلط فہمی میں نہ رہیے گا۔ بچوں کی تربیت ماں کرتی ہے..... وہی ان کے دل میں محبت اور نفرت کے بیج بوتی ہے..... وہی انہیں رشتوں کا احترام اور صلہ رحمی سکھاتی ہے..... دونوں ممکن ہیں، مت ہیں۔''

''انہیں میرے آنے کی خبر نہ ہوئی ہوگی۔'' شاہ مراد کو باپ کی حیثیت سے اپنی عزت کی برقراری عزیز تھی۔

عطرت نے اپنا ہاتھ شاہ مراد کے شانے پر رکھ دیا۔ ''میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ ان کی فکر میں اپنی جان ہلکان نہ کرو جنہیں تمہاری پروا نہیں۔''

''میں حسنہ کا شوہر اور اپنے بچوں کا باپ ہوں عطرت بھائی! کیسے ان کی فکر سے بے نیاز رہ سکتا ہوں۔''

''عالمہ کے ہوتے تمہیں اپنی بیگم اور ان کے ہمراہ بچوں کی فکر نہیں ہونی چاہیے۔ وہ انہیں مکمل سپورٹ فراہم کریں گی..... دونوں بہنوں میں گہری ہم آہنگی ہے۔ تمہارے بچوں پر بھی عالمہ بہت مہربان رہتی ہیں..... مگر یہ کیا..... تم دونوں نے بچوں کا بٹوارا کیوں کرلیا بھائی.....؟ بہن بھائی اکٹھے رہیں تو اچھا ہے۔''

''میں نے بٹوارا نہیں کیا۔ حسنہ نے بچوں سے پوچھا..... میرے ساتھ کون جائے گا..... انیتا اور شاہ تاج ان کے ساتھ ہو گئے..... انیقہ نے میرا ہاتھ تھام لیا..... البتہ انیقہ کے اکیلے رہ جانے کے خیال سے چھوٹی امینہ کو میں نے خود روک لیا۔''

''چاروں کو حسنہ کے ساتھ کرتے، چار بچوں کی ذمے داریوں میں الجھ کر تمہاری بیگم کے چودہ طبق روشن ہو جاتے۔ دوسری بات یہ کہ ماں کے ہاتھوں باپ کی شفقت سے محرومی تمہارے بچوں کو خود بخود تمہاری طرف کھینچ لاتی۔''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں مگر فیصلہ بچوں نے خود کیا۔ انیقہ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ میں بھلا کیسے جھٹک دیتا اس کا ہاتھ۔''

''خیر، اب تو فیصلہ ہو چکا..... کل آپ کی اہلیہ اپنا اور اپنے بچوں کا اسباب اٹھانے کے لیے آئیں گی۔ عالمہ نے مجھ سے گاڑی کروا دینے کو کہا ہے۔'' عطرت نے شاہ مراد کو بتایا۔

شاہ مراد مزید پریشان ہو گئے اور عطرت سے بولے۔ ''آپ عالمہ آپا کو بلا دیجیے۔ میں ان سے بات کروں؟''

''میں بلائے دیتا ہوں مگر فائدہ کچھ نہیں۔ دونوں بہنوں کا موقف ایک ہی ہے۔''

''پھر بھی..... میں ان سے بات کرنا چاہوں گا۔''

عطرت دوبارہ اٹھے، اندر گئے اور عالم آرا کو اپنے ساتھ لیے ہوئے پلٹے۔

''آداب!''

عالم آرا نے نخوت سے جواب دیا۔ کچھ دیر تعزیت کی سی خاموشی رہی پھر شاہ مراد نے کہا۔ ''عالمہ آپا! میں اس لیے حاضر ہوا ہوں کہ آپ اور عطرت بھائی، حسنہ کو سمجھائیں کہ بسا بسایا گھر نہ اجاڑے..... بچے تباہ ہو جائیں گے۔''

''دیکھو بھئی، یہ تمہارا اور حسنہ کا آپس کا معاملہ ہے، میں دخل نہیں دینا چاہتی۔ حسنہ کوئی ناسمجھ بچی تو ہے نہیں کہ میں یا عطرت اسے سمجھائیں۔ سچی بات یہ ہے کہ تم سے شادی کے بعد اسے کچھ بھی نہیں ملا بلکہ زندگی برباد ہو گئی اس کی..... کیا کمی تھی حسنہ میں..... ایک سے بڑھ کر ایک رشتہ ملتا اسے۔''

''آپ درست کہتی ہیں..... مگر آسمان پر تو حسنہ کی شادی میرے ساتھ لکھی تھی۔''

''میں کیا کہہ سکتی ہوں سوائے اس کے کہ..... اس کی بدنصیبی!''

''عالمہ آپا! میں کوشش کر رہا ہوں۔ ان شاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''جب ہو جائے گا تب دیکھ لیں گے۔'' عالم آرا نے نہایت رکھائی سے کہا۔

شاہ مراد جو حسن آرا کو منا کر گھر واپس لے جانے کے لیے عالم آرا کی مدد لینے آئے تھے، ان کے روکھے لہجے سے شرمندہ ہو گئے۔ کچھ دیر سر جھکائے بیٹھے رہے پھر اٹھ کھڑے ہوئے۔ دل اداس تھا کہ مرد و زن کے جس رشتے کو جسم و جاں کا رشتہ کہا جاتا ہے، وہ اتنا یگانہ اور طمع پرور بھی ہو سکتا ہے کہ حسن آرا نے ان کے سامنے آنا بھی گوارا نہ کیا تھا۔

☆☆☆

انیقہ کا اس روز اسکول میں ذرا جی نہ لگا۔ وہ اسکول میں ہوتے ہوئے بھی غیر حاضر رہی۔ اس کا دل اداس تھا اور بار بار ماں، انیتا اور شاہ تاج کو یاد کرنے لگتا۔ اس کے

چھوٹے سے دل پر یہ صدمہ نہایت گراں تھا کہ ماں گھر سے چلی گئی تھی۔ اسے بار بار باپ کا خیال بھی آتا۔ اداس اور فکروں میں ڈوبا چہرہ..... اور صبح کو انہیں اسکول بس میں بٹھانے کے لیے جاتے ہوئے ڈھیلے ڈھیلے قدم۔

دوپہر کو اسکول سے واپسی پر اس نے باپ کی ہدایت کے مطابق نہایت ذمے داری سے تمام کام سرانجام دیے۔ دروازے کا تالا کھولا..... چابی اور تالا لے کر امینہ کے ساتھ گھر میں داخل ہوئی۔ دروازہ بند کیا، کرسی کو کھینچ کر دروازے کے قریب لائی۔ اس پر چڑھ کر اندر سے دروازے کی چٹخنی چڑھائی۔ یونیفارم اتروا کر امینہ کو گھر میں پہنے جانے والے کپڑے پہنائے۔ اپنی یونیفارم اتار کر گھر کے کپڑے پہنے۔ امینہ کا منہ ہاتھ دھلایا۔ خود ہاتھ منہ دھویا۔ کھانا نکالا۔ امینہ دونوالے لے کر ہاتھ کھینچ کر بیٹھ گئی۔ اس کا اپنا تو ایک نوالہ منہ میں ڈالنے کو بھی جی نہ چاہ رہا تھا۔ ماما کیوں چلی گئیں.....؟ امینہ کی وجہ سے وہ رو بھی نہ پا رہی تھی۔

''ماما، خالہ کے گھر گئی ہیں؟'' امینہ پوچھ رہی تھی۔

''پتا نہیں۔''

انیقہ کو خالہ پر بھی غصہ آ رہا تھا۔ جب بھی ان کے گھر جانا ہوتا، وہ انہیں اپنے باپ کو برا بھلا کہتے ہی سنتی تھی۔ ''تمہارا باپ بیکار آدمی ہے..... تمہارے باپ سے شادی کر کے میری بہن کی قسمت پھوٹ گئی۔ تمہارے باپ کا اور میری بہن کا کوئی جوڑ تھا بھلا..... تمہارے باپ کو اب بھی فلم کا جنون ہے..... وہ سمجھتا ہے پھر فلم بنانے کو ملے گی۔ اب کوئی نہیں پوچھتا اسے۔'' تمہارا باپ! تمہارا باپ! تمہارا باپ! خالہ کو بس یہ گردان رہتی تھی۔ وہی تھیں جو بہن کو اکساتی رہتی تھیں..... ''حسنہ! دفع کرو اس شخص کو..... جان چھڑاؤ اس سے اپنی ورنہ ساری زندگی روتی رہو گی۔ ارے، اس شخص میں ہے کیا خوبی۔ تمہیں تو اب بھی ایک سے بڑھ کر ایک آدمی مل سکتا ہے۔ خوبصورت ہو، جوان ہو، ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے۔ انیس سال کی تھیں جب تمہاری شادی ہوئی۔ سال بعد انیتا ہو گئی۔ انیتا تیرہ سال کی ہے۔ گل ملا کر تینتیس سال ہوئے۔ تینتیس سال میں تو بعض لڑکیوں کی شادی بھی نہیں ہوئی ہوتی۔ شاہ مراد سے چھٹکارا لو..... کتنے ہی تیار ہوں گے تم سے شادی کرنے کے لیے.....'' خالہ مسلسل اس کی ماں کو بھڑکاتی اور ورغلاتی رہتی تھیں۔ انیقہ کو خالہ پر سخت غصہ آ رہا تھا۔

☆☆☆

اگلے دن حسن آرا اپنا اور بچوں کا سامان لے جانے کے لیے کرائے کی ایک لوڈنگ گاڑی ساتھ لے کر آئیں۔ وہ خود عالم آرا کی گاڑی میں تھیں جسے عالم آرا کا ڈرائیور چلا رہا تھا۔ عطرت خیال نے دو گاڑیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک اپنے استعمال میں رکھتے اور خود ہی چلاتے، دوسری عالم آرا کے لیے مختص تھی جسے ڈرائیور چلاتا تھا۔ عالم آرا کو کہیں آنا جانا ہوتا اور عطرت گھر پر نہ ہوتے یا مصروف ہوتے تو وہ اسی گاڑی میں ڈرائیور کے ساتھ جاتیں۔ عطرت نے شاہ مراد کو گزشتہ روز حسن آرا کی سامان اٹھانے کے لیے آمد سے باخبر کر دیا تھا۔ وہ اس روز بھی دفتر سے چھٹی کیے گھر میں موجود رہے۔

حسن آرا ایسے وقت آئیں جب انہیں شاہ مراد کے گھر پر موجود نہ ہونے کا گمان تھا۔ انیقہ اور امینہ اسکول سے واپس آ چکی تھیں۔ ماں کو دیکھ کر دونوں کا خوش ہونا قطعاً فطری تھا۔ انہیں ماں کے واپس آ جانے کی خوش فہمی تھی مگر شاہ مراد کو ان کی آمد کا سبب بخوبی معلوم تھا۔ حسن آرا اس غلط فہمی میں تھیں کہ شاہ مراد اس وقت گھر میں نہ ہوں گے مگر گھر کا دروازہ شاہ مراد ہی نے کھولا۔ حسن آرا انہیں دیکھ کر چونکیں اور ناگواری سے منہ بناتی اندر آ گئیں۔

''ماما آ گئیں۔'' امینہ خوش ہو کر چلائی۔

حسن آرا کمرے میں چلی گئیں اور ان کے پیچھے پیچھے دونوں بچیاں بھی۔ شاہ مراد باہر ہی رہے۔

''امینہ! ٹھیک ہو؟'' حسن آرا نے امینہ سے پوچھا۔

''ماما! انیتا باجی اور بھائی کہاں ہیں؟'' امینہ نے ماں کے سوال کا جواب دینے کے بجائے خود سوال کیا۔

''خالہ کے گھر..... تم بھی چلو گی میرے ساتھ؟'' حسن آرا بولیں۔

امینہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

حسن آرا نے انیقہ کو دیکھا۔ ''اور تم؟'' انہوں نے پوچھا۔

انیقہ نے سہم کر دونوں شانے کانوں سے لگا دیے۔

''ٹھیک ہے..... رہو تم اپنے ابا جان کے ساتھ۔''

حسن آرا نے الماری کھولی اور اس میں سے چیزیں نکال نکال کر بیڈ پر رکھنے لگیں۔

شاہ مراد کمرے کے دروازے پر آ کھڑے ہوئے۔ چند ثانیے وہ حسن آرا کی حرکات و سکنات دیکھتے رہے اور وہ جانتے بوجھتے ان کی موجودگی کو نظر انداز کیے رہیں۔ شاہ مراد آگے بڑھے اور حسن آرا کے نزدیک آ تھمے۔ ''تم غلط کر رہی ہو حسنہ!''

حسن آرا انجان بنی اپنے کام میں مصروف رہیں جیسے

انہوں نے سنا ہی نہ ہو۔

''کیوں اپنے ساتھ بچوں کی زندگی بھی برباد کر دینا چاہتی ہو؟''

حسن آرا نے پھر اَن سنی کر دی۔

شاہ مراد نے ان کا بازو دبوچ لیا۔ ''تم چاہتی کیا ہو؟'' وہ غصے سے بولے۔

''طلاق!'' حسن آرا نے ایک جھٹکے سے اپنا بازو چھڑاتے ہوئے جواب دیا۔

''وہ تو میں نہیں دوں گا..... کہہ چکا ہوں۔''

''نہ دیں۔'' حسن آرا نے شانے اچکائے۔ ''پھر بھی مجھے آپ کے ساتھ نہیں رہنا ہے۔''

''کیوں؟''

''آپ نے کبھی خود کو دیکھا ہے؟'' وہ حقارت سے بولیں۔ ''یہ تو تمہیں دیکھنا چاہیے تھا مجھ سے شادی کرتے وقت..... انکار کر دیتیں۔''

''غلطی ہو گئی۔''

''اتنے عرصے بعد احساس ہوا ہے تمہیں؟''

''شکر کرتی ہوں، ہو گیا۔''

''چار بچوں کا کیا قصور تھا..... نہ پیدا کرتیں۔''

''ہاں..... اب میں بھی یہی سوچتی ہوں۔''

''غلطی کی ہے تو اس کے ازالے کی صورت یہی ہے کہ ان بچوں کی خاطر ہم اکٹھے رہیں۔''

''میں پھر کہتا ہوں..... سوچ لو۔''

''میرا جواب پھر وہی ہو گا۔''

شاہ مراد کو پسپائی اختیار کرنا پڑی۔

''انیقہ اور امینہ کو بھی لے جاؤ..... اپنا شوق پورا کر لو..... خرچ جو مجھ سے بن پڑے گا، دیتا رہوں گا۔''

''انیقہ!'' حسن آرا نے آواز دی۔

دروازے کی آڑ میں ہوئی انیقہ کمرے میں آ گئی۔

''جی ماما!''

''میرے ساتھ چل رہی ہو..... چیزیں رکھ لوں تمہاری بھی؟''

انیقہ نے باپ کی طرف دیکھا..... انہوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کہا۔ ''جاؤ۔''

''بولو۔'' حسن آرا نے پھر پوچھا۔

انیقہ کا دل ڈانواں ڈول ہونے لگا۔ انیتا اگر ماں کے بغیر نہیں رہ سکتی تھی تو اسے بھی تو ماں سے محبت تھی بلکہ شاید انیتا سے بھی زیادہ..... ماں کی ذرا سی تکلیف اسے بے چین کر دیا کرتی تھی۔ اسکول سے واپسی پر ماں کو نہ دیکھ کر اس کا پہلا سوال یہی ہوتا تھا..... ماما کہاں ہیں؟ انیتا تو گھر کے کسی کام کو ہاتھ نہ لگاتی تھی جبکہ وہ انیتا سے چھوٹی ہونے کے باوجود گھر کے چھوٹے چھوٹے کاموں میں ماں کا ہاتھ بٹانے کی کوشش کرتی تھی۔

''چلی جاؤ بیٹا!'' شاہ مراد نے اس سے کہا۔ ''امینہ بھی جا رہی ہے۔''

''امینہ بھی جا رہی ہے!'' وہ چونکی۔

''پاپا کے پاس کون رہے گا؟'' اس نے دل میں سوچا۔ ''پاپا تو بالکل اکیلے ہو جائیں گے۔'' اس کا چھوٹا سا دل باپ کے اکیلے پن کے خیال سے کٹنے لگا۔

''آپ کے پاس۔'' اس نے ایک بار پھر باپ کا بازو پکڑ لیا۔

''ٹھیک ہے۔'' حسن آرا نے اسے ٹیڑھی نظر سے دیکھتے ہوئے تلخ لہجے میں کہا۔ ''دیکھتی ہوں، کتنے دن رہتی ہو۔''

وہ سہم کر باپ کی آڑ میں ہو گئی۔

''چلی جاؤ بیٹا! تم اکیلی کیسے رہو گی؟ میں تو دفتر چلا جایا کروں گا۔''

اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھیں مسلتے ہوئے دھیرے سے نفی میں سر ہلایا۔

''چہیتے باپ کی چہیتی بیٹی!'' حسن آرا کا لہجہ اور تلخ ہو گیا۔

حسن آرا گاڑی میں سامان لدوا کر امینہ کو بھی اپنے ہمراہ لے گئیں۔ گھر میں اب شاہ مراد تھے..... انیقہ..... اور اس کی گھٹی گھٹی سسکیاں..... انیتا اور شاہ تاج کے بعد امینہ کے بھی چلے جانے سے اس کا دل بہت اداس ہو رہا تھا۔

☆☆☆

شاہ مراد کا خیال تھا ایک دو دن گزریں گے، انیقہ بھی ماں اور بھائی بہنوں کے پاس جانے کو کہے گی اور وہ اسے وہاں چھوڑ آئیں گے..... مگر ایسا نہیں ہوا۔ وہ اداس تھی مگر اس نے جانے کو نہیں کہا۔ دو دن بعد ہفتہ واری تعطیل تھی۔ شاہ مراد اسے ہمراہ لے کر عالم آرا کے ہاں گئے اور راستے میں اسے سمجھایا۔ ''بیٹا! تم بھی اپنی ماں اور بھائی بہنوں کے ساتھ رہنا۔ جیسے ہی حالات بہتر ہوں گے، میں تم سب کو گھر واپس لے آؤں گا۔ جب تک حالات بہتر نہیں ہو جاتے، میں تم لوگوں سے ملنے کے لیے تمہاری خالہ کے ہاں آتا جاتا رہوں گا..... خرچہ بھی دوں گا..... ٹھیک ہے..... رہو گی نا ان لوگوں کے ساتھ؟'' اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''ٹھیک ہے..... تمہارا سامان میں بعد میں خود پہنچادوں گا۔''

عالم آرا کے گھر پہنچ کر شاہ مراد بیٹھک میں عطرت خیال کے ساتھ بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ نہ حسن آرا ان کے سامنے آئیں، نہ ہی عالم آرا ان سے ملیں۔ انیقہ، شاہ تاج اور امینہ بہت دیر بعد ان سے سرسری ملے اور وہ بھی شاہ مراد کے بلانے پر۔

انیقہ کو دیکھ کر انہوں نے خوشی اور گرمجوشی کا اظہار نہیں کیا بلکہ اسے یوں دیکھا جیسے وہ کسی اور سیارے کی مخلوق تھی۔ حسن آرا نے اسے سینے سے لگانے کے بجائے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''اپنے چہیتے ابا کے ساتھ خوش ہو تم!'' وہ اپنا وجود چراتے ہوئے شرمندگی سے انہیں دیکھے گی۔

''ہم تینوں کو عالمہ خالہ ایک نئے اسکول میں داخل کرادیں گی۔ ہم لوگ خالہ کے ڈرائیور کے ساتھ گاڑی میں اسکول جایا کریں گے۔'' امینا نے بڑے فخر سے اسے بتایا۔

''عالمہ خالہ ہمیں پاکٹ منی بھی دیتی ہیں۔'' شاہ تاج بولا۔

''انیقہ باجی! ادھر بہت مزہ آتا ہے۔ ہم لوگ شام کو سامنے والے پارک میں بھی جاتے ہیں..... جھولے ہیں وہاں۔'' امینا ایکسائٹڈ ہوئی۔

خالہ، ماں، بھائی اور بہنوں میں سے کسی نے اسے جھوٹوں بھی وہاں رکنے کو نہیں کہا حالانکہ اس کا دل چاہ رہا تھا رکنے کو..... شاہ مراد اسے وہاں اسی ارادے سے تو لے کر آئے تھے کہ وہ ماں اور بھائی بہنوں کے ساتھ رہے گی..... وہ کم عمر تھی مگر نہایت حساس..... ساتھ کھیلنے والے بہن بھائی تین چار دن میں ہی کتنے بیگانہ ہوگئے تھے۔

شاہ مراد جانے لگے تو خالہ نے اس سے کہا۔ ''انیقہ! جاؤ، تمہارے ابا جارہے ہیں۔''

اس نے گھائل نظروں سے خالہ کو دیکھا۔ باپ کا ساتھ دینے پر اتنی رکھائی سے کیوں پیش آرہی تھیں وہ اس سے۔ شاہ مراد جانے لگے تو انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ دھرتے ہوئے کہا۔ ''اچھا بیٹا! میں چلتا ہوں..... تمہارے کپڑے اور اسکول بیگ وغیرہ پہنچادوں گا۔''

''پاپا! میں بھی آپ کے ساتھ.....'' اس نے ایک مرتبہ پھر شاہ مراد کا بازو پکڑلیا۔

انہوں نے چونک کر اسے دیکھا۔ ''تم تو یہاں رکنے کے لیے آئی تھیں۔''

''مجھے آپ کے ساتھ جانا ہے۔'' اس نے اپنا چہرہ ان کے پہلو میں چھپاتے ہوئے کہا۔

''کیوں بیٹا! تم یہاں اپنی ماں اور بھائی بہنوں کے ساتھ رہو۔'' شاہ مراد بولے۔ اس نے نفی میں سر ہلادیا۔

جواب میں اس کے پاس فقط ایک تکلیف دہ احساس تھا، الفاظ نہیں جو وہ انہیں بتاسکتی کہ وہاں آکر اسے اپنوں کی طرف سے بیگانگی کا احساس ہوا تھا۔ تینوں بھائی بہن اپنی نئی دنیا میں مگن تھے۔

ماں نے اسے ٹیڑھی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اپنے کنگال ابا کے سینے سے لگی رہنا۔''

خالہ بولیں۔ ''بہت بے وفا ہو تم..... اپنی ماما کے بجائے باپ کے ساتھ رک گئیں..... دیکھتی ہوں کتنے دن گزار پاتی ہو تم اس کے ساتھ..... گھر اس کے پاس نہیں..... نوکری مستقل اور ڈھنگ کی اس کی نہیں..... قلم والوں نے تو چھٹی کردی..... اب کسی دن رسالے والے بھی نکال دیں گے..... پھر کیا کرے گا تمہارا باپ؟'' وہ اسے یوں پھٹکار رہی تھیں جیسے وہ ان کی ہم سن، ہم مرتبہ ہو۔

وہ نہایت شرمساری سے سنتی رہی۔ وہ کم عمر تھی مگر اتنی بھی نہیں کہ متکلم کے الفاظ و تاثرات سے جھلکتی محبت، عداوت، عزت، ذلت، طنز اور تحقیر کو نہ سمجھ پاتی..... اس نے شاہ مراد کا بازو نہیں چھوڑا۔ وہ کچھ دیر تذبذب میں رہے۔ انیقہ اگر وہاں رک جاتی تو وہ بہتر معاش کے لیے زیادہ آسانی اور آزادی سے ہاتھ پاؤں مار سکتے تھے۔ اس کی فکر انہیں جلد گھر واپسی کا پابند رکھتی تھی۔ گھر سے باہر ہوتے تو دھیان اسی کی طرف رہتا..... بیٹی ذات تھی اور وہ باپ تھے..... حسن آرا کے جانے کے بعد انیقہ کے ان کے ساتھ رہ جانے سے ان کی ذمے داری بڑھ گئی تھی۔ کیسی عجیب بات تھی کہ ان کے تین بچے ان سے ملنے کے لیے سامنے آنے کے بھی روادار نہ تھے اور انیقہ ان کا ساتھ چھوڑنے کو تیار نہ تھی۔ عجیب تضاد تھا۔

''ٹھیک ہے بیٹا!'' انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ وہ ان کے ساتھ گھر واپس آگئی۔

''تم کیوں نہیں رکیں خالہ کے گھر؟'' رات کو انہوں نے اس سے پوچھا۔

اس نے شاہ مراد کو سب کچھ بتادیا۔

''اب نہ میں جاؤں گا وہاں..... نہ تمہیں لے جاؤں گا۔'' شاہ مراد نے کہا۔

مگر ان دونوں میں سے کوئی بھی گھر سے چلے جانے والوں کو اپنے دل سے نہ نکال پایا۔ دونوں اکثر انہیں یاد کرتے..... ان کا ذکر کرتے..... رات کو جب باپ بیٹی

سونے کے لیے پہلو بہ پہلو بچھی مسہریوں پر لیٹتے تو گھر سے جانے والوں کا ذکر چھڑ جاتا۔ شاہ مراد گزرے دنوں کی باتیں کیے جاتے اور انیقہ ان کے تذکرے میں راحت محسوس کرتی۔

امینہ کو شاہ مراد بہت یاد کرتے۔ ''پتا نہیں اب وہ سوتی کیسے ہوگی..... میرے سینے پر سر رکھے بغیر تو وہ سوتی ہی نہیں تھی۔''

شاہ مراد اب بھی اکثر اسٹوڈیوز جاتے تھے۔ وہیں ان کی ملاقات عطرت سے بھی ہو جاتی۔ انہی سے بچوں کی خیر وعافیت مل جاتی اور انہی کے ذریعے شاہ مراد سے جتنا بن پڑتا، بچوں کو خرچ بھجوا دیتے۔

''بچی کا ساتھ ہے۔ آپ کوئی مناسب سی عورت دیکھ کر اپنا گھر آباد کر لیجیے۔'' عطرت خیال نے ایک روز شاہ مراد کو مشورہ دیا۔

شاہ مراد ان کا منہ دیکھنے لگے۔

''ایسے کیا دیکھ رہے ہیں بھائی؟'' عطرت بولے۔

''آپ کا کیا خیال ہے۔ حسنہ اب اپنے گھر واپس نہیں آئیں گی؟'' شاہ مراد نے کہا۔

''خیال نہیں..... یقین ہے..... عورت جس گھر کو اپنا سمجھتی ہے، اس کی زمین کو اپنے پیروں تلے سے سرکنے نہیں دیتی..... پوری مضبوطی کے ساتھ اپنے قدم جمائے رکھتی ہے..... استقامت دکھاتی ہے..... جو عورت خود گھر چھوڑ جائے، سمجھ لیجیے وہ اس گھر میں رہنا ہی نہیں چاہتی۔''

شاہ مراد صدمے کی کیفیت میں کچھ دیر عطرت کو دیکھتے رہے پھر ایک لمبی سانس کھینچ کر بولے۔ ''حسنہ اب گھر واپس آئیں یا نہ آئیں..... مجھے اپنے دل کی زمین پر ان کے نقوش اتنی مضبوطی سے گڑے محسوس ہوتے ہیں کہ کوئی دوسری عورت یہ جگہ لے ہی نہیں سکتی۔''

''غلطی کر رہے ہیں۔''

''آپ نے کبھی کسی سے محبت کی ہے عطرت بھائی؟''

عطرت ہکا بکا شاہ مراد کا منہ دیکھنے لگے کہ یہ کیا سوال کر رہے تھے وہ..... ذکر ہو رہا تھا حسنہ کی اپنے گھر واپسی اور شاہ مراد کی دوسری شادی کا..... ان کی کسی سے محبت کو کہاں سے کھینچ لائے تھے وہ اس ذکر میں۔

''میں سمجھا نہیں۔'' عطرت نے کہا۔

''میں نے حسنہ سے محبت کی ہے..... میں اب بھی اس سے محبت کرتا ہوں..... مرتے دم تک کیے جاؤں گا۔ میں تو اس کے لیے آسمان سے چاند تارے توڑ کر اس کے قدموں میں ڈھیر کر دینا چاہتا تھا..... خیر..... کالا آدمی کا آئیڈیا دیا ہے میں نے ایک فلم ساز کو..... وہ تو پھڑک اٹھے کہ روایت سے ہٹ کر ایک کالا بھجنگ آدمی فلم کا ہیرو ہوگا..... ہیروئن حسین ہوگی..... بے مثل ہوگی..... بس فلم ہٹ ہونے کی دیر ہے عطرت بھائی..... مجھے یقین ہے حسنہ اپنے گھر واپس آجائیں گی۔''

عطرت نے شاہ مراد کو ہمدردانہ نگاہوں سے دیکھا۔ گمشدہ جنت کی تلاش میں بھٹکا ہوا وہ شخص انہیں قابلِ رحم محسوس ہوا۔ فلم نگری کی بے مروتی اور بے فیضی پر انہیں غصہ آیا۔ آسمان سے زمین پر پٹخ دیتی ہے جن سے اسے نظریں پھیرنی ہوتی ہیں۔

''بچے کیسے ہیں عطرت بھائی؟''

''مزے میں..... مگن ہیں اپنی ماں اور خالہ کے ساتھ۔ یار! میں عالمہ کی خوشی میں خوش نہ بھی ہوں تو دکھاوے کو خوش ہو جاتا ہوں۔ اس میں ایک خوبی زبردست ہے جس نے مجھے ہمیشہ اس کا مطیع بنائے رکھا ہے۔''

''وہ کیا؟'' شاہ مراد نے بے ساختہ پوچھا اور عطرت کے جواب سے قبل ہی اپنی بے ساختگی پر معذرت چاہی۔

''معلوم نہیں مجھے آپ سے پوچھنا چاہیے تھا کہ نہیں۔''

''کوئی حرج نہیں۔ عالمہ کی خوبی یہ ہے کہ میری ہر ضرورت کا خیال رکھتی ہے..... اور میری ضرورتوں کا خیال رکھ کر وہ میری زندگی کی سب سے بڑی ضرورت بن گئی ہے۔ اس کے بغیر میں خود کو مکمل نہیں سمجھتا..... بھائی! پسلی ہے میری۔'' عطرت دھیرے سے ہنسے پھر بولے۔ ''اپنی زندگی کے تجربے سے میں نے یہ نتیجہ کشید کیا ہے کہ عورت کو مرد کی مجبوری بننے کے لیے اس کی ضرورت بننا پڑتا ہے۔ میری بیوی میری ضرورت، میری مجبوری ہے۔ گھر میں سیاہ کرے، سفید کرے، اس کی مرضی..... بہن کو ساتھ رکھے، بھانجے بھانجیوں کے ناز نخرے اٹھائے، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔''

''آپ کے پاس پیسا ہے عطرت بھائی! معاشی تنگی نہیں..... مختلف تجربات سے مختلف نتائج کشید ہوتے ہیں۔ میں نے اپنی زندگی کے تجربے سے یہ نتیجہ کشید کیا ہے کہ مرد کو عورت کی ضرورت اور مجبوری بننے کے لیے اس کی جیب بھاری ہونی چاہیے۔''

''ٹھیک کہتے ہو۔'' عطرت نے تائید کی۔

شاہ مراد نے ایک ٹھنڈی سانس بھری پھر یکا یک پُرامید لہجے میں بولے۔ ''کالا آدمی کی بات تو ہوئی ہے..... دیکھیے کیا ہوتا ہے۔''

''انیقہ کیسی ہے؟'' عطرت نے موضوع بدل دیا۔

''ٹھیک ہے۔''

''میری صلاح مانو تو اسے بھی ماں کے پاس بھیج دو۔''

''کئی دفعہ کہہ چکا ہوں مگر وہ جانا ہی نہیں چاہتی۔''

''بعض بچیاں ماں کی نسبت باپ سے زیادہ انس رکھتی ہیں۔'' عطرت نے توقف کیا۔ ''تم تو دفتر چلے جاتے ہو گے، وہ اکیلی رہتی ہوگی۔ اسے سمجھاؤ کہ ماں کے پاس چلی جائے۔''

☆☆☆

''ماما یاد آتی ہیں؟'' شاہ مراد نے انیقہ کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔ وہ چونک کر باپ کو دیکھنے لگی۔

''یاد آتی ہیں نا؟'' شاہ مراد نے پھر سوال کیا۔

اس نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''انیتا، شاہ تاج اور امینہ بھی؟''

''جی پاپا!'' اس نے کسی مجرم کے سے انداز میں اعتراف جرم کیا۔

''بیٹا! تمہیں بھی انہی کے ساتھ ہونا چاہیے...... اتوار کو تم چلنا میرے ساتھ...... میں چھوڑ آؤں گا تمہیں تمہاری خالہ کے گھر۔''

''نہیں پاپا!''

''کیوں؟''

''مجھے آپ کے پاس رہنا ہے۔''

''بیٹا! اسکول سے آنے کے بعد تم میری واپسی تک اکیلی ہوتی ہو...... مجھے تمہاری فکر لگی رہتی ہے۔''

''میں دروازہ بند کر لیتی ہوں نا پاپا...... جیسے آپ نے کہا ہے ویسے ہی کرتی ہوں۔ پہلے تو کوئی آتا ہی نہیں...... کبھی کوئی آئے تو سوراخ سے جھانک لیتی ہوں...... دروازہ نہیں کھولتی۔''

''فلم مل جائے گی تو پھر تو میں رات کو دیر سے آیا کروں گا۔''

''کب ملے گی فلم؟''

''مل جائے گی۔''

پھر تو آپ کو خوب سارے پیسے بھی ملیں گے نا؟''

''ان شاء اللہ!''

''پھر تو ماما بھی آجائیں گی؟''

''اچھا!'' شاہ مراد چونکے۔ ''تمہیں کیسے معلوم؟''

''ماما آپ سے پیسوں کے لیے ہی تو لڑتی تھیں نا۔''

شاہ مراد نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور دلگیر لہجے میں بولے۔ ''بڑی بُری چیز ہے پیسا۔''

''نہیں پاپا...... پیسے سے تو ہم لوگ بہت سی چیزیں خریدتے ہیں۔''

''ہاں...... مگر...... اس کی زیادہ طلب ہمیں اپنوں سے دور کر دیتی ہے بیٹا!''

''جیسے ماما چلی گئیں...... انیتا، شاہ تاج اور امینہ بھی۔''

شاہ مراد نے دل گرفتگی سے اثبات میں سر ہلایا۔

''پاپا جی! میں نہیں جاؤں گی...... مجھے آپ کے پاس رہنا ہے۔''

''بیٹا! ہم دو تو لوگ رہ گئے ہیں گھر میں۔ کرائے کا بڑا گھر رکھنے سے فائدہ...... تم اپنی ماما کے پاس چلی جاؤ گی تو میں تو کہیں بھی رہ لوں گا...... جو پیسے مکان کے کرائے میں جاتے ہیں، وہ تمہاری ماما کو بھجوا دیا کروں گا مہینے کا خرچہ بڑھا کر۔''

شاہ مراد کو حسن آرا اور تین بچوں کے جانے کے بعد کرائے کا بڑا مکان رکھنا اسراف محسوس ہوتا تھا۔ کیا ضرورت تھی بلاوجہ ماہ بہ ماہ زیادہ کرایہ ادا کرنے کی۔ وہ اکیلے ہوتے تو کہیں بھی رہ سکتے تھے۔ انیقہ کے ساتھ ہونے کی صورت میں ایک کمرے کا مکان یا فلیٹ بھی کافی تھا۔

شاہ مراد نے انیقہ کو ماں اور بھائی بہنوں کے ساتھ جا کر رہنے کے لیے آمادہ کرنے کی بہت کوشش کی مگر وہ ان کے پاس سے جانے کو آمادہ نہ ہوئی۔ اس سلسلے میں ان کا اصرار زیادہ بڑھا تو ایک روز وہ رونے لگی۔ ''آپ ماما کو واپس لے آئیں نا۔'' اس نے سسکتے ہوئے کہا۔

''کوشش کی تھی بیٹا!'' انیقہ کے آنسو انہیں اپنے دل پر گرتے لگ رہے تھے۔ وہ بھیگی بھیگی آنکھوں سے انہیں دیکھنے لگی۔

''جب کوئی واپس نہ آنا چاہے تو آپ اسے کیسے واپس لا سکتے ہیں۔'' شاہ مراد نے کہا۔

''اب بھی نہیں آئیں گی وہ؟''

''پتا نہیں۔''

''پاپا! آپ انہیں سمجھائیں نا...... آپ کو فلم ملے گی تو پیسے بھی آجائیں گے۔''

''وہ خود بہت سمجھ دار ہیں...... اسی لیے تم سے کہہ رہا ہوں...... تم بھی چلی جاؤ ان کے پاس۔''

''مجھے نہیں جانا ان کے پاس...... مجھے آپ کے پاس رہنا ہے۔'' اس نے بار ہا سنایا ہوا اپنا فیصلہ پھر دہرایا۔

شاہ مراد اسے دیکھنے لگے...... بارہ سالہ انیقہ کس قدر

pklibrary.com

ستقامت سے اپنے فیصلے پر ڈٹی ہوئی تھی۔

☆☆☆

شاہ مراد کی پھوپی زاد بہن سلمٰی شہر کے ایک گنجان آباد علاقے میں دس مرلے پر بنے مکان میں رہتی تھی۔ سلمٰی کا شوہر ضمیر گاڑیوں کے پرزہ جات کا کاروبار کرتا تھا۔ سلمٰی اور ضمیر کی ایک ہی بیٹی تھی آئمہ...... جس کی عمر بارہ تیرہ سال کے لگ بھگ تھی۔ سلمٰی اپنے شوہر اور بیٹی کے ساتھ خوشحال زندگی گزار رہی تھی۔ گھر کی نچلی منزل پر ڈرائنگ روم، ٹی وی لاؤنج، دو بیڈ روم مع اٹیچڈ باتھ اور کشادہ کچن تھا۔ گھر کے آگے پیچھے کھلی جگہیں تھیں جہاں سلمٰی نے پودے لگوا رکھے تھے۔ چھت پر کمرا سلمٰی نے محض کسی آئے گئے کو ٹھہرانے کی خاطر بنوالیا تھا لیکن اس کے استعمال کی شاذ ہی نوبت آئی تھی۔ مہینے میں ایک آدھ بار سلمٰی اپنی کام والی سے اس کمرے کی صفائی کروا دیتی۔ سلمٰی کا شوہر ضمیر دن چڑھے اپنی دکان پر جاتا اور رات کو واپس آتا۔

شاہ مراد کی طرح سلمٰی کا سارا خاندان بھی سرحد پار مقیم تھا۔ ضمیر، سلمٰی کے والد کے ایک دوست کا بھانجا تھا۔ ماموں سے ملنے پڑوسی ملک گیا تو ماموں نے اپنے دوست کی بیٹی سلمٰی سے شادی کی بات چھیڑ دی۔ سلمٰی قبول صورت تھی۔ بتیس سال کی ہو چکی تھی۔ شادی نہ ہو پا رہی تھی۔ دوست نے دوست کی ہمدردی میں ضمیر اور اس کے گھر والوں کو سلمٰی سے ضمیر کے رشتے پر آمادہ کرلیا۔ سلمٰی بیاہ کر ضمیر کے ساتھ پاکستان آگئی۔ تبدیلی سکونت کے معاملات نے کافی عرصہ الجھائے رکھا مگر بالآخر مسئلہ حل ہوگیا۔ شاہ مراد، سلمٰی کے ماموں زاد اور نئی جائے مملکت میں واحد قریبی رشتے دار تھے۔ عمر میں سلمٰی سے بڑے تھے۔ سلمٰی انہیں سگے بڑے بھائی کا سا احترام دیتی۔ شاہ مراد بھی اسے سگی بہن کی طرح سمجھتے تھے۔ دونوں گھرانوں میں بھی کبھار آنا جانا بھی رہا تھا مگر سلمٰی کو حسن آرا کی نخریلی اور متکبر طبیعت پسند نہ تھی اور حسن آرا کی دانست میں سلمٰی ایک جاہل عورت تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو سخت ناپسند کرتی تھیں مگر شاہ مراد کو سلمٰی ہمیشہ احترام دیتی اور ان کے ساتھ حسن آرا کے نامناسب رویے کی وجہ سے ان سے ہمدردی بھی رکھتی۔ حسن آرا کی شاہ مراد سے کشیدگی کے زمانے میں شاہ مراد کا سلمٰی کے ہاں اکثر آنا جانا رہا تھا تاہم حسن آرا کی علیحدگی کے بعد انیقہ کے اکیلے پن کے باعث وہ باہر سے جلد از جلد گھر پہنچنے کی کوشش کرتے، سو سلمٰی کے ہاں ان کی آمدورفت کم ہوگئی تھی۔

کرائے کا مکان چھوڑنے کا معاملہ درپیش ہوا تو شاہ مراد کو سلمٰی کے گھر کی چھت پر تعمیر کردہ کمرا کرائے پر لینے کا خیال آیا۔ وہاں اور بھی بہت سے فوائد تھے۔ سلمٰی کے ہاں رہتے ہوئے انیقہ اکیلی نہ رہتی اور انہیں بھی باہر سے جلدی گھر پہنچنے کی فکر نہ ہوتی اور اسکول کی تبدیلی کوئی بڑا مسئلہ نہ تھا...... انیقہ کو سلمٰی کے گھر کے نزدیک ہی کسی اسکول میں داخل کرایا جاسکتا تھا۔

شاہ مراد نے سلمٰی سے بات کی تو وہ بولی۔ ''بھائی! کرائے کی کوئی بات نہیں مگر ضمیر سے بات کیے بغیر میں ہامی نہیں بھر سکتی۔''

''تم بات کرلو...... لینے کو میں کرائے کی کوئی جگہ کہیں اور بھی لے سکتا ہوں مگر انیقہ میرے ساتھ ہے اور اپنی ماں کے پاس جانے کو تیار نہیں۔ میں اسے ادھر اُدھر کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔ تمہارے ساتھ رہے گی تو مجھے فکر نہیں ہوگی...... یہاں آئمہ بھی ہے۔ دونوں بہنوں کی طرح مل کر رہیں گی۔''

''ہاں، ہاں...... کیوں نہیں...... بہنیں ہی ہیں۔'' سلمٰی نے پُرزور تائید کی پھر بولی۔ ''مگر گھر کے مالک اور مختار تو ضمیر ہی ہیں۔''

''تم پوچھ لو ان سے...... کرائے کی بات بھی کرلینا...... بس تھوڑے دن کی بات ہوگی۔ فلم ملتے ہی میں اسٹوڈیو کے قریب کہیں شفٹ ہوجاؤں گا۔ ہوسکتا ہے انیقہ بھی اپنی ماں کے پاس جانے کو تیار ہوجائے۔''

''حیرت ہے...... بیٹی آپ کو چھوڑ کر ماں کے پاس جانے کو تیار نہیں...... اور بیگم آپ کی...... آپ اپنی بات تو چھوڑیں، بیٹی کو بھی چھوڑ گئیں۔''

''پوچھا تھا اس نے بچوں سے کہ کون جانا چاہتا ہے میرے ساتھ۔''

''ارے یہ نوبت ہی کیوں آنے دی انہوں نے...... بُرا مت مانیے گا بھائی...... آپ کی بیگم چڑھتے سورج کی پجاری ہیں۔ بچوں کی خاطر تو مائیں ہر سختی برداشت کرتی ہیں...... قربانی دیتی ہیں...... اچھا بُرا ہر طرح کا وقت اپنے گھر میں بچوں کے باپ کے ساتھ گزارتی ہیں۔ لکھ لیں میری بات...... ادھر آپ کے حالات بدلے، ادھر آپ کی بیگم واپس آگئیں۔''

''خدا تمہاری زبان مبارک کرے۔''

''ایک بات پوچھوں آپ سے؟'' سلمٰی نے کچھ ہچکچاتے ہوئے کہا۔

''پوچھو۔''

pklibrary.com

''آپ کو ایسی عورت سے.....'' سلمٰی نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''میں یہ کیوں سوچوں کہ میری بیوی اگر میرے ساتھ مخلص رہے گی..... ہر حال میں میرا ساتھ نبھائے گی..... تو ہی میں اس سے محبت کروں گا..... ورنہ نہیں۔ محبت تو ہر شرط سے ماورا ہوتی ہے۔ بس کی جاتی ہے اور ہر حال میں نبھائی جاتی ہے۔''

''میں تو مطلبی انسانوں کا منہ بھی نہیں دیکھوں۔''

شاہ مراد خاموش ہو رہے۔ سادہ لوح سلمٰی کو یہ سمجھانا مشکل تھا کہ محبت انسان کو کتنا مجبور کر دیتی ہے..... اور حسن آرا کو کہاں اندازہ کہ وہ اس سے کتنی محبت کرتے تھے۔

☆☆☆

شاہ مراد نے وہ گھر جس میں وہ حسن آرا سے شادی کرنے سے کئی سال قبل سے مقیم تھے، چھوڑا اور انیقہ کے ساتھ سلمٰی کے گھر کی چھت پر بنے کمرے میں شفٹ ہو گئے۔ انیقہ بہت خوش ہوئی۔ سلمٰی کے گھر میں اسے آئمہ کی دوستی میسر آ گئی تھی۔ شاہ مراد نے انیقہ کے اسکول سے مدرسہ چھوڑنے کا سرٹیفکیٹ لے کر اسے آئمہ کے اسکول میں داخل کرا دیا۔ اسکول گھر کے نزدیک ہی تھا۔ دونوں اکٹھی پیدل اسکول جاتیں اور چھٹی کے بعد اکٹھی واپس آ جاتیں۔ انیقہ خوش تھی اور شاہ مراد مطمئن کہ اب انہیں گھر سے باہر ہوتے ہوئے انیقہ کے اکیلے ہونے کی فکر نہ ستاتی۔ ضمیر نے کمرے کا کرایہ لینے سے منع کر دیا تھا مگر شاہ مراد کو بنا کرائے رہنا گوارا نہ ہوا۔

''یہ تو غیریت والی بات ہوئی۔'' سلمٰی نے کہا۔

''تم میری بہن ہو سلمٰی..... انیقہ کے ساتھ مجبوری نہ ہوتی تو میں ہرگز تمہارے گھر نہ آتا..... بہن کے گھر بھائی کا پڑ جانا اچھا نہیں ہوتا۔''

''ایسی بات نہ کریں۔ میں تو خوش ہوں کہ آپ کے ساتھ انیقہ کے آنے سے میری آئمہ کو بہن اور سہیلی مل گئی۔''

''میں بھی انیقہ کو یہاں لا کر بہت مطمئن ہوں۔ وہ بھی خوش ہے۔''

☆☆☆

ماں تو تھی ہی اپنی ذات کے حصار میں گھری۔ انیقہ کا چھوٹا سا دل اکثر اس بات پر بجھ بجھ جاتا کہ امینہ تو خیر چھوٹی تھی، معصوم تھی، انیتا اور شاہ تاج نے بھی کبھی پلٹ کر اس کی خیر خبر لینے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اسے تو وہ تینوں دن بھر میں نہ جانے کتنی مرتبہ یاد آتے تھے۔ ان کے ساتھ گزارا ہوا وقت تو جیسے خواب بن گیا تھا۔ اس کی ماں کو پہننے، اوڑھنے اور بننے سنورنے کا نہایت عمدہ ذوق اور سلیقہ تھا۔ مجال تھی کہ کبھی اس کا لباس ملگجا یا بدرنگ ہوتا، بال الجھے یا بکھرے ہوتے۔ گھر میں بھی وہ ایسے بنی سنوری رہتی کہ بہت سی عورتیں تو کسی تقریب میں جاتے ہوئے بھی ایسی تیار نہ ہوتی ہوں گی۔

انیتا نے بننے سنورنے کے شوق میں ماں کی پیروی کی تھی۔ اسے بھی ماں کی طرح اچھے کپڑوں، میک اپ اور پرفیومز کا بہت شوق تھا۔ انیقہ کو بناؤ سنگھار سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ جیسے اس کی ہم عمر بچیاں بڑی نظر آنے کے شوق میں اکثر اپنے گھر کی بڑی عورتوں کے دوپٹے اوڑھ کر کھڑی ہو جاتی ہیں یا میک اپ تھوپنے لگتی ہیں..... اس نے کبھی ایسا نہیں کیا تھا حالانکہ اس کی ماں کی سنگھار میز پر انواع و اقسام کی اشیائے آرائش حسن سجی ہوتی تھیں۔

انیتا کی طرح آئمہ کو بھی سنگھار اور اچھا نظر آنے کا بہت شوق تھا۔

سلمٰی اپنے لباس اور بناؤ سنگھار کے سلسلے میں خاصی بے پروا سی عورت تھی۔ کم کم نہاتی..... ایک جوڑا کئی کئی دن پہنے رہتی..... دو دو، تین تین دن بالوں میں کنگھا نہ کرتی۔ میک اپ کے استعمال کا تو کوئی سوال ہی نہ تھا۔ دن بھر گھر کے دھندوں میں الجھی رہتی۔ بھی شوہر کی خاطر داری تو بھی اکلوتی اولاد آئمہ کی ناز برداری..... آئمہ میں تو جیسے سلمٰی کی جان تھی۔ آئمہ کو بھی یہ احساس تھا کہ ماں اور باپ دونوں ہی اس سے بہت پیار کرتے تھے۔ اس احساس کا وہ ہر طرح سے فائدہ اٹھاتی۔ آئمہ سے دوستی کے باعث سلمٰی اور ضمیر دونوں ہی انیقہ کو بھی اہمیت دیتے۔

آئمہ سے اس کے ماں باپ کا لاڈ پیار دیکھ کر انیقہ کو آئمہ کے مقابلے میں کمتری کا احساس ہوتا۔ باپ بے چارہ تو معاشی پریشانیوں کا شکار تھا۔ ماں ایسی خود غرض اور بے رحم تھی کہ جانے کے بعد اس نے شوہر اور بیٹی کی بھی خیر خبر ہی نہ لی تھی۔

حسن آرا کے برعکس شاہ مراد ماں کے ساتھ گئے اپنے تینوں بچوں انیتا، شاہ تاج اور امینہ بلکہ خود حسن آرا کے حالات سے باخبر رہنے کی کوشش کرتے اور اپنے ہم زلف عطرت سے رابطہ رکھتے۔ بچوں کا حال چال معلوم کرنے کے لیے بھی کبھار عالم آرا کے گھر بھی چلے جاتے۔ اپنی بساط کے مطابق نہایت باقاعدگی سے انہیں خرچہ بھی بھجواتے۔ عالم آرا کے ہاں جاتے اور بچوں سے ملنے کی خواہش ظاہر کرتے تو وہ دونوں ان سے سرسری سا ملتے۔ حسن آرا نے

ایک دو اساز ادارے میں ملازمت کرلی تھی۔ شاہ مراد سے ملنا تو کجا، سامنے آنے کی بھی روادار نہ رہی تھی۔

☆☆☆

فلمی دنیا نے شاہ مراد کو یوں فراموش کردیا جیسے وہ کبھی اس دنیا میں رہے ہی نہ تھے مگر شاہ مراد فلمی دنیا کو نہ بھلا پائے۔ وہ اب بھی فلم ملنے اور اپنا کھویا عروج دوبارہ حاصل کرنے کے خواب دیکھتے تھے۔ وہ اکثر اسٹوڈیوز جاتے اور کسی قدر شناس کی تلاش میں گھومتے۔ رسالے کی نوکری چل رہی تھی۔ گو اشاعت بڑی نہ تھی مگر پبلشر، ادارتی عملہ اور مصنفین کا دال دلیا چل رہا تھا۔ ادارتی فرائض کی انجام دہی کے ساتھ شاہ مراد فرضی فلمی نام سے کوئی کہانی بھی لکھ کر شاملِ اشاعت کردیتے تو ماہانہ تنخواہ کے علاوہ کہانی کی اشاعت کے معاوضے کی مد میں قلیل سہی مگر کچھ اضافی آمدنی بھی ہوجاتی۔ سلمیٰ کے گھر میں باپ بیٹی کا گزارہ ہو رہا تھا۔

ماں باپ کی علیحدگی اور ماں، بہنوں اور بھائی سے جدائی نے انیقہ کو وقت سے پہلے ہی بالغ نظر کردیا تھا۔ اسے باپ کی بے بسی پر دکھ ہوتا۔ ماں کی بے مروتی پر غصہ آتا۔ بھائی بہنوں کو یاد کر کے رنجور ہوتی۔ رات کو جب وہ اور شاہ مراد سونے کے لیے لیٹتے تو اکثر گئے ہوؤں کا ذکر چھڑ جاتا۔ شاہ مراد اسے ماں اور بھائی بہنوں سے ملنے کے لیے عالم آرا کے ہاں لے جانے کو کہتے تو وہ منع کردیتی۔

''کیوں بیٹا؟'' شاہ مراد پوچھتے۔

''بس!''

''بس کا کیا مطلب؟''

''مجھے عالمہ خالہ اچھی نہیں لگتیں۔''

''اچھی تو ہیں۔ انہوں نے تمہاری ماں اور بھائی بہنوں کو اپنے گھر میں رکھا ہوا ہے۔''

''وہ نہ رکھتیں تو ماما اپنے ہی گھر میں رہتیں نا۔''

''شاید تب بھی نہ رہتیں۔''

''کیوں پاپا؟''

''کیونکہ انہوں نے جانے کا تہیہ کرلیا تھا۔ انہوں نے جانا ہی تھا۔''

''ماما آپ کو یاد آتی ہیں؟''

''یاد بھلا دینے والوں کو کیا جاتا ہے بیٹا! جنہیں آدمی بھلا نہ پائے وہ تو دل میں رہتے ہیں۔''

انیقہ کے اب دو ہی مشاغل تھے۔ آئمہ سے دوستی اور کتابیں۔ دونوں ہم جماعت بھی تھیں۔ آئمہ کو پڑھنے لکھنے سے خاص رغبت نہ تھی۔ بس پاس ہوجاتی۔ انیقہ اپنی جماعت میں سب سے آگے رہتی۔ ٹیچرز اسے ہم نصابی سرگرمیوں میں بھی پیش پیش رکھتیں۔ تلفظ اور لب ولہجہ اسے شاہ مراد سے گویا ورثے میں ملا تھا اور حسن ماں سے۔ اسکول میں ہونے والی تقریبات میں اسے ٹیبلوز اور ڈراموں میں ہمیشہ مرکزی کردار دیا جاتا۔ شاہ مراد کی ہدایات و تربیت اس کی پرفارمنس کو چار چاند لگا دیتے۔

☆☆☆

ملازمت نے حسن آرا کو پر لگا دیے تھے۔ ہواؤں میں اڑتی تھی۔ اپنی خوبصورتی اور اداؤں سے فارما سیوٹیکل کمپنی کے بڑوں کی نظروں میں آگئی تھیں۔ کچھ عرصہ ریسیپشن پر رہیں پھر کمپنی کے ایم ڈی نے انہیں اپنی معتمدِ خاص بنالیا تھا۔ انٹرمیڈیٹ پاس تھیں۔ کوئی پیشہ ورانہ مہارت بھی نہ رکھتی تھیں مگر چار بچوں کی ماں ہونے کے باوجود ان کے حسن کا جادو دیکھنے والوں کے سر چڑھ کر بولتا تھا۔ ملازمت شروع کی اور ایم ڈی کی معتمدِ خاص بنیں تو دماغ ساتویں آسمان پر جا پہنچا۔ ان کا دماغ خراب کرنے میں بہن عالم آرا کا پورا ہاتھ تھا۔ متمول اور لاولد ہونے کی وجہ سے عالم آرا کی زیادہ مصروفیت تو تھی نہیں، بہن اور بچے ان کے ہاں آبسے تو ان کی غیر مصروف زندگی کو مصروفیت مل گئی۔ حسن آرا کے بچوں کے ساتھ خوش رہتیں۔ بچوں نے انہیں خالہ کے بجائے بڑی ماما کہنا شروع کیا تو اور بھی خوش ہوئیں۔ ان کی کفالت انہوں نے اپنے سر لے لی تھی۔ پیسا کھلا تھا اور شوہر بندۂ بے دام..... کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ جہاں جی چاہتا، خرچ کرتیں۔ حسن آرا کے بچے جو فرمائش کرتے، پوری کرتیں۔ حسن آرا کے بچے گویا عالم آرا کے بچے بن گئے تھے۔ حسن آرا بہن کی اعانت کا پورا فائدہ اٹھاتیں۔

کمپنی کے ایم ڈی کی معتمدِ خاص ہونے کے ناتے حسن آرا کا کمپنی کے اہم عہدوں پر فائز افراد سے رابطہ رہنے لگا۔ شعیب فاروق فارماسسٹ تھا۔ پینتیس سے اوپر مگر ہنوز غیر شادی شدہ۔ والدین حیات نہ تھے۔ دو بہنیں تھیں۔ دونوں شادی شدہ، بیرونِ ملک مقیم اور اپنی اپنی زندگی میں مگن تاہم اکلوتے بھائی کی شادی کے لیے فکرمند رہتی تھیں۔ شعیب تنہا رہتا تھا۔ والدین کا چھوڑا ہوا بنگلا تھا، گاڑی تھی، عمدہ ملازمت تھی۔ وہ ہینڈسم تھا۔ شادی کے لیے رشتوں کی کمی نہ تھی مگر وہ اب تک مجرد تھا۔ دوست شادی کا مشورہ دیتے تو لاابالی پن سے کہتا۔ ''کرلیں گے یار..... شادی کرنے کو زندگی پڑی ہے۔''

''کب شادی کرو گے، کب تمہارے بچے ہوں گے

اور کب وہ بڑے ہوں گے؟'' شعیب کے ایک دوست نے ایک روز کہا۔

''ایسی کسی عورت سے کرلوں گا جس کے پہلے ہی سے بچے ہوں۔'' شعیب نے دوست کی بات کے جواب میں مذاقاً کہا۔

مذاق میں کہی بات یوں سر چڑھے گی، نہ شعیب کے گمان میں یہ تھا نہ اس کے دوست کے۔

ایم ڈی کی معتمدِ خاص ہونے کے ناتے کمپنی کے جن ملازمین سے حسن آرا کا اکثر رابطہ رہتا تھا، شعیب فاروق بھی ان میں سے ایک تھا۔ حسن آرا نے شعیب کو اپنے حسن سے مسحور اور اداؤں سے رجھانا شروع کردیا۔ حسن آرا شادی شدہ اور عمر میں شعیب سے بڑی تھیں۔ مرد کو رجھانا جانتی تھیں۔ شعیب کو اپنا اسیر کرلیا اور ملازمت کے اوقات کار کے بعد اس کے ساتھ نہ صرف گھومنے پھرنے لگیں بلکہ اس کے گھر بھی آنا جانا شروع کردیا۔ شعیب کے گھر میں کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ حسن آرا نہ صرف شادی شدہ بلکہ چار بچوں کی ماں بھی تھیں، شعیب ان سے شادی کے لیے تیار تھا۔

حسن آرا نے عطرت خیال کے ذریعے شاہ مراد کو طلاق کا مطالبہ بھجوایا۔

''نہیں دوں گا۔'' شاہ مراد نے کہا۔

''دے دو بھائی...... میں نے ایک بار پہلے بھی تم سے کہا تھا...... عورت رہے تو اپنے آپ سے...... نہ رہے تو اپنے باپ سے...... اب تو معاملہ ہی اور ہے۔ حسن آرا کا کوئی کولیگ ان سے شادی کرنا چاہتا ہے۔'' عطرت نے کہا۔

''میرے نکاح میں ہوتے ہوئے وہ کسی اور سے شادی کیسے کرسکتی ہیں؟'' شاہ مراد کا لہجہ جارحانہ تھا۔

''ہاں...... نہیں کرسکتیں...... اسی لیے تمہیں مشورہ دے رہا ہوں کہ تم حسن آرا کی چھٹی کرو اور اپنی جان چھڑاؤ ورنہ جب تک تمہارا ان سے رشتہ رہے گا، ان کے ہر فعل کی بالواسطہ ذمے داری تم پر رہے گی کیونکہ تم ان کے شریکِ زندگی جو ہو۔''

''میرے بچے بھی ہیں عطرت بھائی!'' شاہ مراد نے بے بسی سے کہا۔

''کیا بچوں کی خاطر تم اپنی عزت کو داؤ پر لگائے رہو گے۔''

''تین بیٹیاں بھی ہیں۔''

''تو؟''

بہترین تحریریں، لاجواب روداد اور اعلیٰ داستانیں پڑھنے والوں کے لیے سرگزشت کا مطالعہ ضروری ہے

ماہنامہ سرگزشت کراچی

شمارہ جنوری 2024ء کی جھلکیاں

شاعرِ انسانیت

پشتو ادب سے ایک نامور شاعر کی حیرت انگیز داستانِ زیست

کرکٹ کا مغلِ اعظم

ایک معروف کھلاڑی کا زندگی نامہ۔ جو آپ کو چونکا دے گا

کاروانِ زیست

آپ کے پسندیدہ قلم کار کی زندگی سے ان کہی اور مخفی واقعات

اسیرِ جنوں

گلگت بلتستان سے لہو کی رفتار تیز کردینے والی طویل سرگزشت

سمندروں پار اک جزیرہ

دل کے تار بج اٹھیں ایک ایسا سفرنامہ

اس کے علاوہ

بہت سی دلچسپ داستانیں، سچے قصے، سچ بیانیاں، اگر آپ ادب پرست ہیں تو اس شمارے کو بھلا نہیں پائیں گے

''ان کی شادیاں بھی کرنی ہیں۔''

''تمہارا کیا خیال ہے، جن بیٹیوں کی مائیں اپنے شوہروں سے طلاق لے کر دوسری شادی کر لیتی ہیں، ان کی شادیاں نہیں ہوتیں؟ بھائی! مرجانے والی ماؤں کی بیٹیوں کی شادی بھی ہو جاتی ہے۔''

''وہ اور بات ہے۔''

''اور دور کچھ نہیں..... اصل بات یہ ہے کہ تمہارا دل تمہیں حسن آرا سے اپنا رشتہ ختم کر لینے پر آمادہ نہیں ہونے دیتا۔''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں۔''

''میں ٹھیک کہتا ہوں تو تم میرے مشورے پر عمل کرو۔ حسن آرا کو زبردستی اپنے نکاح میں کیوں باندھے رکھنا چاہتے ہو۔ تم سے اپنا رشتہ ختم کرنے کے لیے ان کے پاس خلع کا راستہ بھی موجود ہے..... پھر کیا کرو گے تم؟''

شاہ مراد متفکر نظر آنے لگے۔

''دے دو میاں..... اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔''

شاہ مراد نے عطرت کی طرف دیکھا۔ ''عطرت بھائی! ہوسکتا ہے حسن آرا کو اپنی غلطی کا احساس ہو جائے۔''

''دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے۔''

شاہ مراد جھینپ گئے۔ ''سوچتا ہوں۔'' انہوں نے سر جھکا کر کہا۔

عطرت کا ہاتھ شاہ مراد کے کندھے پر آپہنچا۔ ''مجھے اگر ہلکی سی رمق بھی دکھائی دیتی حسن آرا کی طرف سے تم سے مصالحت کی تو میں تمہیں ہرگز یہ مشورہ نہ دیتا۔ وہ تو تمہارا نام تک نہیں آنے دیتیں اپنی زبان پر۔ تمہارے بچے اور وہ..... سب بہت خوش ہیں تم سے الگ ہو کر۔ وہ شخص جس سے ان دنوں ان کی پینگیں بڑھ رہی ہیں، نہ صرف انہیں بلکہ تمہارے بچوں کو بھی اپنی گاڑی میں باہر گھمانے پھرانے کے لیے لے جاتا ہے۔ عالمہ کی پوری سپورٹ حاصل ہے اس سلسلے میں حسن آرا کو۔''

''غلط ہے عطرت بھائی! آپ اپنی بیگم کو سمجھائیں، روکیں انہیں اس غلط شہ سے۔'' شاہ مراد برافروختہ ہوئے۔

''تمہارا کیا خیال ہے..... میں روک سکتا ہوں؟ ارے بھائی! تم مجھے جو چاہو کہو، میں عالمہ کے ساتھ اپنا گھر بسائے رکھنے پر مجبور ہوں ورنہ تمہاری طرح پریشان ہو جاؤں گا۔''

''آپ کا معاملہ اور ہے..... آپ صاحب زر ہیں۔''

''تجربے کی بات ہے..... زن کے سر میں جب کوئی سودا سما جائے تو نہ زر دیکھتی ہے، نہ زمین کو خاطر میں لاتی ہے۔ اسی لیے میں عالمہ کے کسی معاملے میں الجھنے سے گریز کرتا ہوں۔''

شاہ مراد نے ایک گہری سانس کھینچی۔

''آخری بار برادرانہ اور مخلصانہ مشورہ دے رہا ہوں۔ حسن آرا سے اپنی جان چھڑاؤ..... سکھی ہو جاؤ گے۔''

شاہ مراد دکھی دکھائی دیے۔

☆☆☆

انیقہ کو بتانا ضروری نہیں تھا مگر شاہ مراد کو اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے اسے بتانا پڑا۔ ''میں تمہاری ماں کو چھوڑ رہا ہوں۔'' شاہ مراد اور انیقہ اپنے اپنے بستر پر لیٹے تھے۔ رات کا وقت تھا۔ کمرے میں زیرو پاور بلب کی دھندلی روشنی اور شاہ مراد کی نظریں کمرے کی چھت سے لگی تھیں۔

''کہاں چھوڑ رہے ہیں پاپا؟'' انیقہ چونکی۔

''جہاں وہ مجھے چھوڑ کر گئی ہیں..... طلاق دے رہا ہوں میں انہیں۔'' شاہ مراد کے لہجے میں درد گھلا تھا۔

''پھر کیا ہوگا پاپا؟''

''پھر وہ اور میں..... ہم ہمیشہ کے لیے الگ ہو جائیں گے۔''

انیقہ اٹھ بیٹھی۔

''آپ کو فلم مل جائے گی پاپا۔'' اس نے باپ کو دلاسا دینے کو کہا۔

شاہ مراد نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ ''بیٹا! فلم مل بھی جائے تو وہ اور میں اکٹھے نہیں رہ سکتے۔''

''کیوں پاپا؟'' اس کا لہجہ مغموم تھا۔

''وہ کسی اور سے شادی کرنا چاہتی ہیں۔''

''کس سے؟'' وہ چونکی۔

''ہے کوئی..... جو تمہاری ماں کے ساتھ کام کرتا ہے اور پیسے والا ہے۔''

''آپ کو کیسے معلوم؟''

''ایسی باتیں معلوم ہو ہی جاتی ہیں بیٹا!'' شاہ مراد نے توقف کیا۔ ''تم اپنی ماں کے ساتھ رہنا چاہو گی یا؟''

''آپ کے ساتھ پاپا۔''

وہ نہایت استقامت سے باپ کے ساتھ کھڑی تھی۔

''لیٹو بیٹا! سو جاؤ..... صبح تمہیں اسکول بھی جانا ہے۔''

وہ لیٹ تو گئی مگر نیند آنکھوں سے جیسے کوسوں دور تھی۔

شاہ مراد کے لیے حسن آرا کی ناراضگی سے زیادہ کسی دوسرے مرد کی طرف مائل ہو جانا نہایت کرب انگیز امر تھا۔ عطرت خیال کی باتوں پر انہوں نے جتنا غور کیا، اسی قدر قائل

ہوتے گئے...... بالآخر انہوں نے حسن آرا کو طلاق لکھ دی...... مہر وہ شادی کی رات ہی حسن آرا کو ادا کر چکے تھے۔ اس وقت ان کے حالات اچھے تھے۔ فلمی دنیا میں ان کے نام کا سکہ چلتا تھا۔ اس وقت کون کہہ سکتا تھا کہ فلمی دنیا کا نامور ہدایت کار اپنی ازدواجی زندگی کی ناکامی کا دکھ سہے گا۔

☆☆☆

شاہ مراد سے طلاق کے بعد حسن آرا کا اپنے کولیگ شعیب سے نکاح کرنے میں تقریباً پانچ ماہ کا وقفہ رہا۔ شعیب کی بیرونِ ملک مقیم دونوں بہنیں چار بچوں کی مطلقہ ماں سے جو عمر میں بھی شعیب سے بڑی تھی، اپنے اکلوتے اور غیر شادی شدہ بھائی سے شادی میں حتی الامکان مانع رہیں مگر حسن آرا کا جادو شعیب کے سر چڑھ کر بولا اور بالآخر دونوں ازدواجی بندھن میں بندھ گئے۔

نکاح سے قبل حسن آرا نے ملازمت سے استعفا دے دیا تھا۔ نکاح کے بعد چند دن وہ شعیب کے ساتھ سیر سپاٹوں میں رہیں۔ اس دوران بچے عالم آرا کے پاس رہے۔ حسن آرا اور شعیب کا ہنی مون ختم ہوا تو حسن آرا بچوں کو اپنے ساتھ شعیب کے گھر لے گئیں۔ شعیب کو اپنا اسیر بنائے رکھنے کے لیے حسن آرا نہ صرف اس کا بلکہ اپنا بھی پہلے سے زیادہ خیال رکھ رہی تھیں۔ فارماسیوٹیکل کمپنی میں چند دن دونوں کی شادی کا چرچا رہا۔ شعیب کے بے تکلف ساتھیوں نے چار بچوں کی ماں سے اس کی شادی پر پھبتیاں بھی کسیں مگر پھر سب ٹھنڈے ہو کر بیٹھ رہے۔ حسن آرا نے اپنے حسن اور اداؤں سے شعیب کو شادی سے پہلے جو رجھا رکھا تھا، سو تھا، شادی کے بعد ایسا لبھایا کہ وہ حسن آرا کے قدموں میں ڈھیر ہو گیا۔

حسن آرا خوش تھیں۔ شاہ مراد سے طلاق کا انہیں مطلق ملال تھا نہ ہی پچھتاوا۔ ان کا اپنا فیصلہ تھا اور اس کے بعد انہیں وہ سب کچھ مل گیا تھا جس کی چار بچوں کی مطلقہ ماں محض تمنا ہی کر سکتی تھی۔ جوان، ہینڈسم اور اچھے عہدۂ ملازمت پر فائز شوہر جس کا باپ اس کی زندگی کو پُرسہولت بنانے کے لیے اچھی تعلیم دلوانے کے علاوہ ایک پُرآسائش گھر اور دیگر جائداد بھی چھوڑ کر مرا تھا۔ اس سے رشتہ قائم ہونے کے بعد حسن آرا اپنے تینوں بچے نئے گھر میں لے آئی تھیں جہاں انہیں وہ تمام سہولیات میسر تھیں جو انہیں اپنے باپ شاہ مراد کے گھر میں رہتے ہوئے نہ مل سکی تھیں۔

شعیب نے ان بچوں کو خوشدلی سے قبول کر رکھا تھا۔ حسن آرا نہایت ہوشیاری سے شعیب پر اپنا رنگ جما چکی تھیں۔ اپنی نئی ازدواجی زندگی میں انہیں شاہ مراد کا خیال نہایت تحقیر کے ساتھ آتا۔ شاہ مراد سے شادی انہیں اپنی زندگی کا نہایت جذباتی اور غلط فیصلہ محسوس ہوتا۔ سچ تو یہ تھا کہ اس فیصلے میں محبت، خلوص اور نیک نیتی کا دور دور تک گزر نہ تھا۔ شاہ مراد سے شادی انہوں نے فلمی ہیروئن بننے کے شوق میں کی تھی اور ان کے اس شوق اور خواہش کی بھی تکمیل نہ ہو سکی تھی۔ نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم......

بہرحال اب شعیب سے شادی کے بعد حسن آرا بہت خوش اور مطمئن تھیں اور انیقہ کے بارے میں اپنے دوسرے بچوں سے اکثر کہتیں۔ ''بے وقوف لڑکی! خوار ہو گی باپ کے ساتھ۔ میرے ساتھ ہوتی تو آج وہ بھی تم لوگوں کی طرح آرام سے ہوتی۔''

''ماما! اسے تو اسکول بس میں اسکول جانا پڑتا ہو گا۔ ہم لوگ تو ڈیڈی کی کار میں جاتے ہیں۔'' شاہ تاج فخر سے کہتا۔

''پتا نہیں، اسکول بس میں جاتی ہو گی یا پیدل۔'' حسن آرا کہتیں۔

☆☆☆

وقت کی چال عجیب ہے۔ کبھی پر لگا کر اڑتا ہے، کبھی کچھوے کی چال چلتا ہے۔ شاہ مراد اور انیقہ کے لیے وقت کچھوے کی چال چلا تھا۔ دھیرے دھیرے، یکسانیت سے...... شاہ مراد کے سر میں چاندی کے تاروں کی فصل لہلہا اٹھی تھی۔ بال رنگنا ان کا طریق ہی نہ رہا تھا۔ جن دنوں اسٹوڈیوز میں ان کی آواز گونجا کرتی تھی تب بھی ان کے سیاہ بالوں میں کہیں کہیں چاندی کے تار اپنی چھب دکھایا کرتے تھے۔ انیقہ نے وہ رنگ روپ نکالا تھا کہ ماں کو پیچھے چھوڑ گئی تھی۔

سلمیٰ زیادہ پڑھی لکھی نہ تھی مگر خاطر خواہ سوجھ بوجھ رکھتی تھی۔ اس نے اپنی بیٹی آئمہ کے ساتھ انیقہ کو بھی ہر اونچ نیچ جس سے اس عمر کی لڑکیوں کو آگاہ ہونا ضروری ہوتا ہے، سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ سچ تو یہ تھا کہ سلمیٰ نے انیقہ کے لیے ماں کا کردار ادا کرنے کی کوشش کی تھی۔ انیقہ اور آئمہ بہنوں کی طرح مل جل کر رہتیں۔ آئمہ پڑھائی میں انیقہ کی طرح لائق نہ تھی۔ انیقہ اسے پوری مدد دیتی۔ انیقہ سے اپنے بہناپے پر آئمہ کو فخر ہوتا۔ اسکول میں انیقہ ٹیچرز کی آنکھوں کا تارا بنی ہوئی تھی۔ انیقہ اور آئمہ دونوں اب دسویں جماعت میں تھیں۔ اسکول میں آخری سال تھا۔ آئمہ کہتی، میٹرک کے بعد وہ بھی اسی کالج میں داخلہ لے گی جس میں انیقہ لے گی۔

''انیقہ جیسا پڑھ کر بھی تو دکھاؤ۔ انیقہ تو ایسی لائق ہے کہ اسے کسی بھی کالج میں ہاتھوں ہاتھ داخلہ مل جائے گا۔''

pklibrary.com

سلمیٰ کہتی۔

''بابا میرے لیے کسی سے سفارش کروا دیں گے نا۔''
آئمہ جھینپ کر کہتی۔

''سفارش کا زمانہ گیا۔ اب نمبروں پر داخلہ ملتا ہے۔''

''فکر نہ کریں پھپو! آئمہ نمبر [illegible] لے گی۔'' انیقہ حوصلہ افزا نظروں سے آئمہ کو دیکھتی۔

تعلیم انیقہ کے لیے دنیا کا محبوب ترین مشغلہ بن گیا تھا۔ تعلیم سے اس کی دلچسپی اور لگن ہی [illegible] نے اسے [illegible] کی آنکھوں کا تارا بنا رکھا تھا...... مگر رات کو پڑھتے پڑھتے اس کا دھیان ماں اور بھائی بہنوں کی طرف بھی بٹ جاتا۔

''پاپا......!'' ایک روز اس نے باپ کو محتاط [illegible] مخاطب کیا۔

''ہاں بیٹا!''

''آپ سے ایک بات پوچھوں؟''

''پوچھو۔'' وہ اٹھ بیٹھے۔

''آپ کو وہ سب لوگ یاد آتے ہیں؟''

''کون؟'' شاہ مراد انجان بن گئے۔

''ماما، انیتا، شاہ تاج اور اینہ!''

شاہ مراد نے ایک سرد آہ کھینچی اور بستر سے اٹھ کر اس کے نزدیک آ بیٹھے۔ وہ ان کا چہرہ تکنے لگی۔

''تمہاری ماں سے تو میرا اب کوئی رشتہ ہی نہیں رہا...... ہاں اپنے بچے مجھے اکثر یاد آتے ہیں...... اینہ تو میرے سینے پر سر رکھے بغیر سوتی ہی نہ تھی۔''

''ان سے ملنے کے لیے جائیں [illegible] دن۔''

''تمہاری ماں کے شوہر کے گھر؟ نہیں...... میں وہاں نہیں جا سکتا۔''

انیقہ کو باپ کا چہرہ دکھ اور بے بسی کی گرد میں اٹا دکھائی دیا۔

☆☆☆

شراب اور عورت کا نشہ مستقل نہیں رہتا۔ شعیب کو حسن آرا کے حسن اور اداؤں کا نشہ کچھ عرصے بعد ہی اترنے لگا۔ وہ حسن آرا کا ماضی کریدنے کی کوشش کرتا۔

''اس کالے آدمی سے تمہاری شادی کیسے ہو گئی تھی؟'' ایک روز اس نے کہا۔

''بس، قسمت میں تھا۔''

''قسمت اتنی اندھی تو نہیں ہوتی۔ کیا تمہارے ماں باپ کو بھی دکھائی نہ دیا کہ ہم کیسے بدصورت آدمی کو اپنی بیٹی دے رہے ہیں۔''

''ابا شریف آدمی تھے۔ ان کے نزدیک مرد کی شکل صورت نہیں، شرافت اور خاندانی پن اہمیت رکھتا تھا۔''

''سارے جہان میں تمہارے ابا کو ایک وہی شریف اور خاندانی آدمی دکھائی دیا...... نہیں...... میرے دل کو یہ بات نہیں لگتی۔ تمہارا شادی سے پہلے کسی کے ساتھ چکر تو نہیں تھا؟''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ تم خوبصورت تو تھیں...... لڑکے مرتے تو ہوں گے تم پر...... ہو سکتا ہے تمہارا کسی کے ساتھ افیئر ہو...... کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی ہو اور تمہارے ابا نے بدنامی سے بچنے کے لیے تمہیں بقول تمہارے شریف آدمی کے سر منڈھ دیا ہو...... اور اس بے چارے نے سوچا ہو...... چلو ٹھیک ہے، کوئی بات نہیں۔ بائی دی وے انیتا تمہاری شادی کے کتنے عرصے بعد پیدا ہوئی تھی؟''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''مطلب!'' وہ مکاری سے مسکرایا۔ ''دوسرا شوہر ہوں تمہارا۔ پوچھ گچھ تو میرا حق بنتا ہے۔''

''تمہیں مجھ پر شک نہیں کرنا چاہیے۔ میری اور شاہ مراد کی بے جوڑ شادی تھی جو میرے والد کی مرضی سے ہوئی۔ میرا اس شخص سے کبھی دل ہی نہیں مل سکا...... جتنا عرصہ اس کے ساتھ رہی، زبردستی گزارہ کیا۔''

شعیب نے دونوں ہاتھوں سے تالی بجائی۔ ''واہ...... واہ۔ دل نہ ملنے پر تم چار بچے پیدا کر بیٹھیں۔''

حسن آرا تلملا کر رہ گئیں۔

''تم کچھ بھی کہو...... مجھے تو تمہاری اور اس شخص کی شادی میں دال میں کچھ کالا نظر آتا ہے۔''

یہی نہیں، وہ بات بات پر اس کی سابقہ ازدواجی زندگی کو کریدنے لگتا تھا۔ حسن آرا زچ ہو جاتیں البتہ ایک خوبی تھی اس میں اور وہ یہ کہ اس نے ان کے تینوں بچوں کو نہ صرف قبول کر رکھا تھا بلکہ ان کے ساتھ نہایت دوستانہ رویہ رکھتا۔ تینوں اس کے ساتھ بہت خوش رہتے۔ وہ انہیں سیر و تفریح کے لیے باہر لے جاتا...... اکثر ہوٹلنگ بھی کراتا...... حسن آرا سوچتیں، یہی بہت ہے کہ وہ ان کے بچوں کے ساتھ سوتیلے پن کا رویہ نہیں رکھتا تھا۔ ان کی کفالت پر ناک بھوں نہ چڑھاتا تھا۔ عالم آرا اس کی تعریف کرتے نہ تھکتیں۔

''حسنہ! تمہاری کوئی نیکی پسند آئی ہے اللہ کو جو اس نے تمہیں ایسا شوہر دے دیا ہے جو سگے باپ سے زیادہ تمہارے بچوں کا خیال رکھتا ہے۔''

حسن آرا بہن کو یہ نہ بتا پاتیں کہ شعیب ان کی سابقہ زندگی کے بارے میں ان سے کس کس طرح کے سوال کرتا

pklibrary.com

تھا۔ عطرت چپ چاپ شعیب کے بارے میں اپنی بیگم کے قصیدے سنے جاتے۔ شاہ مراد سے ان کا اب بھی ملنا جلنا تھا۔ گو پہلے کی طرح بہت زیادہ نہیں مگر رابطہ ٹوٹا نہ تھا۔

شاہ مراد رسالے کی ملازمت جاری رکھے ہوئے تھے مگر ان کے دل سے فلم کا خیال اب تک نہ گیا تھا۔ یہی آس تھی کہ کوئی نہ کوئی جوہر شناس ان کی سابقہ تاریخ کے پیشِ نظر انہیں چانس دے دے گا۔ دوربیں ہارے ہوئے گھوڑے پر بھی تو رقم لگانے کو تیار ہوتے ہیں۔

انیقہ اب کالج میں پہنچ گئی تھی۔ آئمہ کو نمبر کم ہونے کے باعث اس کے کالج میں تو داخلہ نہ مل سکا تھا تاہم دونوں کا بہناپا اور دوستی اسی طرح برقرار تھی۔ کالج سے آنے کے بعد زیادہ وقت اکٹھے ہی گزارتیں۔ سلمیٰ ان کی دوستی کو انیقہ سے مہربانی اور اپنایت کا سلوک کر کے بڑھاوا دیتی۔

شاہ مراد کے کندھے وقت سے پہلے ہی جھک گئے تھے۔ مرد کے لیے معاش کی تنگی سے بڑی کوئی ضرب نہیں مگر اس تنگی میں بھی ان کا احساسِ ذمے داری بدستور برقرار تھا۔ حسن آرا کی دوسری شادی کے بعد بھی انہوں نے حسبِ سابق اپنے بچوں کا خرچ اپنی استطاعت کے مطابق عطرت کی وساطت سے حسن آرا کو بھجوایا تو رقم اس جواب کے ساتھ واپس کر دی گئی کہ اس سے زیادہ تو بچوں کی فیسیں چلی جاتی ہیں۔

شاہ مراد نے کہا۔ ''عطرت بھائی! میری حیثیت تو فقط اتنی ہی ہے۔''

''تم دل کو کیوں لگاتے ہو۔ تم نے اپنا فرض پورا کیا۔ اب حسن آرا جانیں اور ان کے بچے۔'' عطرت نے ان سے کہا۔

''بچے میرے بھی ہیں عطرت بھائی!''

''وہ بھی تو تمہیں اپنا باپ سمجھیں۔ کبھی ملنے کی کوشش کی انہوں نے تم سے یا اپنی بہن سے.....؟ ارے میاں! خون سفید ہو جاتا اسی کو کہتے ہیں۔ حسن آرا جب بچوں کے ساتھ اپنی بہن سے ملنے کے لیے آتی ہیں تو ان کے اور بچوں کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر میں حیران ہوتا ہوں۔ حسن آرا کو تو خیر چھوڑو کہ ان سے تمہارا کوئی رشتہ نہیں رہا..... بچے بھی کبھی بھولے سے تمہارا یا انیقہ کا ذکر نہیں کرتے۔''

شاہ مراد ایک ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئے۔

یوں بھی ہونا تھا کہ وہ اپنی ہی اولاد کے لیے اتنے بے وقعت ٹھہرے۔ انیقہ ان کے چار بچوں میں واحد تھی جس نے ان کی ترغیب کے باوجود ان کا ساتھ نہیں چھوڑا تھا۔

سلمیٰ کہتی۔ ''مراد بھائی! آپ خوش قسمت ہو کہ آپ کو اللہ نے انیقہ جیسی بیٹی دی ہے۔ بہت پیار کرتی ہے آپ سے۔''

''ہاں۔'' شاہ مراد اثبات میں سر ہلاتے۔

''میرا کوئی بیٹا ہوتا نا تو میں انیقہ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے پاس رکھ لیتی۔''

''پھپھو! میں اب بھی آپ کے پاس ہی ہوں۔''

''ارے بیٹا! بچیوں کو ایک نہ ایک دن اپنے گھر جانا ہوتا ہے۔''

''میں ہمیشہ پاپا کے ساتھ ہی رہوں گی پھپھو!''

''پاپا کو اپنے ساتھ لے جانا۔'' سلمیٰ مذاقاً کہتی۔

''بیٹیوں کے گھر کون رہتا ہے سلمیٰ بہن!''

''چھوڑیں بھائی.....! زمانہ بدل گیا ہے۔ اب وہ سب ہوتا ہے جو پہلے نہیں ہوتا تھا۔''

''سلمیٰ بہن! زمانہ لاکھ بدل گیا ہو، ہم وہی ہیں..... اپنی روایتوں کے امین۔'' شاہ مراد وضع داری ظاہر کرتے۔

☆☆☆

رات کے سناٹے میں شاہ مراد اور انیقہ اپنے اپنے بستر پر لیٹے دھیمی آوازوں میں باتیں کر رہے تھے۔ یہ ان کا روزمرہ کا معمول تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو دن بھر کی روداد سناتے اور کبھی گزرے وقت اور کبھی آئندہ کی باتیں کرنے لگتے۔

''ایک بات بتایئے پاپا!'' انیقہ کے لہجے میں غیر معمولی حزم تھا۔

''پوچھو۔'' انیقہ سے بات کرتے ہوئے شاہ مراد کے لہجے میں انتہائی محبت اتر آتی تھی۔

''آپ نے..... آپ نے ماما سے شادی کیوں کی؟''

''کیا مطلب؟'' شاہ مراد کی آواز میں چونکنے کا عنصر تھا۔

''اتنی مختلف تھیں وہ آپ سے..... پھر بھی آپ نے ان سے شادی کیوں کی؟''

''آسمان پر طے ہو جانے والے جوڑ کو بہر صورت بندھنا ہوتا ہے بیٹے!''

''پھر بھی پاپا!''

''شادی زندگی کے ان معاملات میں سے ہے میری بٹیا جس میں اللہ کی رضا کے سوا کسی کا کوئی دخل نہیں ہوتا..... جہاں ہونی ہوتی ہے، ہو کر رہتی ہے..... انسانوں کی مرضی اور پسند، ناپسند دھری رہ جاتی ہے۔''

''ماما آپ کو اچھی لگی تھیں؟''

''مجھے تو بس اپنے کام سے لگن تھی۔''

''اچھا!'' اب انیقہ کے چونکنے کی باری تھی۔ ''تو پھر؟''

''عطرت بھائی سے میرا تعلق تھا۔ تمہاری ماما میری

ایک فلم کی مہورت پر تمہاری عالمہ خالہ اور عطرت بھائی کے ساتھ آئی تھیں۔"

"آپ نے انہیں دیکھا اور پسند کرلیا۔"

"نہیں۔"

"تو پھر؟"

"عطرت بھائی نے مجھے بتایا کہ تمہاری ماما مجھ سے شادی کرنے کے لیے تمہاری خالہ سے بضد ہوگئیں اور یہ تک کہہ دیا کہ اگر ان کے گھر والوں نے مجھ سے ان کی شادی نہ کی تو وہ خود مجھ سے شادی کرنے کے لیے اسٹوڈیو آجائیں گی۔"

"رئیلی!"

"ہاں۔"

"پھر؟"

"پھر ان کی اور میری شادی ہوگئی۔"

"وہ خوش تھیں؟"

"ظاہر ہے۔"

"اور آپ؟"

"میں بھی۔"

"پھر ایسا کیوں ہوا پاپا؟"

"کیسا؟"

"کہ آپ اور ماما..... میرا مطلب ہے..... انڈر اسٹینڈنگ کیوں ختم ہوگئی؟"

"بیٹا! انڈر اسٹینڈنگ تو شاید کبھی بھی نہیں تھی..... نہ شادی سے پہلے، نہ شادی کے بعد۔"

"تو پھر آپ نے شادی کیوں کی؟"

شاہ مراد اٹھ بیٹھے۔ ایک ٹھنڈی سانس بھری پھر قدرے توقف سے بولے۔

"میں نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ ظاہراً اور عمر میں تمہاری ماں کا اور میرا کوئی جوڑ نہیں، پوری نیک نیتی اور صدق دلی سے ان کا ہاتھ تھاما تھا مگر..... بعد میں پتا چلا کہ تمہاری ماں نے کسی اور ہی نیت سے مجھ سے شادی کی تھی۔ وہ فلموں میں اداکاری کرنے کی خواہش مند تھیں اور اپنے اس شوق کو پورا کرنے کے لیے انہوں نے مجھ سے شادی کی تھی۔"

"عطرت خالو نے بتایا یہ آپ کو؟" انیقہ نے پوچھا۔

"نہیں..... تمہاری ماں نے خود اعتراف کیا مجھ سے۔"

"یقین نہیں آتا پاپا!"

"میں تم سے جھوٹ بولوں گا؟"

"سوری پاپا..... میرا یہ مطلب نہیں۔"

"جب انہوں نے اپنی اس خواہش کا اظہار مجھ پر کیا اور میں نے اس کی مخالفت کی تو انہوں نے برملا کہا کہ میں نے تو آپ سے شادی اسی لیے کی تھی کہ میں فلموں میں کام کرنا چاہتی تھی۔"

"ورنہ نہ کرتیں؟" انیقہ کی آواز مدھم تھی۔

"ہاں، انہوں نے یہی کہا تھا۔"

"پھر پاپا؟" انیقہ کا تجسس بڑھا۔

"پھر کیا بیٹا.....! تمہارے باپ کی شہرت گہنانے لگی۔ تمہاری ماں سمجھ گئیں کہ مجھ سے شادی کرکے انہوں نے خسارے کا سودا کیا تھا۔ وہ مجھ سے دور ہونے لگیں، یہاں تک کہ ہم جدا ہوگئے۔" شاہ مراد کی آواز بھرا گئی۔

"آئی فیل سوسوری فار یو پاپا!"

"کیوں؟"

"ماما نے اچھا نہیں کیا آپ کے ساتھ۔"

"میں نے اچھا نہیں کیا ان کے ساتھ۔"

"کیوں؟ آپ نے اچھا کیا نہیں کیا..... کیا برا کیا؟"

"فلموں میں کام نہ کرنے دینا..... اچھی زندگی تو دینا انہیں..... وہ بھی نہیں دے سکا۔" شاہ مراد کی آواز میں دکھ تھا۔

"کوشش تو کرتے تھے آپ..... اب تک محنت کررہے ہیں۔"

"لاحاصل!" شاہ مراد نے پھر ٹھنڈی سانس بھری۔

"آئی لو یو پاپا!"

"میں بھی تم سے بہت پیار کرتا ہوں میرے بچے..... میری زندگی میں اب تمہارے سوا ہے ہی کیا۔"

☆☆☆

شاہ مراد کے محدود مالی وسائل کے پیش نظر انیقہ اکثر ضرورتوں کو پس پشت رکھتی تھی۔ خواہشات کا تو ذکر ہی کیا۔ اپنے تعلیمی مصارف میں باپ کا ہاتھ بٹانے کے لیے اس نے گھر میں ٹیوشن کا سلسلہ شروع کرنا چاہا تو شاہ مراد نے روک دیا۔

"بیٹا! سکی اور ان کے شوہر کہیں نہ کہیں دل میں سوچیں گے کہ انہوں نے تو ہمارے گھر کو ذریعۂ آمدن بھی بنالیا۔"

"پاپا! میں بچوں کو اوپر بلالیا کروں گی۔"

"اوپر بھی تو انہی کا گھر ہے۔ کرایہ وہ لوگ لیتے نہیں۔ میں کسی نہ کسی بہانے تھوڑا بہت دینے کی کوشش کرتا ہوں مگر آٹے میں نمک کے برابر ہوتا ہے۔"

"یہ تو ٹھیک ہے پاپا!"

"ٹھیک ہے تو تمہیں ٹیوشنز کی کیا ضرورت؟"

وہ یہ نہ کہہ سکی کہ اپنی تعلیم کا سارا بوجھ باپ پر ڈالنے

کے بجائے ان کا ہاتھ بٹانا چاہتی تھی مگر شاہ مراد اس کے کہے بنا بھی سمجھ سکتے تھے۔

''فکر مت کرو بیٹا! بس ایک فلم ملنے کی دیر ہے..... کالا آدمی کا آئیڈیا دیا ہے میں نے ایک فنانسر کو۔''

انیقہ کو باپ پر ترس آنے لگتا۔ اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود وہ اب تک اس حقیقت کو قبول نہ کر پائے تھے کہ ان کا دور گزر چکا تھا۔ حیات کے دیگر شعبوں کی طرح فلم میکنگ کی تکنیک میں بھی جدت آچکی تھی۔ ایسے میں شاہ مراد کے لیے جگہ کہاں بنتی..... مگر شاہ مراد پُرامید تھے۔

☆☆☆

آئمہ کی سالگرہ تھی اور اس کی خواہش پر سلمٰی اور ضمیر گھر کے بجائے باہر اس کی سالگرہ منانے کے لیے لے گئے تھے۔ انیقہ کا ہمراہ جانا تو لازم تھا ہی، سلمٰی اور ضمیر کے بے حد اصرار پر شاہ مراد کو بھی ان کے ساتھ جانا پڑا تھا۔ انیقہ اور شاہ مراد دونوں نے علیحدہ علیحدہ آئمہ کے لیے تحائف بھی لیے تھے۔ ایک معروف ریسٹورنٹ کے ڈائننگ ہال میں آئمہ نے کیک کاٹا اور ضمیر کے بندوبست پر پُرتکلف عشائیہ میز پر آگیا۔ کھانا کھاتے ہوئے انیقہ نے دیکھا شاہ مراد کھانے سے ہاتھ روکے دم بخود ایک ہی سمت میں گھور رہے تھے۔

''پاپا!'' انیقہ نے ان کی محویت توڑنے کی کوشش کی۔

''آں..... ہاں.....!'' وہ چونکے۔

''آپ کھانا کیوں نہیں کھا رہے؟''

''ہاں..... کھاتا ہوں..... کھا تو رہا ہوں۔'' انہوں نے پھر اسی سمت میں دیکھا۔

انیقہ نے گردن موڑ کر خود بھی اسی سمت میں دیکھنے کو نظر دوڑائی اور خود شاہ مراد ہی کی طرح دم بخود رہ گئی۔ بہت فاصلے پر مگر اسی ہال میں حسن آرا اپنے تین بچوں اور ایک مرد کے ساتھ جو یقیناً ان کا دوسرا شوہر ہی تھا، کھانا کھا رہی تھیں۔ ایک ڈائننگ ٹیبل کے گرد بیٹھے وہ پانچ نفوس خوشحالی اور مسرت و اطمینان کا دلفریب مرقع نظر آتے تھے۔ کوئی انجانا فرد حسن آرا کے عمدہ میک اپ سے جگمگاتا چہرہ، ان پانچوں کے بہترین ملبوسات اور چہروں پر بکھری طمانیت اور مسکراہٹ دیکھ کر یقین نہیں کر سکتا تھا کہ اسی ہال کے ایک دور افتادہ حصے میں ایک دوسری میز پر بیٹھے پانچ ہی نفوس میں سے ایک نہایت پژمردہ چہرے اور سیاہ رنگت والے مرد اور اس کے برابر سادہ سے سوتی لباس میں بیٹھی نوجوان لڑکی سے اس عورت اور اس کے ساتھ بیٹھے تین بچوں کا ان دونوں سے کتنا قریبی رشتہ رہا ہوگا۔ انیقہ نے دیکھا، اس کی ماں کا نیا شوہر اعتنا اور باقی دونوں بچوں سے بھی خوب ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔

''آپ کی پلیٹ میں رائس ڈالوں پاپا؟'' انیقہ کو خود اپنی آواز بیگانہ لگی۔

''آں..... ہاں..... نہیں..... بس کھالیا۔''

''ارے بھائی! ابھی تو کھانا شروع ہوا ہے اور آپ کہتے ہو کھالیا۔'' ضمیر نے کہا۔

''پاپا تھوڑا ہی کھاتے ہیں انکل!'' انیقہ بولی۔

''اسی لیے تو اتنے اسمارٹ ہیں میرے بھائی۔'' سلمٰی نے ہمیشہ کی طرح شاہ مراد سے اپنایت کا اظہار کیا۔

''ہاں بھئی تمہارے بھائی جو ہیں۔ بہن بھائی دونوں ہی ہوا پر گزارہ کرتے ہو۔ بھئی ہم تو کھاتے پیتے لوگ ہیں۔ اسمارٹ رہ کر کیا کرنا ہے۔ اللہ نے بے شمار نعمتیں اس لیے تو عطا نہیں کر رکھیں کہ اسمارٹنس کے شوق میں ان سے منہ موڑ لیا جائے۔''

''کھائیں بھئی کھائیں..... خوب پیٹ بھر کر کھائیں اور وزن بڑھائیں۔'' سلمٰی نے خوشدلی سے کہا۔

☆☆☆

''آپ نے دیکھا پاپا! وہ سب کتنے خوش تھے۔'' گھر واپسی پر انیقہ نے شاہ مراد سے کہا۔

''ہاں..... دیکھا تھا۔'' شاہ مراد نے ٹھنڈی سانس بھری پھر قدرے توقف سے بولے۔ ''تمہاری ماں ایسی ہی زندگی چاہتی تھیں۔''

''پھر انہوں نے آپ سے شادی کیوں کی؟''

''بتایا تو تھا تمہیں اور..... اس لیے بھی کہ میں اس وقت انہیں ایسی ہی آسائش دینے کے وسائل رکھتا تھا۔''

''آپ کو دکھ ہوا؟''

''کس دکھ کی بات کرتی ہو بیٹا؟''

''آئی ہیٹ ہم۔''

''اس کا کیا دوش؟''

''یہ جانتے ہوئے بھی کہ ماما کے تین بچے ہیں، اس نے ماما سے شادی کیوں کی؟''

''یہ بات تو تمہاری ماں کے سوچنے کی تھی اور..... یہ کیا کہا تم نے..... تین بچے..... خود کو شمار کرنا بھول گئیں؟''

''میں آپ کی بیٹی ہوں بس۔''

''عجیب بات ہے۔'' شاہ مراد نے پھر ایک گہرا سانس کھینچا۔

''کون سی بات؟''

''کیسی ہی ناراضگی ہو، کتنی ہی لاتعلقی ہو، سوائے ایک رشتے کے سارے رشتے قائم رہتے ہیں۔ بس وہی ایک رشتہ ٹوٹ جاتا ہے اور زندگی بھر کی رفاقت صرف تین سیکنڈ میں ٹوٹ جاتی ہے..... لائف پارٹنرز اجنبی بن جاتے ہیں۔''

''آپ کو افسوس ہے پاپا؟''

''کس بات کا؟''

''ماما سے اپنا رشتہ ٹوٹ جانے کا۔''

''کچھ زخم ایسے بھی ہوتے ہیں بیٹا جو زندگی بھر نہیں بھر پاتے۔ مجھے تمہاری ماں سے محبت تھی۔''

''اب تو نہیں رہی ہوگی۔''

شاہ مراد کچھ نہیں بولے۔

''یو اسٹل لو ہر پاپا؟'' انیقہ کے لہجے میں استفہام تھا۔ اسے کوجب باپ سے کوئی بات کہنی مشکل لگتی تو وہ انگریزی کا سہارا لینے کی عادی تھی۔

''تعلق ٹوٹ جائے تو محبت اور نفرت اپنے معانی کھو دیتے ہیں بیٹا! بس کسک رہ جاتی ہے۔''

''آئی لو یو پاپا!''

''می ٹو بیٹا!''

''آمنہ کی برتھ ڈے پارٹی اچھی رہی نا پاپا؟'' انیقہ نے موضوع بدل دیا۔

''ہاں..... بہت اچھی..... ہم پانچ ہی افراد تھے مگر اچھا رہا..... آمنہ خوش تھی۔''

''پاپا! آمنہ دل کی بہت اچھی ہے۔''

''تم سے زیادہ نہیں ہوگی۔''

☆☆☆

انیقہ سیکنڈ ائر میں تھی۔ ڈائریکٹوریٹ آف کالجز کی روایت تھی کہ زیر انتظام کالجوں کے مابین ہم نصابی سرگرمیوں کے مقابلے کرائے جاتے اور اس مقصد کے لیے سرکردہ کالجوں کو ایک ایک انٹر کالجیٹ مقابلہ کرانے کی ذمے داری تفویض کردی جاتی۔ انیقہ کے کالج کو ٹیبلو مقابلہ منعقد کرانے کی ذمے داری سونپی گئی۔ اس مقابلے میں شرکت کے خواہشمند کالجوں کو پانچ منٹ دورانیے پر مشتمل ٹیبلو پیش کرنے کی دعوت دی گئی۔ انیقہ کے اپنے کالج نے اسے اپنی طرف سے پیش کیے جانے والے ٹیبلو میں مرکزی کردار کے لیے منتخب کرنا چاہا تو اس نے شاہ مراد سے اجازت طلب کی جو انہوں نے بلا اعتراض نہایت خوشدلی سے دے دی۔

انیقہ روزانہ اپنی اور ٹیبلو کی تیاری میں شامل دیگر طالبات کی کارکردگی کا احوال شاہ مراد کو سناتی اور وہ اسے اپنے ماہرانہ مشوروں سے مستفید کرتے۔ اسے چہرے کے اتار چڑھاؤ اور اعضا کی حرکات وسکنات کو زیادہ متاثر کن بنانے کے لیے عملاً ہدایات دیتے کہ کبھی نامور ہدایت کار جو رہ چکے تھے۔

ٹیبلو مقابلے کے لیے جن منصفین کو مدعو کیا گیا، ان میں ایک ملک کی نامور ڈراما نگار خاتون تھیں، دوسرے فنونِ لطیفہ کی تعلیم وتدریس سے منسلک استاد اور تیسرے صاحب ٹی وی ڈراما پروڈیوسر تھے۔

مقابلے میں شریک اٹھارہ کالجوں میں انیقہ کے کالج کو اول انعام کا حقدار قرار دیا گیا۔ مہمانِ خصوصی کو اظہارِ خیال کے لیے ڈائس پر بلایا گیا تو انہوں نے تمام شرکائے مقابلہ کی حوصلہ افزائی کی۔ اول، دوم، سوم اور خصوصی انعام حاصل کرنے والے کالجوں کی طالبات کی تعریف وتوصیف کے ساتھ مبارک باد دی اور فرمایا۔ ''مجھے اس مقابلے میں مستقبل کے کئی معروف اداکار دکھائی دیتے ہیں۔''

تقریب کے اختتام پر مدعوئین کے لیے پُرتکلف چائے کا اہتمام بھی تھا۔ مقابلے کے منصفین میں شامل ٹی وی ڈراما پروڈیوسر سلمان بدر ہاشمی نے انیقہ کے پرنسپل سے خواہش ظاہر کی کہ وہ ان کے کالج کی جانب سے پیش کیے گئے ٹیبلو میں مرکزی کردار ادا کرنے والی طالبہ سے ملنا چاہتے ہیں۔ پرنسپل نے ٹیبلو کی تیاری کرانے والی خاتون کو انیقہ کو بلوانے کی ذمے داری سونپی اور انہوں نے انیقہ کو بلانے کے لیے ٹیبلو کی تیاری میں معاونت کرنے والی اسسٹنٹ لائبریرین کو دوڑایا۔

انیقہ چائے طلبی پر پہنچی تو سلمان بدر ہاشمی نے کہا۔

''آپ کی پرفارمنس بہت عمدہ تھی۔''

''تھینک یو سر!'' انیقہ نے کہا۔

''لگتا ہے آپ کو اداکاری کا شوق ہے؟''

''سر! ہماری میڈم نے بہت سکھایا ہمیں۔''

''یقیناً، مگر کچھ فنکار پیدائشی فنکار ہوتے ہیں۔ مجھے آپ میں وہ اسپارک نظر آیا ہے۔''

''تھینک یو سر!'' انیقہ نے ایک بار پھر کلمۂ ممنونیت ادا کیا۔

''بی بی! میں ٹی وی ڈراما پروڈیوسر ہوں۔ آج کل ہم ایک نئی ڈراما سیریل کی تیاری کررہے ہیں۔ آپ اگر دلچسپی رکھتی ہوں تو کسی روز آڈیشن کے لیے آجائیں۔''

(جاری ہے)